حرفِ محرمانہ

(عہدِ حاضر میں فکری اجتہاد)

ظفر اللہ خان



حرفِ محرمانہ

ظفر اللہ خان





اسلام، انسانیت کے لیے فرداً فرداً اور ان کی اجتماعی زندگی کی تشکیل کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخری ہدایت ہے۔ اس کے امن و سلامتی اور خوشحالی کے پیغام نے 1400 سال سے زائد عرصہ پہلے ایک پاکیزہ اور پُر جمال و پُر جلال امّت کی تشکیل کی۔ مسلمانوں نے ایک شاندار اور بے مثل تہذیب کی تخلیق کی جس نے انسان کی زندگی، اس کے علم اور اس کے ارتقا کی سرحدوں کو دُور دُور تک پھیلا دیا۔ یہ امّت تقریباً ایک ہزار برس تک بنی نوعِ انسان کے لیے روشنی کا مینار بنی رہی۔ دنیا اس عظیم الشان تہذیب و تمدن، اس کی وسعت پذیر ذہنی استعداد اور قوتِ عمل کو نگاہِ حیرت سے دیکھتی رہی مگر یہ سلسلہ اس شان و تمکنت کے ساتھ جاری نہ رہ سکا۔

پھر مسلم تہذیب لڑکھڑانے لگی اور مسلمان سو گئے۔ اس گہری نیند کے دوران وہ اپنے شاندار ماضی کی یادوں میں کھوئے رہے اور چیختے رہے۔ 'پدرم سلطان بود' (ہمارا باپ بادشاہ تھا)۔ اس دعوے نے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر کوئی اثر نہیں ڈالا، نہ پہلے اس سے کوئی فائدہ ہوا اور نہ اب ہو سکتا ہے۔ عظمتِ رفتہ حالیہ افزائش و ترقی کی ضرورتوں کو نہیں جھٹلاتی۔ مسلمانوں کو سنجیدگی کے ساتھ دروں بینی کرنے کی ضرورت ہے۔ انہیں تازہ افکار پیدا کرنے ہوں گے تا کہ جہانِ نو کو وجود میں لا سکیں۔ یہ ان کی بقا اور زندہ درگور کر دینے والے تعطّل سے بچنے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ آپ اس کتاب میں ایسی نئی دنیا کے بارے میں میرا خواب پائیں گے۔

حرفِ محرمانہ

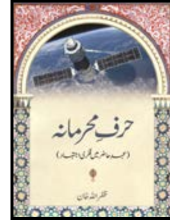
(عہدِ حاضر میں فکری اجتہاد)

ظفراللہ خان



نیشنل بک فاؤنڈیشن
اسلام آباد





نگران : **ڈاکٹر انعام الحق جاوید**
مصنف : ظفر اللہ خان

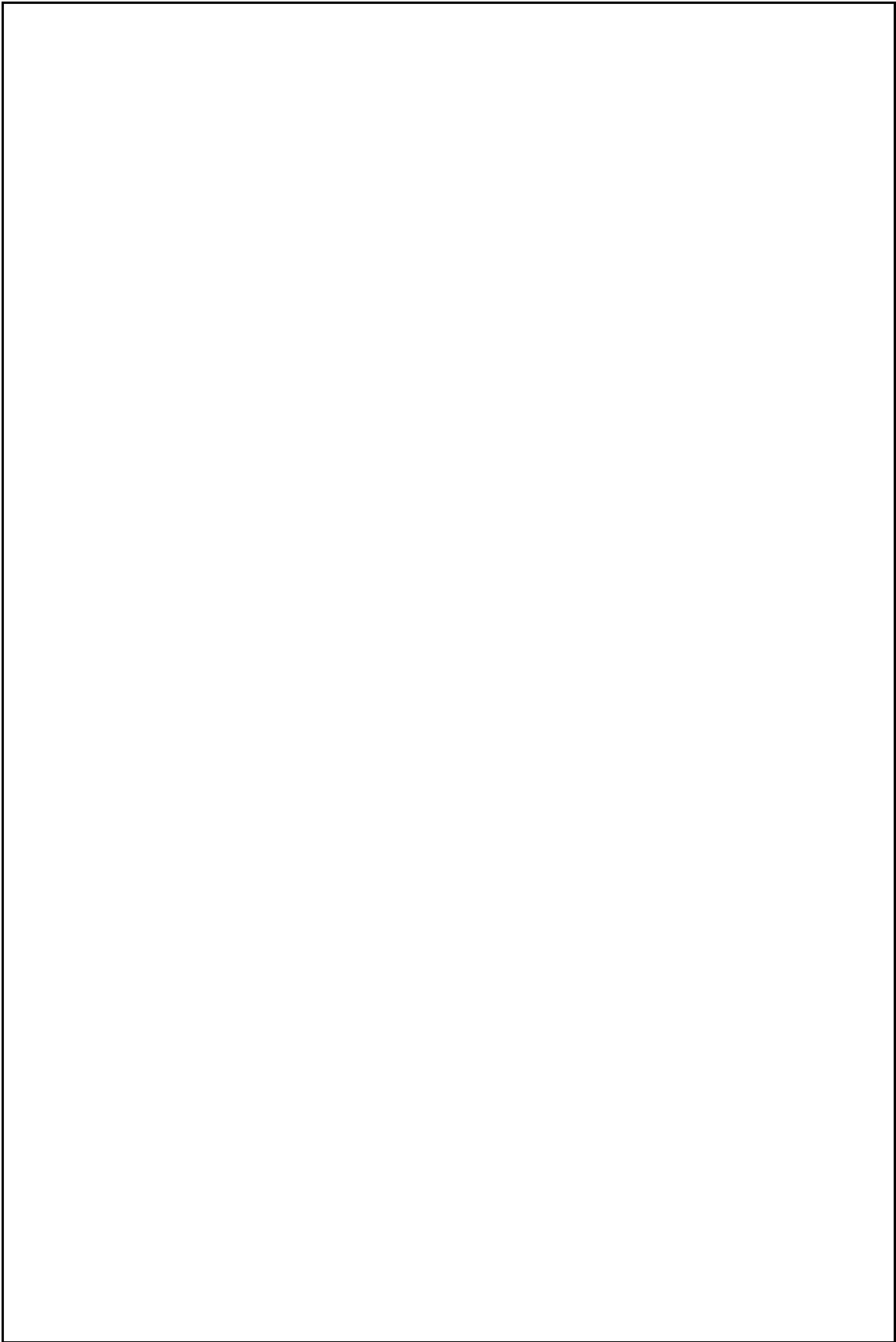
اشاعت : جولائی، 2018ء
تعداد : 1000
کوڈ نمبر : GNU-694
آئی ایس بی این : 978-969-37-1102-8
طابع : ایس ٹی پرنٹر، راولپنڈی
قیمت : -/830 روپے

نیشنل بک فاؤنڈیشن کی مطبوعات کے بارے میں مزید معلومات کے لیے رابطہ:
ویب سائٹ:http/www.nbf.org.pk یا فون 92-51-9261125
یا ای میل:books@nbf.org.pk

جو تھا نہیں ہے، جو ہے نہ ہو گا، یہی ہے اک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی، اسی کا مشتاق ہے زمانہ[1]

---

[1]۔ زمانہ؛ بالِ جبریل از محمد اقبالؒ



فہرست مضامین

(اجمالی)

تیسرا باب

چوتھا باب

پانچواں باب

حصہ دوم

کسی اور زمانے کا خواب

چھٹا باب

ساتواں باب

آٹھواں باب

نواں باب

دسواں باب

گیارھواں باب

بارھواں باب

تیرھواں باب

چودھواں باب

اکیسواں باب

بائیسواں باب

تیئیسواں باب

حصہ سوم

متفرقات

ازخواب گراں خیز

فہرست مضامین

(تفصیلی)

تیسرا باب

چوتھا باب

آٹھواں باب

نواں باب

دسواں باب

گیارہواں باب

بارہواں باب

حصہ سوم

متفرقات

ازخواب گراں خیز

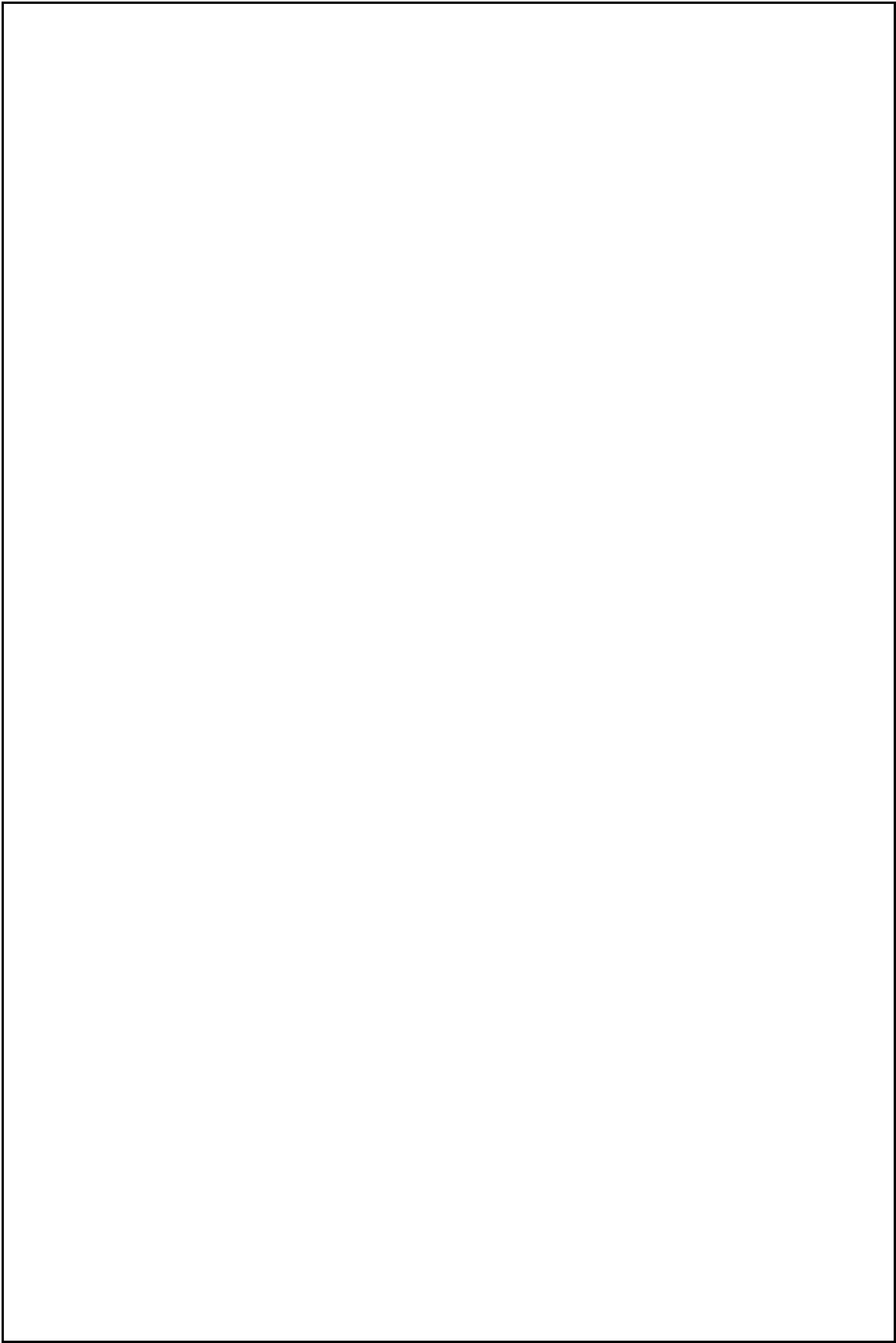
پیش لفظ

نیشنل بُک فاؤنڈیشن کی طرف سے کتب بینی کے فروغ کے لیے علم وادب، سائنس، فلسفہ، تاریخ، اخلاقیات اور دیگر اہم موضوعات پر ہر خاص وعام کے ذوقِ مطالعہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے معلوماتی کتب شائع کی جارہی ہیں تاکہ عاداتِ مطالعہ کے فروغ کے مقاصد کے تحت کتاب تک قارئین کی رسائی کو آسان بنایا جاسکے۔

اشاعتِ کتب کے اسی تسلسل میں "حرفِ محرمانہ" جناب ظفر اللہ خان کی ایک اہم کتاب ہے جس میں عہدِ حاضر میں فکری اجتہاد جیسے موضوع پر انتہائی محققانہ انداز میں بامقصد و بامعنی بحث کی گئی ہے۔ اندازِ تخلیقی اور اسلوب عام فہم ہے جس کے باعث پڑھنے والے کو مکمل بات بہ آسانی سمجھ آجاتی ہے اور وہ اس سے بھرپور استفادہ کرسکتا ہے۔

ظفر اللہ خان صاحب عہدِ حاضر کے ایک نامور مصنف ہیں۔ اُردو اور انگریزی میں لکھی گئی ان کی کتابیں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ اس سے قبل "Islam in the Contemporary World: A New Narrative"، "کتاب الزُّہد" اور "کسی اور زمانے کا خواب" کے نام سے ان کی تین کتابیں این بی ایف سے شائع ہو کر خاص وعام میں مقبول ہو چکی ہیں۔ ہم ان کے ممنون ہیں کہ انہوں نے کتابوں کو قارئین کے وسیع تر حلقے تک پہنچانے والے قومی ادارے این بی ایف کو اس کتاب کی اشاعت کے حقوق دیئے۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید
(پرائڈ آف پرفارمنس)
مینیجنگ ڈائریکٹر



نغمۂ حیات

اسلام، انسانیت کے لیے فرداً فرداً اوران کی اجتماعی زندگی کی تشکیل کے لیے بھی خدا کی طرف سے آخری ہدایت ہے۔اس کے امن وسلامتی اور خوشحالی کے پیغام نے 1400 سال سے زائد عرصہ پہلے ایک پاکیزہ اور پُر جمال و پُر جلال امّت کی تشکیل کی۔ مسلمانوں نے ایک شاندار اور بے مثل تہذیب کی تخلیق کی جس نے انسان کی زندگی، اس کے علم اور اس کے ارتقا کی سرحدوں کو دُور دُور تک پھیلا دیا۔ یہ امّت تقریباً ایک ہزار برس تک بنی نوعِ انسان کے لیے روشنی کا مینار بنی رہی۔ دنیا اس عظیم الشان تہذیب وتمدن، اس کی وسعت پذیر ذہنی استعداد اور قوتِ عمل کو نگاہِ حیرت سے دیکھتی رہی مگر یہ سلسلہ اس شان وتمکنت کے ساتھ جاری نہ رہ سکا۔

پھر مسلم تہذیب لڑکھڑانے لگی اور مسلمان سو گئے۔اس گہری نیند کے دوران وہ اپنے شاندار ماضی کی یادوں میں کھوئے رہے اور چیختے رہے۔'پدرم سلطان بود' (ہمارا باپ بادشاہ تھا)۔ اس دعوے نے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر کوئی اثر نہیں ڈالا، نہ پہلے اس سے کوئی فائدہ ہوا اور نہ اب ہوسکتا ہے۔ عظمتِ رفتہ حالیہ افزائش وترقی کی ضرورتوں کو نہیں جھٹلاتی۔مسلمانوں کو سنجیدگی کے ساتھ دروں بینی کرنے کی ضرورت ہے۔انہیں تازہ افکار پیدا کرنے ہوں گے تاکہ جہانِ نو کو وجود میں لاسکیں۔ یہ ان کی بقا اور زندہ درگور کر دینے والے تعطل سے بچنے کے لیے بے حد ضروری ہے۔آپ اس کتاب میں ایسی نئی دنیا کے بارے میں میرا خواب پائیں گے۔

میں نے اسلام کی تعلیم بہت کم عمری میں، ملتان کے ایک دُور افتادہ گاؤں کے ایک مدرسے میں حاصل کرنا شروع کی جو آج تک جاری ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھ پر اسلام کی خوبصورت سچائیاں واضح ہوتی چلی گئیں۔اس سے میں اس امر کا قائل ہو گیا ہوں کہ اسلام کی موجودہ قدامت پسندانہ تعبیر نہ صرف سہوِ زمانی (anachronistic) ہے بلکہ دشمنِ ترقی اور دشمنِ انسانیت بھی ہے۔اسلام،

جو بنی نوعِ انسان پر اللہ تعالیٰ کی سراسر شفقت و رحمت ہے، غلط تعبیر کرنے والوں کے ہاتھوں استحصال اور غربت و افلاس پھیلانے حتیٰ کہ دہشت گردانہ اقدامات کی وجہ سے قتلِ انسان کا بھی ایک ذریعہ بن چکا ہے۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ مسلمان ماضی میں پھنس کر رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک صحیح جدید اسلامی زندگی وجود میں لانے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اگر پیروکارانِ اسلام اپنے مذہب کو صحیح طور پر سمجھتے اور اس پر عمل کرتے تو یہ انہیں شاندار ترقیوں سے ہمکنار کر دیتا۔ حقیقی 'اجتہاد' نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان امن و خوشحالی کی زندگی کے حصول سے محروم ہو چکے ہیں، جس کی بنا پر وہ اپنی پوری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع کھو بیٹھے ہیں۔

'یہ کتاب' لکھنے کی بنیاد ایک لیکچر بنا جو میں نے 2003ء میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں علماء کے سامنے دیا تھا۔ اس لیکچر کو شرح و بسط کے ساتھ پہلے اردو بعنوان ''کسی اور زمانے کا خواب'' (2004ء) میں شائع کیا گیا پھر 2008ء میں انگریزی میں (The Way Out) شائع کیا گیا۔ جب حکومتِ پاکستان 2014ء میں انتہا پسندی کے مقابلے کے لیے نیا ایکشن پلان تیار کرنے لگی تو ایک عمومی رائے کے تحت اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اسلام کا ایک جوابی بیانیہ پیش کر کے پاکستان (اور دنیا بھر) میں تعصب، انتہا پسندی اور دہشت گردی کا مقابلہ کیا جائے جبکہ بدقسمتی سے اسلام کا غلط اطلاق کر کے بعض انتہا پسند عناصر اپنے نظریۂ دہشت گردی کا جواز پیش کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ وہ جوابی بیانیہ اب تک سامنے نہیں آ سکا۔ اس مقصد کے لیے میری یہ کتاب ایک عاجزانہ کوشش ہے۔ اس کے لیے میں 40 برس تک اسلام کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ یہ مسئلہ اب تک میری روز و شب کی سوچ بچار کا مرکز و محور بنا چلا آ رہا ہے۔ یہ کتاب نیشنل بک فاؤنڈیشن نے پہلے انگریزی میں 'Islam in the Contemporary World: A New Narrative' کے عنوان سے شائع کی۔ میں جناب یحییٰ خان صاحب کا خصوصی طور پر شکرگزار ہوں جنہوں نے اس کتاب کو انگریزی سے اردو میں بہت مہارت اور عرق ریزی سے منتقل کیا۔

یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول ماضی کے حالات کی نقش گری ہے اور حصہ دوم میں حال اور مستقبل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ حصہ اول (باب ایک تا باب پانچ) میں، میں ایک تاریخی تنقید کے عمل

میں سے گزر رہا ہوں تا کہ ماضی کو واضح طور پر سمجھا جائے اور ہم مستقبل کا نئے سرے سے تصور قائم کرنا شروع کر دیں۔ حصہ دوم (باب چھ تا باب تئیس) میں اسلامی افکار اور مسلم معاشروں کی تشکیلِ نو پیش کر رہا ہوں۔

ذیل میں ہر باب کے مواد کا ایک مختصر خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے جو میرے استدلال کی ساخت اور نئے اسلامی بیانیے کی تشکیل کی بنیاد کی وضاحت کرتا ہے۔

پہلا باب: کائنات کی زندگی حرکت میں سے نمودار ہوتی ہے؛ حالتِ جمود میں موت چھپی ہوئی ہوتی ہے تاہم فطرت میں تغیر اور استحکام بیک وقت موجود رہتے ہیں لہٰذا تغیر اور استحکام کے باہمی انحصار کا تسلسل زندگی میں ایک توازن قائم کرتا ہے اور اسلام کی تشکیل میں اصولِ تحرک کو 'اجتہاد' کہا جاتا ہے۔

دوسرا باب: مسلمانوں نے ماضی میں تبدیلی اور جہاد کے سنہرے اصولوں کی روشنی میں ہر چیلنج کا جواب دیا ہے۔ اس طرح وہ ہر شعبۂ زندگی میں بنی نوعِ انسان کے ارتقاء میں خصوصی کردار ادا کرتے رہے۔

تیسرا باب: اسلام نے اپنی اعلیٰ وارفع اقدار کے لیے روحانی بنیادیں اور فطری ترغیبات فراہم کی ہیں۔ اس نے فطرت کے مطالعے پر زور دیا ہے، نہ کہ اس کی پوجا پر، جیسے کہ یہ ہوتی رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں سائنسی اندازِ فکر نے جنم لیا، اس طرح علم کو بڑے پیمانے پر فروغ ملا۔ یہ علم پورے یورپ میں پھیلا اور اس سے یورپی نشاۃِ ثانیہ کی شمع روشن ہو گئی۔

چوتھا باب: قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے اپنے زمانے کے چیلنج کا بڑی کامیابی سے جواب دیا اور وہ مہذب دنیا پر چھا گئے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ انحطاط کا شکار ہوتے چلے گئے۔ بالآخر نیند کی گہری وادیوں میں کھو گئے جبکہ اہلِ یورپ نے مسلمانوں کے علم کی بنیادوں پر سلطنتیں استوار کر لیں۔ یہ بنیادیں آج تک حکمرانی کے لیے استعمال ہو رہی ہیں۔ ان کے سائنسی انقلاب نے ان کی کایا پلٹ دی ہے اور عہدِ روشن خیالی (Age of Enlightenment) نے ایک نئے معاشرتی نظام کو جنم دے دیا ہے تاہم ان پیش قدمیوں کے دوران مسلمان غفلت کی گہری نیند میں

پڑے رہے۔

پانچواں باب: مسلم تہذیب خطرات سے دوچار ہے۔ یہ خطرات نہ اچانک سامنے آئے ہیں اور نہ یہ غیر متوقع تھے۔ یہ آنے ہی تھے کیونکہ مادی دنیا فطری قوانین کے تابع ہے۔ مسلمانوں نے ان قوانین کی اطاعت اختیار نہیں کی چنانچہ وہ اپنی زیست کے سب سے پست درجے پر زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کا فخر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے۔

چھٹا باب: یہ دنیا فضول نہیں بنائی گئی بلکہ ایک مقصد کے تحت وجود میں لائی گئی ہے۔ یہاں آنے والے انسانوں کے لیے خدا کی طرف سے رہنمائی کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت اپنے مقصدِ تخلیق کو فراموش کیے بیٹھی ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ دوسرا گروہ کئی خداؤں کے احکامات کی اطاعت کرتا ہے۔ پھر ایک اور گروہ کا کہنا ہے کہ تمام انسانی مسرتیں گناہ ہیں۔ مسلمانوں کو ایک صحیح نظامِ فکر کی ضرورت ہے جسے اختیار کر کے انھیں ان مطالبات کو پورا کرنا ہے جو یہ نظامِ فکر ان پر عائد کرتا ہے۔

ساتواں باب: اسلام میں صرف دو ہی مستند ماخذ ہیں۔ قرآن پاک اور سنت۔ یہی شریعت کی بنیاد ہیں جبکہ فقہ میں حالات کے مطابق قرآن پاک اور سنت کی تشریحات شامل ہیں۔ شریعت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا لیکن فقہ میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ عصرِ حاضر کے مسلمان شریعت کی بہ نسبت فقہ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ مزید برآں فقہ کو بہت زیادہ اہمیت دینے سے قانون پرستانہ نقطۂ نظر (legalistic view) پیدا ہو گیا ہے جس سے اسلام کے اخلاقی، معاشرتی اور روحانی پہلو نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

آٹھواں باب: اسلام کا مطلب ہے سلامتی اور اطاعت۔ اللہ تعالیٰ کی منشا و مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کو اطاعت کہا جاتا ہے۔ اسلام میں چند ایک بنیادی اجزائے ایمان ہیں اور چند ایک لازمی رسوم ہیں۔ مقاصدِ شریعت میں مذہب کا تحفظ و مدافعت، زندگی، قوائے ذہنی، عزت و ناموس، خاندان، مال و دولت کی حفاظت اور عدل گستری شامل ہیں۔ چند ایک بنیادی اور قانونی تعلیمات

ہیں جن پر عمل کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کو صرف بنیادی تعلیمات پر توجہ مرکوز کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

نواں باب: عقلیت (rationality) انسان کو دیگر مخلوقات سے الگ کرتی ہے۔ مسلم روایت عقلیت کو وحی کے اندر شامل کرتی ہے اور عقل کو ایک بڑی حقیقت کا جزو سمجھتی ہے۔ تاہم بیشتر مسلمانوں کا عمومی طرزِ عمل غیر معقول اور غیر متوازن ہے جس کی وجہ سے انہوں نے نظامِ ترجیح کو درہم برہم کر دیا ہے۔ لہٰذا انہیں اس غیر معقول رویّے سے نجات پانے کی کوشش کرنا ہوگی۔

دسواں باب: اسلام کسی مادی و اخلاقی اور دنیاوی و روحانی تقسیم کی اجازت نہیں دیتا۔ مسلمانوں نے 'دین' کے اسلامی تصور کو ترک کر دیا ہے اور اس کی بجائے نفس کشی اور رواقیت کا تصور اپنا لیا ہے۔ مسلمانوں کو دنیاوی اور روحانی شعبوں کی تقسیم کا سلسلہ چھوڑ دینا چاہیے، ورنہ وہ ترقی نہیں کر سکیں گے۔

گیارہواں باب: اسلام نے نیم قبائلی یا موروثی سیاسی نظاموں کو تبدیل کر کے مشاورت پر مبنی نظام (شوریٰ) قائم کیا ہے۔ چاروں خلفائے راشدین کے بعد مسلم حکمرانوں نے پھر سے مطلق العنان خاندانی نظام قائم کر لیے تھے۔ اس تاریخی سیاق وسباق نے مسخ شدہ مذہبی وسیاسی سوچ کو جنم دیا۔ بعض اہل دانش اس فطری جمہوری اصول سے اختلاف کرتے ہوئے ایک غیر حقیقی مثالیت کا تصور پھیلا رہے ہیں تا کہ ایک ہمہ مقتدر خلیفہ وجود میں لا سکیں جبکہ مسلمانوں کو ایک ایسے سیاسی نظام کی ضرورت ہے جو کہ مشاورتی ہو۔

بارہواں باب: ہمارے مدارس نے روایتی اسلامی تعلیمات ہم تک منتقل کر کے حیرت انگیز کردار ادا کیا ہے لیکن اب حالات وکیفیات تبدیل ہو چکی ہیں۔ مسلمانوں کو بھی لازماً تبدیل ہو جانا چاہیے تا کہ وہ وقت کے ساتھ ہم قدم ہو کر چل سکیں۔ ہمارے مذہبی تعلیم کے نظام کی اصلاح وتجدید کی ضرورت ہے۔ نصاب اور طریقِ تدریس فوری تبدیلیوں کے متقاضی ہیں تا کہ مسلمانوں کو مزید ذہنی افلاس سے بچایا جا سکے۔

تیرہواں باب: آج مسلم دنیا میں سائنس کا حال اندوہ ناک ہے۔ مسلم ممالک میں ہر دس لاکھ کی آبادی میں صرف 530 سائنسدان ہیں جب کہ جاپان میں ہر دس لاکھ افراد میں 5095 سائنس دان ہیں۔ 194 یہودی سائنسدانوں کو نوبیل پرائز مل چکا ہے جبکہ یہ صرف دو مسلمانوں کو مل سکا ہے اور وہ دونوں امریکہ میں ہی آباد ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی پر توجہ مرکوز کرنا ہوگی اگر وہ دنیا میں باوقار حیثیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

چودہواں باب: مسلمان بالعموم اخلاقی انحطاط کا شکار ہیں اگرچہ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ حضور نبی کریم ﷺ کے پیروکار ہیں جو اعلیٰ وارفع کردار کے حامل تھے۔ کسی انسان کی عظمت کو اس کی تعلیم، مال ومتاع یا منصب کے پیمانے سے نہیں بلکہ اس کے بلند کردار اور طور طریقوں سے ناپا جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اعلیٰ اخلاقی اقدار کے فروغ کے لیے ایک باقاعدہ تحریک شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

پندرہواں باب: اسلام ہمیں بنی نوعِ انسان کے فطری وقار کا احترام کرنے کا درس دیتا ہے لیکن مسلمانوں نے انسانی حقوق کی جدید تحریک کے بارے میں منفی رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ وہ ان طور طریقوں سے اختلافی رویہ اختیار کر سکتے ہیں جو ان کے نظامِ عقائد سے متصادم ہوں لیکن ایسے تمام اطوار کو مثبت انداز میں قبول کر لینا چاہیے جو ان عقائد سے مطابقت رکھتے ہیں۔

سولہواں باب: عورتیں انسانی آبادی کا نصف ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ زیادہ تر غیر اسلامی اور قدامت پسندانہ بلکہ ازمنہ وسطیٰ جیسا ہے۔ جب کہ مسلم تہذیب کے سنہری دور میں عورتیں امت مسلمہ کی معاشرتی ثقافتی اور تہذیبی زندگی میں موثر طور پر شریک رہی ہیں۔ اس کے برعکس جدید دور کے مسلمانوں نے عورتوں کو مسلم معاشرے سے الگ تھلگ کر رکھا ہے۔ مسلمانوں کو اپنا طرزِ عمل تبدیل کرنا ہوگا کیونکہ یہ بالکل ناقابل دفاع ہے۔

سترہواں باب: قدیم اسلامی ادب میں مسلم ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کو ذمّی کہا جاتا ہے یا ایسے لوگ کہا جاتا ہے جن کی حفاظت ایک معاہدے کے تحت کی جاتی ہو۔ قرآن پاک کسی عداوت کے بغیر ہمہ گیر مذہبی یکجہتی کو مقدس قرار دیتا ہے، اس طرح شدت پسندی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ کیا

آج کل کے مسلمان اپنے ملکوں میں اقلیتوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ 'ہرگز نہیں' یہ صورت حال تبدیل ہونی چاہیے۔

اٹھارہواں باب: بیشتر مسلمان کسی نہ کسی شکل میں غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ مذہبی طبقہ ماضی بعید کے ساتھ چپکا ہوا ہے اور سوچتا ہے کہ ہر وہ چیز جو مغرب سے آتی ہے وہ 'کفر' ہے۔ مسلم آبادی کا تعلیم یافتہ طبقہ مغربی تہذیب کا ایک اندھا غلام ہے۔ مسلمانوں کو یہ سوچ ترک کر کے ہر اس چیز کو قبول کر لینا چاہیے جو اچھی ہے اور جو چیز بُری ہے اسے ترک کر دینا چاہیے۔ انہیں ذہانت میں بھی دنیا کی قیادت کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔

انیسواں باب: اسلام 'شریعۃ' اور 'تزکیۂ نفس' یا تصوّف پر زور دیتا ہے۔ تصوف نے بیرونی اثرات کے تحت ایسے اصول وضع کر لیے ہیں جو اسلامی روحانیت کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اس کی وجہ سے مسلمان ترکِ دنیا (asceticism) اور غیر معقولیت (irrationality) کی طرف مائل ہو گئے۔ حقیقی تصوّف اس جدید دنیا میں مفید کردار ادا کر سکتا ہے، جہاں لوگ دولت، جائیدادوں اور سامانِ تعیش کی ہوس میں مبتلا ہو رہے ہیں، تصوّف انہیں راہِ راست پر لا سکتا ہے۔

بیسواں باب: مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد غیر مسلم ممالک میں بستی ہے۔ جدید شہریت ان سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ ان ملکوں کے قوانین کی پاسداری کریں اور وہاں کے شہریوں کے ساتھ یکجہتی اور یگانگت کا مظاہرہ کریں۔ مغربی ریاستوں کے مسلم رہائشیوں کو سیاسی لبرل ازم کا مقامی برانڈ قبول کرنا پڑتا ہے۔ 'دعوت' اور 'مصلحت' کے اصول تقاضا کرتے ہیں کہ وسیع تر معاشرے کے ساتھ خوش دلانہ اور مخلصانہ روابط بڑھائے جائیں۔ اگر مسلمان ایک غیر مسلم ریاست میں ایسا کرنے میں اذیت محسوس کریں تو وہ وہاں سے ہجرت کر کے کسی اسلامی ریاست میں جا سکتے ہیں۔

اکیسواں باب: بعض مسلمان پوری مسلم اُمّہ کے لیے ایک 'خلافت' کے قیام پر زور دیتے ہیں تاہم اسلام ہمہ گیر 'خلافت' کے قیام کا حکم نہیں دیتا جو کہ ایک تاریخی تعامل کا مظہر ہوتی ہے۔ مسلمان زمین پر اللہ عزوجل کے خلیفہ ہیں۔ تاریخی طور پر خلافتِ راشدہ کے بعد کوئی مستحکم خلافت قائم نہیں ہوئی۔

ایک ہمہ گیر مسلم خلافت کا قیام اب نا قابلِ عمل (unrealizable) رومانوی تصور ہے، بالخصوص جدید قومی ریاستوں کے سیاق و سباق میں یہ بالکل ہی ایک خواب ہے۔ مسلم اُمّہ کے اتحاد کی خواہش مسلم ریاستوں کی دولتِ مشترکہ کے قیام میں ہی ممکن ہوسکتی ہے۔

بائیسواں باب: جہاد کے نام پر مسلمانوں کی بہت خون ریزی ہوچکی ہے۔ جہاد، درحقیقت شر کے خلاف تمام سطحوں پر ایک طویل پُر امن جدو جہد کا نام ہے۔ جہاد کا مطلب یہ بھی ہے کہ بہت ہی خاص حالات میں ایذا رسانی سے بچنے کے لیے ایک مسلح جدو جہد شروع کر دی جائے۔ جہاد کا اعلان صرف ایک مسلم ریاست اپنے دفاع کی خاطر کرسکتی ہے؛ چند گروہوں یا افراد کو، حکومت سے بے نیاز ہوکر، اعلانِ جہاد کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ جب گروہ یا افراد اپنے طور پر، آزادانہ یہ عمل شروع کر دیں گے تو یہ انارکی اور فتنہ انگیزی ہوگی جو کہ 'انسان کے ہاتھ سے انسان کے قتل' سے بھی بدتر ہوگا۔

تیئیسواں باب: اسلام کے بعض اصول مستقل نوعیت کے ہیں۔ اسلام اجتہاد کا تصور اس لیے دیتا ہے کہ انسانی تہذیب کی پیش قدمی کے لیے پُر امن جدو جہد کا ساتھ دیا جائے۔ شریعت بنیادی اصول دیتی ہے جن کی ترجمانی لازماً بذریعہ اجتہاد کی جانی چاہیے۔ پوری امتِ مسلمہ ایک ذہنی انحطاط کے دور سے گزر رہی ہے۔ اس کا رُخ پیچھے کی طرف موڑنے کی اشد ضرورت ہے۔ آج مسلمانوں کو ایک کلّی اجتہاد کی ضرورت ہے جو اسلام کی بنیادی تعلیمات کی بنیاد پر موجودہ مذہبی افکار کی جامع تشکیلِ نو کی طرف لے جائے لیکن گزشتہ پانچ سو سالوں کی پیش قدمیوں کو بھی ذہن نشین رکھنا ہوگا۔

یہ مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میں مسلم عوام اور مذہبِ اسلام پر پورا یقین رکھتا ہوں۔ میرا یہ یقین بھی ہے کہ علم اور صحیح ایمان رکھتے ہوئے ہم وہی لوگ بن سکتے ہیں جو کبھی ہوا کرتے تھے۔ ایسے لوگ جیسے اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے چاہتا رہا ہے کہ ہم ویسے ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اس نصب العین کے لیے یہ کتاب ہمارے سفر کا ایک حصہ ہوگی۔ درحقیقت گمشدہ روایت کی بازیافت کے لیے ایک

کوشش ہے:

میں کہ میری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سُراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو[1]

میں ان متعدد حضرات کا شکر گزار ہوں، جنھوں نے اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا۔ میں شکریہ ادا کرتا ہوں سیف اللہ بخاری کا جس نے تحقیق میں میری مدد کی۔ احمد جاوید صاحب اور وقار حمدی صاحب کا جنھوں نے نہایت فکر انگیز اور مدلّل بحثیں کیں اور ایوب پراچہ صاحب کا جنھوں نے پروف ریڈنگ کی۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید مینیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بک فاؤنڈیشن کا جنھوں نے میری اس کاوش کو کتابی شکل میں قارئین تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری اس حقیر کوشش کو قبول فرمائے جو میں نے بہتر پاکستان اور بہتر دنیا وجود میں لانے اور مسلمانوں کی اصلاح اور احیا کی خاطر کی ہے۔

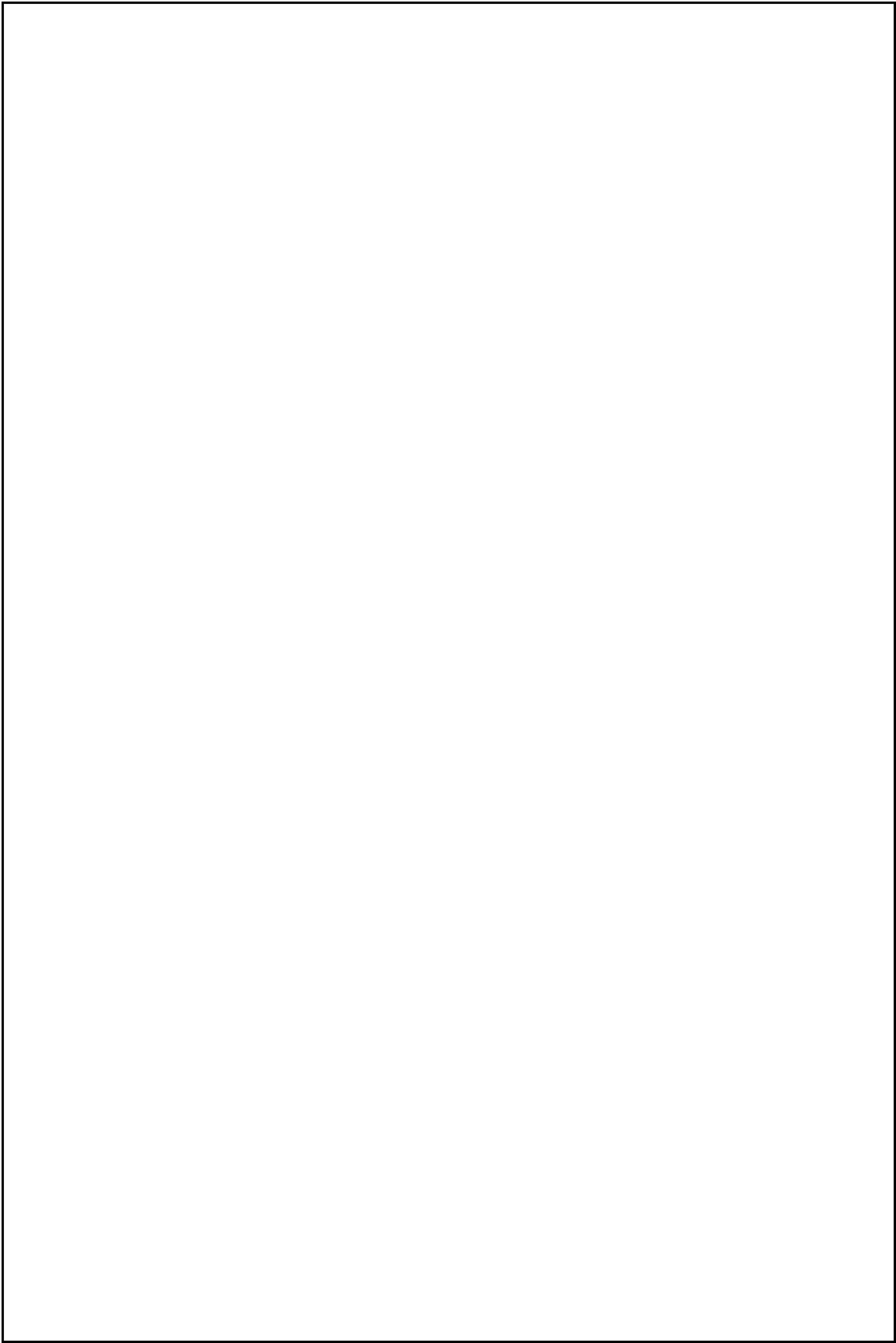
ظفر اللہ خان

اسلام آباد

مئی 2018ء

---

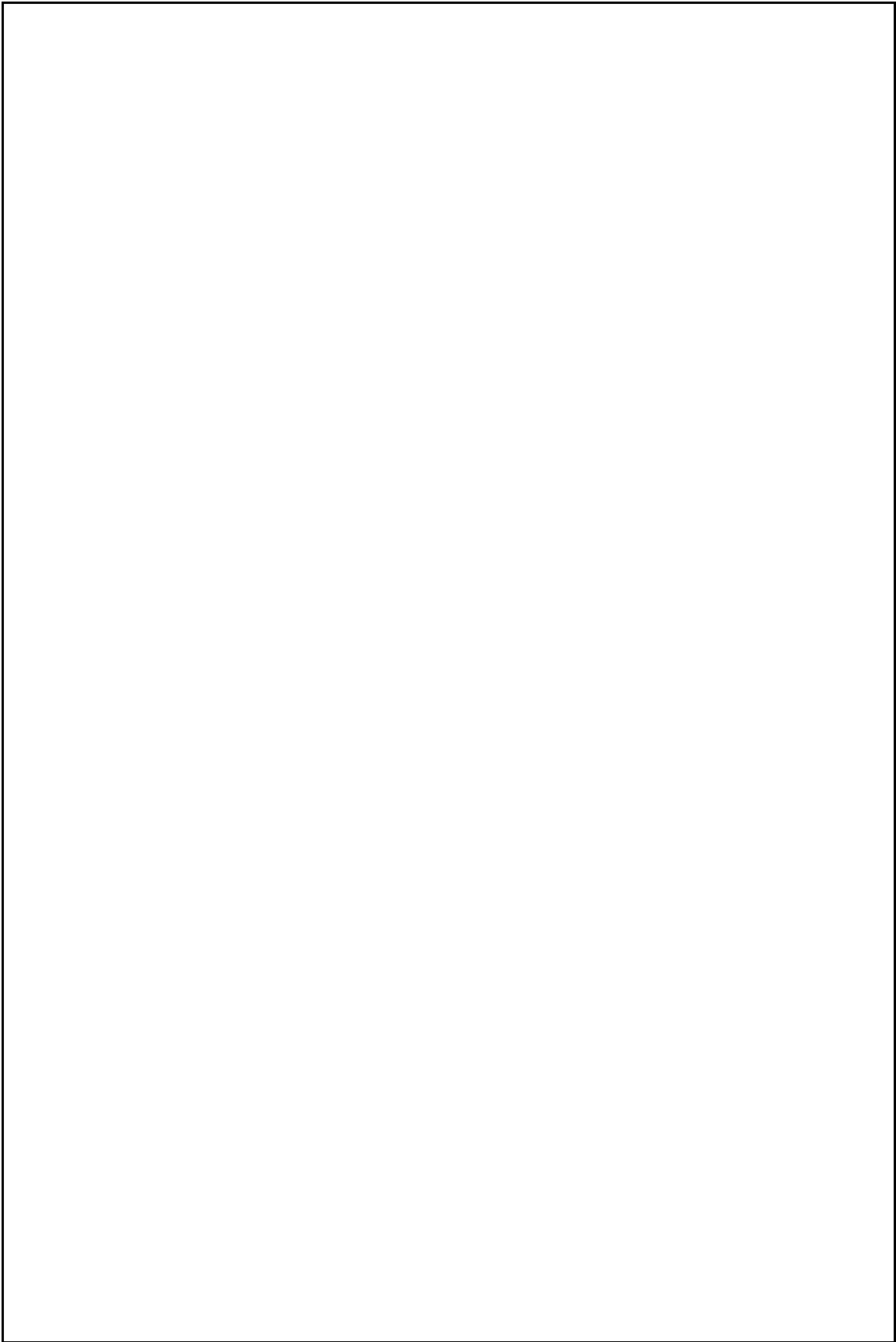
[1] ۔ ذوق وشوق؛ بالِ جبریل از محمد اقبالؒ



حصۂ اول

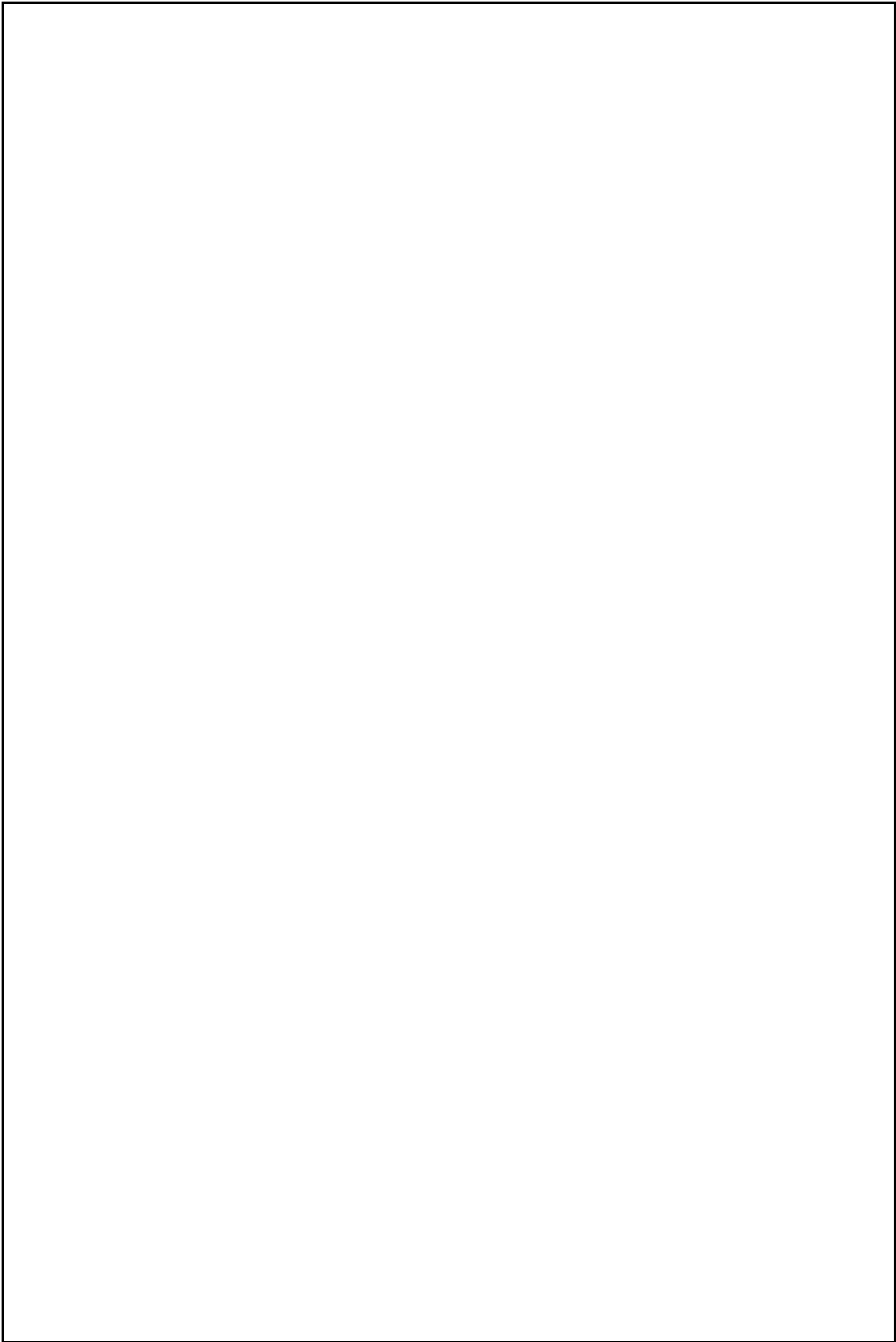
پدرم سلطان بود





اسلام بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لئے خداوند قدوس کی طرف سے بھیجی گئی آخری وحی ہے۔ اس نے ایک اعلیٰ و ارفع امت کی تشکیل کی طرف رہنمائی کی اور ایک ایسی شاندار تہذیب کو جنم دیا جس نے زیستِ انسانی کی تمام سرحدوں کو آگے دھکیل دیا۔ مسلمان تقریباً ہزار سال تک بنی نوع انسان کے لئے روشنی کا مینار بنے رہے اور دنیا ان کی پُرعظمت تہذیب سے استفادہ کرتی رہی۔ مگر پھر ان کی تہذیب خود ہی لڑکھڑا گئی اور مسلمان رفتہ رفتہ حالتِ خودرفتگی میں کھو گئے۔ ایک گہری نیند نے انہیں دبوچ لیا۔ اُس حالت کے دوران وہ اپنے شاندار ماضی کی طرف دیکھتے رہے ہیں اور صدا دیتے رہے ہیں:

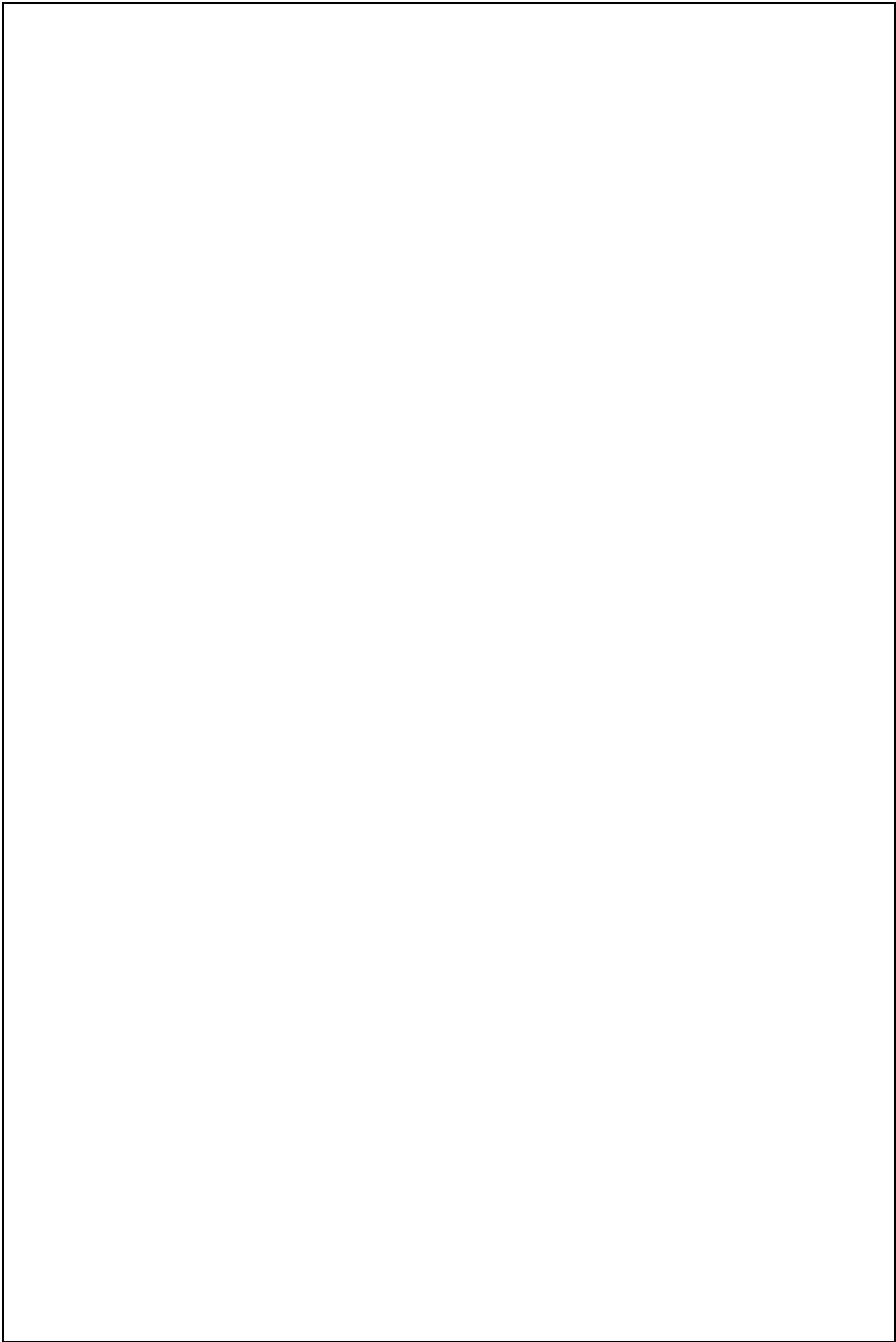
'پدرم سلطان بود'



پہلا باب

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی





ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بے زیستم
ہیچ نہ معلوم شدہ آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتۂ، تیز خرامید و گفت
ہستم اگر میروم ، گر نروم نیستم[1]

(ٹوٹ پھوٹ سے نڈھال ساحل نے کہا اگر چہ میری زندگی کے دن بیت چکے ہیں آہ میں سمجھ نہیں سکا کہ میں کون ہوں۔ آپے سے باہر ہوتی موج نے پاس سے گزرتے ہوئے کہا، میں اس وقت تک ہوں جب تک چلتی رہوں، اگر نہ چلی تو مر جاؤں گی)

1۔ حرکت

1972ء میں جب میں چھٹی جماعت میں تھا۔ میرے ایک محترم استاد کلاس میں با آواز بلند حضرت اقبالؒ کی یہ نظم پڑھ کر ہمیں سنایا کرتے تھے:

چاند اور تارے

ڈرتے ڈرتے دم سحر سے — تارے کہنے لگے قمر سے
نظارے رہے وہی فلک پر — ہم تھک بھی گئے چمک چمک کر
کام اپنا ہے صبح و شام چلنا — چلنا ، چلنا ، مدام چلنا
بے تاب ہے اس جہاں کی ہر شے — کہتے ہیں جسے سکوں ، نہیں ہے
رہتے ہیں ستم کشِ سفر سب — تارے ، انساں ، شجر ، حجر سب

ہو گا کبھی ختم یہ سفر کیا
منزل کبھی آئے گی نظر کیا

کہنے لگا چاند ، ہم نشینو — اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی — یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ — کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

[1] ۔ زندگی و عمل؛ پیامِ مشرق از محمد اقبالؒ

اس رہ میں مقام بے محل ہے پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھہرے ذرا، کچل گئے ہیں
انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق، انتہا حسن[۱]

میرا ناپختہ ذہن اس خوبصورت نظم کے پُرشکوہ معنوں کو نہ سمجھ سکا۔ پھر بھی میں نے اس کے غنائی ابیات اور ہم وزن مصرعوں کو زبانی یاد کرلیا۔ جوں جوں میرا شعور ترقی کرتا رہا۔ان کے معنی اور اہمیت میری روح کو سیراب کرتی رہی۔ میرے استاد کی رعب دار تحریک انگیز آواز میرے ذہن میں گونجتی رہی ہے۔

جب میں نے ایک مدرسے میں فلسفہ اور منطق کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی تو پہلی کتاب جو ہم نے پڑھی 'ایساغوجی فی منطق'[۲] تھی۔ اس کتاب کے فلسفیانہ مفروضوں میں سے ایک یہ ہے کہ 'کائنات ہمیشہ تبدیل ہوتی رہتی ہے'[۳]۔ ایساغوجی فی منطق، ہرقلیطس[۴] (Heraclitus, d. 475 BC) کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ جس نے بجا طور پر کہا تھا کہ 'ہر چیز متغیر ہوتی ہے، کوئی چیز ساکن نہیں رہتی۔ کوئی شخص ایک ہی دریا میں دو مرتبہ قدم نہیں رکھ سکتا'۔ میرے نوخیز اور اثر پذیر ذہن نے کتاب کے نام کو کسی حد تک مزاحیہ پایا تاہم اس نے مجھے کائنات پر سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ کر دیا جو ہمیشہ متغیر ہوتی اور وسیع سے وسیع ہوتی چلی جا رہی ہے۔ میں زندگی بھر حرکت اور تبدیلی (تغیرّ) کے ہمہ گیر تصورات کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرتا آ رہا ہوں۔ تاہم جب میں ان تصورات کو سمجھنا شروع کرتا ہوں تو وہ پہلے ہی تبدیل ہو چکے ہوتے ہیں۔ صاحبِ شعور انسان بننے کے چالیس سال بعد اور زندگی کے عملی تجربات حاصل ہونے پر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تبدیلی کائنات کا جوہرِ حقیقی ہے اور ہم سب کو اس سے ہم قدم

---

[۱]۔ چاند اور تارے؛ بانگ درا از محمد اقبالؒ

[۲]۔ 'ایساغوجی فی المنطق'، علم منطق کی ایک یونانی کتاب ''Porphyry`s Isagoge'' کی شرح ہے۔ جو ایک ایرانی فلسفی اثیر الدین ابجری نے لکھی ہے۔ یہ 1265 میں آذربائیجان میں فوت ہوا تھا۔ یہ کتاب برصغیر ہند و پاکستان کے دینی مدرسوں کے نصاب کا حصہ ہے اور سارے عہد متوسط میں ایک معیاری نصابی کتاب تھی۔

[۳]۔ العالم متغیرون

[۴]۔ Heraclitus of Ephesus؛ ہرقلیطس (535 - 475 BC) یونانی فلسفی تھا جس نے کائنات کے بنیادی جوہر کے مستقل تغیر پر اصرار کی وجہ سے شہرت پائی تھی۔

ہو کر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں[1]

قرآن تغیرِ پیہم کے اس اصول کی توثیق کرتا ہے۔

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ[2]

(ہر آن وہ نئی شان میں ہے)

اس کارگاہ عالم میں اللہ عز وجل کی کارفرمائی کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ وہ بے حد وحساب نئی سے نئی وضع اور شکل اوصاف پیدا کر رہا ہے۔ اس کی دنیا کبھی ایک حال پر نہیں رہتی۔ ہر لمحہ اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اور اس کا خالق ہر بار اُسے ایک نئی صورت سے ترتیب دیتا ہے جو پچھلی تمام صورتوں سے مختلف ہوتی ہے۔

يُقَلِّبُ اللّٰهُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ[3]

(رات اور دن کا الٹ پھیر وہی کر رہا ہے۔ اس میں ایک سبق ہے آنکھوں والوں کے لیے)

یہ آیات اس بدیہی (manifest) صداقت کی طرف واضح طور پر اشارہ کرتی ہیں کہ کائنات میں بنیادی اصول حرکت ہے، جمود (innertia) نہیں۔ یہاں مسلسل آگے کی طرف بڑھتی ہوئی ایک حرکت اور ایک مستقل تخلیقی بہاؤ ہے، نہ کوئی ٹھہراؤ ہے اور نہ رکاوٹ ہمیشہ ایک پیش قدمی ہے، ہر لمحہ نیا ہے اور ہر لمحہ ایک نئی دنیا سامنے لاتا ہے۔ کائنات متحرک ہے اور مستقلاً حرکت میں رہتی ہے۔ اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں اور ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی واضح وصحیح تقسیم نہیں۔ جدید سائنس اس حقیقت کی دریافتوں کے ساتھ شہادت دیتی ہے کہ مادہ (matter) مستقل وجود نہیں رکھتا بلکہ ہمیشہ 'سیال حالت' میں رہتا ہے۔

لیکن کائنات کی تبدیل ہوتی ہوئی حالت کے بارے میں ہمارے علم کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی طرف

1۔ ستارہ؛ بانگ درا از محمد اقبالؒ

2۔ سورۃ الرحمٰن: آیت: 29

3۔ سورۃ النور: آیت: 44

سے فراہم کی گئی ہے جس میں ہمیں ہدایت دی گئی ہے کہ صرف تغیر مستقل ہے۔ خالق حقیقی ہمیں یہ بھی بتا تا ہے کہ صرف اہل بصیرت حالتِ تغیر کو سمجھ سکیں گے بہ الفاظ دیگر نادان مستقل رہتے ہیں اور حالتِ موجود میں خوش وخرم رہتے ہیں اور وہ مستقلاً تبدیل ہوتے ہوئے زمانے اور ہمیشہ برپا رہتی ہوئی تبدیلیوں کا ساتھ نہیں دیتے۔ وہ یقیناً فہم وبصیرت سے محروم ہیں۔

اس فہم کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں حالتِ تغیر کو قبول کرنا ہوگا۔ ہر تغیر ایک لمحہ پہلے مستقل (constant) تھا۔ تسلسل، تغیر کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ حال (present) کے لئے ماضی (past) ضروری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فطرت میں تغیر اور تسلسل/ استقلال (استحکام) پہلو بہ پہلو موجود ہوتے ہیں۔ یہ ایک دائمی قانون ہے جو بتا تا ہے کہ 'پائیداری' اور تغیر کو لازماً ساتھ ساتھ رہنا ہے۔ صرف حالتِ استحکام (stability) میں موجود رہنے کا مطلب جامد (static) رہنے اور ملیا میٹ ہو جانے کی طرف میلان کا مظہر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ناعاقبت اندیشی سے تبدیلی کر دینا دروازے کے قبضے اکھاڑ دینے کے مترادف ہے۔ اگر کوئی آدمی استحکام کے ساتھ زنجیر سے بندھا رہے اور مسلسل ہونے والی تبدیلیوں کا ساتھ نہ دے تو وہ ماضی کی یادگار بن جائے گا، یا زیادہ بہتر الفاظ استعمال کئے جائیں تو وہ ایک پتھرایا ہوا ڈھانچہ (fossil) کہلا سکے گا۔ اگر وہ صرف تبدیلی کے ہی ساتھ رہے تو وہ ماضی کے استحکام کے ساتھ اپنے نفع بخش روابط منقطع کر بیٹھے گا۔ شواہد کے اس مجموعے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ تسلسل اور تغیر کائنات کے دو مطلق حقائق ہیں اور ان کا مسلسل باہمی انحصار انسانی زندگی کے توازن کی ضمانت ہے۔

اس تغیر کا انسانی اور اخلاقی، سیاق وسباق میں ایک خاص مقصد اور خصوصی مطلب ہے: وہ ہے انسانی تجربات کی تقطیر (filter) کرنا۔ فطرت، اس طریق عمل کے ذریعے بنی نوع انسان کو آزمائش میں ڈالتی ہے اور مفید کو غیر مفید سے چھانٹ کر الگ کر دیتی ہے۔ قرآن مجید اس نقطے کو یوں واضح کرتا ہے:

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ[1]

(ہم دنوں کو لوگوں کے درمیان پھیرتے رہتے ہیں تاکہ ہم چھانٹ سکیں کہ

---

[1] سورۃ آل عمران: آیت:140

اللہ تعالیٰ کی قدرت ونظام کو کون سمجھتا ہے اور کون اس کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے)

یہ آیت اس بات کو کافی حد تک واضح کر دیتی ہے کہ جو لوگ تبدیلی کا ساتھ دیتے ہیں وہ بقا پائیں گے۔ حضرت اقبالؒ نے حرکت کے اس تصور کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ شخصیت کا ایک تسلسل ہے جس کے لئے 'خودی' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

شخصیت ایک کیفیتِ اضطراب ہے اور یہ صرف اسی صورت میں جاری رہ سکتی ہے کہ یہ حالت قائم رہے۔ اگر کیفیتِ اضطراب برقرار نہ رہے تو سکون آنا شروع ہو جائے گا۔ حالت اضطراب انسان کی انتہائی بیش قیمت کامیابی ہے اس لئے اسے اس امر کا اہتمام کرنا چاہیے کہ یہ حالتِ سکون کی طرف واپس نہ لوٹ جائے۔ وہ چیز جو کیفیتِ اضطراب کو برقرار رکھنے کے لئے کوشاں رہتی ہے وہ ہمیں لافانی بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے، اس طرح اگر ہمارے مشاغل کا رخ اضطراب برقرار رکھنے کی طرف ہے تو موت کا صدمہ اس کو متاثر نہیں کرے گا[1]۔

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بے زیستم
ہیچ نہ معلوم شدہ آہ کہ من چیستم
موج ز خود رفتۂ، تیز خرامید و گفت
ہستم اگر میروم ، گر نروم نیستم[2]

(ٹوٹ پھوٹ سے نڈھال ساحل نے کہا ''اگرچہ میری زندگی کے دن بیت چکے ہیں آہ میں سمجھ نہیں سکا کہ میں کون ہوں۔ آپے سے باہر ہوتی موج نے پاس سے گزرتے ہوئے کہا، میں اس وقت تک ہوں جب تک چلتی رہوں، اگر نہ چلی تو مر جاؤں گی)

2۔ جدوجہد

تسلسل کے ساتھ ہونے والا یہ تغیر ہم سے توجہ کا مطالبہ کرتا ہے۔ عظیم مسلم فلسفی اور سائنسدان

۱۔ تعارفی نوٹ؛ اسرار خودی از محمد اقبالؒ

۲۔ زندگی و عمل؛ پیام مشرق از محمد اقبالؒ

ابن مسکویہ[1] (Ibn-e-Miskawayh, d. 1035) نے کہا ہے کہ کائنات میں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر جہد للبقا (بقا کی کوشش) جاری ہے۔ جس میں صرف اعلیٰ صلاحیتوں والی انواع بقا پاسکتی ہیں۔ یہی وہ اصول ہیں جو چارلس ڈارون[2] (Charles Robert Darwin, d. 1882) نے 'جہد للبقا' اور 'بقائے اصلح' کے عنوانات سے لکھے ہیں۔ ہم بطور مسلمان ان حیاتیاتی اصولوں کی تعبیرات سے پوری طرح اتفاق نہیں کرتے۔ بہرحال ہم ان اصولوں کے انسانی اور اخلاقی سطحوں پر عملی اطلاقات کا ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں۔ جو لوگ روحانی اور مادی طور پر ترقی کی منازل طے نہیں کرتے صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔

بنی نوع انسان اور انبیاء علیہم السلام کی تاریخ جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے اس حقیقت کی ایک قابل اعتماد گواہی ہے کہ بنی نوع انسان کا ارتقاء اور اس کی بقا جہدِ مسلسل اور بلند اخلاقی اقدار کا علم بلند رکھنے میں مضمر ہیں۔ قرآن مجید اس کی یوں تاکید کرتا ہے:

كَذٰلِكَ يَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡحَقَّ وَالۡبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذۡهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنۡفَعُ النَّاسَ فَيَمۡكُثُ فِى الۡاَرۡضِ[3]۔

(اللہ تعالیٰ حق و باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے۔ جو جھاگ ہے وہ اڑ جاتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نفع دینے والی ہے وہ زمین میں قائم رہتی ہے)

کیا خوبصورت اصول بیان کیا گیا ہے۔ بے کار جھاگ اور غیر مفید چیزیں غائب ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک شخص جھاگ جیسا ہے یا اس جیسا ہو جاتا ہے وہ مٹا دیا جاتا ہے۔ اگر وہ بنی نوع انسان کے لئے

---

[1]۔ (Abu Ali Ahmad ibn-e-Muhammad Ibn-e-Yaqub ibn-e-Miskawayh) ابوعلی احمد بن محمد بن یعقوب مسکویہ مسکویہ (932–1030) کو مورخین نے موجوداتِ عالم پر سائنسی نقطہ نظر سے بحث و تحقیق کرنے والا حکیم، حیاتیات کا ماہر خصوصی، نباتات میں زندگی دریافت کرنے والا پہلا سائنس دان تسلیم کیا ہے۔ زندگی کے ارتقا کا نظریہ سب سے پہلے معلم ثانی ابونصر فارابی نے پیش کیا اور ابن مسکویہ نے اس کی تشریح کی اور دلائل کے ذریعہ ثابت کیا۔

[2]۔ Charles Robert Darwin؛ چارلس ڈارون (1809–1882) ایک انگریز ماہر حیاتیات تھا۔ اس نے قدرتی انتخاب (Natural Selection) کا نظریہ پیش کیا جس کے مطابق جو چیز زیادہ خوبیوں کی حامل اور طاقتور ہے وہی اس دنیا میں باقی رہتی ہے۔

[3]۔ سورۃ الرعد: آیت: 17

فائدہ مند ہے وہ دوام حاصل کر لیتا ہے۔اسی طرح اگر کوئی نسل،قوم یا مذہب انسانیت کے لئے بے فائدہ ہوجاتا ہے،اسے صفحاتِ تاریخ سے مٹا دیا جاتا ہے۔اگر کوئی قوم،نسل یا مذہب انسانیت کے لئے نفع بخش ہے،وہ اس وقت تک برقرار رہتا ہے جب تک اپنے اندر افادیت رکھتا ہے۔حافظ شیرازیؒ بالکل بجا کہتے ہیں:

ہرگز نمیرد آن کہ دلش زندہ باعشق
ثبت است برجریدہ عالم دوام ما[1]

(جس کا دل عشق سے زندہ ہوجائے وہ کبھی بھی نہیں مرتا۔ہم چونکہ انسانیت کے عشق میں مبتلا ہیں اس لیے دنیا کے نقشہ پر ہم ہمیشہ زندہ رہیں گے)

انسان کے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت،ترقی کرنے اور بقا پانے کی اہلیت اور مقامِ عظمت حاصل کرنے کی استعدادان اوصاف اور اعمال کے ذریعے نشوونما پاتی ہیں جن کی تفصیل اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے۔مثلاً علم،عبادت،صداقت،دیانت،محبت،انسان کی خدمت،انصاف،گناہ سے نفرت اور دیگر خصوصیات جو اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو ودیعت کی ہیں،انہیں فروغ دینے کے لئے کوشاں رہنا چاہیے۔ان خصوصیات کے برعکس بھی کچھ خصوصیات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ سخت ناپسند کرتا ہے۔سچائی ایک قوت ہے اور جھوٹ کمزوری ہے۔انصاف ایک قوتِ کار ہے اور بے انصافی ایک ضعیفی ہے۔صرف ایسے لوگ بقا پاتے ہیں جو نیک اعمال کے ذریعے اپنے اندر قوت اور صلاحیتِ زیست پیدا کرتے رہتے ہیں۔چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے:

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ[2]

(ہم نے زبور میں (اچھائی اور برائی کے) ذکر کے بعد یہ بات لکھ دی تھی کہ زمین کے وارث وہی لوگ ہوں گے جو اچھے اعمال (قوت والے اعمال) کریں گے)

---

[1]۔غزلیات از حافظؒ

[2]۔سورۃ الانبیاء: آیت:105

انیسویں صدی کا جرمن فلسفی نطشے[1] (Friedrich Nietzsche, d. 1900) اس تصور کو یوں بیان کرتا ہے: جو چیز بھی زندگی کو بڑھاتی اور اس میں بہتری لاتی ہے، مفید ہے، باقی چیزیں بالکل ردّی ہیں اور انسانی تاریخ کے کوڑے دان میں پھینک دینے کے قابل ہیں۔ بنی نوع انسان کے لیے بیکار چیزوں کو ضائع کر دیئے جانے پر انسانی تاریخ میں کوئی نوحہ نہیں ہے۔

متذکرہ بالا روایات، مذہبی اور دنیاوی، دونوں سے یہ بات کافی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ صرف وہ لوگ اور مذاہب باقی رہ جاتے ہیں جو بنی نوع انسان کے لئے فائدہ مند ہوں، جن میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہو۔ علمی معیار رکھتے ہوں۔ سچائی کے حامل ہوں۔ بنی نوع انسان کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہوں اور عدل گستری کرتے ہوں۔ ظلم، جھوٹ اور انسان سے نفرت پر استوار قوموں اور مذاہب کا تاریخ صفایا کر دیتی ہے۔ لوگوں کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ان کی اخلاقی اور جسمانی کمزوریاں انہیں نیست و نابود نہیں کریں گی۔ انہیں یقینی طور پر معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے لئے موت کا گھنٹہ ضرور بجے گا:

And therefore never send to know for whom the
bell tolls;
It tolls for thee[2].

(اور کسی کو یہ جاننے کے لئے باہر مت بھیجو کہ گھنٹہ کس کے لئے
بج رہا ہے، یہ تمہارے لئے بج رہا ہے جناب)

تغیر کے ساتھ چلنے والے معاشرے اس گروہ، نسل یا قوم کو لازماً پیچھے چھوڑ دیتے ہیں جس کا قدم آہستہ اٹھتا ہے۔ انگریز رومانوی شاعر کیٹس[3] (John Keats, d. 1821) نے لکھا ہے:

---

[1]۔ Friedrich Nietzsche: فریڈرک نطشے (1844ء - 1900ء) جرمن فلسفی تھا جس نے فوق البشر (superman) کے تصور کو آگے بڑھایا۔

[2]۔ John Donne, Meditation XVII

[3]۔ John Keats: جان کیٹس (1795ء-1821ء) انگریزی ادب کا ایک عظیم شاعر اور رومانوی تحریک کی ایک اہم شخصیت تھا۔ اس کی خوبصورت شاعری حسوں کو متاثر کرتی ہے۔

So on our heals a fresh perfection treads,
A power strong in beauty, born of us
And fated to excel us, as we pass
In glory that old darkness[1].

(پس پیچھے پیچھے ہمارے کامل تازہ صاحبانِ کمال آ رہے ہیں۔ یہ ایک قوت ہیں،
حسین بھی ہیں جو ہم سے ہی پیدا ہوئے۔ مقدر ان کا ہے کہ وہ ہم سے آگے نکل
جائیں اور ہم دیرینہ تاریکیوں میں شان سے گزرتے ہیں)

اگر کوئی کمزور اور پیچھے مُڑ مُڑ دیکھنے والی قوم کسی بحران سے دوچار ہے تو ترقی کی راہ پر گامزن اقوام ایک لمحہ رک کر اظہار افسوس کر سکتی ہیں لیکن وہ پھر سے اپنی منزل مقصود کی طرف گامزن ہو جاتی ہیں۔ ہم اس مادی دنیا میں یہی چیز دیکھ رہے ہیں۔ جب کسی گاڑی کو حادثہ پیش آ جاتا ہے تو پیچھے سے آنے والی گاڑیاں لمحہ بھر کے لئے رکتی ہیں اور پھر اپنی منزل کی طرف سفر شروع کر دیتی ہیں۔

(دانش کی دیوی کے) اُلّو کو اپنا سفر ہر حال میں پوہ پھٹنے سے پہلے شروع کر دینا ہوتا ہے[۲]۔ حضرت اقبالؒ نے اپنی نظم 'ٹیپو کی وصیت'[۳] میں جو الفاظ کہے وہ اس تصور کی بڑی خوبصورتی سے عکاسی کرتے ہیں اور ہماری حوصلہ افزائی کرتے ہیں کہ ہم اس تبدیلی کا خوش دلی سے خیر مقدم کریں جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے سامنے رکھی ہے۔

تُو رہ نوردِ شوق ہے، منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

---

[1]۔ Hyperion: A fragment book II

[۲]۔ منروا، یونانی علم الاصنام میں دانش کی ایک دیوی ہے جو الّو کو اہم کاموں کے لئے استعمال کرتی تھی۔ یہ الّو رات کے سائے گہرے ہو جانے پر اپنی پرواز شروع کرتا تھا۔ ہیگل نے اسے اپنی کتاب Elements of the Philosophy of Right میں بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔

[۳]۔ ''ٹیپو سلطان کی وصیت'' کے عنوان سے علامہ اقبال کی یہ نظم ''ضرب کلیم'' میں ہے۔ ٹیپو میسور کا مسلمان حکمران تھا۔ اسے برطانوی نو آبادکاروں نے 4 مئی 1799ء کو شہید کیا (اس وقت اس کی عمر 48 برس تھی) انگریزوں نے اس کے سرنگا پٹنا کے قلعے کا محاصرہ کر کے اسے شہید کیا تھا۔ آج کل اس شہر کو کرناٹکا (بھارت) کہا جاتا ہے۔

اے جُوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول[1]

حضرت اقبالؒ نے بارہا جدو جہد کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے اس لئے کہ آزادئ عمل ایک انعام ہے جسے جیتا جانا چاہیے۔

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوای زندگانے نرم خیز است
بہ دریا غلت و باموجش در آویز
حیاتِ جاودان اندر ستیز است[2]

(ساحل پر بزم آرائی نہ کرو کیونکہ وہاں نغمۂ زندگی بہت دھیما ہے۔ دریا میں غوطہ زن ہو اور موجوں سے زور آزمائی کرو کیونکہ دائمی زندگی جدو جہد میں مضمر ہے)

چکنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد
دل نا صبور دارم چو صبا بہ لالہ زاری

(میں کیا کروں، اس لئے کہ میں فطری طور پر ایسا نہیں ہوں کہ زیادہ عرصہ ایک جگہ پر ٹک سکوں! میں ایک دلِ مضطرب رکھتا ہوں، جو ایسے مچلتا ہے جیسے مغرب کی طرف سے آنے والی ہوا سے گلِ لالہ کے کھیتوں میں ہلچل مچتی ہے)

چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے
تپد آن زمان دل من پی خوبتر نگاری

(جونہی میری نظریں ایک خوبصورت چہرے سے ٹکراتی ہیں میرا دل اس سے بھی زیادہ خوبصورت چیز کے لئے مچلنے لگتا ہے)

---

[1]۔ سلطان ٹیپو کی وصیت؛ ضرب کلیم از محمد اقبالؒ

[2]۔ یہ شعر نظم لالہ سینائی سے لیا گیا ہے۔ لفظ بزم کا ترجمہ 'ضیافت' کے معنی میں استعمال ہوا ہے جسے عموماً 'ڈنر' کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ یہ چند لوگوں کا ایک اجتماع ہوتا ہے جس کا مقصد تفریح طبع اور موج میلہ ہوتا ہے۔ اگر ہم اسے ڈنر کے معنی میں لیں تو لوگوں سے یہ کہنا نا مناسب ہوگا کہ اچھے ڈنر کے بعد سمندر میں چھلانگ دیں۔ تاہم شاعر 'موج میلہ' اور 'لہروں سے زور آزمائی کرنے' میں فرق کرتا ہے اور مؤخر الذکر کام کو بہت اہم قرار دیتے ہوئے اسے حیاتِ جاوداں پانے کا ذریعہ گردانتا ہے۔

زشرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابی
سرِ منزلی ندارم کہ بمیریم از قراری

(میں چنگاری سے ستارہ تلاش کرتا ہوں اور ستارے سے سورج۔منزل کا کچھ پتہ ہی نہیں،ٹھہراؤ کی وجہ سے مرا جا رہا ہوں)

چو ز بادۂ بہاری قدحی کشیدہ خیزم
غزلی دگر سرایم بہ ہوای نو بہاری

(جب ایک چشمے سے کشید کی ہوئی شراب نوش کر کے اٹھتا ہوں تو دوسرا شعر الا پتے ہوئے ایک اور چشمہ تلاش کرنے لگتا ہوں)

طلبم نہایتِ آن کہ نہایتی ندارد
بہ نگاہِ ناشکیبی بہ دل امیدواری[1]

(میں اس چیز کی انتہا ڈھونڈ تا ہوں جس کی کوئی نہایت ہے ہی نہیں۔ بے قرار نظروں اور پُر امید دل کے ساتھ جی رہا ہوں)

3۔ اسلام میں حرکت وجد و جہد کا تصور

زندگی کے لئے تغیر و ثبات (change and stability) دونوں ہی نہایت ضروری ہیں۔ تغیر صرف اس صورت میں اچھا ہوتا ہے جب وہ اپنے اندر انسانیت کے لئے کوئی افادیت رکھتا ہو اور بقائے انسانیت کے لئے کوئی کردار صرف وہ قومیں ادا کر سکتی ہیں جو علم کے زیور سے آراستہ ہوں اور بنی نوع انسان کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہوں۔

ہمیں بحیثیت انسان اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ کیا ہم زمان و مکان میں رونما ہونے والے تغیر و تبدل کا ساتھ دے رہے ہیں؟ کیا ہمارے پاس وہ علم موجود ہے جس کی ہمیں زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ضرورت ہے؟ کیا ہم انسانیت کی خدمت کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں؟ کیا ہم عہد حاضر کے

---

[1]۔حور و شاعر؛ پیام مشرق از محمد اقبالؒ

چیلنجوں کا مناسب جواب دے سکتے ہیں؟ یہی وہ سوالات ہیں جن کا دورِ جدید کے مؤرخ آرنلڈ ٹائن بی[1] (Arnold Toynbee, d. 1975) نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب 'A Study of History' (مطالعۂ تاریخ) میں جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب میں وہ پوری تاریخِ انسانیت میں قوموں کے عروج وزوال کی وضاحت کرتا ہے۔

ٹائن بی (Arnold Toynbee, d. 1975) نے تہذیبوں کی فرداً فرداً نشاندہی کرتے ہوئے انہیں 'اکائیاں' (units) قرار دیا ہے اور وہ ہر تہذیب کے لئے ایک 'للکار' (challenge) اور ایک 'جواب' (response) کا تصور پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تہذیبیں چند شدید مشکلات کے ایک مجموعے اور ان کے جواب کے طور پر وجود میں آئی ہیں۔ تخلیقی صلاحیتیں رکھنے والی اقلیتوں نے ان کے ایسے حل وضع کئے جنہوں نے ان کے سارے سماج کی ازسرِنو تشکیل کردی۔

یہ 'للکاریں' (challenges) اور ان کے 'جوابات' (responses) مادّی وجسمانی تھے جیسا کہ قدیم بابل کے سمیریوں (Sumerians) نے جواب دیا۔ جب انہوں نے جنوبی عراق کے بے قابو دلدلی علاقوں کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا اور وہ اس طرح کہ انہوں نے عہدِ حجری کے آخری دور کے ایسے باشندوں کو اپنے معاشرے میں ضم کرلیا جو بڑے پیمانے کے آبپاشی کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکتے تھے۔ (اور ان سے کام لے لیا گیا) جبکہ بعض تہذیبوں نے 'للکار' کا سماجی جواب (reponse) دیا جیسے کیتھولک چرچ نے بعداز روما کے یورپ میں چھڑنے والی بدنظمی پر اس طرح قابو پایا کہ نئی جرمن خصوصیات رکھنے والی بادشاہتوں کو ایک غیرمنقسم مذہبی کمیونٹی کی شکل دے دی۔

جب کسی تہذیب نے پیش آمدہ چیلنج (للکار) کا جواب دیا تو اس نے فروغ پایا۔ تہذیبوں کو اس وقت زوال آیا جب ان کے رہنماؤں نے موجدانہ انداز میں جواب دینا چھوڑا تو وہ قومیت، عسکریت اور مستبد اقلیت کے جبر کی وجہ سے ڈوب گئیں۔ ٹائن بی (Toynbee, d. 1975) اپنی قوتِ استدلال کی بنا پر دعویٰ کرتا ہے کہ معاشرے قدرتی اسباب کی بہ نسبت خودکشی یا قتل کی وجہ سے زیادہ مرتے ہیں۔ خودکشی کے باعث تقریباً ہمیشہ مرتے ہیں۔ وہ تہذیبوں کے عروج وزوال کو ایک روحانی طریق کار کے طور پر دیکھتے ہوئے کہتا ہے کہ انسان جو تہذیب پاتا ہے وہ اعلیٰ درجے کے حیاتیاتی عطیے یا

---

[1] Arnold Joseph Toynbee؛ آرنلڈ جوزف ٹائن بی (1889ء-1975ء) ایک برطانوی مورخ تھا۔ اس کی کتاب A Study of History بہت معروف ہے۔

جغرافیائی ماحول کے نتیجے میں وجود میں نہیں آتی بلکہ اس للکار یا چیلنج کا مناسب جواب دینے کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتی ہے جس کا وہ خصوصی نوعیت کی مشکل پیش آنے پر فقید المثال اظہار کرتی ہے[1]۔

اسلام بطور ایک مذہبِ فطرت جو فلسفہ پیش کرتا ہے وہ بقولِ حضرت اقبالؒ یہ ہے:

اسلام ایک ثقافتی تحریک کی حیثیت سے کائنات (universe) کے قدیم جامد نظریئے کو مسترد کرتے ہوئے ایک متحرک وتوانا (dynamic) نظریہ پیش کرتا ہے۔ جملہ زندگی کی حتمی وقطعی روحانی بنیاد جو اسلام کی پیش کردہ ہے دائمی وابدی ہے اور یہ اپنا اظہار تنوع اور تغیر کی صورت میں کرتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت (reality) کے ایسے تصور پر استوار ہو، اسے اپنی زندگی، دوام اور تغیر کی تمام اقسام کے ساتھ لازماً ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ اسے لازماً ازلی وابدی اصولوں کا حامل ہونا چاہیے تا کہ یہ اپنی اجتماعی زندگی کو منضبط (regulate) کر سکے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جو حی وقیوم ہے ہمیں مستقل تغیرّات کی دنیا میں قدم جمانے کی جگہ عطا کرتا ہے۔ لیکن جب دائمی اصولوں کو یہ سمجھ لیا جائے کہ وہ تغیرّ کے تمام امکانات کو خارج کر دیتے ہیں، جو کہ از روئے قرآن اللہ عزوجل کی عظیم ترین 'نشانیوں' میں سے ہے۔ یہ ایسے مظہر کو ساکت کے طور پر پیش کرنے کی کوشش ہے جو اپنی فطرت کے تحت اساسی طور پر متحرک ہے۔ یورپ کی سیاسی اور سماجی علوم میں ناکامی اوّل الذّکر اصول کو روز روشن کی طرح واضح کر دیتی ہے؛ اسلام کی گزشتہ پانچ سو (500) سالوں کے دوران حرکت ناپذیری (immobility) مؤخر الذکر اصول کی وضاحت کر دیتی ہے۔ تو پھر اسلام کی تشکیل میں اصولِ تحرک کیا ہے؟ اسے 'اجتہاد' کہا جاتا ہے[2]۔

سوال پیدا ہوتا ہے: ہم کیسے یقین حاصل کریں کہ ہم پہلے ہو چکے ہوئے تغیر سے جاملیں گے کہ ہم بہتری کی طرف بڑھ رہے ہیں اور یہ کہ ہم بنی نوع انسان کے لئے نفع بخش ہیں؟ ان مقاصد کے حصول کے لیے ہمیں اپنے آپ کو جانچنا اور اپنا احتساب کرنا ہوگا۔

۱۔ A Study of History by Arnold Toynbee, p.570

۲۔ The Principle of Movement in the Structure of Islam; The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam by M. Iqbal

اپنا احتساب کرنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں: یا تو یہ کام ہم خود کریں یا دوسروں کو اجازت دیں کہ وہ ہمارا احتساب کریں۔ اسلام ہمیں خود احتسابی (self-reckoning) کی تعلیم دیتا ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے خود احتسابی کے عمل کو پسند فرماتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے:

فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا[1]

(پھر قسم ان کی جو جھڑک کر چلاتے ہیں)

یہ تصوّف کی تعلیمات کا ایک لازمی جزو ہے کہ ہر رات سونے سے پہلے ہم اپنے دن بھر کے اعمال پر غور وفکر کریں۔ اپنا محاسبہ کریں اور اپنے آپ کو جانچیں۔ ہر لمحے کے بارے میں سوچیں اور ہر قدم پر غور کریں۔ صوفیاءِ کرامؒ کے دو اصول ہیں[2]۔ (i) نظر بر قدم (اپنے قدموں کا مشاہدہ کرنا) اور (ii) نگاہ داشت (دھیان رکھنا):

(i)۔ **نظر بر قدم (اپنے قدموں کا مشاہدہ کرو):** اپنی توجہ کو مسلسل مقصد پر مرکوز رکھو۔ قدموں کا مشاہدہ کرنے کا مقصد اپنے حالات پر نظر رکھنا بھی مراد ہے۔ اس امر کا خیال رکھو کہ اقدام کرنے کے لئے کونسا وقت صحیح ہے؟ کون سا وقت ایسا ہے کہ اقدام نہ کیا جائے اور کون سا وقت توقف کے لئے صحیح ہے؟ بعضوں کا خیال ہے کہ 'نظر بر قدم' ایک جملہ ہے جو کسی کے فطری مزاج میں مضمر دانش کا حوالہ دیتا ہے۔

(ii)۔ **نگاہ داشت (دھیان رکھنا):** تمام اجنبی اور ضعیف خیالات اور اعمال کا مقابلہ کرو۔ ہمیشہ خیال رکھو کہ تم کیا سوچ رہے ہو اور کیا کر رہے ہو؟ تا کہ ہر گز رتے واقعے اور تمہاری روزمرہ کی زندگی کے ہر معاملے پر تمہاری بقائے دائمی کا نقش ثبت ہو سکے۔ خبردار رہو۔ خیال کرو کہ کونسی چیز تمہاری توجہ کو کھینچتی ہے؟ اپنی توجہ کو ناپسندیدہ چیزوں سے واپس موڑنا سیکھو۔ اس امر کا اس طرح بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ خیالوں میں چوکنا رہو اور اپنے آپ کو یاد رکھو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنے فکر اور عمل کے ہر پہلو کے بارے میں محتاط اور ہوشیار رہنا

---

[1]۔ سورۃ الصافات: آیت:2

[2]۔ یہ اصول خواجہ عبدالخالق غجدوانیؒ (d. 1179) کے وضع کردہ آٹھ اصولوں میں سے ہیں۔ یہ اصول ان کے صوفیانہ اعمال میں سے ہیں جنہیں کلماتِ قدسیہ یا قواعد یا اسرارِ نقشبندیہ کہا جاتا ہے۔

چاہیے۔ یہ مسلسل خود احتسابی بطور فرد اور بطور قوم ہماری بقا کے لئے ناگزیر ہے۔

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب[1]

اسلام نے تغیر اور ثبات کے دو اساسی اصولوں کو درست قرار دیا ہے۔ اسلام کے اندر بھی چند نظریات ہیں جنہیں 'محکمات' (دائمی، مستقل) کہا جاتا ہے جو زمان یا مکان کی تبدیلی کے تابع نہیں ہیں۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ[2]

(وہی ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری اس میں بعض آیتیں محکم ہیں (جن کے معنی واضح ہیں) وہ کتاب کی اصل ہیں اور دوسری مشابہ ہیں (جن کے معنیٰ معلوم یا معین نہیں)

مثال کے طور پر خدا کی وحدانیت پر ایمان لانا۔ رسولوں پر ایمان لانا۔ حضور نبی کریم ﷺ کے آخری نبی ہونے پر ایمان۔ قرآن پر ایمان۔ جزا و سزا پر ایمان۔ بنیادی اشیائے ضرورت کے جائز و ناجائز ہونے پر ایمان۔ یہ سب دائمی و مستقل اصول ہیں ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ یہ بنیادی عقائدِ ایمان ہیں جو اثبات و استحکام کے تقاضے پورے کرتے ہیں اور صحت مند انسانی نفسیات اور اجتماعی وجود کے لئے ایک ٹھوس بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

اسلام نے تغیر و تبدل کے ساتھ ہم قدم ہو کر چلنے کے لئے ہمیں 'اجتہاد' کا تصور دیا ہے۔ لفظ 'اجتہاد'، عربی کے لفظ 'جَہَدَ' سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں 'جدوجہد' (جهد فی الامر کسی کام کے لئے بہت کوشش کرنا) بالخصوص 'اجتہاد' کے معنی ہیں گہرے غور و فکر کے ذریعے اپنے آپ سے سخت مقابلہ کرنا۔ اسلامی قانون میں اجتہاد کے معنی ہیں ایسے مسائل کی آزادانہ یا فطری و خلقی تعبیر کرنا جن کا قرآن پاک اور سنت (حضور نبی کریم ﷺ کی زندگی اور ارشادات) اور 'اجماع' (اہل علم کے اتفاق رائے) میں واضح طور پر اور حسب ضرورت ذکر موجود نہیں۔ قرونِ اولیٰ کی امت مسلمہ میں مناسب استعداد اور اہلیت رکھنے والے ہر قانون دان کو اپنی فکر کو بروئے کار لا کر ان مسائل پر اپنی 'رائے' اور 'قیاس' کے استعمال کا حق ہوتا

۱۔ مسجد قرطبہ؛ بال جبریل از محمد اقبالؒ

۲۔ سورۃ آل عمران: آیت: 7

تھا۔ جن فقہا نے یہ ذہنی کاوشیں کیں انہیں اصطلاحاً مجتہدین کہا جاتا تھا۔ عباسیوں کے دور (750ء-1258ء) میں مختلف 'مذاہب فقہی' وجود میں آ گئے تھے۔ 'سنیوں' نے (جو اسلام کے اندر ایک اکثریتی فرقہ ہے) تیسری صدی ہجری کے اواخر میں قرار دیا کہ 'اجتہاد کے دروازے' بند ہو چکے ہیں اور کوئی عالم کبھی بھی 'مجتہد' کی اہلیت حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ طے پایا کہ بعد میں آنے والے فقہا کو صرف 'تقلید' کرنا ہوگی۔ یعنی انہیں اپنے عظیم پیشروؤں کی رائے بلا حیل و حجت مستند سمجھنا ہوگی اور وہ زیادہ سے زیادہ اس امر کے مجاز ہوں گے کہ وہ اپنی قانونی رائے ان مسلمہ نظائر (established precedents) کی روشنی میں قائم کریں۔ اہلِ تشیع (جو اسلام کے اندر ایک اقلیتی فرقہ ہے) نے اس معاملے میں سنّیوں کی کبھی پیروی نہیں کی اور وہ اب بھی اپنے سرکردہ فقہا کو 'مجتہد' قرار دیتے ہیں۔ اس کے باوجود متعدد سنّی ممتاز علما مثلاً شیخ ابن تیمیہؒ[1] (d. 1328) اور امام جلال الدین سیوطیؒ[2] (d. 1505) نے خود کو مجتہد کے طور پر پیش کرنے کی جرأت کی۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں متعدد اصلاحی تحریکیں اٹھیں جنہوں نے بڑے زور وشور سے 'اجتہاد' کے احیاء کا مطالبہ کیا اور کہا کہ اسلام کو ان 'بدعتوں' کی ضرررسانیوں سے نجات دلائی جائے جو صدیوں سے چلی آ رہی ہیں اور ایسی اصلاحات کی جائیں جو اسلام کو جدید[3] دنیا کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے قابل بنا دیں۔

اسلام اپنے بنیادی اصولوں (محکمات) کے تحت ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم 'اجتہاد' کے ذریعے ہر نئے چیلنج کا جواب دیں۔ قرآن مجید اور احادیث کی ہر دور کے مطابق تشریح وتعبیر کی ضرورت ہے۔ اگر ہم قرآن پاک یا احادیث میں کسی مسئلے پر اپنی رہنمائی نہیں پاتے تو پھر ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنی ذہانت اور تمثیلی استدلال سے کام لیں۔

حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا۔ یمن اس وقت ریاست مدینہ کے سیاسی اثر تلے آ گیا تھا۔

---

[1]۔ امام تقی الدین احمد ابن تیمیہؒ (1263ء-1328ء) اسلامی سکالر اور مفکر تھا۔ جس نے اپنی زندگی میں قلم اور تلوار دونوں سے جہاد کیا۔ انہوں نے تاتاریوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کی سرپرستی کی۔

[2]۔ امام جلال الدین سیوطیؒ (1445ء-1505ء) ایک معروف مفسر، محدث، فقیہ اور مورخ تھے۔ آپ کی کثیر تصانیف ہیں جن میں تفسیر جلالین، تفسیر درمنثور، الاتقان فی علوم القرآن اور تاریخ الخلفاء کافی مقبول ہیں۔

[3]۔ تفصیل کے لیے دیکھیے انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا؛ موضوع اجتہاد

آپ ﷺ نے پوچھا: جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو جائے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم اللہ عزوجل کی کتاب میں وہ مسئلہ نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ مسئلہ سنت رسول (ﷺ) میں بھی نہ پاؤ اور کتاب اللہ میں بھی نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کروں گا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ان کے سینہ کو تھپتھپایا اور ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ جس نے اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے قاصد (معاذ رضی اللہ عنہ) کو اس چیز کی توفیق دی، جس سے رسول اللہ (ﷺ) راضی ہیں[1]۔

اس حدیث شریف سے یہ بالکل واضح ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے چشم تصور سے دیکھ لیا تھا کہ انسانی تہذیب کی مسلسل ترقی کے جاری عمل کی وجہ سے یقیناً ایک ایسا وقت آنے والا ہے جب مسلمان قرآن وسنت سے براہِ راست رہنمائی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے آپ ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے جواب کو بے حد پسند فرمایا کہ وہ جن معاملات کے بارے میں قرآن وسنت سے رہنمائی حاصل نہیں کر پائیں گے وہ آزادانہ طور پر سوچیں گے اور ایسا کرتے ہوئے قرآن پاک میں مذکور رحم، انصاف، غیر جانبداری اور مساوات کے بنیادی اصولوں کو یقیناً ذہن میں رکھیں گے۔ یہی اجتہاد کے تصور کا ماخذ ہے۔

اس سیاق وسباق میں ایک اور حدیث بھی قابل ذکر ہے۔ جب حضور نبی پاک ﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے کھجور کے درختوں کے عملِ زیرہ پوشی (pollination) کو پسند نہ کیا۔ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں: میں حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھا۔ ہم چند لوگوں کے پاس سے گزرنے لگے تو وہ اپنی کھجوروں کے بالائی حصے پر کچھ کام کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا 'یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟' (بعض لوگوں نے) جواب دیا: 'یہ درختوں میں نرحصوں کو مادہ حصوں کے ساتھ ملا کر زیرہ پوشی کر رہے ہیں' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: 'میرا نہیں خیال کہ اس سے کوئی فائدہ پہنچے گا'۔ انہیں آپ ﷺ کی بات بتائی گئی اور انہوں نے یہ کام چھوڑ دیا۔ پھر رسول اللہ ﷺ کو ان کے یہ کام چھوڑنے سے متعلق مطلع کیا گیا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ 'اگر یہ ان کو فائدہ پہنچاتا ہے تو پھر انہیں یہ کرنا چاہیے'۔ میں نے محض ایک خیال ظاہر کیا تھا، مجھے اظہار خیال پر اس کا ذمہ دار مت ٹھہراؤ۔

---

[1] سنن ابوداؤد۔ جلد سوم: رقم: 199

جب میں تم سے اللہ تعالیٰ سے متعلق کچھ کہوں اسے قبول کرلو کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹی بات نہیں کہتا'۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا اپنی دنیاوی زندگی کے بارے میں تم بہتر جانتے ہو[1]۔

اس سے عام بھلائیوں پر ایمان 'معروف' کا تصور دیا گیا ہے۔ 'عرف' ایک رائج الوقت قاعدے یا رسم کو کہا جاتا ہے جسے لوگوں کا اجتماعی شعور قبول کرتا ہے اور قابل اعتبار ہوتی ہے۔ عربی میں ایک عادت یا رواج جسے وسیع پیمانے پر قبولیت اور احترام حاصل ہو اس کو معروف کہا جاتا ہے۔ 'معروف' ایک اسلامی تصور ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جسے عام طور پر جانا پہچانا جاتا ہو۔ اسے سمجھا، تسلیم کیا جاتا اور قبول کیا جاتا ہو۔ قرآن مجید میں اس کا چالیس سے زیادہ مقامات پر ذکر آیا ہے۔ قرآن مجید اور احادیث کی رُو سے بنی نوع انسان کا اجتماعی ضمیر جس بات پر بھی متفق ہو جائے مسلمانوں کو اسے بطور ایک امر لازم قبول کر لینا چاہیے۔

قرآن پاک اور احادیث کے مطالعہ سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ تمام مسلمانوں کے لئے عصری علوم سے آگاہی حاصل کرنا ایک فریضے کی حیثیت رکھتا ہے اور انہیں اچھے اور مشترکہ طور طریقوں کو قبول کرنا چاہیے۔ 'اجتہاد' اور 'معروف' آنے والی تبدیلیوں کے ساتھ ہم قدم ہو کر چلنے کے لئے ذرائع اور وسائل ہیں۔ ابتدائی دور کے مسلمانوں نے ان خدائی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر بہت سے مسائل کے حل ڈھونڈ لئے تھے۔ درحقیقت انہوں نے نئے نئے شعبہ تعلیم تخلیق کئے اور دنیا کی قیادت کی۔ اس طرح وہ دنیا کے بڑے حصے پر صدیوں حکمرانی کرتے رہے۔

مسلمانوں نے بطور ایک امت اجتہاد کے دروازے بند رکھے ہوئے ہیں اور معروف پر یقین کرنا بھی ترک کر دیا ہے۔ وہ ماضی کے ساتھ زنجیروں سے بندھے ہوئے ہیں جو غیر متغیر ہیں اور ایک یادگار ماضی بن کر زندگی گزار رہے ہیں اور اپنے گرد و پیش کی دنیا سے ہم آہنگ اور ہمقدم ہونا چھوڑ چکے ہیں۔ ایک سنجیدہ تجزیئے کی ضرورت ہے تاکہ پتہ چلے کہ آج کے مسلمان کہاں کھڑے ہیں اور وہ کل کہاں چلے جائیں گے؟

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات، کشمکشِ انقلاب[2]

---

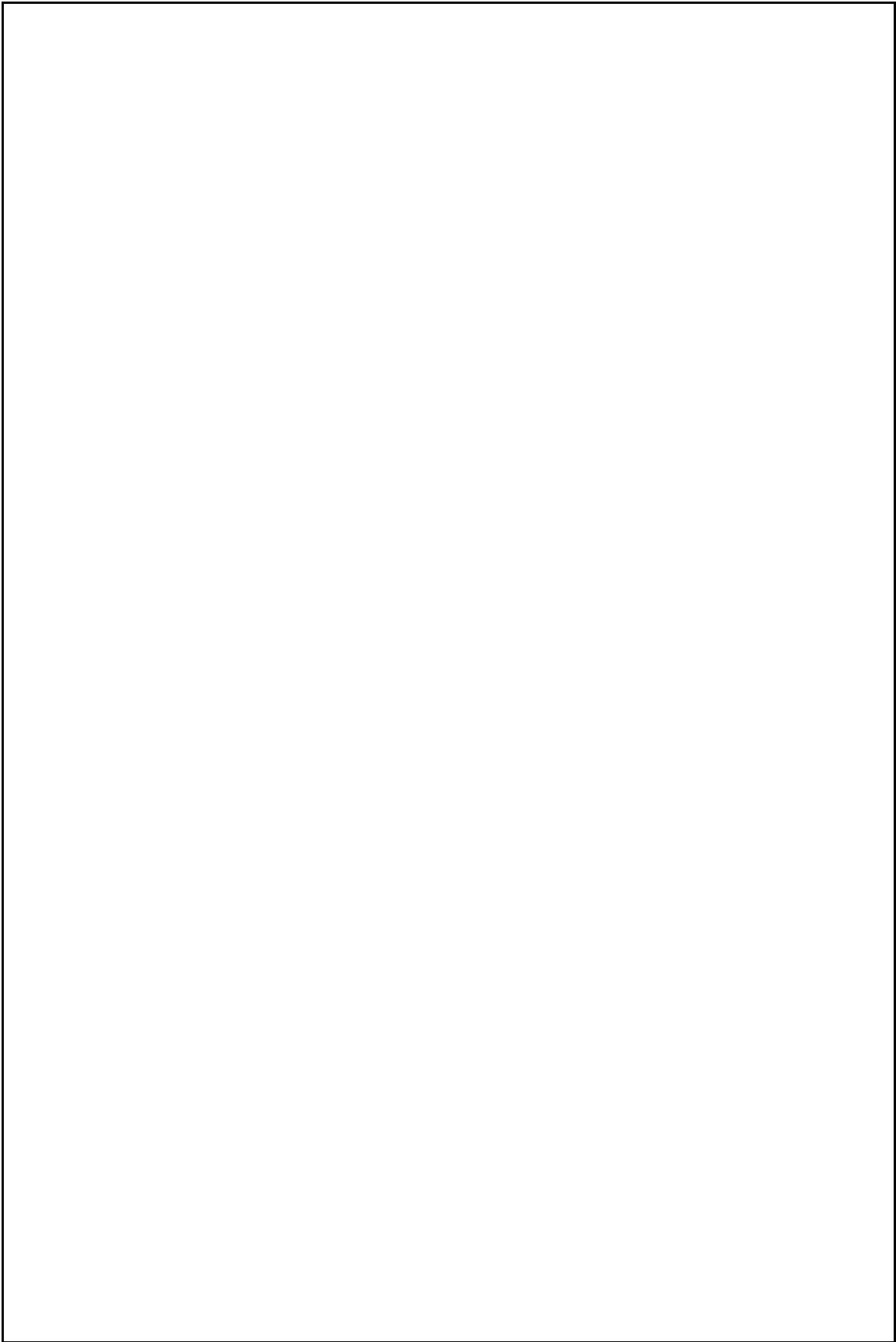
[1] صحیح مسلم: رقم: 2363-2361

[2] مسجد قرطبہ؛ بال جبریل از محمد اقبالؒ

دوسرا باب

ذوق پرواز ہے زندگی





گر بر فلکم دست بُدی چون یزدان
برداشتمی من این فلک را ز میان
از نو فلکی دگر چنان ساختمی
کازادہ بکام دل رسیدی آسان[1]

(اگر مجھے قدرت ہوتی جیسی کہ خدا کو حاصل ہے میں اس آسمان (حالاتِ دنیا) کو درمیان سے ہٹا دیتا اور آسمان کو ایسا بنا دیتا کہ میرے دل کی تمنا پوری ہو جاتی)

مسلمانوں نے ماضی میں تغیر اور جدوجہد کے دائمی اصولوں کی روشنی میں ہر چیلنج کا جواب دیا ہے۔[2] اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کیسے فتوحات کیں اور کس طرح دنیا کے بڑے حصے پر صدیوں شایانِ شان طریقے سے حکمرانی کرتے رہے۔ انہوں نے ہر شعبۂ زندگی میں بنی نوع انسان کے ارتقاء میں نمایاں کردار ادا کیا۔

اس باب میں، صرف چند ایک چیلنجوں کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا جو مسلمانوں کو اپنے دورِ حکمرانی میں پیش آئے اور چند مثالیں پیش کی جائیں گی جو اس امر کو افشا کریں گی کہ اس عہد کے مسلمان اپنے دور کے ان چیلنجوں سے کس طرح نبرد آزما ہوئے اور انہوں نے کس طرح دنیا کو اپنی آرزوؤں کے مطابق ڈھال کر دکھایا۔ یہ تجزیہ اس لئے ضروری ہے کہ یہ اس امر کا تعین کرے گا کہ آج ہم کہاں کھڑے ہیں؟ کیا ہم خود احتسابی کے تقاضوں سے استقامت کے ساتھ عہدہ برآ ہو رہے ہیں؟ کیا ہم تغیرات اور اپنے زمان و مکان کے چیلنجوں کا مناسب جواب دے رہے ہیں؟

1۔ فکر میں تبدیلی

اسلامی عربیہ میں عرب زیادہ تر صحرانشین تھے۔ ان کے ہاں چند شہری آبادیاں تھیں لیکن ان کے اندر کوئی ترقی یافتہ سیاسی ڈھانچہ نہیں تھا۔ صرف چند ایک مشترک مفادات رکھنے والے چھوٹے

---

[1]۔ رباعیات از عمر خیام
[2]۔ تفصیل کے لیے دیکھیے باب: 1

چھوٹے گروہوں کی آبادیاں تھیں جیسے مکہ، مدینہ اور طائف۔ قبائلی ڈھانچے کے بنیادی خدّوخال یہ تھے:

(1)۔ صحرانشین یا بدو زیادہ تر قبائلی ماحول میں رہتے تھے۔ جس میں چند خاندانوں کا ایک گروہ ایک کنبہ بناتا اور کنبوں کے ایک گروہ سے ایک قبیلہ وجود میں آجاتا تھا۔ مکہ اور مدینہ کے اندر اور اردگرد متعدد قبیلے تھے اور ہر قبیلے کے اپنے اپنے رسم ورواج اور قواعد وضوابط تھے۔ جن چیزوں کی ایک قبیلے میں عام اجازت تھی وہ دوسرے قبیلے میں ممنوعہ چیزیں سمجھی جاتی تھیں۔

(2)۔ متعدد قبیلے ایک دوسرے سے مستقلاً برسرِپیکار رہتے تھے۔ ان کی زیادہ لڑائیاں خطے میں وسائل کی قلت کی وجہ سے ہوتی تھیں۔ قبیلوں کے درمیاں لڑائیاں کئی کئی نسلوں سے چلتی آرہی تھیں۔ قرونِ وسطیٰ کے عرب میں جنگ بسوس[1] جو دو حریف قبائل کے درمیان ایک طویل چپقلش تھی ایک اونٹ کی ملکیت کے تنازعے پر شروع ہوئی تھی۔ قبیلہ بنوتغلب اور قبیلہ بنوبکر تقریباً چالیس سال (494ء - 534ء) آپس میں لڑتے رہے۔ ایک دوسرے کے مستقل دشمن بنے رہے اور انتقام در انتقام کا سلسلہ جاری رہا۔

(3)۔ یہ قبیلے خون اور نسل کی بنیاد پر بنے تھے۔ اس سے قبائلی شجاعت اور جوانمردانہ صفت نے جنم لیا جسے 'مرّوۃ' کہا جاتا تھا۔ جس نے ان کی زندگیوں میں معانی پیدا کیے اور ان کے اندر جرأت، صبر، حوصلہ، میزبانی اور سخاوت نے جنم لیا۔ اس سے انتقام کا جذبہ بھی پیدا ہوگیا۔

(4)۔ کسی قبیلے کے 'شیخ' کا انتخاب بڑوں کی ایک مجلس کرتی تھی۔ شیخ اس شخص کو بنایا جاتا تھا جو اس کام کے لئے موزوں سمجھا جاتا تھا۔ ذہانت، پختہ کاری، جرأت، قیادت، انتظامی صلاحیت، زبان میں روانی اور اعلیٰ تجارتی صلاحیتیں رکھتا ہوتا تھا۔

(5)۔ شیخ مختارکل تھا جو اپنے لوگوں اور ان کے انتظامی امور کو کنٹرول کرتا تھا، وہ قبیلے کی حفاظت کرتا اور جھگڑے نمٹاتا، اشیاومقبوضات کی تقسیم کرتا اور قبیلے کے کمزور افراد کو تحفظ بھی دیتا تھا۔

(6)۔ اس وقت جذبۂ حب الوطنی قومی نہیں بلکہ قبائلی ہوتا تھا۔ ہر چیز قبیلے کے مفاد کے تابع تھی جب کہ کسی شخص کی انفرادیت کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔

---

[1]۔ جنگ بسوس دو رقیب قبیلوں بنوتغلب اور بنوبکر کے درمیان البسوس نامی عورت کے اونٹ کو ہلاک کرنے پر شروع ہوئی۔ البسوس عورت کا تعلق بنوبکر سے تھا جس کے اونٹ کو بنوتغلب کے ایک سردار نے ہلاک کر دیا تھا۔ یہ لڑائی تقریباً 40 برس (494ء-534ء) جاری رہی اور فریقین نے جی بھر کر خونریزی کی۔

(7)۔ زمانہ قبل از اسلام کے عرب اپنی شاعری کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے اوران کے شعراء اپنے قبیلے اور اپنے سرداروں کی عظمت کے گیت گاتے تھے لیکن اپنے بتوں کے گیت کبھی کبھار گاتے تھے۔ شاعری کے مقابلے سالانہ بنیاد پر مشہور منڈی 'عکاظ'[1] میں منعقد ہوتے تھے۔ جیتنے والے کو بہت پیسہ اور معاشرے میں عزت ملتی تھی۔ اس کے بعد سے اس کو سردار مانا جاتا تھا۔

(8)۔ قبیلے کے ہر فرد کو پورا تحفظ حاصل ہوتا تھا مگر اس تحفظ کو صرف شیخ یا قبیلہ یقینی بناتا تھا۔ اس سیاق و سباق میں انفرادیت کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ فرد قبیلے کا تابع ہوتا تھا۔ کسی کی شخصی بقا قبیلے پر منحصر تھی۔ قبیلے سے ملنے والے تحفظ میں اکثر انتقام مضمر ہوتا تھا۔ ہر قبیلہ اپنے ہر فرد کی موت کا انتقام لیا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے قبائلی لڑائیاں نسل در نسل جاری رہتی تھیں۔ نتیجتاً تشدد کا ایک دائمی چکر چلتا رہتا تھا۔

(9)۔ ان قبیلوں میں ایک نہ ختم ہونے والی مسابقت جاری رہتی تھی۔ توازن قائم کرنے کے لئے اونٹوں، مویشیوں یا اشیا پر قبضے کے لئے چھاپے مارنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ دولت اور خوشحالی قبائلی کلچر کا سرمایۂ افتخار تھا۔ اس معاشرتی ڈھانچے میں صرف طاقتور کو بقا حاصل تھی اور کمزور ہمیشہ استحصال کا نشانہ بنے رہتے تھے۔ اس لئے عورتیں، لڑکیاں اور معذور افراد خطرے میں رہتے تھے۔

اسلام کی آمد کے بعد قبائلی ڈھانچے میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں آئیں:

(1)۔ اسلام نے قبائلی وفاداریاں تبدیل کر دیں۔ یہ وفاداریاں اسلامی تصورات کے سامنے ماند پڑ گئیں۔ نئے نئے اسلام قبول کرنے والے اپنے قبائلی سرداروں کے وفادار رہے لیکن اب ان کی اوّلین وفاداری اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھی۔

(2)۔ اسلام نے 'مروۃ' کی توثیق کی اور اس کے بہترین حصے کو برقرار رکھا لیکن اس میں توسیع کر کے تمام مسلمانوں کو اس میں شامل کیا نہ کہ صرف کسی فرد کے قبیلے کے ارکان کو شامل کیا گیا۔ ہر فرد کو اپنے لیے، اپنے قبیلے کے لیے، اپنے ساتھی مسلمانوں کے لیے اور پوری انسانیت کے لیے جدوجہد بروئے کار لانا ہوتی تھی۔

---

[1]۔ عکاظ کا میلہ ہر سال ذوالقعدہ کی یکم سے 21 تاریخ تک طائف کے عکاظ نامی بازار میں منعقد ہوتا تھا۔

(3)۔ عرب اپنے شیخ کے چناؤ کے لئے قبائلی مساوات کے عادی تھے مگر اس نظام میں کمزوریاں تلاش کی جا سکتی تھیں۔ خاص طور پر اس وقت جب ایک رہنما کو اس کی شہرت کی بنیاد پر منتخب کرنا ہوتا۔ اس کی شہرت رائے دہندہ کی آزادانہ مرضی پر اثر انداز ہوتی تھی۔ یہ رائے ایک قسم کا جبر بن جاتی تھی۔ چنانچہ اس طریقے کی اصلاح اس طرح کی گئی کہ انتخاب کی بنیاد تقویٰ، قابلیت، علم اور شعورِ خدمت پر رکھ دی گئی۔

(4)۔ اسلام نے فرد کو اہمیت دی، قطع نظر اس کے کہ وہ کون تھا اور اس کی قبائلی وابستگی کیا تھی؟ ایک وسیع مسلم امہ کا ایک رکن ہونے کی بنا پر شہری ہونے کی حیثیت، محض مقامی قبائلی وفاداری کی بہ نسبت زیادہ اہم قرار پا گئی۔

(5)۔ اللہ تعالیٰ حتمی منصف قرار پایا۔ عرب خون خرابے اور انتقام کے زیادہ دلدادہ تھے۔ ان کے اس مزاج نے قبائل کے درمیان جنگوں کا سلسلہ جاری کرا دیا جو نسل در نسل چلتی رہتی تھیں۔ جیسا کہ جنگ بسوس تھی۔ اسلام نے انتقام کے تصور سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے مسلمانوں کے ایمان اور عقیدۂ تقدیر کو خدا کے قانون (شریعت) کی طرف موڑ دیا تا کہ وہ ذاتی یا قبائلی انتقام کی بجائے قانون کی حکمرانی پر یقین رکھیں۔

(6)۔ اگرچہ بدو مستقل مزاج اور محنتی لوگ تھے تاہم ان میں سے بہت سے افراد لوٹ مار اور دیگر اقتصادی جرائم میں ملوث ہوتے تھے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ان کی مستقل مزاجی کی حوصلہ افزائی کی لیکن نئے نظامِ سیاسی معیشت کے اندر لا کر انہیں غیر قانونی طریقوں اور ناجائز معاشی سرگرمیوں سے روک دیا۔

2۔ بادشاہت سے شوریٰ تک

اسلام کی آمد کے زمانے میں جزیرہ نمائے عرب میں جو سیاسی نظام مرّوج تھا وہ نیم قبائلی اور نیم شاہی تھا جبکہ ہمسایہ علاقوں میں موروثیت اور مستبد بادشاہتوں پر مبنی نظام تھا۔ اس ماحول میں عام لوگوں کے کوئی شہری یا سیاسی حقوق نہیں تھے نہ ہی امور مملکت میں ان کی کوئی آواز ہو سکتی تھی۔ حضور نبی پاک ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو یہاں ایک ریاست کی رسمی بنیادیں رکھیں۔ حکمرانی کے لئے ایسا نظام وضع کیا جو شراکت اور باہمی مشاورت پر مبنی تھا۔ 'شوریٰ' (مشاورت) سیاسی وسماجی تنظیم کے اسلامی تناظر کے بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے۔ مسلم فقہاء کی اکثریتی رائے یہ ہے کہ 'شوریٰ' عظائم الاحکام

(Great Commandments) کا حصہ ہے اور ان کی اطاعت کرنا حکمران اور مسلم عوام دونوں کے لئے فرضِ عین ہے۔

(1)۔ قرآن پاک شوریٰ کو حکمرانی کے ایک اصول کے طور پر پیش کرتا ہے، نہ کہ بطور ایک نظام کے۔ ان دونوں باتوں میں ایک فرق ہے اور وہ بہت اہم ہے۔ اسے نوٹ کیا جانا چاہیے۔ ایسا کر کے قرآن پاک نے یہ امر مسلمانوں کی آئندہ آنے والی نسلوں کے لئے چھوڑ دیا ہے کہ وہ اصول شوریٰ کو زیادہ سے زیادہ حقیقت آفریں بنانے کی کوششیں جاری رکھیں۔

(2)۔ قرآن پاک حکم دیتا ہے کہ

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ[1]

(کام میں ان کے ساتھ مشورہ کیا کریں۔ جب آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا ارادہ پختہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں)

یہ ایک حکم ہے اور اللہ تعالیٰ شوریٰ کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بھی لازم قرار دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غیر معمولی خدائی بصیرت، علم، شفقت اور لوگوں کی بھلائی کا اتنا احساس عطا کیا گیا تھا کہ کسی دوسرے حکمران کو اتنا نہ تھا اور نہ کسی کو ہو سکے گا۔ مزید برآں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر براہ راست وحی نازل ہوتی تھی۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امتیازی فضلیت وخصوصیت تھی۔ یہ ایسی خصوصیت تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی مسلم حکمران کو نہ حاصل تھی اور نہ کبھی حاصل ہو سکے گی۔ لہٰذا اگر شوریٰ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے لازمی تھی تو بعد کے تمام مسلمان حکمرانوں کے لئے یہ بدرجہ اتم لازمی ہو گئی ہے۔

(3)۔ شوریٰ کو مومنوں کی ایک لازمی خصوصیت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے کہ

وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ[2]

(ان کے معاملات باہمی مشورے سے چلتے ہیں)

اس خصوصیت کا دیگر سب مومنانہ خصوصیات کی طرح ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی، ادائیگی نماز، (فرض نمازیں) اور اللہ عزوجل کی راہ میں خرچ کرنا (زکوٰۃ عشر، صدقات

---

[1]۔ سورۃ آل عمران: آیت:159

[2]۔ سورۃ الشوریٰ: آیت:38

وغیرہ)، جو کہ قرآن مجید میں مذہبی فرائض کے طور پر مذکور ہیں۔

(4)۔ شوریٰ کے معنی ہیں فیصلہ سازی میں موثر طور پر شریک کرنا، نہ کہ محض ایک رسمی کارروائی کر کے خانہ پُری کر دینا۔قرآن مجید،حضور نبی اکرم ﷺ کو جن پر وحی الٰہی نازل ہوتی تھی، مخاطب کر کے کہتا ہے کہ جن معاملات کے بارے میں کوئی خاص وحی نہیں آتی ان کے فیصلے کے لئے شوریٰ پر انحصار کیا جائے۔تمام اہلِ ایمان کو بطور پکے حکم کے (a fortiori) اس ہدایت پر عمل کرنا چاہیے۔ممتاز اندلسی مفسرِ قرآن ابن عطیہ (d. 1151) نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ شوریٰ شریعت کے بنیادی قوانین میں سے ہے اور ایک تاکیدی حکم ہے۔جس شخص کو سرکاری اختیار دیا گیا ہو اور وہ ان لوگوں سے مشورہ نہیں لیتا جو علم اور خوفِ خدا رکھتے ہیں تو اسے اس منصب سے فارغ کر دیا جانا چاہیے۔

(5)۔ یہاں شوریٰ کے حوالہ سے دو باتوں کا ذکر کرنا بہت ضروری ہے۔ پہلا ہے اس کی اشتقاقی صورت، یہ اپنی جڑ 'شاور' سے ماخوذ ہے،جس کا مطلب ہے باہمی مشاورت جو ایک وسیع ترین دائرۂ کار میں کی جائے۔ یہ ایک اجتماعی سوچ وبچار کا اہتمام ہے جس میں تمام فریقین نے ایک دوسرے کے ساتھ تبادلۂ خیال کیا ہو۔ اس لحاظ سے شوریٰ کی اصطلاح کو استشارا ح کی اصطلاح سے ممیز کیا جانا چاہیے۔جس کے معنی دوسرے آدمی سے صرف مشورہ لینا ہے۔شوریٰ کا لفظ تشاور سے بھی مختلف ہے جس کا مطلب صرف باہمی مشورہ ہے جبکہ جس بات کا شوریٰ میں تصور کیا گیا ہے، وہ ایک بھرپور قومی شراکت پر مبنی سیاسی مشق ہے۔

(6)۔ انسان زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔خلیفہ کا مطلب خدا کی طرف سے امت کو تفویض کیا گیا اختیار ہے جسے بروئے کار لا کر وہ زمین پر امن قائم کرے۔عدل وگستری کرے اور خوشحالی لائے۔ یہ تصور اس لحاظ سے ہمہ گیر ہے کہ امہ کا ہر شخص انفرادی طور پر قانوناً اس امر کا پابند ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ تفویض کردہ اختیار پر کما حقہ عمل درآمد ہو اور نمائندہ حکمرانی جس کے ذریعے یہ اجتماعی ذمہ داری مناسب انداز میں پوری ہو سکے۔اسلام کی رو سے دستوری طور پر واجب التعمیل ہو جاتی ہے۔مطلق کائناتی حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے لیکن اس نے بذریعہ حکمِ استخلاف (انسان کو اپنا خلیفہ بناتے ہوئے) زمین پر حاکمیتِ اعلیٰ امت یعنی عوام کو سونپی ہے۔

(7)۔ منتخب خلفاء (مسلم حکمران) عام لوگوں کے پاس جاتے تھے تاکہ بذریعہ بیعت ان سے رضامندی (حلفِ اطاعت) حاصل کرسکیں۔ بیعت (یا بیعہ) ایک باہمی عہد و پیمان ہوتی ہے۔ حکمران کی طرف سے یہ عہد ہوتا ہے کہ وہ اسلامی قانون کی پیروی کرے گا اور پبلک کو مطمئن کرے گا اور عوام کی جانب سے یہ عہد ہوتا ہے کہ وہ حکمران کی پشت پناہی کریں گے اور اس کو مشورے دیں گے۔ خلفاء نے اپنی نامزدگی کے بعد عوام سے بیعت لی تھی۔ 'بیعت' بنیادی طور پر منتخب کرنے یا خلیفہ یا چیف ایگزیکٹو کی توثیق کرنے کی ایک شکل تھی۔ یہ دو مرحلوں پر مشتمل تھی۔ پہلے قدم کو بیعۂ خاصہ (خصوصی اظہار وفاداری) کہا جاتا تھا۔ یہ نجی صلاح مشورے کے ذریعے ایک نامزدگی کے مترادف تھی۔ دوسرے قدم کو بیعۂ عامہ (عوامی اظہارِ وفاداری) کہا جاتا تھا۔ یہ نامزد شخص کی عوامی منظوری ہے۔ اس منظوری یا قبولیت کا اظہار نامزد خلیفہ کے ساتھ مصافحے کی صورت میں ہوتا تھا۔ جن لوگوں کو اختلاف ہوتا تھا وہ مصافحہ سے گریز کرنے میں آزاد تھے۔

(8)۔ دستوری نقطہ نظر سے بیعت کی منسوخی ممکن ہوتی ہے۔ یہ مواخذے یا منصب سے معزولی کے مترادف ہوتی ہے۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اتفاق رائے سے خلیفۂ رسول کے طور پر اپنی توثیق ہوجانے کے بعد اس حق کی پُرزور تائید کی تھی۔ انہوں نے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسجد (مسجد نبوی) میں 'بیعت' کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: مجھے تم پر اختیار دے دیا گیا ہے لیکن میں تم میں سے بہترین نہیں ہوں۔ آپ میری اس وقت تک اطاعت کریں جب تک میں تمہارے معاملات میں اللہ عزوجل کی اطاعت کرتا ہوں۔ جب میں اس کی اطاعت نہ کروں تو آپ میری اطاعت نہ کریں۔ اسی اصول کی پیروی میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا: 'جب میں صحیح کام کروں تو میری مدد کرنا، اگر میں کچھ غلط کروں تو میری اصلاح کر دینا'۔

(9)۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دنیائے فانی سے رحلت کے بعد امت (مسلم کمیونٹی) کے معاملات عملِ مشاورت سے چلائے جاتے رہے جس میں تمام مسلمان شریک رہتے تھے۔

(10)۔ پہلے بیان کردہ قرآن پاک کی آیت (159:3) سے بالکل واضح ہے کہ ہر فیصلہ شوریٰ کے نتائج پر مبنی ہونا چاہیے۔ تاریخی واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ فیصلے اکثریت کی آراء لے کر کیے

جاتے تھے۔ اگرچہ اقلیت یا خواہ ایک فرد کی رائے درست ہی کیوں نہ ہو اور اکثریت کی رائے غلط ہی کیوں نہ ہو۔ اکثریتی رائے ہی معقول اور قابل قبول ہوتی ہے۔ اسی میں بنی نوع انسان کی بھلائی سمجھی جاتی ہے کیونکہ ایسے کیس میں خطرے کا امکان، انفرادی یا اقلیتی کیس کی بہ نسبت بہت ہی کم ہوتا ہے۔

(11)۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے کئی نظائر اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے فیصلوں کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ اکثریت کی آرا کے مطابق ہوئے تھے، اگرچہ وہ امیر کے نظریئے سے مختلف تھے۔ اسلام ہمیں یہی درس دیتا ہے کہ فرد کو معاشرے یا الجماعت کی پیروی کرنی چاہیے۔ اس کی تعبیر بطور اکثریت کی جاسکتی ہے۔ ذیل کی احادیث اسی اصول کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

(ا)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ میری امت گمراہی پر مجتمع (متفق) نہ ہوگی۔ جب تم اختلاف دیکھو تو سوادِ اعظم کا ساتھ دو[1]۔

(ب)۔ یقیناً اللہ عزوجل میری امت یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کو غلط بات پر متفق نہیں ہونے دے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ سب سے بڑے اجماع کے ساتھ ہے[2]۔

(ج)۔ تم میں سے جو کوئی بھی جنت کے وسط میں جگہ پانا چاہتا ہے، اسے جماعت کے ساتھ پیوستہ رہنا لازمی ہے[3]۔

(د)۔ جو کوئی جماعت سے علیحدہ ہو گیا وہ جاہلیت کی موت مرا[4]۔

(12)۔ اس مشاورت پر مبنی انقلابی سیاسی فکر نے دنیا میں ایک مقبول انقلاب برپا کر دیا۔ عام سے لوگوں اور زیادہ تر نادار عربوں مثلاً حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جیسے غریب لوگوں کو منجنیق کی طرح اچھال کر عالی مرتبت مسندوں پر متمکن کر دیا۔ ایرانی اور رومی سلطنتیں زمیں بوس ہو گئیں۔ مقبول انقلابی طوفانی لہر نے جسے مسلم خلافت نے اداراتی شکل دی

---

[1] سنن ابن ماجہ۔ جلد سوم: رقم: 830
[2] جامع ترمذی۔ رقم: 2256
[3] جامع ترمذی۔ جلد دوم: رقم: 40
[4] صحیح مسلم۔ جلد سوم: رقم: 289

تھی، ان کا صفایا کر دیا۔ موروثی شاہی خاندانوں کی جگہ اللہ تعالیٰ کے غلاموں کی حکمرانی نے لے لی۔ پھر تاریخ نے سرِ عام خلفاء کا احتساب ہوتے دیکھا۔

(13)۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ ہم رومیوں اور ایرانیوں کے نقش قدم پر چلنے لگے۔ ہم نے ان کے رسم و رواج اختیار کرتے ہوئے موروثی خاندانی حکمرانی قائم کر لی۔ بلا شبہ یہ مسلم بادشاہتیں تھیں لیکن اسلامی حکومتیں نہیں تھیں۔ اسلام کا انقلابی اور جمہوری جذبہ بہت جلد ختم ہو گیا۔ مسلم بادشاہوں نے خود کو زمین پر خدا کا سایہ (ظل اللہ) ہونے کا اعلان کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ حکمران اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں خدائی حقوق (Divine rights) حاصل ہیں۔ بہت سے علماء نے بدامنی پھیلنے کے خوف سے ان کے اس سراسر غیر اسلامی تصور کی غیر مشروط تائید کی۔ بدقسمتی سے ہم مسلمانوں کی سیاسی تاریخ میں زیادہ زیر بحث عوام کے حقوق کی بجائے امیر (حکمران) کے بنیادی کردار پر پاتے ہیں۔ عوام کو اطاعت امیر کا درس دیا جاتا تھا۔ یعنی یہ کہ ان پر امیر کی اطاعت ایک فرض کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ کہ شوریٰ (پارلیمنٹ) صرف مشورہ دے سکتی ہے جب کہ امیر اس کے مشوروں اور نصیحتوں کو قبول کرنے کا پابند نہیں ہے۔

(14)۔ اس ناقص اور غیر اسلامی سیاسی نظریے نے ہماری مذہبی اور سیاسی زندگی کے ارتقاء پر سنگین اثرات مرتب کیے ہیں۔ میں نے ذیل میں اس کی دو تاریخی مثالیں پیش کی ہیں:

(ا)۔ تقریباً 450 علمائے وقت (مذہبی سکالرز) نے ابو الفضل[۱] (d. 1602) اور فیضی[۲] (d. 1595) کی قیادت میں ایک محضر نامہ[۳] مرتب کیا جو بادشاہ اکبر[۴] (d. 1605) کو

[۱]۔ شیخ ابو الفضل ابن مبارک (1551ء-1602ء) مغل بادشاہ اکبر کا وزیر اور اکبر نامہ کا مصنف تھا۔ اس کا شمار اکبر کے شاہی نورتنوں میں ہوتا تھا۔

[۲]۔ شیخ ابو الفیضی ابن مبارک (1547ء-1595ء) زیادہ تر اپنے قلمی نام فیضی سے پہچانا جاتا تھا۔ وہ اکبر کے مورخ ابو الفضل کا بڑا بھائی، مغل بادشاہ اکبر کے دور کا شاعر اور عالم تھا۔ 1588ء میں اسے دربار اکبری کا ملک الشعرا بنا دیا گیا۔

[۳]۔ محضر نامہ ایک حکم نامہ تھا جس کا بیشتر حصہ فیضی نے تحریر کیا تھا۔ اس کا مقصد بادشاہ اکبر کو تمام مذہبی امور میں مختار کل تسلیم کرنا تھا۔

[۴]۔ ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر (1542ء-1605ء) ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کا تیسرا بادشاہ تھا جو 1556ء سے لے کر 1605ء تک برسر اقتدار رہا۔

دنیاوی اور مذہبی اختیارات تفویض کرتا تھا اور رعیت پر بادشاہ کی اطاعت لازم قرار دیتا تھا۔ بادشاہ اکبر (d. 1605) نے لادینی کے ایک نئے مذہب کو جنم دیا، جس کا نام 'دین الٰہی'[1] رکھا گیا۔

(ب)۔ جب شیخ احمد سرہندیؒ[2] (d. 1624) اس نئے مذہب کی مخالفت اور اس کے رد کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو بہت سے علماء اور صوفی مغل بادشاہ کی طرفداری کرتے ہوئے شیخ احمد سرہندیؒ (d. 1624) کی تحریک کی مخالفت کے لئے کمر بستہ ہو گئے اور انہوں نے دارا شکوہ[3] (d. 1659) کی بھی حمایت کی جو شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر[4] (d. 1707) کی مخالفت میں نئے مذہب کی حمایت کر رہا تھا۔

(ج)۔ مطلق بادشاہت نے مسلم دنیا میں سیاسی جبر کو جنم دیا۔ ہندوستان کے ایک مسلمان حاکم نے کسی شہری سے ناراض ہو کر اسے ہاتھی کے پاؤں تلے روندنے کا حکم دیا۔ شام کو جب بادشاہ سلامت مغرب کی نماز پڑھنے لگے تو امام صاحب نے اتفاقاً سورۃ الفیل (جس میں ہاتھی والوں کی بربادی کا ذکر ہے) کی تلاوت کی۔ بادشاہ سلامت برہم ہو گئے کہ امام اس کی تضحیک (insult) کر رہا ہے۔ بادشاہ

۱۔ مغل بادشاہ اکبر (1542ء-1605ء) نے اپنے دور میں، ایک نئے مذہب کی شروعات کی، جس کا نام دین الٰہی رکھا۔ اس مذہب کا مقصد، تمام مذاہب والوں کو یکجا کرنا اور ان میں ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ اکبر کے مطابق، دین اسلام، ہندومت، مسیحیت، سکھ مذہب، اور زرتشتیت مذاہب کے، عمدہ اور خالص اُصولوں کو اکھٹا کر کے ایک نیا دینی تصور قائم کرنا تھا۔ جس سے رعایا میں نا اتفاقیاں دور ہوں اور، بھائی چارگی قائم ہو۔

۲۔ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی (1564 - 1624) ہندوستان کے مشہور و معروف عالم اور صوفی بزرگ تھے جنہوں نے بادشاہ اکبر کے دین الٰہی اور دیگر خلاف شرع بدعات کے خلاف بھرپور عملی کوششیں کیں۔

۳۔ داراشکوہ (1615-1659) مغل شہنشاہ شاہجہان کا بیٹا اور اورنگزیب کا بھائی تھا۔

۴۔ سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ (1618 - 1707) مغلیہ سلطنت کا بادشاہ اور شاہ جہاں کا بیٹا تھا۔ جس نے 1658 سے لے کر 1707 تک ہندوستان پر حکومت کی۔ عالمگیرؒ نے ہندوستان میں حکومتی سطح پر اسلامی شریعت کا احیا کیا جس کی وجہ سے آپؒ کو محی الدین کا خطاب دیا گیا۔ فتاویٰ عالمگیری آپؒ کے دور کی شاہکار تخلیق ہے۔ مغل بادشاہوں میں عالمگیرؒ واحد حافظ قرآن بادشاہ تھا۔

سلامت نے حکم دیا کہ اس امام کو بھی ہاتھی کے پاؤں تلے روند دیا جائے۔حضرت اقبالؒ فرماتے ہیں:

کرتی ہے ملوکیّت آثارِ جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو کہ چنگیز[1]

3۔ غلامی سے آزادی تک

اسلام نے انسانی غلامی کی تمام شکلوں اور مظاہر کی شدید مذمت کی ہے اور اس کے خلاف لڑائی لڑی ہے۔ اس نے اس لعنت کو کم اور صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے عملی اقدامات کئے ہیں۔ اس نے انسانیت کو آزادی کا سبق دیا ہے۔ آیئے حضور نبی کریم ﷺ کے دوسرے خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے تاریخی بیان کو یاد کریں۔

حضرت امام ابن الحاکمؒ کی روایت ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے بیان کرتے ہیں کہ مصر کا ایک آدمی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا: اے امیر المومنین رضی اللہ عنہ میں ناانصافی سے پناہ مانگنے کے لئے آیا ہوں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ تم نے کسی کو اس پر آمادہ پایا۔اس شخص نے کہا کہ میں نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے سے مقابلہ کیا تھا اور میں جیت گیا تھا۔اس نے مجھے کوڑے مارے اور کہا کہ میں عزت دار آدمی کا بیٹا ہوں۔اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو خط لکھ کر بیٹے سمیت مدینہ بلایا اور پوچھا کہ وہ مصری کہاں ہے؟ وہ آیا تو انہوں نے اس کو کوڑا دیا اور کہا حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے بیٹے کو اس سے مارو۔اس شخص نے اس کو مارنا شروع کر دیا۔حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کی قسم اس شخص نے اسے مارا اور ہمیں اس کا یہ مارنا بہت اچھا لگا۔ پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے مصری کو کہا اب اس کے باپ (حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ) کی طرف بڑھو۔مصری نے جواب دیا کہ یا امیر المومنین رضی اللہ عنہ اس کے بیٹے نے مجھے مارا تھا۔ میں اس سے بدلہ لے لیا ہے۔حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے کہا: تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا ہے حالانکہ ان کی ماؤں نے انہیں آزاد پیدا کیا ہے۔حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ

[1]۔غزلیں: بال جبریل از محمد اقبالؒ

امیرالمومنین رضی اللہ عنہ مجھے اس کے بارے میں معلوم نہ تھا اور نہ ہی مصری میرے پاس شکایت لے کر آیا تھا[1]۔

یہ آزادی کا اعلان عہد حاضر کے مشہور فرانسیسی فلسفی اور سیاسی مفکر روسو[2] (Rousseau,d. 1778) کے اس مشہور نعرہ سے بھی زیادہ جامع (comprehensive) ہے کہ

انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر ہر جگہ غلامی کی زنجیروں میں ہے۔

روسو (Rousseau, d. 1778) نے محض ایک حقیقت بیان کی تھی جبکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے روسو (Rousseau, d. 1778) سے ایک ہزار سال پہلے غلامی کی مذمت کی اور سب کے لیے اعلانِ آزادی کیا تھا۔ غلامی کی مذمت نہ صرف جسمانی غلامی کے خلاف جہاد تھا بلکہ غلامی کی تمام شکلوں اور تمام مظاہر کے خلاف ایک جہاد (انتہائی جدوجہد) تھا۔ مذکورہ واقعے میں 'بڑی عزت والے شخص کا بیٹا ہونے کی شیخی بگھارنے کو غلامی کی ایک قسم قرار دیا گیا ہے۔

اس اصول کو جنگ قادسیہ سے پہلے حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ[3] کے ایلچی نے فارس کے جرنیل کے دربار میں زیادہ شاعرانہ طور پر پیش کیا تھا۔ (یہ جنگ 636ء میں عرب مسلم فوج اور ساسانی فارسیوں کے درمیان لڑی گئی تھی)۔ فارسی فوج کے کمانڈر رستم نے مسلم کمانڈر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ بات چیت کے لئے اپنا ایلچی بھیجیں۔ جس پر انہوں نے حضرت ربیعہ بن عامر رضی اللہ عنہ کو بطور ایلچی بھیجا۔

رستم نے حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ فارس میں کیوں آئے ہیں اور آپ کا مقصد کیا ہے؟ حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ہم کو اللہ پاک نے اس لیے بھیجا ہے کہ جس کے بارے میں اس

---

[1]۔ دیکھیے کنزالعمال۔ جلد ششم: رقم: 5640

[2]۔ ژاں ژاک روسو: Jean-jacques Rousseau (1712-1778) انسانی مساوات کا مبلغ اور ایک فلسفی تھا۔ جس کی تحریریں فرانس میں انقلاب برپا کرنے کا سبب بنیں۔

[3]۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ 578ء-664ء) اولین مسلمانوں میں سے تھے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے متعلق ارشاد فرمایا تھا کہ وہ 1,000 جنگجوؤں کے برابر ہیں۔ وہ تاریخی جنگ قادسیہ میں اسلامی فوج کے کمانڈر انچیف تھے۔ اسی جنگ کے بعد سلطنتِ فارس منہدم ہوئی تھی۔ اس جنگ کی منصوبہ بندی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے خود کی تھی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے چھ ممکنہ جانشینوں میں بھی شامل تھے۔

کی مرضی ہو،اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ تعالیٰ کی بندگی میں داخل کریں۔ دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہنچا دیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے بچا کر اسلام کے عدل میں لے آئیں[۱]۔

اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت اور اس کے سامنے اظہار نیاز مندی انسانیت کو غلامی کی تمام شکلوں سے نجات دلاتی ہے۔ حضرت اقبالؒ نے اس تصور کو بڑی خوبصورتی سے شعر میں پیش کیا ہے:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات[۲]

انسانوں کو غلام بنانے کے طریق کار اور اس کی تاسیس کے انسانی معاشرے پر بہت دوررس نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ یہ انسان کے وقار اور عزتِ نفس کے منافی ہے۔ غلامی میں انسانی سرگرمیوں کا دائرہ سکڑ جاتا ہے جبکہ آزادی میں پھیل جاتا ہے۔ آزادی میں انسان اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کر سکتا ہے اور اس کی تخلیقی اور اختراعی قابلیتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ حضرت اقبالؒ نے کتنی خوبصورتی سے اس بات کا اظہار کیا ہے:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی[۳]

ہمارے بادشاہوں کو یہ انسانی شرف پسند نہ آیا۔ انہوں نے انسانوں کو جسمانی اور ذہنی طور پر غلام بنانا شروع کر دیا۔ غلاموں کی خرید و فروخت ہونے لگی۔ حرم میں باندیوں (slave girls) کا ہجوم بڑھنے لگا۔ علماء نے قرآن و حدیث کی تعلیمات کے خلاف فقہ کی کتابوں میں غلاموں اور باندیوں کے مسائل اور جواز کے دلائل دیئے۔ اسلام کی حریت کی تعلیم اور شرف انسانی کی تعظیم کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ جس نے بھی ذرہ بھر آواز بلند کی اس کو قید و سلاسل میں ڈال دیا گیا۔ شہید کر دیا گیا۔ حضرت

۱۔ تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) از امام ابی جعفر محمد بن جریر طبریؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ نمبر 702
۲۔ نماز؛ ضرب کلیم از محمد اقبالؒ
۳۔ خضر راہ؛ بانگ درا از محمد اقبالؒ

امام حسین ؓ، حضرت محمد نفس ذکیہؒ[1] (d. 763)، حضرت احمد بن حنبلؒ[2] (d. 855)، حضرت امام ابوحنیفہؒ[3] (d. 772)، حضرت مجدد الف ثانیؒ (d. 1624) اور حضرت امام سرخسیؒ[4] (d. 1096) کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

4۔ ظلم سے عدل و احسان تک

ناانصافی اپنی تمام شکلوں کے ساتھ روزمرہ کا ایک چلن تھا۔

(1)۔ سماجی استحصال عام تھا جو انفرادی، خاندانی اور معاشرتی سطحوں پر ہو رہا تھا۔ انسانی زیست کی ہر سطح پر طبقاتی امتیازات تھے۔

(2)۔ سیاسی جبر اور جور و ستم تھا جو شخصی اقتدار، معاشرتی اور قبائلی حیثیتوں اور شاہی اختیارات پر مبنی تھا۔

(3)۔ اقتصادی استحصال اور عدم مساوات تھی جو ہوا و ہوس اور ناانصافیوں پر مبنی تھی۔

اسلام نے ناانصافیوں اور استحصال کی تمام شکلوں کی مذمت کی۔ انصاف و مساوات کے اصولوں کا پرچم بلند کیا اور وسیع ترین پیمانے پر ان اصولوں پر عمل درآمد کا اعلان کیا۔ اسلام نے ظلم کے

---

[1]۔ محمد النفس الزکیہ یہ بن عبداللہ کامل بن حسن المثنیٰ بن حسن السبط بن علی ابن ابی طالب (d. 763) فاطمی سادات میں سے تھے۔ آپؒ کا اصل نام محمد تھا لیکن اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے نفس الزکیہ مشہور تھے۔ آپؒ کو عباسی اپنی حکومت کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے انہیں شہید کروا دیا۔

[2]۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ (780ء-855ء) اپنے دور کے بڑے عالم اور فقیہ تھے۔ آپؒ امام شافعیؒ کے شاگرد ہیں۔ اپنے زمانہ کے مشہور علمائے حدیث میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ انہوں نے مسند کے نام سے حدیث کی کتاب تالیف کی جس میں تقریباً چالیس ہزار احادیث ہیں۔

[3]۔ امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ (702ء-772ء) مسلمان عالم دین، مجتہد، فقیہ اور اسلامی قانون کے اولین تدوین کرنے والوں میں شامل تھے۔ ان کی وجہ شہرت احادیث رسول ﷺ کو اکٹھا کرنے اور فقہی اجتہاد کی وجہ سے ہے۔ جو لوگ ان کی تشریحات پر عمل کرتے ہیں حنفی کہلاتے ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اس طرح فقہ حنفی کے بانی امام سمجھے جاتے ہیں۔

[4]۔ شمس ائمہ محمد بن احمد ابوبکر امام سرخسیؒ (d. 1096) ایک مشہور و معروف حنفی سکالر تھے جن کا تعلق ایران کے شہر سرخس سے تھا۔ اسی شہر کی نسبت سے سرخسی مشہور ہو گئے۔ آپؒ کی مشہور کتاب المبسوط فی الفقہ ہے۔

معاشرے کے خلاف عدل کا اعلان کیا ہے۔ افلاطون[1] (Plato, d. 347 BC) نے ایک نظری بحث کے طور کہا کہ

Justice is virtue and virtue is justice

(انصاف نیکی ہے اور نیکی انصاف ہے)

قرآن پاک نے اس سے بڑھ کر بات کی کہ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ[2]

(دنیا میں تمام انبیاء اور تمام آسمانی کتابیں اس لیے نازل کی گئی ہیں کہ لوگوں کے درمیان انصاف قائم کیا جا سکے)

اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل علیہم السلام (حضرت آدم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اپنی کتابیں (توراۃ، زبور، انجیل اور قرآن مجید) صرف نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے احکامات دے کر نہیں بھیجیں بلکہ انصاف کے قیام اور عدل و انصاف پر مبنی معاشرے کی تشکیل کے لئے بھی بھیجی ہیں۔ ہمارے بعض مذہبی علماء یہ اعلان کرنے تک پہنچ گئے ہیں کہ غیر مسلموں کی منصفانہ حکمرانی مسلمانوں کی غیر منصفانہ حکمرانی سے بہتر ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول بیان کیا جاتا ہے:

اَلْمُلْكُ يَبْقٰى مَعَ الْكفرِ وَلَا يَبْقٰى مَعَ الظُّلم۔

(کفر کے ساتھ ریاست قائم رہ سکتی ہے مگر ظلم کے ساتھ نہیں رہ سکتی)

اسلامی فلسفے میں انصاف کا تصور کسی بھی دوسرے نظام کے تصورِ انصاف سے زیادہ جامع ہے۔ مسلمان اہل دانش نے 'ظلم' کا دیگر مختلف زاویوں سے مطالعہ کیا اور اس پر بحث کی ہے۔ ان اہل دانش کے مطابق 'ظلم' کا مطلب کسی چیز کو ایک غلط جگہ پر رکھنا ہے اور 'عدل' کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو اس کی صحیح

---

[1] ۔Plato؛ افلاطون (347 BC -428BC) یونان کے موثر ترین فلسفیوں میں سے ایک ہے۔ افلاطون سقراط کا شاگرد اور متعدد فلسفیانہ مکالمات کا خالق اور ایتھنز میں اکادمی (اکیڈمی) نامی ادارے کا بانی تھا۔ جس میں بعد ازاں ارسطو نے تعلیم حاصل کی۔ افلاطون نے اکیڈمی میں وسیع پیمانے پر تعلیم دی اور بہت سے فلسفیانہ موضوعات، جن میں سیاست، اخلاقیات، مابعد الطبیعیات اور علمیات شامل ہیں، پر لکھا۔ افلاطون کے مکالمات (Dialogues) اس کی اہم ترین تحریریں ہیں۔

[2] ۔سورۃ الحدید: آیت:25

جگہ پر رکھا جائے۔ یہ 'عدل' اور 'ظلم' کی سادہ مگر جامع بلکہ قدرے وسیع تعریف ہے اور انسانی وجود کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ یہی حقیقت کہ اہل دانش نے 'انصاف' اور 'ناانصافی' کی تشریحات وسیع ترین ممکنہ اصطلاحات میں کی ہیں، اس امر کا ثبوت ہے کہ مسلم دانشور انصاف کے حقیقی تصور کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

اسلام 'عدل' کے علاوہ 'احسان' (equity) کی وکالت کرتا ہے۔ عدل کا مطلب ہے کہ جو کچھ واجب (due) ہے جبکہ 'احسان' کا مطلب ہے 'واجب سے زائد'۔ قرآن فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ[1]۔

(اللہ تعالیٰ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے)

احسان ایک ذریعہ ہے جس سے قانون کا ایک نظام قواعد سازی میں تیقن کی ضرورت کو منفرد حالات میں منصفانہ نتائج حاصل کرنے کی ضرورت کے ساتھ متوازن بناتا ہے۔ یہ ایک اظہار ہے جس سے عموماً اس طریقے کو بیان کیا جاتا ہے جس میں احسان اپنا کام دکھاتے ہوئے عام قانون کی سختی کو کم کر دیتا ہے۔ احسان اس امر کو یقینی بناتا ہے کہ قانون کا سخت استعمال کسی مخصوص معاملے پر لاگو ہو کر اسے غیر منصفانہ نہ بنا دے۔

اسلام نے نہ صرف انصاف اور احسان کی تبلیغ کی ہے بلکہ انصاف بھی قائم کیا ہے اور اس قدیم معاشرے کے ساتھ احسان کر کے دکھایا ہے جو جزیرہ نمائے عرب میں قائم چلا آ رہا تھا۔ قدیم معاشرے کے ہر شعبے پر انصاف اپنی تمام سماجی، سیاسی اور اقتصادی شکلوں میں غالب رہا۔

- سیاسی نظام: استحقاق اور اخلاقی اصولوں پر استوار تھا۔
- معاشی نظام: سخت محنت، تجارت اور رحم دلی و ہمدردی پر مبنی تھا۔
- معاشرتی نظام: انسانی مساوات اور احسان پر قائم تھا۔

اسلام نے حقوق و فرائض/ ذمہ داریوں کا توازن، انفرادیت اور اجتماعی زندگی کا توازن، شہریوں کے درمیان باہمی توازن، معاشرے اور ریاست کا توازن قائم کیا۔

بعدازاں فاسقانہ سیاسی افکار اور مکروہ عزائم انصاف اور اعتدال پر غالب آ گئے۔ سیاسی اور

---

[1] ۔ سورۃ النحل: آیت:90

معاشرتی استحصال شروع ہو گیا اور معاشی ناانصافیوں نے سر اٹھا لیا۔ مسلمان بادشاہوں نے اپنے جبر اور ناانصافیوں کا جواز ثابت کرنے کے لئے علمائے سُو کی خدمات حاصل کر لیں اور عوام پر حکمرانوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ بدقسمتی سے اسلامی حکومت کی ساری تاریخ میں بااثر علمائے سوء اور اہل دانش کی ایک بڑی اکثریت نے مالی منفعتوں کے لئے اہل اقتدار کے ساتھ ساز باز کر لی۔ ظلم کے خلاف کسی نے موثر آواز نہ اٹھائی بلکہ ان کی صلاحیتیں حکمرانوں کی بدکاریوں کا جواز پیش کرنے پر صرف ہوتی رہیں۔

فقہ کی کتب میں متعدد ابواب اس موضوع پر ہیں کہ زکوٰۃ اور دیگر لازمی محاصل کی ادائیگی سے کیسے بچا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات سے بچنے کے لئے بنی اسرائیل کی جو حکمت عملیاں اور حیلہ سازیاں تھیں ان کا اگر مسلمان علماء کے گھڑے ہوئے حربوں اور عذر تراشیوں سے موازنہ کیا جائے تو وہ ماند پڑ جاتی ہیں۔

مختصراً یہ کہ مسلمانوں نے انصاف اور مساوات کے اس درس کو فراموش کر دیا جو قرآن مجید میں دیا گیا تھا۔ وہ ظلم و جبر اور ناانصافیوں کو فروغ دینے لگے۔

5۔ بنیادی حقوق کی علمبرداری

قدیم تہذیبوں میں انسانوں کو ایسا نہیں سمجھا جاتا تھا جن کے کچھ فطری حقوق ہوں۔ اگرچہ رومن فقہ میں فطری حقوق کا کچھ سراغ ملتا ہے۔ اسلام پہلا مذہب تھا جس نے شہریوں کے حقوق کا علم بلند کیا اور اعلان کیا کہ انسان تمام معاشرتی، سیاسی اور معاشی حقوق رکھتا ہے کیونکہ وہ ایک بہترین اور عمدہ ترین مخلوق اور ساری تخلیقات کا تاج ہے۔

قرآن مجید نے غیر مبہم الفاظ میں اعلان کیا کہ یہ حقوق انسان کو خلقی طور پر حاصل ہیں۔ یہ کسی بادشاہ یا کسی اور ذی اختیار ادارے یا شخص کے عطا کردہ نہیں ہیں:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا۔[1]

(اور بلاشبہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی اور انہیں خشکی اور تری میں سواریاں

---

[1] سورۃ الاسراء: آیت: 70

دیں اور انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے جو مخلوق پیدا کی، ان میں بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا کی)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ [1]۔

(ہم نے انسان کو بہترین شکل وصورت میں پیدا کیا ہے)

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً [2]۔

(اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر ایک خلیفہ بنانے والا ہوں)

اسلام انسانیت کے لیے مجموعی طور پر چند بنیادی حقوق مقرر کرتا ہے۔ ان حقوق کا ہر قسم کے حالات میں التزام اور احترام کیا جانا چاہیے، خواہ کوئی شخص اسلامی ریاست کے اندر کسی علاقے میں ہو یا باہر ہو، خواہ وہ برسرِ جنگ ہو یا حالتِ امن میں ہو۔ ان بنیادی حقوق کے اہم خدوخال ذیل کی سطور میں بیان کیے جا رہے ہیں:

(1)۔ انسانی زندگی ہر طرح کے حالات میں مقدس ہے۔ اگر کوئی شخص کسی کو بلا جواز قتل کر کے زندگی کے تقدس کو پامال کرتا ہے تو قرآن مجید اس اقدام کو پوری انسانیت کے قتل کے برابر قرار دیتا ہے:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا [3]

(اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا کہ جس نے ایک جان کو کسی جان کے بدلے کے بغیر قتل کیا یا زمین میں فساد پھیلایا تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کیا)

(2)۔ اسلام میں انسان کی جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دے دی گئی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں ارشاد فرمایا: تمہارا خون اور مال ایک دوسرے پر حرام ہے جس

[1]۔ سورۃ التین: آیت:4

[2]۔ سورۃ البقرہ: آیت:30

[3]۔ سورۃ المائدہ: آیت:32

طرح یہ آج کا (یوم نحر) دن یہ مہینہ (ذوالحجہ) اور یہ شہر حرام (مکہ مکرمہ) ہیں[1]۔

(3)۔ اسلام میں انسان کی عزت و آبرو کو تحفظ کر دیا گیا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۡ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ[2]

(اے ایمان والوں! ایک مرد دوسرے مرد کا ذاق نہ اڑائے، ہوسکتا ہے کہ وہ اس سے بہتر ہو۔ نہ ہی عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد نافرمانی کرنا بری بات ہے۔ جو لوگ اس روش سے باز نہیں آئیں گے وہ ظالم ہیں۔ اے ایمان والو! بدگمانی کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ بہت سی بدگمانیاں گناہ ہوتی ہیں۔ جاسوسی نہ کرو۔ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں کوئی ہے جو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے؟ تم اسے برا سمجھتے ہو۔ اللہ عزوجل سے ڈرو! اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)

(4)۔ اسلام انسانی رہائش کو بے جا مداخلت سے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا

---

[1]۔ صحیح مسلم۔ جلد دوم: رقم: 456

[2]۔ سورۃ الحجرات: آیت: 11-12

وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ [1]

(اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں اس وقت تک داخل نہ ہوا کرو، جب تک اجازت نہ لے لو اور ان میں بسنے والوں کو سلام نہ کرلو۔ یہی طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ امید ہے کہ تم خیال رکھو گے)

(5)۔ اسلام ظلم کے خلاف احتجاج کے حق کی ضمانت دیتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَــهْرَ بِالسُّوْۗءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ [2]

(اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کسی کی برائی علانیہ زبان پر لائی جائے، الا یہ کہ کسی پر ظلم ہوا ہو)

یعنی مظلوم کو حق پہنچتا ہے کہ ظالم کے خلاف آواز اٹھائے۔

(6)۔ اسلام میں ضمیر اور عقیدے کی آزادی کے حق کو تحفظ حاصل ہے۔ قرآن کہتا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ [3]

(دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے)

(7)۔ اسلام میں بنیادی انسانی ضروریاتِ زندگی کی ضمانت دی گئی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ [4]

(اور ان کے مال و دولت میں سائلوں اور محروم لوگوں کا (باقاعدہ) حق ہوتا تھا)

یعنی ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے، دونوں کا حق ہوتا ہے۔

(8)۔ اسلام میں قانون کی حکمرانی کے سامنے سب برابر ہیں۔ جب ایک عالی نسب خاندان کی عورت چوری کے الزام میں پکڑی گئی تو معاملہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش ہوا۔ سفارش کی گئی کہ اسے چھوڑ دیا جائے کیونکہ معاشرے میں اس کا مقام بہت بلند ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

---

[1]۔ سورۃ النور: آیت: 27

[2]۔ سورۃ النساء: آیت: 148

[3]۔ سورۃ البقرہ: آیت: 256

[4]۔ سورۃ الذاریات: آیت: 19

جواب دیا کہ تم سے پہلے جو قومیں اللہ تعالیٰ نے تباہ کی ہیں ان میں عام آدمی کو تو جرم پر سزا دی جاتی تھی لیکن بڑے خاندانوں کے افراد کو ان کے جرائم پر سزا دیئے بغیر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ اگر فاطمہ بنت محمدؐ نے یہ جرم کیا ہوتا تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا[1]۔

(9)۔ اسلام میں ہر انسان کو امور ریاست میں حصہ لینے کے حق کی ضمانت دی گئی ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ[2]

(اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی بات مانی ہے اور نماز قائم کی ہے اور ان کے معاملات آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں)

حضور نبی کریم ﷺ نے تاریخ انسانیت میں پہلی بار انسانی حقوق کا واضح اور جامع منشور (Charter) دیا۔ مسلمان پورے وثوق کے ساتھ اور بجا طور پر دعویٰ کر سکتے ہیں کہ حقوق انسانی کی تاسیس وتشکیل کا تاریخی اعلان خطبہ حجۃ الوداع میں ہوا تھا۔ اس آخری خطبے کے اہم نقاط درج ذیل ہیں:

(1)۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے انسانوں ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقینا اللہ پاک سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔

(2)۔ تمام نوعِ انسان حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کی اولاد ہے۔ ایک عربی کو ایک عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، نہ ہی ایک عجمی کو ایک عربی پر کوئی فضیلت ہے۔ اسی طرح سفید فام کو سیاہ فام پر یا سیاہ فام کو سفید فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ فضیلت صرف تقویٰ اور اعمالِ صالحہ کی بنا پر ہو سکتی ہے۔

---

[1]۔ دیکھیے صحیح بخاری۔ جلد دوم: رقم: 733

[2]۔ سورۃ الشوریٰ: آیت: 38

(3)۔ جان لو کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمان مل کر اسلامی برادری کی تشکیل کرتے ہیں۔

(4)۔ خوب جان لو کہ زمانہ جاہلیت کے تمام طور طریقے اب میرے پاؤں تلے ہیں۔اس زمانے کے خون کے انتقام معاف کر دیئے گئے ہیں۔

(5)۔ اے لوگو! تمہارا خون، تمہاری جائیداد اور تمہاری آبرو مقدس اور قابلِ احترام ہیں۔تاوقتیکہ تم اپنے مالک کے پاس پہنچ جاؤ، یہ اتنی مقدس ہیں جتنا تمہارے لئے یہ دن (یوم نحر)، تمہارا یہ مہینہ (ذوالحجہ) اور تمہارا یہ شہر (مکہ مکرمہ) قابل احترام ومقدس ہے۔

(6)۔ جان لو! استحقاق کا ہر دعویٰ خواہ خون کا ہو یا املاک کا، میرے پاؤں تلے ہے۔

(7)۔ کسی کو نقصان نہ پہنچاؤ تا کہ کوئی تمہیں نقصان نہ پہنچائے۔

(8)۔ کسی مسلمان کے لئے وہ چیز حلال نہیں ہے جو اس کے مسلمان بھائی کی ملکیت ہے سوائے اس کے کہ وہ اس نے خوشی اور رضامندی کے ساتھ دی ہو۔اس لئے اپنے ساتھ ناانصافی نہ کرو۔

(9)۔ تمہارے پاس کوئی امانت رکھوائی گئی ہو تو اسے اس کے صحیح مالکوں کو واپس دو۔

(10)۔ اللہ نے تمہیں سود لینے سے منع کیا ہے۔اس لئے تمام سودی مطالبات ختم کر دیئے جائیں گے۔ اصل رقم تمہاری ہے۔صرف اسے ہی واپس لے سکتے ہو۔

(11)۔ تم بے انصافی نہ مسلط کرو اور نہ اس کے شکار بنو گے۔

(12)۔ اے لوگو! یومِ حساب تم اس طرح نہ پیش ہونا کہ اس دنیا کے بوجھ تمہاری گردنوں پر ہوں۔

(13)۔ اے لوگو! یہ درست ہے کہ عورتوں پر تمہارے چند حقوق ہیں لیکن تمہارے ذمہ بھی ان کے حقوق ہیں۔

(14)۔ یاد رکھو کہ تم نے اپنی بیویاں صرف اللہ تعالیٰ کی امانت کے طور پر اور اس کی اجازت کے ساتھ حاصل کی ہیں اگر وہ تمہارے حق کی پابند ہیں۔ان کا بھی حق ہے کہ تم ان کو شفقت کے ساتھ نان ونفقہ دو۔

(15)۔ عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ کیونکہ وہ تمہاری شریک حیات اور پُرخلوص مددگار ہیں۔یہ تمہارا حق ہے کہ وہ کسی ایسے فرد کے ساتھ دوستی نہ کریں جس کو تم پسند نہ کرو اور یہ بھی کہ وہ

کبھی آلودہ دامن نہ ہوں۔

(16)۔ اولاد اسی کی ہے جس کے بستر پر پیدا ہوئی ہو۔

(17)۔ اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے جو قادرِ مطلق ہے حکم دیا ہے کہ ہر ایک کو وراثت میں سے اس کا حق دیا جائے۔اس لئے اب کسی وارث کے حق میں خصوصی وصیت کرنے کی ضرورت نہیں۔

(18)۔ اپنی املاک پر عائد ہونے والی زکوۃ بلا تاخیر ادا کرو۔

(19)۔ تمام قرضے لازماً واپس لوٹائے جائیں۔ادھار لی گئی املاک لوٹا دی جائیں۔تحائف کا بدلہ دیا جائے۔ضامن کو نقصان کی تلافی کا پورا اہتمام کرنا ہوگا۔

(20)۔ ہر انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔کوئی بچہ اپنے باپ کے جرم کا ذمہ دار نہیں اور نہ ہی کوئی باپ بچے کے جرم کا ذمہ دار ہے۔

(21)۔ کسی مسلمان کے لئے اس کے بھائی کی چیز حلال نہیں ہے ماسوائے اس کے کہ وہ اپنی مرضی سے اس کو دے دے۔اس لئے اپنے ساتھ برائی نہ کرو۔

(22)۔ اپنے خدام کو ایسی خوراک دو جیسی تم خود کھاتے ہو اور ایسے کپڑے پہناؤ جیسے تم خود پہنتے ہو۔

(23)۔ اے لوگو! اپنے امیر کی بات سنو اور اطاعت کرو، خواہ ایک ناک کٹا حبشی تمہارا 'امیر' بنا دیا جائے۔بشرطیکہ وہ کتاب اللہ کے احکامات کے مطابق تمہیں ہدایات دے۔

(24)۔ آگاہ رہو کہ دین کے بارے میں جو حدود مقرر ہیں ان سے تجاوز نہ کرنا کیونکہ ان حدود (کی جائز وسعتوں) سے تجاوز کرنے کی وجہ سے ہی تم سے پہلے کی امتیں تباہی سے دوچار ہوئی تھیں[1]۔

حضور نبی کریم ﷺ شہریوں کے حق تعلیم کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ آپ ﷺ نے غزوہ بدر کے قیدیوں کو اختیار دیا کہ اگر وہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو انہیں آزاد کر دیا جائے گا۔ آپ ﷺ کو یہ خوف نہیں تھا کہ یہ کافر (جنگی قیدی) مسلمانوں کے عقیدے کو خراب کر دیں گے۔ اسلام نہ صرف ان کو مذہبی اعمال کی آزادی دینے کا مطالبہ کرتا ہے بلکہ یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ ان سے دیگر لوگوں کی طرح منصفانہ سلوک کیا جائے۔حضرت عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ

---

[1]۔سیرت ابن ہشام از محمد بن عبدالملک بن ہشامؒ۔جلد سوم: صفحہ نمبر 232-233

نے ارشاد فرمایا: جس نے ذمی کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھ سکے گا حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت تک محسوس ہوتی ہے[1]۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے کسی معاہد (ذمی) پر ظلم کیا یا اس پر اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ ڈالا، میں قیامت کے دن اس کا دشمن ہوں گا[2]۔

مسلم ریاستوں کے علاقوں میں غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک کو غیر مسلم مؤرخین نے وسیع پیمانے پر تسلیم کیا ہے۔ وِل ڈیورانٹ[3] (Will Durant, d. 1981) نے لکھا ہے:

> بنو امیہ کی خلافت کے زمانے میں زیر معاہدہ لوگوں (ذمی) عیسائیوں، زرتشتیوں، یہودیوں اور صائبین لوگوں کے ساتھ ایسا رواداراناہ رویّہ اختیار کیا گیا تھا کہ آج کے مسیحی ممالک میں بھی کہیں نہیں پایا جاتا۔ وہ اپنی اپنی مذہبی رسوم آزادی سے ادا کر سکتے تھے ان کے معبدوں اور گرجاؤں کی پوری حفاظت کی جاتی تھی۔ انہیں ان میں خود مختاری حاصل تھی اور وہ اپنے علماء اور ججوں کے بنائے ہوئے مذہبی قوانین کے تابع تھے[4]۔

آیئے ایک نظر اقتصادی حقوق پر ڈالیں۔ ایک دفعہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ آپ رضی اللہ عنہ معاشی انصاف پر اتنا اصرار کیوں کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس کے پاس ایک بکری ہے۔ جس کا آدھا دودھ ان کے لئے ہے اور آدھا ہمسایوں کے لیے۔ پھر انہوں نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی:

۱۔ سنن ابن ماجہ۔ جلد دوم: رقم: 844

۲۔ کنز العمال۔ جلد سوم: رقم: 2521

۳۔ William James "Will" Durant؛ ولیم جیمز ڈیورانٹ (1885ء۔ 1981ء) ایک امریکی مصنف، مورخ اور فلسفی تھا۔ اس نے فلسفے کا ایک کلی تناظر میں تصور قائم کیا اور تاریخ کے وسیع علم کو یکجا کرنے اور انسان دوست بنانے کی کوشش کی۔ اسے سب سے زیادہ شہرت اس کی کتاب 'The Story of Civilization' سے ملی جو 11 جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اس نے اپنی بیوی ارائیل ڈیورانٹ کے تعاون سے لکھی۔

۴۔ The Story Of Civilization by Will Durant, Vol. 13. p. 131-132.

وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ مَاذَا يُنۡفِقُوۡنَ ۬ؕ قُلِ الۡعَفۡوَ [1]

(تم سے یہ بھی دریافت کرتے ہیں کیا خرچ کریں؟ تو آپ ﷺ فرما دیں اپنی ضرورت سے زائد چیز خرچ کرو)

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کی دلیل کیا ہے؟ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے کیسا خوبصورت جواب دیا:

اوصانی خلیلی

(میرے دوست رسول اللہ ﷺ کا یہی حکم ہے)

ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر ساحل فرات پر ایک بھیڑ کا بچہ بھی بھوکا مر گیا تو روزِ قیامت انہیں ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔ یہ محض ایک سیاسی نعرہ یا انتخابی منشور نہیں تھا بلکہ اسلام کے اقتصادی اور سیاسی فلسفے کا ایک ضابطۂ کار تھا جس کا انہوں نے اظہار کیا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے خود ارشاد فرمایا تھا:

انا ولیُّ مَن لا وَلِیَ لَهُ

(میں اس شخص کا مددگار اور محافظ ہوں جس کا کوئی مددگار و محافظ نہیں ہے)

حضور نبی کریم ﷺ محض ایک اخلاقی اصول نہیں سکھا رہے تھے یا اپنے ذاتی کردار کی وضاحت نہیں کر رہے تھے بلکہ ایک پالیسی کا اعلان کر رہے تھے کہ ریاست معاشرے کے تمام کمزور اور زد پذیر طبقات کی سرپرست اور محافظ ہوگی۔ آپ ﷺ اہلِ ایمان کو بھی ان کی یہ ذمہ داری یاد دلا رہے تھے کہ انہیں معاشرے کے مجبور اور محروم طبقات بشمول محتاج افراد، یتامیٰ، نابالغ بچوں اور بیواؤں کی دستگیری و دادرسی کے سلسلے میں کوشاں رہنا ہوگا۔ یہ اعلیٰ و ارفع تعلیمات تھیں جس نے ایک ایسے مثالی معاشرے کو جنم دیا جو سماجی انصاف پر مبنی تھا جس میں لوگوں کو عزت و وقار اور احترام حاصل تھا۔ بہ الفاظ دیگر اسلام نہ صرف انسانی حقوق کے تصور اور دائرۂ عمل کو وسیع و عریض کرنے کا ذمہ دار تھا بلکہ ریاست کو شہریوں کے حقوق کے تحفظ کا کردار سونپنے کا بھی ذمہ دار تھا۔

---

[1] سورۃ البقرہ: آیت: 219

شواہد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ بات بلا خوف وخطر کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ دنیا کا منشورِ عظیم میگنا کارٹا[1] (Magna Carta)، دستاویز حقوق[2] (Bill of Rights) اور 'تحریک حقوق انسانی' (Human Rights Movement) نے جذبہ و رہنمائی ان اعلیٰ وارفع تصورات سے حاصل کی جو قرآن پاک اور خطبہ حجۃ الوداع میں بیان کر دیئے گئے تھے۔

6۔ توہمات سے تجربیت تک

یہ بہت ضروری امر ہے کہ ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے ابتدائی عہد میں زمانے کے ذہنی چیلنجوں پر کیسے ردِعمل کا اظہار کیا اور ان سے عہدہ برآمد ہونے کے لئے کیا تدابیر اختیار کیں۔ قرآن مجید کے مطابق زمین پر انسانی زندگی کا آغاز علم سے ہوا تھا:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ

1۔ میگنا کارٹا (Magna Carta) انسانی تاریخ کی ایک اہم قانونی دستاویز ہے جس میں برطانوی عوام کو بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ دیا گیا ہے۔ یہ قانونی دستاویز جون 1215ء میں برطانوی عوام اور بادشاہ جان کے درمیان رنی میڈ کے مقام پر لکھی گئی۔

2۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی دستاویز حقوق کو دسمبر 1789ء میں ایکٹ آف پارلیمنٹ کے طور پر منظور کیا گیا۔ اس دستاویز میں قوم کے قدیم حقوق اور آزادیوں کا اظہار اور اعلان کیا گیا جو یہ تھے:

(1)۔ ارکان پارلیمنٹ کا انتخاب آزادانہ ہوگا۔ پارلیمنٹ میں ہونے والی تقاریر، اور بحث مباحثہ کرنے کی آزادی ہوگی۔ ان کے بارے میں کسی عدالت کے اندر سوال نہیں کیا جائے گا اور نہ پارلیمنٹ سے باہر کوئی مواخذہ کیا جائے گا۔

(2)۔ پارلیمنٹ کے اجلاس بکثرت ہوا کریں گے۔

(3)۔ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر محصول لگانا غیر قانونی ہے۔

(4)۔ بادشاہ کا یہ اختیار کہ وہ ایکٹس آف پارلیمنٹ کو ختم کر سکتا ہے، غیر قانونی ہوگا۔

(5)۔ بادشاہ کے سامنے عرضی پیش کرنا رعایا کا حق ہے اور عرضی پیش کرنے پر استغاثہ کی کارروائی غیر قانونی ہوگی۔

(6)۔ معمول سے زائد ضمانت اور جرمانے نہیں ہونے چاہئیں اور ظالمانہ اور غیر معمولی سزائیں نہیں دی جانی چاہئیں۔

(7)۔ زمانۂ امن میں مستقل فوج رکھنا جو پارلیمنٹ کی مرضی کے بغیر ہو غیر قانونی ہے۔

كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ○ قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ [1]

(جب اللہ پاک نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا کہ کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خون ریزیاں کرے گا۔ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ فرمایا: میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔ اس کے بعد اللہ عزوجل نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تمہارا خیال صحیح ہے تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ! انہوں نے عرض کیا: نقص سے پاک تو صرف آپ کی ذات ہے۔ ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا آپ نے ہم کو دے دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آدم سے کہا کہ تم انہیں ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ جب اس نے ان کو ان سب کے نام بتا دیئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں جو تم سے چھپی ہوئی ہیں)

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ فرشتوں کی تقدیس و عبادت کے مقابلے میں انسانی علم کو لایا جا رہا ہے۔ علم دے کر آدم علیہ السلام کو فرشتوں سے فضیلت دی گئی۔ علم کو عبادت سے افضل قرار دیا جا رہا ہے۔ شرف آدم علیہ السلام قرار دیا جا رہا ہے۔ علم ہی اللہ تعالیٰ کا نائب بننے کے لیے لازم ہے۔ علم بھی اشیا کا دیا جا رہا ہے جو سائنس کا موضوع ہے، دینیات یا علم الکلام (scholasticism) کا نہیں ہے۔

اسلام کا آخری مرحلہ بھی علم سے شروع ہوا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو پہلی وحی وصول فرمائی وہ یہ تھی:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ○ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ○ اِقْرَاْ

[1] سورۃ البقرہ: آیت: 30-33

وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ○ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ○ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ [1]

(پڑھو! (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا۔ جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی۔ پڑھو! اور تمہارا رب بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔ انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا)

آپ دیکھ لیں کہ نبوت کی ابتدا سائنسی علوم کی طرف مائل کرنے سے ہو رہی ہے۔ خدا کی معرفت کے لیے علم حیاتیات (biology) کی دلیل لائی جا رہی ہے۔ پھر قلم کی عظمت بیان ہو رہی ہے۔ کائنات کی عام تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد خاص طور پر انسان کا ذکر کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس کمزور حالت سے اس کی تخلیق کی ابتدا کر کے اسے پورا انسان بنایا۔ یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے انسان کو صاحب علم بنایا جو مخلوقات کی بلند ترین صفت (virtue) ہے اور صرف صاحب علم ہی نہیں بنایا بلکہ اس کو قلم سے لکھنے کا فن سکھایا جو بڑے پیمانے پر علم کی اشاعت و ترقی کا ذریعہ بنا۔ اگر وہ الہامی طور (intuitively) پر انسان کو لکھنے کا فن نہ دیتا تو انسان کی ترقی رک جاتی اور علم اگلی نسلوں تک منتقل نہ ہوتا۔

فلسفہ مسلمانوں کا علم نہیں ہے۔ اسلام کی بعثت سے پہلے معلوم انسانی تاریخ کے عظیم ترین فلسفی یونان میں پیدا ہو چکے تھے۔ دنیا میں افلاطونی مثالیت (Platonic Idialism) ارسطو [2] کی منطق (Aristotlian Logic) وغیرہ کا غلبہ تھا۔ مسلمانوں نے فلسفہ کو کفر قرار نہ دیا بلکہ اس کی تعلیم حاصل کی۔ ابو نصر محمد بن محمد فارابی [3] (A bu Nasr Muhammad ibn Muhammad Al

---

[1] سورۃ العلق: آیت: 1-5

[2] ارسطو یونان کا ممتاز فلسفی، مفکر اور ماہر منطق تھا، جس نے سقراط اور افلاطون جیسے اساتذہ کی صحبت پائی اور سکندر اعظم جیسے شاگرد سے دنیا کو متعارف کروایا۔

[3] ابو نصر محمد الفارابی (872-950) ایک مشہور ریاضی دان، طبیب، فلسفی، سائنسدان، علم نجوم کا ماہر اور موسیقار تھا۔ اس کو ارسطو کے بعد دوسرا بڑا فلسفی بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے علم طبیعیات میں وجود خلاء پر اہم تحقیقات کیں۔ اس کے علاوہ ماہر عمرانیات، سیاسیات و موسیقیات بھی تھا۔ فارابی ارسطو اور افلاطون سے بے حد متاثر تھا۔ اس نے ارسطو کی اکثر کتابوں کی شروحات لکھیں، اسی وجہ سے اسے 'معلّم ثانی' بھی کہا جاتا ہے۔ ان شرحوں میں شرح ''ایساغوجی'' اور بطلیموس کی 'المجسطی' بہت مشہور ہیں۔

(Farabi, d. 950) پہلا مسلمان عالم تھا جو یونان کے فلسفہ کا شارع بنا اور تاریخ فلسفہ میں ارسطو (Aristotle, d. 322BC) کو معلم اول (first teacher) اور فارابی کو معلم ثانی (second teacher) کہا جاتا ہے۔

ہمارے علما نے فلسفہ یونان کو سمجھا۔ اس کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تا کہ مسلم دنیا میں پڑھا جا سکے اور پھر اس پر عالمانہ تنقید کی۔ امام غزالیؒ[1] (Abu Hamid Muhammad ibn Muhammad al-Ghazali, d. 1111) نے تہافتہ الفلاسفہ (فلسفیوں کی تباہی) لکھی۔ اس میں انہوں نے یونان کے فلسفہ پر سخت تنقید کی جس کا جواب یونان کے بجائے مسلم دنیا کے نامور فلسفی ابن رشد[2] (Averroes, d. 1198) نے دیا۔ ان کی کتاب کا نام تہافتہ التہافہ (تباہی کی تباہی) ہے۔ اس کے بعد امام ابن تیمیہؒ[3] (Taqi-ud-Din Ahmad ibn Taymiyya, d. 1328) نے فلسفہ یونانی پر کاری ضرب لگائی۔ اس شرح اور تنقید کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں نے فلسفہ یونان کو پڑھا۔ اسے آگے منتقل کیا لیکن اس سے مرعوب نہ ہوئے۔

یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یونان کے اس بے بہا علم کو مغرب تک پہنچایا۔ جرمن فلسفی کانٹ[4] (Kant, d. 1804) کی کتاب (Critique of Pure Reason) امام غزالیؒ al-Ghazali,

---

[1]۔ ابوالحامد محمد بن محمد الغزالیؒ (1058 - 1111) اسلام کے نہایت مشہور مفکر، صوفی اور متکلم تھے۔ آپؒ کی کتابوں میں احیاء العلوم الدین ایک بلند پایہ تصنیف ہے جو کہ ہر دور میں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی رہی ہے۔ آپؒ کا شمار مجدد دین امت میں ہوتا ہے۔ آپؒ نے اسلامی شریعت وتصوف کو غیر ضروری فلسفہ سے پاک کیا۔ آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ آپؒ نے فلسفہ کو دین بننے سے روکا۔

[2]۔ ابوالولید محمد ابن احمد ابن رشد (Averroes)، (1126-1198) ایک ماہر فلسفی، ریاضی دان، ماہر علم فلکیات، ماہر فن طب اور قانون دان تھا۔ ابن طفیل اور ابن اظہر جیسے مشہور عالموں سے دینیات، فلسفہ، قانون، علم الحساب اور علم فلکیات کی تعلیم حاصل کی۔ خلیفہ یعقوب یوسف کے عہد میں اشبیلیہ اور قرطبہ کا قاضی رہا۔

[3]۔ تقی الدین احمد ابن تیمیہؒ (1263-1328) اسلامی سکالر اور مفکر تھا۔ جس نے اپنی زندگی میں قلم اور تلوار دونوں سے جہاد کیا۔ انہوں نے تاتاریوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کی سرپرستی کی۔

[4]۔ Immanuel Kant: ایمانویل کانت (1724ء-1804ء) ایک جرمن فلسفی اور مشہور ترین مفکر تھا۔ کانٹ نے فلسفے کی دنیا میں انقلاب پیدا کیا۔ وقت کی حاکم قوتوں کے بارے میں سوال پیدا کیے۔ عقل اور آزادی کو اپنی سوچ کا محور قرار دیا۔ اسکے خیالات اب بھی مستقبل کے لیے مشعل راہ ہیں۔

(d. 1111) کے فلسفے کی شرح لگتی ہے۔یہی حال مسلمانوں نے ارسطو(Aristotle, d. 322BC) کی منطق کے ساتھ کیا۔مثالیت(Idealism) نے بھی عرب تجربیت(Empiricism) سے اثر قبول کیا۔ پھر کیا ہوا کہ مسلمان سو گئے اور پرانی کتب ہی مدارس میں پڑھاتے رہے جبکہ زمانہ وسطیٰ (Middle Period) کے بعد نئے فلسفے متعارف ہوئے جن کا ہم نے مطالعہ وتدارک نہ کیا۔تحریک اصلاح(Reformation)اور صنعتی انقلاب کے پیچھے نئی نئی سائنسز اور فلسفوں کا ظہور ہوتا رہا مگر مسلمان ان سے لا پرواہ رہے۔

مسلمان تخیلاتی (speculative)نہیں بلکہ عملی (practical) تھے۔قران پاک نے انسان کو تجربیت و مشاہدہ (observation) سکھایا۔قرآن پاک نے بار بار کہا: کیا تم آسمان نہیں دیکھتے؟ کیا تم زمین نہیں دیکھتے؟ کیا تم جانور نہیں دیکھتے؟ یہ وہ تعلیمات تھیں جنہوں نے مسلمانوں کو عملی سائنس کی طرف مائل کیا۔طبیعات میں ہم نے روشنی (light) کا مطالعہ کیا۔ ابوالہیثم[1] (Ibn al-Haytham, d. 1040) نے جدید فزکس کی بنیاد رکھی۔الخوارزمی[2] (al-Khwarizmi, d. 850) نے نویں صدی عیسوی میں دنیا کو جدید ریاضی کا علم دیا۔ابن سینا[3] (Avicenna, d. 1037)

---

[1]۔ابوعلی الحسن بن الہیثم، ابن الہیثم کے نام سے مشہور ہیں۔ابن الہیثم (965-1039) عراق کے تاریخی شہر بصرہ میں پیدا ہوئے۔وہ طبعیات، ریاضی، انجنیئرنگ، فلکیات اور علم الادویات کے مایہ ناز محقق تھے۔ان کی وجہ شہرت آنکھوں اور روشنی کے متعلق تحقیقات ہیں۔

[2]۔عبداللہ بن محمد بن موسیٰ خوارزمی (780ء-850ء) خوارزم سے تعلق رکھتے تھے۔آپ ریاضی اور فلکیات کے ماہر تھے۔ مشہورِ زمانہ کتاب الجبر والمقابلہ جسے انہوں نے لوگوں کے روزمرہ ضروریات اور معاملات کے حل کے لیے تصنیف کیا جیسے میراث، وصیت، تقسیم، تجارت، خرید وفروخت، کرنسی کا تبادلہ (ایکسچینج)، کرایہ، عملی طور پر زمین کا قیاس (ناپ)، دائرہ اور دائرہ کے قطر کا قیاس وغیرہ۔خوارزمی پہلے سائنسدان تھے جنہوں نے علم حساب اور علم جبرا کو الگ الگ کیا۔ الخوارزم (لاطینی میں جو الگورتھم بنا) آپ ہی کے نام سے ماخوذ ہے۔

[3]۔ابن سینا (980-1037) کا مکمل نام علی الحسین بن عبداللہ بن الحسن بن علی بن سینا ہے، جو دنیائے اسلام کے ممتاز طبیب اور فلسفی ہیں۔ابن سینا کو مغرب میں Avicenna کے نام سے جانا جاتا ہے۔ان کا لقب ''الشیخ الرئیس'' ہے۔اسلام کے عظیم تر مفکرین میں سے تھے اور مشرق کے مشہور ترین فلسفیوں اور اطباء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

وزہراوی[1](al-Zahrawi, d. 1013) نے جدید طب (میڈیسن) اور جراحت (سرجری) کی بنیاد رکھی۔ تفصیل میں جائے بغیر یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ مسلمان سائنسدانوں نے دنیا کو جدید سائنس دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تسخیر کائنات اور تسخیر ذات میں فرق نہ کرتے تھے۔ ان کے ہاں اس دنیا اور اس دنیا کی تفریق نہ تھی۔ وہ مادہ اور روح کی تقسیم کے قائل نہ تھے۔ وہ قدیم(old) وجدید(new) علم کی بحث کو بے خبری سمجھتے تھے۔ سائنسی علوم کی تحصیل سے مسلمان ٹیکنالوجی میں ماہر تھے۔ فرانس کے عظیم بادشاہ شارلیمان[2](Charlemagne, d. 814) کو گھڑی عباسی خلیفہ ہارون الرشید[3] (Harun al-Rashid, d. 809) نے بھجوائی تھی۔

پھر کیا ہوا؟ جو لوگ مافوق البشری رازوں کے امین، انسانی حقوق کے علمبردار اور جدید سائنس کے اصل خالق تھے خواب غفلت میں کھو گئے۔ وہ یونانی اثرات کی وجہ سے لا حاصل مذہبی بحثوں میں الجھ گئے۔ انہوں نے زندگی کو روحانی اور دنیاوی دائروں میں تقسیم کر دیا اور مادی ترقی وفروغ کو خلافِ اسلام تحریک قرار دینے لگے۔ انہوں نے فطری علوم (سائنسز) کو نظر انداز کر دیا اور ایسے جھوٹے تصوف کے نشے میں دھت ہو گئے جو خالص وجدانی اور باطنی درجہ بندی کے نظام کو تجربیت (empiricism) کے برعکس ہونے کا پرچار کرتا ہے جو کہ جدید سائنس کی حقیقی بنیاد ہے۔ وہ مذہبی رسوم کی بال کی کھال اتارنے اور لا حاصل مدرسانہ بحثوں میں الجھ گئے۔ جبکہ انہیں جدید دور کے چیلنجوں کا جواب دینے اور علم کی

---

[1]۔ ابوالقاسم خلف بن عباس الزہراوی (936ء-1013ء) اندلس سے تعلق رکھنے والے علم جراحت کے بانی، متعدد آلات جراحی کے موجد اور مشہور مسلم سائنسدان تھے۔ آپ کی مشہور کتاب التصریف لمن عجز عن التالیف ہے جو کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ الزہراوی صرف ماہر جراح ہی نہیں تھے بلکہ تجربہ کار طبیب بھی تھے، ان کی کتاب میں آنکھوں کے امراض، کان، حلق، دانت، مسوڑھے، زبان، عورتوں کے امراض، فنِ تولید، جبڑہ اور ہڈیوں کے ٹوٹنے پر تفصیلی ابواب موجود ہیں۔ الزہراوی نے ناسور کے علاج کے لیے ایک آلہ دریافت کیا۔ زہراوی وہ پہلے طبیب تھے جنہوں نے ہیموفیلیا نہ صرف دریافت کیا بلکہ اس کی تفصیل بھی لکھی۔ آپ کے ایجاد کردہ آلات جراحی آج تک استعمال ہوتے ہیں۔

[2]۔ شارلیمان: Charlemagne (742ء-814ء) فرانس اور روم کا بادشاہ تھا۔

[3]۔ ہارون الرشید (763-809ء) پانچویں اور مشہور ترین عباسی خلیفہ تھے۔ وہ 786 سے 24 مارچ 809ء تک مسند خلافت پر فائز رہے۔ ان کا دور سائنسی، ثقافتی اور مذہبی رواداری کا دور کہلاتا ہے۔ ان کے دور حکومت میں فن وحرفت اور موسیقی نے بھی عروج حاصل کیا۔

سرحدوں کو آگے بڑھانے کے لئے سنجیدہ ذہنی کاوشیں کرنے کی ضرورت تھی۔ وقت نے ان کا انتظار نہیں کیا اور وہ قوموں کی برادری سے بہت پیچھے رہ گئے۔

عہد اول اور عہد متوسط میں مسلمانوں نے اپنی ذات و کائنات کو بدل ڈالا۔ اس لیے کہ وہ اس کی امنگ رکھتے تھے۔

گر بر فلکم دست بُدی چون یزدان
برداشتمی من این فلک را ز میان
از نو فلکی دگر چنان ساختمی
کازاده بکام دل رسیدی آسان[1]

(اگر مجھے قدرت ہوتی جیسی کہ خدا کو حاصل ہے میں اس آسمان (حالاتِ دنیا) کو درمیان سے ہٹا دیتا اور آسمان کو ایسا بنا دیتا کہ میرے دل کی تمنا پوری ہو جاتی)

بیا تا گل برافشانیم و می در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشکافیم و طرحی نو در اندازیم[2]

(آئیں کہ ہم پھول بچھائیں اور شراب پیالوں میں ڈالیں)
(آسمان کی چھت کو توڑ ڈالیں اور نئی دنیا بنائیں)

جب تک یہ امنگ رہی وہ نئی کائناتیں تخلیق کرتے رہے اور پھر یوں ہوا کہ

بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے[3]

---

[1]۔ رباعیات از عمر خیام

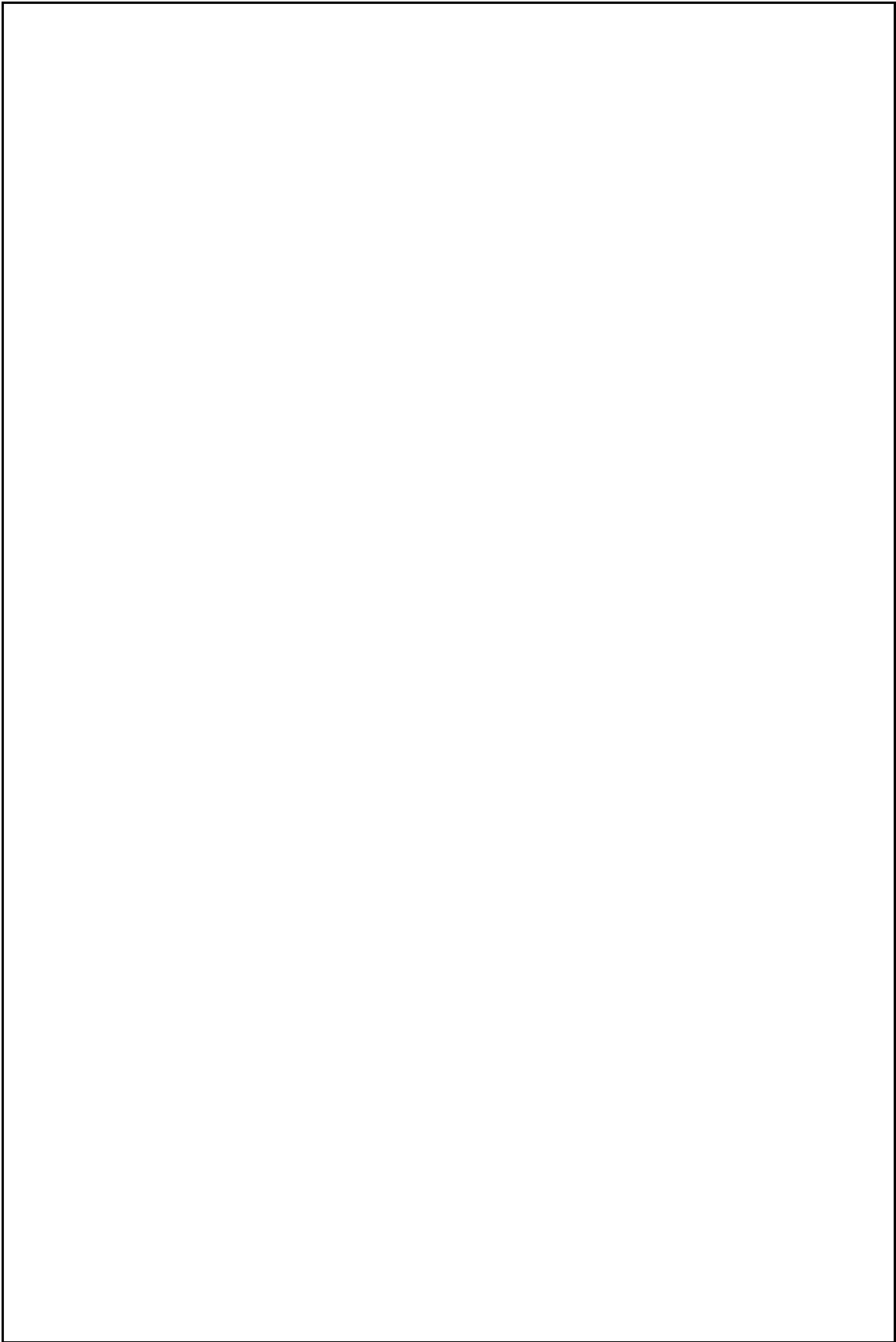
[2]۔ دیوان حافظ از حافظ شیرازیؒ۔ غزل شمارہ 374؛ بیا تا گل برافشانیم و می در ساغر اندازیم

[3]۔ ساقی نامہ؛ بالِ جبریل از محمد اقبالؒ

تیسرا باب

ہم پر مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے





ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غمِ الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں[1]

اسلام نے تمام شعبہ ہائے حیات میں رہنمائی کرکے انسان کو بے شمار فوائد سے ہمکنار کیا۔ اسلامی سکالرز نے تخلیقی ذہانت کو بروئے کار لاکر کارہائے نمایاں کرنے کے علاوہ قدیم یونانی اہل دانش کے بیشتر اہم سائنسی اور فلسفیانہ متون کو بھی عربی تراجم کے ذریعے محفوظ کرلیا۔ مسلمان دانشوروں نے یونانی علوم کے ڈھانچے اور ساخت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں متعدد ایسے اہم اضافے کیے جو رومن عہد میں بھی برقرار رہے۔ مسلمانوں نے بارہویں اور تیرہویں صدی میں ان تصانیف کے بیشتر حصے کا لاطینی زبان میں جو ترجمہ کیا اس نے یورپی نشاۃ ثانیہ کی بیداری میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ بارہویں صدی عیسوی کے واقعات اس امر کے گواہ ہیں کہ مسلمانوں کے علوم وفنون بڑے پیمانے پر تراجم کے ذریعے مغرب میں مقبول ہو رہے تھے۔ جب اسلامی دنیا میں حالات خراب ہوئے تو ان تراجم نے ہی یورپ کو مسلمانوں کی پیش قدمی روکنے میں ان کی مدد کی۔ امریکی مؤرخ اور فلاسفر وِل ڈیورانٹ[2] (Will Durant, d.

---

[1] ۔رقیب سے از فیض احمد فیض۔
یہ اشعار فیض احمد فیض کی مخصوص طرز کی شاعری کی مظہر ایک نظم 'رقیب سے' کا حصہ ہیں۔ جس میں ایک شخص نے ایک دوسرے شخص کو جو اسی عورت کی محبت میں گرفتار ہے جس کا یہ خود بھی اسیر ہے، مخاطب کیا ہے۔ Faiz Ahmed Faiz؛ فیض احمد فیض (1911ء-1984ء) اردو ادب کے ترقی پسند شاعر تھے۔ اس نظم میں 'رقیب' ان روایتی مسلمانوں میں سے ایک ہے جو اسلام کا ایک بہت محدود دقیانوسی تصور رکھتے ہیں۔ میں اپنے رقیب کے قدامت پسندانہ اور اذعانی نظریات کو اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے انسانیت پر اسلام کے احسانات شمار کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

[2] ۔William James "Will" Durant؛ ولیم جیمز ڈیورانٹ (1885ء۔ 1981ء) ایک امریکی مصنف، مورخ اور فلسفی تھا۔ اس نے فلسفے کا ایک کلی تناظر میں تصور قائم کیا اور تاریخ کے وسیع علم کو یکجا کرنے اور انسان دوست بنانے کی کوشش کی۔ اسے سب سے زیادہ شہرت اس کی کتاب 'The Story of Civilization' سے ملی جو 11 جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اس نے اپنی بیوی ارائیل ڈیورانٹ کے تعاون سے لکھی۔

1981) کے مطابق 700ء سے 1200ء تک پانچ صدیوں کے دوران اسلام دنیا کو قوت واقتدار، نظم وضبط، طرز حکمرانی، آداب معاشرت، علم وفضل اور فلسفے کے فروغ میں رہنمائی فراہم کرتا رہا۔

انسانی تہذیب پر اسلام کے اثرات کو اخلاقی اثرات اور ذہنی اثرات میں منقسم کر کے پیش کیا جاسکتا ہے۔ دونوں حصوں کا محتاط تجزیہ، اسلامی ثقافت کی ترقی اور برتری کے حقائق سامنے لاتا ہے۔

1۔ اخلاقی اثرات

زندگی بہت اہمیت رکھتی ہے اور اس کی اقدار اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ اقدار رہنما اصول یا طرز عمل کا معیار ہیں جنہیں ایک مہذب اور منصف معاشرہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہ وہ اصول ہیں جنہیں ہم دیگر افراد کے ساتھ، اپنے دوستوں کے ساتھ اور اپنے خاندان کے ساتھ تعامل کے لئے بروئے کار لاتے ہیں۔ یہ ان بستیوں اور گروہوں کے ساتھ بھی ہمارے طرز عمل کی رہنمائی کرتے ہیں جن میں ہم رہتے ہیں۔ جن کے ہم ممبرز ہیں۔ جن کے ساتھ ہم تجارت کرتے ہیں اور ایک پیشہ ورانہ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اخلاقیاتی اقدار، اخلاقی معیاروں، اخلاقی ذمہ داری اور اخلاقی شناخت کے تصورات کی حامل ہوتی ہیں۔ اخلاقی معیارات، طرز عمل کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں۔ اخلاقی ذمہ داری ہمارے ضمیر کا حوالہ دیتی ہے اور اخلاقی شناخت اس امر کا حوالہ دیتی ہے کہ کون صحیح یا غلط اقدام کرنے پر قدرت رکھتا یا رکھتی ہے۔ جب ان خیالات کی انسانوں کے ساتھ تجسیم کی جائے تو وہ مندرجہ ذیل کے کام کرتے ہیں:

- افراد کے مابین معقول رویےّ اور ہم آہنگی کی ضمانت دیتے ہیں۔
- ہمیں اچھے لوگ بننے میں مدد دیتے ہیں تاکہ ہم ایک اچھا معاشرہ تشکیل دے سکیں۔
- ہمارا اس قادر مطلق کے ساتھ اچھا تعلق قائم کراتے ہیں جس نے ہمیں تخلیق کیا۔

اخلاقیاتی اقدار زندگی کے ہر فلسفے کا جوہرِ حقیقی ہیں۔ ایک چینی محاورہ ہے کہ اگر دل میں سچائی ہو تو کردار میں حسن پیدا ہو جائے گا۔ اگر کردار میں حسن ہو گھر میں یگانگت پیدا ہو جائے گی۔ گھر میں یگانگت ہو گی تو قوم میں نظم وضبط پیدا ہو جائے گا۔ جب قوم میں نظم وضبط ہو گا تو دنیا میں امن ہو جائے گا۔

اسلام نے انسانی زندگی میں اقدار کی غیر معمولی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کیا ہے۔ اس نے نہ صرف سابق مذاہب کی پیش کردہ اخلاقی اقدار کی توثیق کی ہے بلکہ ان میں گہرائی اور حُسن کا اضافہ بھی کیا

ہے۔اس نے ان کے لئے روحانی بنیاد فراہم کی اور اعلیٰ وارفع اقدار کے لئے فطری وتخلیقی تحرک بھی فراہم کیا۔اسلام نے انسانی نفسیات کو گہرائی میں جا کر چھیڑا ہے تا کہ اسے نہ صرف غصے، حسد، حرص اور دیگر منفی انسانی صفات کے تاریک سایوں سے صاف کیا جا سکے بلکہ صبر، محبت، رحم، ایثار اور ذاتی وقار کی روشنی سے منور بھی کیا جا سکے۔

(1)۔ خوفِ خدا

اسلامی انقلاب کا انسانی وجود کے نفسیاتی اور معاشرتی پہلوؤں پر گہرا اور دائمی اثر ہوا تھا۔اسلام سے پہلے فلسفے اور مذہب نے (عیسائیت کے علاوہ) انسانی زندگی پر کوئی زیادہ گہرا اثر نہیں ڈالا تھا۔عمومی بات کی جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ انفرادی اور معاشرتی زندگیاں مذہب یا فلسفے سے زیادہ متاثر نہیں ہوئی تھیں۔

زیادہ تر لوگ یہ سمجھتے تھے کہ خدا کائنات کو تخلیق کرنے کے بعد دنیاوی معاملات سے لاتعلق اور لا پرواہ ہو گیا ہے۔ان کے دل یا تو خدا کے خوف اور محبت سے خالی ہو گئے تھے یا خدا کا خوف اور محبت ان کی زندگیوں کو سنوارنے کے لئے قابل عمل تخلیقی قوتیں نہیں تھیں۔یونانی فلسفے کی زیادہ تر تعلیمات میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں ایک منفی تصور پایا جاتا تھا اور وہ کبھی کبھار ہی خدا کی بے پایاں محبت، رحم اور معافی کا ذکر کرتے تھے۔تاریخ بتاتی ہے کہ بے ہنگم تصورات اور غیر صحت مند رویوں پر کسی مثبت ثقافت و تہذیب کی عمارت نہیں کھڑی کی جا سکتی۔

اسلام نے بنی نوع انسان کو یونانی فلسفے کی مہلک معلومات اور بیمار ولاغر عرفان (Gnosticism) سے نجات دلا کر ایسے خدا سے متعارف کرا دیا جو جسم وروح میں سرایت کر جاتا ہے اور وہ خون کے ہر قطرے کے اندر محسوس ہوتا تھا۔اسلام کا خدا نہایت مہربان اور رحم کرنے والا۔رزق دینے والا۔حفاظت کرنے والا۔سلامتی عطا کرنے والا۔اور جل جلالہٗ کی شان رکھتا ہے۔ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنے اندر اس کی صفات پیدا کریں۔خود کو اس کے رنگ میں رنگ لیں کیونکہ وہ بہترین رنگ رکھتا ہے[1]۔

تصور یہ ہے کہ خدا پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔وہی قطعی طور پر اس کو چلاتا ہے اور یہ کہ اسی نے شعورِ زندگی عطا کیا ہے اور وہ ایک زندہ حقیقت ہے۔خدا پر ایمان لانا انسانی زندگی کے لئے لازمی

---

[1]۔سورۃ البقرہ: آیت: 138 (صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ کا رنگ اختیار کرو۔اس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟ اور ہم اسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں)

اور خلقی ہے۔ یہ ایمان ان کی رگوں میں حیات آفریں خون کی طرح گردش کر رہا ہے اور ان کے دل و دماغ کو منور کر رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک متقی و پرہیزگار اور باوقار تصور انسانیت ابھرا ہے، جو ان کے شعور اور محبت کے اندر سرایت کر گیا ہے۔ قرآن اس کا اظہار یوں کرتا ہے۔

(ا)۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى[1]

(اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا)

(ب)۔ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا[2]

(صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں)

(ج)۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ[3]

(درحقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے)

حضور نبی کریم ﷺ نے اسی شعور کی وضاحت فرمائی، جب ایک بار ایک شخص نے آپ ﷺ سے پوچھا: اے رسولِ خدا ﷺ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں یہ نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ عزوجل سے ڈرو کیونکہ یہ ہر چیز کا منبع ہے۔

(2)۔ اخلاقی جرأت

روحانی جرأت نے ایک مومن کو روحانی شعور اور غیر معمولی قوتِ ارادی عطا کر دی اور اسے محاسبۂ نفس کے تصور سے بھی مسلح کر دیا تاکہ وہ اپنی غلطیوں اور ناکامیوں کی اصلاح کے لئے کوشاں رہے۔ یہ ایک مسلسل مشق کا عمل ہے۔ اسے 'نفسِ لوامہ'[4] کہا جاتا ہے۔ (یہ ہمیشہ توبہ کرتے رہنے کا شعور ہے)۔ جب بھی مومن سے کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے، یہ اسے کچوکے لگاتا ہے اور اسے تاریک گوشے میں بیٹھے ہوئے بھی برائی کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے۔ اس شعور نے لوگوں کو اس بات کے لئے بھی تیار کر دیا کہ وہ

---

[1]۔ سورۃ النازعات: آیت:40

[2]۔ سورۃ فاطر: آیت:28

[3]۔ سورۃ الحجرات: آیت:13

[4]۔ انسانی ضمیر جو انسان کو غلط کاموں پر ملامت کرتا ہے، نفس لوامہ کہلاتا ہے۔

اعتراف گناہ کر کے خود کو سزا کے لئے پیش کر دیں۔ اس محاسبۂ ذات نے ان میں اخلاقی جرأت پیدا کر کے راست بازی اور لائق بھروسہ ہونے کے اعلیٰ ترین معیارات قائم کر دیئے۔ اس طرح لوگوں میں ایسا تقویٰ اور حسنِ اخلاق پیدا ہوا جو نجی زندگی اور باہر کے معاملات میں ہر جگہ یکساں طور پر موجود رہا۔ چنانچہ انسانوں کے لئے یہ ناممکن ہو گیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ دوسری قوتوں کے سامنے سر جھکائیں۔ بادشاہ، علماء اور رؤساء سب نے اللہ عزوجل کی عاجز مخلوق جیسے رویئے اپنا لیے۔ اللہ پاک کی عظمت اور جلالت نے بنی نوع انسان کو ان سب زمینی خداؤں کے شکنجے سے آزاد کرا دیا۔ تمام دنیاوی حُسن اور شاہی درباروں کی شان وشوکت اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے ماند پڑ گئی۔

تاریخ نے یہ بھی دیکھا کہ عرب فاقہ کش قیصر وکسریٰ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے لگے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے رستم ایران (ایران کا سپہ سالار) کے پاس حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا۔ جب وہ رستم کے دربار میں پہنچے تو دربار سجا تھا۔ تاج وتخت تھا۔ ریشم وحریر تھا۔ یاقوت ومرجان تھے۔ یہ اللہ والا غربت کے ہاتھوں تنگ تھا۔ مختصر سا لباس تھا۔ نیم مردہ سا گھوڑا تھا۔ محل میں وہ گھوڑے سے نہیں اترے۔ مخمل وکمخواب (velvet) کے فرش پر چلتے گئے۔ حتیٰ کہ گھوڑے کو دربار کے گاؤ تکیہ سے باندھ دیا۔ نیزے کو فرش پر مارتے مارتے رستم تک پہنچے[1]۔ ارشاد فرمایا:

ہم کو اللہ پاک نے اس لیے بھیجا ہے کہ جس کے بارے میں اس کی مرضی ہو اس کو بندوں کی بندگی سے نجات دلا کر اللہ تعالیٰ کی بندگی میں داخل کریں۔ دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعتوں میں پہنچا دیں اور مذاہب کی زیادتیوں سے بچا کر اسلام کے عدل میں لے آئیں[2]۔

اعلیٰ ترین راستبازی، دنیاوی مال ومتاع سے بے اعتنائی، اللہ تعالیٰ سے محبت اور آخرت کی تمنا نے مسلمانوں کو حق گو اور جرأت مند بنا دیا۔ وہ جنت کی محبت سے سرشار تھے۔ جس کی وجہ سے وہ دنیا کی زندگی اور اس کی مادی اشیا کو حقارت ونفرت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہیں اسلام کے اعلیٰ تصورات اتنے مرغوب تھے کہ وہ گرد وپیش کی دنیا سے بے گانہ ہو گئے۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی[3]

---

[1]۔ تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) از امام ابی جعفر محمد بن جریر طبریؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ نمبر 701

[2]۔ تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) از امام ابی جعفر محمد بن جریر طبریؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ نمبر 702

[3]۔ طارق کی دعا (اندلس کے میدان جنگ میں)؛ بال جبریل از محمد اقبالؒ

(3)۔ تمنّائے موت

غزوہ احد میں حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ شریک تھے۔ایک موقع پر دشمن کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو سامنے دیکھا تو فرمانے لگے کہ

اے سعد (رضی اللہ عنہ)! خدا کی قسم جنت کی خوشبو احد پہاڑ کے اس طرف سے آ رہی ہے۔حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے اسی (80) سے زیادہ زخم ان کے جسم پر پائے۔جسم ٹکڑے ٹکڑے تھا۔جس کی وجہ سے ان کی کوئی شناخت نہ کر سکا۔ان کی بہن نے ان کی انگلی کے پور سے شناخت کیا[1]۔

غزوہ بدر میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بڑھو! اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین و آسمان ہے۔تو حضرت عمر بن حمام انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا: یا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اس کی وسعت زمین و آسمان ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں! کیا تم کو شک ہے؟ کہنے لگے نہیں۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میری تمنا تھی کہ میں اس کو پالیتا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! ہاں! آپ اس کو پالو گے۔وہ چند دانے کھجور نکال کر کھانے لگے۔پھر فرمانے لگے: اگر ان کھجوروں کے کھا لینے کا انتظار کروں گا تو بہت سا وقت لگے گا۔پھر تمام کھجوروں کو پھینک دیا اور میدان میں کود پڑے اور شہادت پائی[2]۔

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست
زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے[3]

(4)۔ قبولِ اطاعت

اس پاکیزہ فکر نے انسان کو مکمل سپردگی (resignation) عطا کی۔اپنی ذاتی خواہشات سے دستبردار ہو کر وہ اللہ تعالیٰ کے غلام بن گئے۔اپنی جان و مال کو اس کے سپرد کر دیا۔جنگ اسی کے لیے، صلح اسی کے لیے۔محبت اسی کے لیے۔نفرت اسی کے لیے۔ایمان کا ایک لمحہ ان کی کایا پلٹ دیتا تھا۔اچھی چیز بری بن جاتی تھی۔بری چیز اچھی بن جاتی تھی۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت اللہ شریف کا طواف کر رہے تھے۔فضالہ بن عمیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کے ارادے سے آیا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: فضالہ کیا کرنے آئے ہو؟ اس نے کہا کہ کچھ

---

[1]۔صحیح بخاری۔جلد دوم: رقم:79

[2]۔سنن کبریٰ للبیہقی۔جلد نہم: رقم:4071

[3]۔امامت؛ ضربِ کلیم از محمد اقبالؒ

نہیں۔آپ ﷺ نے تبسم فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے توبہ کرو۔ پھر آپ ﷺ نے اپنا دست مبارک اس کے سینے پر رکھا۔فضالہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کا ہاتھ جیسے ہی سینے سے اٹھا آپ ﷺ مجھ کو ایسے محبوب لگنے لگے کہ دنیا میں سب سے زیادہ محبوب۔ واپسی پر مجھے وہ عورت ملی جس سے دل لگی کرتا تھا۔ اس نے کہا کہ آؤ باتیں کریں۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اسلام کے بعد اب اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے[1]۔

(5)۔ معرفت(Gnosis)

انسان کو خدا اور اس کی صفات سے آگاہی حاصل ہونے، زندگی کی ابتدا اور انتہا کا گہرا شعور حاصل ہونے اور صحیح زندگی گزارنے کا واضح لائحہ عمل معلوم ہونے سے حقیقت کا وجدانی علم حاصل ہو گیا۔ بنی نوع انسان کو کسی اور فلسفے یا دین کی تلاش کے لئے غیر متعلقہ اور لا حاصل کوششوں سے نجات دلا دی۔ اس کی قوت اور توانائی ضائع ہونے سے محفوظ ہوگئی۔اس طرح اسے بلند مقاصد کے حصول کی جدوجہد کے لئے وافر وسائل دستیاب رہے۔مسلمانوں نے اپنی ان توانائیوں کو اپنے دنیا کے مسائل اور دینی امور کی تکمیل کے لئے استعمال کیا اور ایک حیرت انگیز تہذیب پیدا کر لی جس نے اس کی اخلاقی قدروں اور مادی سہولتوں کو یکجا کر دیا۔

معرفت الٰہی دو قسموں کی ہے۔'علمی'(cognital) اور'حالی'(emotional) اول الذّکر یعنی'علمی معرفت'اس دنیا اور آخرت کی تمام نعمتوں کی بنیاد ہے۔اللہ تعالیٰ قرآن پاک فرماتا ہے:

وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ [2]

(نصیحت کرتے رہو، کیونکہ نصیحت ایمان لانے والوں کو فائدہ دیتی ہے)

معرفت اللہ تعالیٰ کے ذریعے زندگی ہے۔ یہ اپنے انتہائی داخلی خیالات کو اللہ عزوجل کے سوا (غیر اللہ) سے ہٹا لینے کا نام ہے۔ ہر شخص کی قدر و قیمت اسے حاصل معرفت کے تناسب سے ہے۔ جسے معرفت حاصل نہیں وہ بالکل ناچیز ہے۔معرفت، دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے قلوب انسانیت کے لئے روحانی روشنی کی ترسیل ہے۔اللہ عزوجل از راہِ عنایت و کرم انسان کے دل کو منور کر دیتا ہے اور اس کو مخلوق

---

[1]۔زاد المعاد از حافظ ابن قیمؒ۔جلد 2 صفحہ نمبر 232

[2]۔سورۃ الذاریات: آیت:55

کی آلائشوں سے صاف رکھتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے دل میں ان چیزوں کی قیمت رائی کے دانے کے برابر بھی نہیں[1]۔

(6)۔ اجتماعی ذمہ داری

اسلامی شعور واحساس نے اجتماعی ذمہ داری کا تصور دیا ہے۔ اسلام اور بیشتر دیگر مذاہب میں فرق یہ ہے کہ اس نے صرف عبادات کرنے اور معاشرتی ذمہ داریاں دنیاوی حکمرانوں پر چھوڑ دینے کا حکم دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے طریق ہائے عمل، باہمی تعلقات، فرد بمقابلہ خاندان و معاشرہ وقوم اور مابینِ اقوام، حقوق اور ذمہ داریوں کا بھی احساس دلایا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید اعلان کرتا ہے:

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ[2]

(اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں)

اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ[3]

(تم نے اس شخص کو دیکھا ہے جو آخرت کی جزاوسزا کو جھٹلاتا ہے۔ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے کی ترغیب نہیں دیتا)

حضور نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مومن بندوں کی مثال ان کی آپس میں محبت اور اتحاد اور شفقت میں جسم کی طرح ہے کہ جب جسم کے اعضاء میں سے کسی عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو اس کے سارے جسم کو نیند نہیں آتی اور بخار چڑھ جانے میں اس کا شریک ہوجاتا ہے[4]۔

حضور نبی کریم ﷺ نے اسلام کے اس بنیادی امتیاز کو واضح کرنے کے لئے ارشاد فرمایا:

---

[1]۔ کشف المحجوب از حضرت علی بن عثمان ہجویریؒ منقولہ حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ۔ صفحہ نمبر 255

[2]۔ سورۃ التوبہ: آیت: 71

[3]۔ سورۃ الماعون: آیت: 1-3

[4]۔ صحیح مسلم۔ جلد سوم: رقم: 2085

آ گاہ رہو! تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحت کے بارے میں جوابدہ ہے۔ پس وہ امیر جو لوگوں پر نگہبان بنایا گیا ہے (روز قیامت) اس سے لوگوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا۔ عورت اپنے شوہر کے مکان اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا۔ خادم اپنے آقا کے مال کا نگہبان ہے اور تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحت کے بارے میں جواب دہ ہے[1]۔

حضور نبی کریم ﷺ نے اس فرض کی ایک بڑی خوبصورت وضاحت کی ہے کہ معاشرہ ہر ایک فرد کے رویئے کے بارے میں جوابدہ ہے۔ ارشاد مبارک ہے کہ

اس شخص کی مثال جو اللہ تعالیٰ کی حدود پر قائم ہے اور اس شخص کی جو اللہ تعالیٰ کی حدود میں پڑنے والا (اللہ عزوجل کے حکم کے خلاف ورزی کرنے والا) ہے۔ اس قوم کی سی ہے جو ایک جہاز میں بیٹھے ہوں۔ قرعہ سے جہاز کی منزلیں تقسیم کر لی جائیں۔ کچھ لوگ اوپر والی منزل میں ہوں اور کچھ نیچے والی منزل میں ہوں۔ جب نیچے والوں کو پانی کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ جہاز کے اوپر والے حصے میں جا کر پانی لیتے ہیں۔ اگر وہ یہ خیال کر کے کہ ہمارے بار بار اوپر جانے سے اوپر والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے ہم اپنی نچلی منزل میں ایک سوراخ سمندر میں کھول لیتے ہیں تا کہ پانی لے سکیں۔ اگر اوپر والے نیچے والوں کو اس احمقانہ تجویز سے نہیں روکیں گے تو جہاز غرق ہو جائے گا اور دونوں گروہ ڈوب جائیں گے۔ اگر ان کو روکیں گے تو دونوں بچ جائیں گے[2]۔

ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم ظالم اور مظلوم دونوں کی مدد کریں۔ مظلوم کی مدد اس طرح کہ اسے تشدد سے بچا لیں اور ظالم کی مدد اس طرح کہ اسے ظلم کرنے سے باز رکھیں۔ حضور نبی پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] سنن ابوداؤد۔ جلد دوم: رقم: 1161

[2] صحیح بخاری۔ جلد اول: رقم: 2393

اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہے یا مظلوم ہے۔ لوگوں نے پوچھا: اے رسول اللہ ﷺ! اگر وہ مظلوم ہے تو اس کی مدد کرنا صحیح ہے۔ ہم ایک ظالم کی مدد کس طرح کریں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اسے دوسروں پر ظلم کرنے سے روک کر[1]۔

(7)۔ عشق کا نقطۂ ارتکاز

بنی نوع انسان نے حضور نبی کریم ﷺ کی ذات میں اپنے لئے ایک 'رول ماڈل' (عملی نمونہ) پالیا تھا جو ان کی دائمی محبت و عقیدت کا مرکز تھا۔ محبت ایک ملکوتی جذبہ اور ایک تند و تیز قوت ہے جو اس مادی دنیا میں ہزاروں طریقوں سے اپنا اظہار کر لیتی ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو اپنا ایک تاثر نہ رکھتی ہو۔

یہ جذبۂ عشق دنیاوی جاہ و حشمت اور چمک دمک میں گم ہو گیا۔ انسانیت صدیوں ایک ایسے انسانی پیکر سے محروم رہی جو اس کی محبت و عقیدت کا مرجع و مرکز بن سکتا تاوقتیکہ اسے حُسن، قوت و وقار کا نمونۂ کامل محمد رسول اللہ ﷺ کی شکل میں دکھائی دے گیا۔ جو بنی نوع انسان کی توجہ اور محبت کا نقطۂ ماسکہ بن گیا تھا۔ جس کسی نے اسے دور سے دیکھا وہ آپ ﷺ کی شخصیت کے سحر سے مرعوب و مغلوب ہو گیا اور جب اس نے قریب آ کر شرفِ ملاقات حاصل کیا تو آپ ﷺ کا شیدا بن گیا۔

میرا دل چاہتا ہے کہ میں حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ کی ایک شاندار نعت کے اشعار درج کروں جو میری رائے میں حقیقت کے قریب تر ہیں:

بَلَغَ العُلیٰ بکمَالِہِ
کَشَفَ الدُجیٰ بجمالِہِ
حَسُنَت جمِیع خِصَالِہِ
صَلُّوا عَلیہِ وآلِہِ

(انسانی عظمت آپ ﷺ کی ذات میں اپنے کمال تک پہنچی)
(آپ ﷺ کے حسن و کمال کی روشنی سے اندھیرے چھٹ گئے)
(آپ ﷺ میں تمام اعلیٰ انسانی خوبیاں تھیں)
(اللہ عزوجل آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کی آل پر سلام بھیجتے ہیں)

---

[1]۔ صحیح بخاری۔ رقم: 624

مرزا غالب نے بھی خوب کہا ہے:

حق جلوہ گر زطرزِ بیانِ محمد ﷺ است

آرے کلامِ حق بزبانِ محمد ﷺ است

(حضور نبی کریم ﷺ کے بیان میں ذات خداوندی جلوہ گر ہے)

(واقعی کلام حق حضور ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہوتا ہے)

غالب ثنائے خواجہ بہ یزدان گزاشتم

کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد ﷺ است

(غالب ہم حضور نبی کریم ﷺ کی تعریف کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑتے ہیں)

(اس لیے کہ صرف وہی ذات ہے جو محمد ﷺ کا مرتبہ جانتی ہے)

ایک انصاری عورت جس کا باپ، بھائی اور شوہر احد کے دن رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے اور شہید ہو گئے تھے۔ اسے خبر ملی تو وہ اپنے بیٹوں کی بجائے گھر سے نکل کر پوچھنے لگی: رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟ لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے خیریت سے ہیں۔ اس نے کہا میں آپ ﷺ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس نے جب آپ ﷺ کو دیکھ لیا تو بولی: اگر آپ ﷺ سلامت ہیں تو دنیا کی ہر مصیبت ہیچ ہے[1]۔

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو پھانسی کے تختہ پر چڑھایا گیا۔ سب کہنے لگے کہ کہو یہ پسند ہے کہ (نعوذ باللہ) محمد ﷺ تمہاری جگہ ہوں؟ انہوں نے کہا کہ اللہ عزوجل کی قسم میں اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ آپ ﷺ کے پاؤں مبارک میں کانٹا بھی چبھے اور میں چھوڑ دیا جاؤں۔ وہ سب ہنس دیئے[2]۔

حضرت عروہ بن مسعود ثقفی (کفار مکہ کا سفیر) نے حدیبیہ سے واپسی کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہا: اے لوگو! خدا کی قسم، میں نے بہت سے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں۔ قیصر و کسریٰ کے دربار دیکھے ہیں۔ نجاشی[3] کا دربار بھی دیکھا ہے۔ خدا کی قسم! میں نے ایسا بادشاہ نہیں دیکھا جس کے ساتھی اس کی اتنی عزت کرتے ہیں جتنی محمد ﷺ کے ساتھی محمد ﷺ کی۔ خدا کی قسم! جب وہ تھوکتے ہیں لوگ اس

---

[1]۔ شرح حدیث مشکوٰۃ شریف۔ جلد اول: رقم: 6

[2]۔ تاریخ الامم والملوک (تاریخ طبری) از امام ابی جعفر محمد بن جریر طبریؒ۔ جلد 4 صفحہ نمبر 63

[3]۔ نجاشی زمانہ قدیم میں حبشہ موجودہ ایتھوپیا کے بادشاہ کا لقب تھا۔

کو اپنے جسم پر مل لیتے ہیں۔ جب وہ ان کو حکم دیتے ہیں تو وہ سب ان کے حکم پر لپکتے ہیں۔ جب وہ وضو کرتے ہیں تو اس کے پانی پر لڑتے لڑتے رہ جاتے ہیں۔ جب بات کرتے ہیں تو لوگ اپنی آوازیں پست کر لیتے ہیں۔ وہ لوگ فرطِ ادب سے آپ ﷺ پر گہری نظر نہیں ڈال سکتے[1]۔

انسانیت کے اپنی محبت کے اظہار کے لیے ایک نقطہ مل گیا تھا۔ جہاں وہ اپنے اعلیٰ جذبات قربان کر سکتے تھے۔ فطری جذبے کی تسکین کر سکتے تھے۔ جذباتی انتشار (dispersion) سے بچ گئے۔ پاکیزگی اور لطف و عنایت نے ایک عمدہ شکل دیکھی۔ محبت و اطاعت کی نئی روایات قائم ہوئیں۔ محبت کے تخلیقی عمل سے کمالات نے جنم لیا۔ لازوال نقوش جنم لینے لگے۔ محبت فاتح عالم بنتی چلی گئی۔ حضرت اقبالؒ نے کیا صحیح ارشاد فرمایا ہے:

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے[2]

(مسلمانوں کا رہنما وہ شخص ہوسکتا ہے جس کی نگاہ بلند ہو۔ جس کا سخن دلنواز ہو۔ جان پرسوز ہو یعنی وہ عشق رسول ﷺ میں فنا ہو چکا ہو)

(8)۔ شخصی وقار

نفسیاتی اور اخلاقی عوامل نے انسانی طرزِ عمل اور رویوں کو نئی تبدیلیوں سے آشنا کر دیا۔ بنی نوع انسان کو حیاتِ نو مل گئی اور اس کی عزت و احترام بحال ہو گیا۔ ایک عظیم انسان دوست انقلاب نے عرب قوم کی کایا پلٹ کر رکھ دی جو اس وقت تک انتہائی پسماندہ اور جاہل قوم شمار ہوتی تھی۔ عمر جو ایک چرواہا ہوتے تھے اس تعلیم اور تربیت کی بدولت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بن گئے اور اپنی غیر معمولی شخصیت کی وجہ سے دنیا کو حیران کر دیا۔ تقویٰ (پرہیزگاری اور خدا خوفی) اور انتظامی قابلیت کے لئے وہ ایک نمونۂ عمل بن گئے۔ خالد بن ولید ایک عام نوجوان تھے جنہوں نے بعد میں روم فتح کیا اور سیف اللہ (حضرت خالد بن

---

[1]۔ زادالمعاد از حافظ ابن قیمؒ۔ جلد دوم۔ صفحہ 125

[2]۔ غزل؛ بالِ جبریل از محمد اقبالؒ

ولید رضی اللہ عنہ کا لقب) کہلانے لگے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نہایت نرم دل انسان تھے لیکن انہوں نے ہرقل کو شام سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ایک عام دانش مند انسان تھے وہ گورنرِ مصر بن گئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ایک عام آدمی تھے جنہوں نے جنگ مدائن میں عراق اور ایران، دونوں کو فتح کر لیا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جو ایک غلام خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنے ملک ایران کے حکمران بن گئے لیکن ایک جھونپڑی میں رہتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک چھوٹے قد کے آدمی تھے ایک عالم اور قانون دان بن گئے جو اگلی نسلوں کے لئے علم و دانش کا منبع قرار پائے۔

یہ سب کچھ کیا تھا؟ یہ کیسے ہوا؟ ایسا لگتا ہے جیسے کہ دعوت اور عشق کی تاریں پھیلا دی گئیں۔ ان میں ایمان کی برقی رو آ گئی۔ یہ رو اہل ایمان کے جسد میں دوڑ گئی جس سے مردہ دل زندہ ہو گئے اور جلد ہی پوری دنیا اس کے جلوے سے منور ہو گئی۔ یہ عظمت و قوت بنی نوع انسان پر اسلام کا ایک احسانِ عظیم تھا۔ اس نے افراد اور قوموں کو انقلاب سے آشنا کیا۔ چرواہوں کو حکمران بنا دیا۔ انسانی زندگی کی کایا پلٹ گئی اور چرواہے عام حکمران نہیں بلکہ غیر معمولی اور مثالی حکمران بن گئے۔

ان کے علاوہ دیگر عظیم لوگوں نے بھی امتِ مسلمہ کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ یہ انصاف اور سچائی کے علمبردار بنے۔ ان کی ذاتی خواہشات اور عبادت و ریاضت نے انہیں عدل گستری کے فریضے سے غافل نہیں ہونے دیا۔ وہ بنیادی فوائد سے دور رہے اور حصولِ اقتدار کے کبھی متمنی نہ ہوئے۔ تاہم جب انہیں سرکاری منصب کی ذمہ داری قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑا تو انہوں نے اسے ایک مقدس امانت سمجھا۔ وہ کسی خاص نسل یا علاقے کی نمائندگی نہیں کرتے تھے بلکہ پوری انسانیت کی بھلائی میں دلچسپی رکھتے تھے اور انہوں نے انسانی وقار اور احترام کا علم بلند رکھا۔

2۔ علمی خدمات

(1)۔ سائنسی افکار

سائنسی فکر کا مطلب تحقیق کے انضباطی طریق کار کا اطلاق ہے جو معروضی اور مقصدی اور اصولی طریقوں پر مبنی ہو۔ اسے علم کی نئی شاخوں کی تخلیق اور اس عمل کی تسہیل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ تحقیق کا ایک منظم طریقہ ہے جو فطرت کے محتاط مشاہدے اور سوچ بچار سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ عقلِ خدا داد قرآنی تحریک برائے علمی تحقیق کا ساتھ دیتی ہے۔ قرآن مجید نے اس اسلامی مقصد کی طرف پیش قدمی

کے لئے طریق کار کی تشکیل نو کی طرف دعوت ایسے دی ہے:

اِقۡرَاۡ بِاسۡمِ رَبِّکَ الَّذِیۡ خَلَقَ [1]

(اپنے رب کے نام سے پڑھیے جس نے سب کو پیدا کیا)

یہ وہی وحی ہے جو اعلان کرتی ہے کہ ساری 'تخلیق کردہ' دنیا کا مطالعہ کرنا 'خالق' کی معرفت حاصل کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ فطرت (nature) تک رسائی کے لئے اس نئے طریق کار نے مسلمانوں کو رازہائے فطرت کی بصیرت حاصل کرنے کے لئے ایک تخلیقی قوت فراہم کر دی ہے۔ قرآن مجید انسانی ذہانت کو مظاہر فطرت کی گہری بصیرت حاصل کرنے کا نہ صرف جذبہ عطا کرتا ہے بلکہ اسے مختلف اسلوب ہائے فکر اور استدلال کے مختلف انداز بھی فراہم کرتا ہے۔ قرآن پاک کے نقطۂ نظر سے فطرت (nature) اللہ تعالیٰ کی ایک واضح نشانی (آیت) ہے جو اللہ عزوجل کے تخلیق کردہ ایک مرتب نظام کی نشاندہی کرتی ہے۔

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ [2]

(بیشک آسمان اور زمین کی تخلیق میں، رات اور دن کے لگا تار آنے جانے میں، ان کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کا سامان لیکر سمندر میں تیرتی ہیں، اس پانی میں جو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتارا اور اس کے ذریعے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشی اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے، ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع دار بن کر کام میں لگے ہوئے ہیں، ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں)

۱۔ سورۃ العلق: آیت: 1

۲۔ سورۃ البقرہ: آیت: 164

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ أَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ[1]

(کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے؟)

أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ[2]

(کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟)

أَفَلَا يَنْظُرُوْنَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَإِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَإِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَإِلَى الْأَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ[3]

(تو کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے پیدا کیا گیا؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کہ اسے کیسے بلند کیا گیا ہے؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے نصب کیا گیا ہے؟ اور زمین کو نہیں دیکھتے کہ یہ کس طرح بچھائی گئی ہے)

قرآن پاک کے پیدا کردہ تجسس نے قرونِ اولیٰ کے ذہین مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ اپنی تخلیقی فکر کو صحیح معنوں میں بروئے کار لائیں۔ ان میں یہ تخلیقی فکر اور طریقۂ کار ان کی طبع زاد کتابوں میں جو انہوں نے لکھیں اور تراجم میں جو انہوں نے کیے اور قدیم یونانی، ہندوستانی اور ایرانی تہذیبوں کے سائنسی ورثے کے تحفظ میں، جس کا انہوں نے اہتمام کیا، صاف دکھائی دیتا ہے۔ ان کی کاوشیں دو نمایاں تخلیقی طریق ہائے کار میں ظہور پذیر ہوئیں جنہوں نے بنی نوع انسان کی مستقبل کی پیش رفتوں میں بے پناہ کردار ادا کیا۔ ایک تو انہوں نے ترقی یافتہ ٹیکنالوجی ایجاد کی اور دوسرا یہ کہ انہوں نے تخلیقی اور تجزیاتی ذہنوں کی آبیاری کی۔

مسلمانوں نے تمام قوموں کی مثبت اور تخلیقی کاوشوں کا خیر مقدم کیا، انہیں سمجھا اور جانا اور پھر ان کا تنقیدی جائزہ لے کر ان کے تصورات کو اسلامی عالمی تناظر کے ڈھانچے میں ضم (integrate) کر لیا[4]۔

---

[1]۔ سورۃ الانعام: آیت: 50

[2]۔ سورۃ البقرہ: آیت: 44

[3]۔ سورۃ الغاشیہ: آیت: 17-20

[4]۔ The Arabs: A Short History by Phillip Hitti, p. 111

فلپ ہٹی[1](Philip Hitti, d. 1978)رقم طراز ہے:

اسلام کی وحدانیت اور سائنس کو ہم آہنگ کرنے کی استعداد کے باعث انسانی فکر میں پہلی بار ثابت ہوا ہے کہ دینیات، فلسفہ اور سائنس بالآخر ایک اکائی کے طور پر متحد ہو گئے تھے۔ اس طرح ان کا یہ کارنامہ بہت اہم تھا کیونکہ اس نے سائنسی اور فلسفیانہ فکر اور بعد کے زمانے کی دینیات پر بہت اثرات مرتب کیے۔ یہ سائنس کے ارتقا کے اسباب میں سے ایک ہے۔ غالباً یہ خدا کے ان احکامات کی وجہ سے ہے کہ قوانین فطرت کی تفتیش کی جائے۔

اسلام کی آمد سے پہلے لوگ اشیائے فطرت کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اسلام نے اسے 'شرک' قرار دے دیا (اس کا مطلب خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانا ہوتا ہے) اور اپنے پیروکاروں پر زور دیا کہ وہ ہرگز اشیائے فطرت کو نہ پوجیں بلکہ ان کا مطالعہ کریں۔ اس حکم کے نتیجے میں سائنسی سوچ اور طریق ہائے کار کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

اسلام سے پہلے تجربات اور مشاہدے کا کوئی باقاعدہ تصور نہیں تھا۔ کائنات انسان کے لئے ایک پوجا کی شے تھی نہ کہ تفتیش اور تحقیق کا موضوع۔ اسلام کا یہی عظیم کارنامہ تھا جس نے زمین پر بنی نوع انسان کی تاریخ مکمل طور پر بدل دی۔ اس سیاق وسباق میں انسائیکلوپیڈیا بریٹنیکا (تاریخ ندارد) کا ایک اقتباس یہ ہے:

مذاہب میں ایک وسیع پیمانے پر پھیلا یا ہوا ایک سلسلہ اشیائے فطرت ہے جو قوتوں کے ساتھ خدائی صفات منسوب کرتا (دیوی دیوتا بناتا) ہے۔ اس مظہر کی وضاحت کے لئے ان اشیا کی درجہ بندی کی گئی ہے وہ یہ کہ ان میں سے کچھ آسمانی (celestial) کچھ فضائی (atmospheric) اور کچھ ارضی (earthly) ہیں۔ اس درجہ بندی کو انڈو آرین مذہب نے خود تسلیم کیا ہے: 'سُریا' (سن گاڈ) آسمانی

---

[1]۔ Philip Khuri Hitti؛ فلپ خوری ہٹی (1886-1978) ایک امریکی مستشرق تھا جو لبنان میں پیدا ہوا۔ اس نے بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ 1915ء میں کولمبیا یونیورسٹی کے مشرقی علوم کے شعبے میں لیکچرر مقرر ہوا اور آٹھ سال تک پروفیسر رہا۔ اس کے بعد پرنسٹن یونیورسٹی امریکا چلے گیا۔ 1916ء میں ''اسلامی ریاست کی ابتدا'' نامی ایک کتاب لکھی لیکن ان کی شہرت ''تاریخ عرب'' کی وجہ سے ہے جو 1937ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔

ہے۔'اندرا' (آندھی، بارش اور جنگ وجدل کی دیوی) فضائی ہے۔'اگنی' (آگ کا دیوتا) زیادہ تر زمینی سطح پر کام کرتا ہے[1]۔

اسلام نے دنیا کو سائنسی طریق کار دیا۔اسلام سے پہلے لوگ قدیم روایتی علم کو کسی تجربے کی بنیاد پر پرکھے بغیر قبول کر لیا کرتے تھے۔ممتاز برطانوی مفکر اور فلاسفر برٹرینڈ رسل[2] (Bertrand Russell, d. 1970) کا کہنا تھا کہ یونانی لوگ تجربے اور مشاہدے کے مخالف تھے۔وہ اپنی کتاب 'The Impact of Scienсes on Society' میں لکھتا ہے:

> جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ واقعات کو مشاہدے کی بنا پر پرکھتے ہیں۔قدیم اہل دانش سے مشورہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔لیکن یہ بالکل ایک جدید تصور ہے جو سترہویں صدی سے پہلے بمشکل ہی پایا جاتا تھا۔ارسطو (Aristotle, d. 322BC) کا موقف تھا کہ عورتوں کے دانت مردوں کے دانتوں سے کم ہوتے ہیں۔اگرچہ اس کی دوبار شادی ہوئی تھی لیکن اسے یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ وہ اپنی بیویوں کے دانت خود گن لیتا[3]۔

ماہر معاشرتی بشریات (social anthropologist) رابرٹ بریفالٹ[4] (Robert Briffault, d. 1948) یہ اعلان کرنے کی حد تک چلا گیا ہے کہ جدید سائنس مسلمانوں کا کارنامہ ہے۔

۱۔ Encyclopedia Britannica, Vol. 14, p. 785

۲۔ برٹرینڈ آرتھر ولیمز رسل (Bertrand Arthur William Russell)(1872-1970) ایک معروف محقق، مورّخ، سائنسدان، ماہر ریاضیات، ماہر طبیعیات، مدرّس اور فلسفی تھے۔1970ء میں یہ ادیب دنیا سے رخصت ہوگیا۔برٹرینڈ رسل کے علمی اور فلسفیانہ کاموں کی ایک طویل فہرست ہے۔فلسفہ، سائنس، تاریخ، سیاست، معاشرت، جنگ، امن، جنس، قانون اور انسانی ہمدردی پر برٹرینڈ رسل کی علمی اور تحقیقی کتب اور کتابچوں کی تعداد سینکڑوں میں پہنچتی ہے۔1950ء میں ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔

۳۔ The Impact of Sciences on Society by Bertrand Russell, p.17

۴۔ Robert Stephen Briffault؛ رابرٹ سٹیفن بریفالٹ (1874-1948) ایک فرانسیسی ماہر سرجن تھا۔جس نے بطور social anthropologist اور ایک ناول نگار کے شہرت حاصل کی۔

سائنسی تحقیق یونانیوں سے شروع ہوئی لیکن یہ مسلمان عرب ہی تھے جنہوں نے سائنسی طریق، یعنی 'تجربے کے عمل' کا طریقہ (experimentation) مشاہدے کا عمل اور ناپنے کا طریقہ دریافت کیا۔ اس طرح یورپ میں جدید سائنس کی بنیاد استوار ہوگئی۔ رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault, d. 1948) کے مطابق:

> ہماری سائنس کا قرضہ جو عربوں کا قرضہ ہے وہ چونکا دینے والے انقلابی نظریات کی دریافتوں پر مشتمل نہیں ہے؛ سائنس نے اس سے کہیں زیادہ قرضہ عرب ثقافت کو ادا کرنا ہے، بلکہ اس کا وجود ہی عرب ثقافت کا مرہونِ منت ہے۔ قدیم دنیا جیسا کہ ہم جانتے ہیں سائنس سے پہلے کی دنیا تھی۔ یونانیوں کے علومِ فلکیات اور ریاضی جو غیر ملکی درآمد کاری (importation) تھے، یونانی ثقافت کے اندر کبھی کماحقہٗ رچ بس نہ سکے۔ ٹھیک ہے کہ یونانیوں نے انہیں ترتیب دی، ان کو عمومی بنایا اور ان کی نظریہ سازی بھی کی۔ لیکن صبر و تحمل کے طور طریقوں پر مشتمل تفتیش، مثبت علم کی جمع بندی، سائنس کے باریک بینی کے طریقے، تفصیل طلب اور طویل مدتی مشاہدات اور تجرباتی تحقیق وغیرہ یونانی مزاج کے لئے بالکل اجنبی تھے۔ صرف قدیم کلاسیکی دنیا (چہارم تا یکم صدی قبل مسیح) کے سکندریہ میں کچھ سائنسی کام ہوسکا تھا لیکن جس علم کو ہم سائنس سے تعبیر کرتے ہیں وہ یورپ میں ایک نئے جذبۂ تفتیش، طریق ہائے تحقیق، تجربات و مشاہدات، پیمائش اور ریاضی کی ترقی کے ذریعے آئی۔ جن سے اہل یونان بے خبر تھے۔ پوری دنیا کو اس جذبۂ تفتیش و تحقیق اور طریق ہائے کار سے عربوں نے متعارف کرایا تھا[1]۔

قرآن مجید کائنات میں پیدا کردہ تمام اشیا پر غور و فکر کرنے پر بہت زور دیتا ہے۔ یہی اشیا ہیں جنہیں ہم آج سائنس کہتے ہیں۔ یہ باضابطہ اور منضبط طریق کار ہمیں خدا پاک کے قریب لے جاتا ہے۔ تاریخ اسلام اس حقیقت کی گواہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے اولین دور میں سائنسی علوم میں بے پناہ ترقی کی تھی۔ برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell, d. 1970) اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

---

[1] Making of Humanity by Robert Stephen Briffault, p. 190

مسلمانوں نے سائنسی علوم اور تعلیم کو بہت فروغ دیا اور انہوں نے سائنس میں دنیا کی اس وقت رہنمائی کی جب یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس وقت ہندوستان سے سپین تک ایک شاندار اسلامی تہذیب اپنی ترقی کی منازل طے کر رہی تھی۔ وہ کہتا ہے:

> ہم 'تاریک دور' کے الفاظ، 600ء سے 1000ء تک کے زمانے پر پردہ ڈالنے کے لئے استعمال کرتے ہیں چونکہ مغربی یورپ پر ہمارا غیر ضروری ارتکاز تھا۔ چین کے اس زمانے میں ٹینگ خاندان (*Tang Dynasty*) کا دور، چینی شاعری کے عروج کا دور اور کئی پہلوؤں سے بہت ہی قابل ذکر عہد شامل تھا۔ ہندوستان سے سپین تک اسلام کی شاندار تہذیب فروغ پا رہی تھی۔ عیسائیت کو اس وقت جو شکست ہوئی وہ تہذیب کو شکست نہیں ہوئی تھی بلکہ معاملہ بالکل برعکس تھا[1]۔

(2)۔ طبی علوم

عہد متوسط کے دوران طبی شعبے میں مسلمانوں نے زبردست خدمات انجام دیں۔ ان خدمات کی نوعیت بہت غیر معمولی تھی۔ الرازی[2] (al-Razi, d. 925) بلاشبہ اسلامی دنیا کا سب سے بڑا طبیب تھا اور دائمی شہرت پانے والے اطباء میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی تصانیف کے لاطینی زبان میں وسیع پیمانے پر تراجم ہوئے۔ یہ تراجم 'Rhaze' کے نام سے ہوئے اور اسلامی دنیا سے باہر بھی ان کے اثرات مرتب ہوئے۔ الرازی (al-Razi, d. 925) کی تصنیف کتاب المنصوری، دس (10) جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ یونانی دواؤں پر لکھی گئی ہے۔ لاطینی زبان میں یہ 'Liber ad Almanisorem' کے عنوان سے چھپی۔ اس کی ایک اور غیر معمولی تصنیف 'الجدری والحصبہ' چیچک اور خسرہ کے امراض کے بارے میں ہے اور اس موضوع پر انتہائی مستند کتاب ہے جو آج بھی زبردست افادیت کی حامل سمجھی جاتی ہے۔ اس کا لاطینی اور دیگر یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا اور یہ 1498ء اور 1866ء کے درمیان چالیس (40) سے زائد مرتبہ شائع ہوئی۔ اس کی ایک جامع اور معروف کتاب 'الحاوی' بیس (20) جلدوں پر مشتمل ہے۔ شاہِ سسلی

---

[1]۔ A History of Western Philosophy by Bertrand Russell, p.372

[2]۔ Abu Bakr Muhammad ibn Zakariyya al-Razi؛ ابوبکر محمد بن زکریا الرازی (854-925) مسلمان سائنسدان، ماہرِ طبیعیات، ہیئت دان اور فلسفی تھے۔

(Charles I, King of Sicily) کے حکم پر سسلی کے یہودی طبیب فراج بن سالم[1] (Faraj bin Salim) نے اس کا 'Continens' کے عنوان سے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ الرازی (al-Razi, d. 925) نے امراضِ نسواں (gynecology) اور زچہ بچہ (obstetrics)، امراضِ چشم (ophthalmology) اور امراضِ گردہ (nephrology) پر بھی کتابیں لکھیں۔ وہ ایک نامور سرجن بھی تھا اور اس نے سرجری میں سیٹن[2] (Seton Stitch) کا طریقہ کار بھی متعارف کروایا۔

الرازی (al-Razi, d. 925) نے ایک مخصوص 'ڈوری' (sutures) بنائی جو اس نے مویشیوں سے حاصل کی تا کہ ریشوں (tissues) کو جوڑا جا سکے۔ وہ پہلا معالج تھا جس نے زخموں کے علاج کے لئے ڈوری استعمال کی۔ اس نے علم کیمیا (chemistry) کے تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے چند مرکبات بھی تیار کئے مثلاً مرکری سالٹس (mercury salts)، لیڈ اور کاپر سالٹس (lead and copper salts) جو پہلی دفعہ علاج میں استعمال ہوئے۔ اس کی عملی کامیابیوں کا بہت سا حصہ ان مرکبات کو آزمائشی طور پر بندروں پر استعمال کرنے پر مشتمل تھا۔ وہ اس معاملے میں بھی پہلا معالج تھا کہ اس نے مرہموں میں سفید لیڈ (white lead) استعمال کیا اور پارا (mercury) کو بطور جلاب استعمال کیا۔ اس کے علم اور تجسس نے طب کے شعبے میں اسے سب سے بلند مقام دلوا دیا جب کہ دیگر معاشرے اس کی پیش رفتوں کے ساتھ قدم ملانے کے لئے اس کے تراجم میں سر کھپاتے رہ گئے۔

علی ابن العباس المجوسی[3] (Ali ibn al-'Abbas al-Majusi, d. 994) جسے مغرب میں 'ہالی عباس' (Haly Abbas) کہا جاتا تھا ایک معتبر عالم تھا۔ اس نے 'کتاب الملکی' تصنیف

---

[1]۔ Faraj Ibn Salim؛ فرج بن سالم (تیرہویں صدی) سسلی کا یہودی طبیب اور مترجم تھا۔ سسلی کے بادشاہ چارلس اول نے اسے عربی زبان کی طب کی کتب کو لاطینی میں ترجمہ کرنے کے ذمہ داری سونپ دی تھی۔ فرج نے بڑی ہی کامیابی سے عربی زبان کی طب کی کتب خاص طور پر الرازی کی کتب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ تراجم ہی فرج کی وجہ شہرت بن گئے۔

[2]۔ 'Seton Stitch' سرجری کا طریقہ کار ہے۔ اس طریقہ کار میں زخم میں سے ایک سرجیکل ڈوری گزار دی جاتی ہے تا کہ یہ ڈوری ایک راستہ بنائے جو زخم میں سے باہر چلا جائے۔ اس راستہ کے ذریعے پیپ اور دوسرا مواد زخم سے باہر نکلتا رہتا ہے اور زخم مندمل ہوتا رہتا ہے۔

[3]۔ Ali ibn al-'Abbas al-Majusi؛ علی بن العباس المجوسی (دسویں صدی عیسوی) ایک ماہر طبیب تھے۔ طب میں ان کی مشہور زمانہ کتاب کامل الصناعہ الطبیہ الضروریہ، یہ کتاب، الکتاب الملکی (شاہی کتاب) کے نام سے مشہور ہے۔

کی،جس کا لاطینی نام 'Liber Regius' تھا۔ یہ ایک مبسوط انسائیکلوپیڈیا تھی جس میں طب کے نظریات (theory of medical science) اور عمل (practic) پر لکھا گیا تھا۔ یہ اس وقت تک معیاری کتاب رہی جب تک ابن سینا (Avicenna, d. 1037) کی شاہکار تصنیف 'Canon' نے اس پر سبقت حاصل نہیں کر لی تھی۔ المجوسی (al-Majusi, d. 994) پہلا معالج تھا جس نے نظامِ رگِ شعری (Capillary System) کے بارے میں لکھا اور یہ تفصیلات بھی بیان کیں کہ بچہ کیسے جنم لیتا ہے۔

ابن سینا (Avicenna, d. 1037) کا شمار مسلم دنیا کے مشہور دانشوروں میں ہوتا تھا۔ اسے ارسطو (Aristotle, d. 322BC) کے بعد ذہین ترین شخص سمجھا جاتا تھا۔ اس کی عظیم الشان کتاب 'القانون فی الطب' ہے[1]۔ لاطینی زبان میں اس کا نام 'Canon of Medicine' ہے۔ یہ عربوں کی نظم بندیٔ علم کی مہارت تامہ کی مظہر ہے۔ یہ میڈیکل انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں 760 دواؤں اور امراض پر تحقیق شامل ہے۔ اس میں پورے جسم کے امراض بشمول پانی کے ذریعے پھیلنے والی بیماریوں کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر 'پیتھالوجی'[2] (pathology) اور 'فارماکوپیا'[3] (pharmacopoeia) سے متعلق ہے۔ بارہویں صدی میں گیراڈ آف کریمونا[4] (Gerard of Cremona, d. 1187) نے اس کا لاطینی زبان میں ترجمہ کر کے یورپ کے اہلِ علم کو اس سے فیض یاب ہونے کا موقع دیا۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ پندرہویں اور سولہویں صدی میں یہ یورپ کی مختلف زبانوں میں سینکڑوں بار شائع ہوئی۔

القانون (Canons of Medicine) پندرہویں صدی کے آخر میں یورپی یونیورسٹیوں کے کل طبی نصاب کا نصف حصہ تھا اور تقریباً 1650ء تک مغرب کی یونیورسٹیوں میں نصابی کتاب (text book) کے طور پڑھائی جاتی رہی ہے[5]۔

---

[1]۔ یعنی قوانین ادویات

[2]۔ طب کے ذیلی موضوع Pathology میں امراض کی فطرت، کسی بھی متعلقہ بیماری کی ساخت، اس بیماری کا جسمانی اعضاء، نسیج اور خلیات پر اثر اور اس بیماری کی وجہ سے پیدا (یا نا پید) ہونے والے مظاہر کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

[3]۔ ادویات بنانے کے علم کو دستور الادویہ (pharmacopoeia) کہتے ہیں۔

[4]۔ Gerard of Cremona؛ گیراڈ آف کریمونا (1114-1187) ایک اطالوی مترجم (translator) تھا۔ جس نے بے شمار سائنسی کتب کا عربی زبان سے لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

[5]۔ The Arabs: A Short History by Phillip Hitti, p. 110

الزہراوی (al-Zahrawi, d. 1013) ایک نامور جراح (surgen) تھا جس نے التصریف لکھی۔ اس کتاب میں تمام آلات جراحی کی اشکال اور طریقہ ہائے جراحت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب نے مشرق اور مغرب کے فن جراحی کے ارتقاء میں قابل قدر اضافے کیے ہیں۔ الزہراوی (al-Zahrawi, d. 1013) پہلا سرجن تھا جس نے خون کی نالیوں کے سرجیکل آپریشنز (جراحت) کیے۔ مثلاً اس نے کٹی ہوئی شریانوں کی سلائی کی اور انہیں اس حال میں جوڑا، جب ان میں خون جاری تھا۔ اس نے پہلی بار زخموں کو جوڑنے کے لئے ریشمی دھاگا استعمال کیا اور دانتوں کے علاج کے لیے سونے کے رباطی بندھن (ligaments) استعمال کیے۔ اس نے پلاسٹک کی سلائی اور متعدد دیگر آلات جراحی کو ترقی دی جس سے حکماء (طبیب) پہلے آگاہ نہ تھے۔ اس نے ان آلات کی تصاویر بنوائیں۔ ان کے سائز اور انہیں بنانے کے لئے استعمال ہونے والے سامان (material) کی تفصیلات بتائیں۔

زہراوی (al-Zahrawi, d. 1013) نے مثانے کی پتھری نکالنے کے لئے عمل جراحی اور حلق کے غدود (tonsils) نکالنے کے فن کو ترقی دی۔ علاوہ ازیں اس نے بوقت پیدائش 'جنین' (embryo) کی پوزیشن معمول کے مطابق نہ ہونے کی بنا پر بچے کو تسلے (basin) میں جنوانے (deliver) کا طریقہ وضع کیا۔ اس نے خواتین کا آپریشن کرنے کے وقت خواتین نرسوں کی مدد حاصل کرنے کی ضرورت پر زور دیا کیونکہ خواتین نرم دل ہوتی ہیں اور مریض ان کے ساتھ زیادہ انس محسوس کرتی ہیں۔ ابن سینا (Avicenna, d. 1037) کی 'القانون' (cannon) اور زہراوی (al-Zahrawi, d. 1013) کی علم جراحت (سرجری) پر تصنیف 'التصریف' سترہویں صدی تک پورے یورپ میں نصابی کتب کے طور پر پڑھائی جاتی رہیں۔

الزہراوی (al-Zahrawi, d. 1013) کی سرجری سے متعلق کتاب التصریف کا گیراڈ آف کریمونا (Gerard of Cremona, d. 1187) نے عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا۔ یورپ میں اس کے مختلف ایڈیشن چھپے۔ وینس (Venice) میں 1497ء میں باسل (Basel) میں 1541ء میں اور آکسفورڈ میں 1778ء میں چھپا۔ یہ ترجمہ کئی صدیوں تک یورپ کے میڈیکل سکولوں میں بطور نصاب پڑھایا جاتا رہا[1]۔

بغداد کے علی بن عیسیٰ الکحال[2] (لاطینی نام Jesu Occulist) نے امراض چشم پر ایک

1۔ The Arabs: A Short History by Phillip Khuri Hitti, p.577

2۔ Ali ibn Isa al-Kahhal؛ علی بن عیسیٰ الکحال (گیارہویں صدی عیسوی) مشہور ماہر امراض چشم تھا۔

شاندار کتاب لکھی۔اس کتاب کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ یہ کتاب یورپ میں اٹھارہویں صدی کے وسط تک امراض چشم کی ایک مستند کتاب سمجھی جاتی رہی۔حنین بن اسحاق[1] (Hunayn Ibn Is-haaq, d. 873) نے امراض چشم پر دس مضامین لکھے۔اس نے ایک اور کتاب بھی لکھی جس میں امراض چشم پر تمام مطلوبہ معلومات یکجا کر دی گئی تھیں۔

ابوالہیثم (ibn al-Haytham, d. 1040) جو مغرب میں 'Alhazen' کے نام سے معروف تھا۔اسے بصریات (optics) میں سند مانا جاتا تھا۔دنیا نے اس جیسا ماہر کبھی نہیں دیکھا تھا۔اس نے اس موضوع پر 'اقلیدس' [2] (Euclid, d. n.d.) اور بطلیموس [3] (Ptolemy, d. 170) کے نظریات کی تصحیح کی۔اس کی تصنیف 'Opticae Thesaurus' نے علم بصریات پر لکھنے والے 'راجر بیکن' [4] (Roger Bacon, d. 1294)، لیونارڈ ڈاونچی [5] (Leonard da Vinici, d. 1519)، 'جان کیپلر [6] (Kepler, d. 1630) اور عہد متوسط کے کئی اور مغربی مصنفین کو متاثر کیا۔ ابوالہیثم (ibn al-Haytham, d. 1040) نے بصارت کے قدیم نظریہ کو بدل دیا کہ شعاع ہماری

---

[1]۔Hunayn Ibn Is-haaq؛ حنین بن اسحاق (809ء-873ء) ایک فلاسفر، سائنسدان، طبیب اور مترجم تھا۔عرب میں اسے شیخ المترجم کہا جاتا ہے۔

[2]۔Euclid؛ اقلیدس ایک یونانی ریاضی دان تھا جو مصری شہر اسکندریہ میں تیسری صدی قبل مسیح میں رہا۔اس کی کتاب ایلیمنٹس (Elements) ریاضی کی تاریخ کی مشہور ترین اور سب سے زیادہ دیر تک پڑھائی جانے والی نصابی کتاب ہے جو انیسویں اور بیسویں صدی تک پڑھائی جاتی رہی ہے۔

[3]۔Ptolemy؛ بطلیموس (100ء-170ء) ایک مشہور یونانی ماہر فلکیات، جغرافیہ دان اور ریاضی دان تھا۔

[4]۔Roger Bacon؛ راجر بیکن (1214ء-1294ء) ایک انگریز فلسفی اور راہب تھا۔ یہ ایک عرصہ تک پیرس میں ارسطو کے فلسفے پر لیکچر دیتا رہا۔کئی کتابوں کا مصنف ہے جن میں اوپن میرر اور پوپ کلیمنٹ زیادہ مشہور ہیں۔اسے 1277ء میں کیتھولک کلیسا نے مجرم قرار دیا اور قید میں ڈال دیا وہیں وفات پائی۔

[5]۔Leonardo da Vinci؛ لیونارڈو ڈاونچی (1452ء-1519ء) ایک اطالوی عالم، سائنسدان، حساب دان، موجد، تشریحدان، مصور، مجسمہ ساز، معمار، ماہر نباتیات، موسیقار اور مصنف تھا۔انہیں نشاۃ ثانیہ کے مرکزی کردار سمجھا جاتا ہے۔

[6]۔(Johannes Kepler) جان کیپلر (1571-1630) ایک جرمن ماہر فلکیات، ریاضی دان اور سترھویں صدی کے سائنسی انقلاب کی ایک بہت اہم شخصیت تھا۔وہ سیاروں کی حرکت کے قوانین دریافت کرنے کے لیے مشہور تھا جس کی بعد میں آنے والے ماہر فلکیات نے تصدیق کی۔اس کی تحقیق نیوٹن کی تحقیقات کی بنیاد بنی۔

آنکھ سے نکل کر کسی چیز سے ٹکراتی ہے تو ہم اس چیز کو دیکھتے ہیں۔ اس کا دعویٰ تھا کہ روشنی اس چیز سے ٹکرا کر ہماری آنکھ تک پہنچتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں۔

ابن رشد[1] (Averroes, d. 1198) نے طب پر سولہ (16) معتبر کتابیں لکھیں جن میں ایک 'کلیات فی الطب' ہے۔ یہ دواؤں کے عمومی اصولوں سے متعلق ہے۔ لاطینی میں اس کا ترجمہ 'Colliget' کے عنوان سے چھپا ہے۔ یہ کتاب اپنی اہمیت، معیار اور افادیت کی بنا پر یورپ میں کئی بار شائع ہوئی۔

ابن کتینہ (Ibn Katina, d. 1369) ایک بربری حکیم تھا۔ اس نے طاعون (plague) پر ایک نہایت عمدہ کتاب لکھی اور وہ اس سے پہلے اس موضوع پر لکھی گئی تمام کتابوں پر فوقیت حاصل کر گئی۔ اس کی پندرہویں صدی عیسوی میں یورپ میں تدوین اور ترجمہ ہوا۔ اس کتاب میں طاعون (plague) کے متعدی مرض ہونے کا انکشاف کیا گیا اور علاج بھی بتایا گیا۔ اس سے قبل یونانی اطباء اس سے آگاہ نہیں تھے۔

ابن نفیس[2] (Ibn Nafees, d. 1288) قاہرہ میں منصوری ہسپتال کا منتظم تھا جو اس وقت دنیا کا بہترین ہسپتال تھا۔ ابن نفیس (Ibn Nafees, d. 1288) نے 'نظام دوران خون' (minor circulatory system) دریافت کیا۔ دائیں طرف کے دوران خون (پھیپھڑوں کے حوالہ سے) سے متعلق ابن نفیس (Ibn Nafees, d. 1288) کی تصانیف ولیم ہاروے[3] (William Harvey, d. 1657) کی کتاب 'De Motu Cordis' (1628ء) سے پہلے کی ہیں۔ دونوں نظریات دوران خون کی وضاحت سے متعلق ہیں۔ دونوں مل کر گردش خون پر روشنی ڈالتی ہیں اور یہ قلبی افعال کی اولین اور بہترین مشرقی اور مغربی تحقیقات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ابن نفیس (d. 1288) کی معروف ترین طبی تحریروں میں سے ایک کتاب 'جامع' (Comprehensive) کے عنوان سے تھی جو

---

[1]۔ ابوالولید محمد بن احمد بن رشد (Averroes)، (1126-1198) ایک ماہر فلسفی، ریاضی دان، ماہر علم فلکیات، ماہر فن طب اور قانون دان تھا۔ ابن طفیل اور ابن اظہر جیسے مشہور عالموں سے دینیات، فلسفہ، قانون، علم الحساب اور علم فلکیات کی تعلیم حاصل کی۔ خلیفہ یعقوب یوسف کے عہد میں اشبیلیہ اور قرطبہ کا قاضی رہا۔

[2]۔ ابوالحسن علاء الدین علی بن ابی الحزم المعروف ابن نفیس (1213ء-1288ء) مشہور مسلمان طبیب اور فلسفی تھے۔

[3]۔ William Harvey؛ ولیم ہاروے (1578ء-1657ء) ایک انگریز سائنسدان تھا جس نے خون کی گردش اور دل کے افعال پر کام کیا۔

دس (10) جلدوں پر مشتمل تھی۔

ابن مساویہ[1] (Ibn Masawayh, d. 857) نے دنیا میں سب سے پہلے آنکھوں کی امراض (ophthalmology) کی کتاب عشر مقالات فی العین (آنکھ پر دس مضامین) لکھی[2]۔

(3)۔ علم کیمیاء (Chemistry)

علم کیمیا (Chemistry) کو بطور سائنس بلا شک وشبہ مسلمانوں نے متعارف کروایا۔ سائنس کے اس شعبہ میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ خدمات سرانجام دیں اور اسے کاملیت کے اعلیٰ درجے تک پہنچایا۔ مسلمانوں کو ان کی دریافتوں اور ان کے فہم کیمیاء کی وجہ سے سترہویں صدی تک سند سمجھا جاتا رہا ہے۔ جابر بن حیان[3] (Jabir ibn Hayyan, d. 806) اور الرازی (al-Razi, d. 925) کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ انہیں عہدِ متوسط کے سب سے بڑے کیمیادان کہا جاتا تھا۔

جابر بن حیان[4] (Jabir ibn Hayyan, d. 806) کو جدید کیمیاء کا باپ کہا جاتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ تمام مادوں (matters) کی ابتداء کا سراغ لگایا جائے تو وہ ایک سادہ سا ذرہ ہوگا جو چمک اور آگ پر مشتمل ہوگا اور مادے (matter) کی ناقابل تقسیم اکائی (unit) ہوگی۔

اس نے انیس (19) عناصر دریافت کیے اور وزنِ مخصوص (measurements of specific weights) کی صحیح پیمائشیں کیں۔ متعدد کیمیائی تعامل (chemical processes) مثلاً عمل کشید (distillatiion) مائع کو قلموں کی شکل میں جمانا (crystallization) اور عمل تصعید

---

[1]۔ Ibn Masawayh؛ یوحنا بن مساویہ (777ء-857ء) ایک نسطوری عیسائی طبیب اور بغداد کے ایک ہسپتال کا ڈائریکٹر تھا۔ اس نے متعدد موضوعات بشمول امراض چشم، بخار، درد سر، مالیخولیا، غذائیات اور طبی اقوال سے متعلق علمی مقالے لکھے۔ اس نے متعدد یونانی کتابوں کا شامی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس نے تشریح الابدان پر بھی لکھا۔

[2]۔ The Arabs: A Short History by Phillip Khuri Hitti, p.364

[3]۔ Abu Musa Jabir ibn Hayyan؛ ابوموسیٰ جابر بن حیان (721-806) تاریخ کا سب سے پہلا کیمیادان اور عظیم مسلمان سائنسدان تھا۔ جس نے سائنسی نظریات کو دینی عقائد کی طرح اپنایا۔ دنیا آج تک اسے بابائے کیمیا کے نام سے جانتی ہے۔ اہل مغرب اسے Geber کے نام سے جانتے ہیں۔

[4]۔ Abu Musa Jabir ibn Hayyan؛ ابوموسیٰ جابر بن حیان (721-806) تاریخ کا سب سے پہلا کیمیادان اور عظیم مسلمان سائنسدان تھا۔ جس نے سائنسی نظریات کو دینی عقائد کی طرح اپنایا۔ دنیا آج تک اسے بابائے کیمیا کے نام سے جانتی ہے۔ اہل مغرب اسے Geber کے نام سے جانتے ہیں۔

(sublimation) کے تجربات کیے۔ وہ اس لحاظ سے بھی پہلا شخص تھا جس نے سرکہ (vinegar) کو عمل کشید کے ذریعے 'Acetic acid' میں تبدیل کیا۔ مادے کی محلول حالت سے اس کی اضافی حل پذیری یا عدم حل پذیری متعارف کروائی۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے گلاس ٹیوبز اور بوتلیں بڑے پیمانے پر استعمال کیں اور اس نے اپنی تحقیق میں جانچ پڑتال کی اہمیت پر زور دیا تھا۔

اس نے کیمیا کے دو نہایت اہم تعاملات 'تکلیس'[1] (calcination) اور 'تقلیل'[2] (reduction) کی سائنسی طور پر وضاحت کی۔ اس نے عمل ہائے 'تبخیر' (evaporation)، 'تصعید' (sublimation)، 'تقطیر' (filtration)، 'کشید' (distillation) اور 'قلماؤ' (crystallization) کو نمایاں طور پر ترقی دی۔ سائنسی مؤرخ ہولمیارڈ[3] (Holmyard, d. 1959) اپنی کتاب 'Makers of Chemistry' میں کہتا ہے کہ جابر بن حیان (d. 806) کیمیائی تعامل کے دوران رونما ہونے والے تغیرات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ وضاحت کرتا ہے کہ دھاتوں کو کس طرح 'تکلیس' (calcination) کے ذریعے آلائشوں سے پاک کیا جا سکتا ہے اور کن طریقوں سے دھاتوں کی تکلیس (calcinate) کی جا سکتی ہے[4]۔

جابر بن حیان (d. 806) نے کیمیائی مادے بشمول شنگرف 'cinnabar' (پارے کا سلفائیڈ) اور سنکھیا (arsenic oxide) تیار کرنے کے طریقے کی تفصیل بتائی۔ اس نے مرکری آکسائیڈ (mercury oxide) بنایا اور وہ خام سلفیورک ایسڈ (crude sulfuric acid) اور

۱۔ calcination: عمل تکلیس ایک کیمیائی عمل ہے جس میں ہوا یا آکسیجن میں بہت زیادہ درجے کی حرارت پہنچائی جاتی ہے۔ calciner دراصل ایک سٹیل کا سیلنڈر ہوتا ہے جو ایک بھٹی کے اندر گھومتا ہے اور کنٹرول کردہ ماحول میں اعلیٰ درجہ حرارت (550-1150 ڈگری سینٹی گریڈ) مہیا کرتا ہے۔ اسے انتہائی ٹھوس مواد کی thermal decomposition کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

۲۔ reduction: تقلیل 'ریڈکشن آکسیڈیشن' (redox) کے ری ایکشن کا ایک حصہ ہے جس میں ایٹموں کی آکسیڈیشن کی حالت تبدیل ہو جاتی ہے۔ دراصل اس کیمیائی تعامل میں کسی چیز کے ایٹم میں سے آکسیجن کو ہٹا دیا جاتا ہے یا پھر ہائیڈروجن کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

۳۔ Eric John Holmyard: ارک جون ہولمیارڈ (1891ء-1959ء) ایک ماہر تاریخ دان برائے سائنس وفنون تھا۔ وہ ایک عرصہ تک مختلف تعلیمی اداروں میں تدریسی سرگرمیاں بھی سرانجام دیتا رہا۔

۴۔ Makers of Chemistry by E.J. Holmyard, p. 59

نائیٹرک ایسڈ (nitric acid) بنانے کے طریقوں سے خوب آگاہ تھا۔ایسے کیمیائی مادوں پر اس کے مقالے کئی یورپی زبانوں بشمول لاطینی میں چھپے۔جدید کیمیا نے جابر بن حیان (d. 806) کی وضع کردہ کئی سائنسی و فنی اصطلاحات کو اختیار کیا ہے۔ اس نے دھاتوں کی ارضیاتی تشکیل (geologic formation of metals) کا نظریہ بھی پیش کیا اور کیمیا کے بہت سے عملی اطلاقات بتائے۔مثلاً دھاتوں کو مصفیٰ (refinement) کرنا، فولاد بنانا، کپڑے اور چمڑے کو رنگنا، کپڑوں کی وارنشنگ (varnishing) کر کے انہیں واٹر پروف بنانا اور مینگنیز ڈائی آکسائیڈ (manganese dioxide) کو شیشے رنگنے کے لئے استعمال کرنا۔علاوہ ازیں اس نے مسودوں کے لئے سستی اور چمکیلی روشنائی (ink) تیار کرنے اور شیشہ سازی کے لئے مینگنیز ڈائی آکسائیڈ (manganese dioxide) کے استعمال کرنے کے طریقوں کا ذکر بھی کیا ہے[1]۔

جابر بن حیان (d. 806) نے ایک نہایت نفیس وحساس (precise) ترازو بنایا جو چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی صحیح وزن کرسکتا تھا۔اس نے کیمیائی امتزاجوں (combinations) کو عناصر کے باہمی ارتباط سے تعبیر کیا اور انہیں ایسے اجزا (particles) قرار دیا جو اتنے چھوٹے ہوتے ہیں کہ 'محدب شیشے' کے بغیر نہیں دیکھے جاسکتے اور اتنے مہین ہونے کے باوجود اپنی خصوصیات برقرار رکھتے ہیں۔اس نے یہ تصریحات جان ڈالٹن[2] (John Dalton, d. 1844) سے دس صدیاں پہلے کی تھیں۔اس نے نئی پیداواروں (products) کا تعین کیا۔جن میں الکلیاں (alkalines)، تیزاب (acids)، نمکیات (salts)، روغنیات (paints) اور چکنائیاں (greases) شامل تھیں۔اس نے گندھک کا تیزاب (Sulfuric acid)، نمک کا تیزاب (nitro-hydrochloric acid) بنائے (جنہیں وہ بعض دھاتوں کو حل کرنے کے لئے استعمال کرتا تھا)۔اسی طرح اس نے کاسٹک سوڈا (caustic soda) اور متعدد سالٹس (salts) تیار کیے۔مثلاً سلفیٹس (sulphates)، نائیٹریٹس (nitrates)، پوٹاشیم (potassium) اور سوڈیم کاربونیٹس (sodium carbonates)۔دھاتوں اور نمکیات پر اس کی تحقیق کی بنا پر بعدازاں ڈھلائی کی طریقے (foundry techniques) اور ٹائلوں اور ظروف کو

۱۔ Makers of Chemistry by E.J. Holmyard, p. 59

۲۔ John Dalton؛ جان ڈالٹن (1766ء-1844ء) ایک برطانوی ماہر کیمیا، ماہر طبیعیات اور موسمیات تھا۔ وہ جدید ایٹمی نظریہ کے لئے ابتدائی کام کرنے کی وجہ سے معروف ہے۔

چمکانے کے نسخے تیار کرنے میں مدد ملی[1]۔

جابر بن حیان (d. 806) کی وفات کے تقریباً ایک صدی بعد الرازی (d. 925) نے علم کیمیا کی بنیادیں استوار کیں۔ جن سے جدید دور میں بڑی مدد ملی۔ الرازی (d. 925) نے اپنی کتاب 'رازوں کا راز' (Secret of Secrets) میں اشیائے فطرت کی ایک نہایت مفید 'درجہ بندی' (classification) پیش کی۔ اس نے مادوں کو زمینی، نباتاتی اور حیوانی مادوں میں تقسیم کیا اور ان میں کچھ مصنوعی طور پر حاصل کردہ مادوں کو بھی شامل کیا۔ مثلاً لیڈ آکسائیڈ (lead oxide)، کاسٹک سوڈا (caustic soda) اور مختلف مخلوط دھاتیں (alloys)۔ آگے چل کر اس نے اپنے تجربات کی فہرست سازی اور توضیحات کیں۔ پہلے اس نے اپنے استعمال میں لائے گئے مواد (materials) کی وضاحت کی، پھر اوزار/ ساز و سامان (apparatus)، طریق کار اور تجربوں کے حالات پر روشنی ڈالی[2]۔ الرازی (d. 925) نے (جدید مفہوم کی حامل) لیبارٹری قائم کی، ڈیزائننگ کی اور تفصیلات اکٹھی کیں اور بیس سے زیادہ آلات استعمال کیے۔

مسلمہ المجریطی[3] (Maslama al-Majriti, d. 1007) میڈرڈ (Madrid) میں رہنے والا ایک اندلسی تھا۔ اس کو اپنی ایک تصنیف 'رتبۃ الحکیم' (دانشوروں کے مراتب) کی وجہ سے شہرت ملی جس میں اس نے اور باتوں کے علاوہ قیمتی دھاتوں کے فارمولے اور ان دھاتوں کی تطہیر (purification) کے لئے بھی ہدایات دیں۔ المجریطی (al-Majriti, d. 1007) وہ پہلا شخص بھی تھا جس نے تحفظِ مادہ (mass conservation) کے تصور کا ذکر کیا۔ یہ لیوائزیر[4] (Lavoisier, d. 1790) سے آٹھ صدیاں پہلے کی ایک اہم دریافت تھی۔

۱۔ Introduction to Islamic Civilisation by R.M. Savory, p. 113

۲۔ Science and Technology in Islam by M. Ali Kettani, p. 79

۳۔ Maslama al-Majriti؛ مسلمہ المجریطی (950ء - 1007ء) کا نام ابو القاسم مسلمہ بن احمد ہے۔ المجریطی ماہر ریاضی دان تھے اور اندلس میں ریاضی دانوں کے امام کہلاتے تھے۔ علم فلکیات، کیمیا اور دیگر علوم پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ کیمیا میں ان کی کتب رتبۃ الحکم اور غایۃ الحکیم بہت مشہور ہیں۔

۴۔ Antoine-Lauret de Lavoisier؛ لیوائزیر (1743ء - 1790ء) ایک فرانسیسی کیمیا دان تھا۔ اسے اٹھارہویں صدی کے کیمیائی انقلاب میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ تاریخ کیمیا اور تاریخ حیاتیات پر بھی اس کے گہرے اثرات تھے۔ عوامی لٹریچر میں اسے بابائے جدید کیمیا قرار دیا گیا ہے۔

(4)۔ علم الادویات (Pharmacology)

مسلم دنیا میں علم کیمیاء کی ترقی نے فن علم الادویہ (pharmacology) کو بھی فروغ دیا۔ الرازی (al-Razi, d. 925) نے اپنی تحریروں میں علم الادویات کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا اور کیمیائی مرکبات کو علاج معالجے کے لئے استعمال کیا۔ اس کے پیشرو سابور بن سہل[1] (Sabur Ibn Sahl, d. 869) نے علم الادویات پر لکھنا شروع کر دیا تھا جس میں اس نے مختلف بیماریوں کے علاج اور دواؤں کی بہت سی اقسام پر روشنی ڈالی۔ تقریباً ایک صدی کے بعد البیرونی[2] (al Biruni, d. 1048) نے علم الادویہ پر نہایت بیش قیمت کتاب 'کتاب الصیدانہ' لکھی جس میں دواؤں کے خواص کی مکمل معلومات تھیں۔ اس میں علم الادویات کے کردار اور دوا ساز کے کردار اور فرائض کا بھی ذکر تھا۔ ابن سینا (Avicenna, d. 1037) نے تقریباً سات سو (700) معجونیں اور دیگر مرکبات تیار کیے اور ان کی تیاری کے طریقے اور ان کے خواص اور فوائد و اثرات بتائے۔ دواؤں کے بارے میں بغداد کے ابن مساویہ (Ibn Masawayh, d. 857) اور سپین کے ابن الوافد[3] (Abenguefit, d. 1074) کی تصانیف لاطینی زبان میں پچاس سے زائد بار شائع ہوئیں۔ ان کے لاطینی میں نام یہ تھے:

De Medicinis Universalibus by Mesue the, Younger

Medicamentis Simplicibus by Abenguefit

(Meyerhof, 1931)

الزہراوی (al-Zahrawi, d. 1013) نے عمل تصعید (sublimation) اور عمل

---

[1]۔ Sabur Ibn Sahl: سابور بن سہل (نویں صدی عیسوی) ایک ماہر علم الدویات تھا۔

[2]۔ Abu Rayḥan Muhammad ibn Aḥmad Al-Biruni: ابوریحان محمد بن احمد البیرونی (973ء-1048) ایک نامور مسلمان محقق اور سائنس دان تھے۔ البیرونی نے ریاضی، علم ہیئت، تاریخ اور جغرافیہ میں ایسی عمدہ کتابیں لکھیں جواب تک پڑھی جاتی ہیں۔

[3]۔ Ibn al-Wafid: ابن الوافد (997ء-1074ء) ایک ماہر طبیب اور علم الدویات تھا۔ اس کا تعلق ہسپانیہ کے شہر طلیطلہ (Toledo) سے تھا۔ اس کی شہرہ آفاق تحقیقی کتاب کا نام کتاب الدویۃ المفردہ ہے۔ جسے لاطینی زبان میں De medicamentis simplicibus کے نام سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

کشید(distillation) کے ذریعے دوا سازی میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ اس کی کتاب 'Liber Servitoris' یہ بتاتی ہے کہ سادہ اور پیچیدہ دوائیں کیسے بنائی جاسکتی ہیں۔ الزہراوی (al-Zahrawi, d. 1013) نے مردہ سنگ[1] (Litharge)، سفید سیسہ(white lead) کشتہ سیسہ(lead sulphide)، کشتہ تانبا(burnt copper)، کیڈمیا[2](cadmia)، مارکاسائیڈ(marcaside)، زرد سنکھیا(yellow arsenic)، چونا(lime) اور مختلف قسم کی پھٹکڑیاں(various vitriols)، نمکیات(salts) خام شورہ(natron) اور دیگر مادے تیار کرنے کی تراکیب بتائیں۔ اس نے مقطر اور کشید کردہ مصنوعات (اگرچہ شراب نہیں) بھی تیار کیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس دور میں عمل کشید، بطور ذریعہ دوا سازی شروع ہو چکا تھا[3]۔

ابو المنصور المؤفق[4] (Abu Mansur Muvaffak Harawi, d. 976) نے 'Foundations of the True Properties of Remedies' لکھی جس میں اس نے 'آرسینس آکسائیڈ'(arsenious oxide) اور 'سیلیسک ایسڈ'(silicic acid) پر روشنی ڈالی اور سوڈیم کاربونیٹ (sodium carbonate) اور پوٹاشیئم کاربونیٹ (potassium carbonate) میں امتیاز کیا۔ تانبہ کے مرکبات(copper compounds) کے زہریلے اثرات بالخصوص کاپر وٹرائل(copper vitriol) کی طرف توجہ دلائی اور مرکبات پر بھی روشنی ڈالی۔ اس نے سمندر کے پانی کو پینے کے لیے میٹھے میں تبدیل کرنے کا طریقہ کشید کا بھی ذکر کیا[5]۔

'مارٹن لیوے'[6](Martin Levey, d. 1970) کے مطابق مسلمانوں کی دوا سازی کی

---

[1]۔ Litharge لیڈ آکسائیڈ(PbO) کی قدرتی معدنی شکلوں میں سے ایک ہے۔

[2]۔ کیڈمیا، زنک (جست) کا ایک آکسائیڈ ہے جو ان بھٹیوں کے اطراف میں جمع ہو جاتا ہے جن میں تانبا یا پیتل پگھلایا گیا ہو اور زنک بخارات میں بدل جاتی ہے۔

[3]۔ Sherwood Taylor, A History of Industrial Chemistry by Sherwood Taylor, p. 140-141

[4]۔ Abu Mansur Muvaffak Harawi؛ ابومنصور المؤفق ہروی (دسویں صدی عیسوی) کا ایک ماہر طبیب تھا۔

[5]۔ Makers of Chemistry by E.J. Holmyard, p. 68

[6]۔ Martin Levey؛ مارٹن لیوے(1913ء-1970ء) امریکی تاریخ دان برائے کیمیا تھا۔

کتب نے نہایت احتیاط سے عملی تحقیق وتفتیش کے اصول اختیار کیے جو دوا فروشی اور علاج معالجہ کرنے والوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہوئے۔ لیوے(Levey, d. 1970)اس نے دوا سازی میں مسلمانوں کی خدمات کا یوں ذکر کیا:

(i)۔ دوا سازی کی تراکیب: جن میں بہت سی اقسام کی دوائیں، گولیاں، دافع عفونت دھونیاں (pastilles)،سفوف،شربتیں،روغن،مالش کا تیل اور منجن تیار کرنا شامل ہیں۔

(ii)۔ زہریات(poisons) کی کتابیں لکھی گئیں۔

(iii)۔ بیماریوں کی علامات پر کتابیں جن میں طبی فوائد کے حامل پودوں کی فہرستیں ہیں۔ یہ حروف تہجی کی ترتیب سے بنائی گئی ہیں تاکہ قاری دوسری زبانوں میں بھی دوائیں شناخت کر سکیں۔

(iv)۔ جدول کے طور پر مرتب شدہ کتب جن کی وجہ سے طویل موضوعات مختصر ہو گئے اور وہ فوراً اور آسانی سے تلاش کیے جا سکتے تھے۔ جب کہ ان کے اقتباسات ویسا ہی کام دے سکتے تھے۔

(v)۔ مفرد دواؤں(Materia Medica) کی فہرستیں جن میں علاجیات و شفائیات سے متعلق مختلف مصنفین کی آراء، دواؤں کی تیاری اور اس شعبے میں متعلقہ مواد کی تفصیلات شامل ہیں۔

(vi)۔ دستیاب نہ ہونے والی دواؤں کی متبادل ادویہ بتا دی گئیں۔ میڈیکل سپیشلٹیز (medical specialties) پر کتابیں مہیا کر دی گئیں خواہ وہ الگ نسخے کی صورت میں ہیں یا دواؤں کی بڑے حجم کی انسائیکلو پیڈیاز کے حصے کے طور پر ہیں[1]۔

(5)۔ ریاضی(Mathematics)

اسلامی دنیا نے آٹھویں صدی عیسوی سے ریاضیاتی علوم میں نمایاں اضافے کرنا شروع کر دیئے تھے۔ انہوں نے یونان اور ہندوستان کی ریاضیاتی پیش قدمیوں کو ملا جُلا کر اور اس میں اپنی پیش رفتوں کو بھی شامل کر کے اس علم کو نئی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ اسلام نے چونکہ انسانی شکل کی مصوری و نمائش کی ممانعت کی تھی اس لیے مسلمانوں نے عمارتوں کی تزئین و آرائش کے لئے پیچیدہ اقلیدسی اشکال (complex geometric patterns) کو وسیع پیمانے پر استعمال کیا۔ اس کے نتیجے میں ریاضی ایک ہنر(art) بن گیا۔

1۔Early Arabic Pharmacology by Martin Levey, p. 68-70

810ء کے آس پاس بغداد میں قائم ہونے والے بیت الحکمہ نے یونان اور ہندوستان کی ریاضی کی ضخیم کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ نویں صدی میں ذہین ریاضی دان الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) بیت الحکمہ کا اولین مہتمم (Rector) تھا۔

الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) جس کا نام لاطینی زبان میں 'الگورتمی' (Algoritmi) لیا جاتا تھا، نے ریاضی کے فروغ میں زبردست کردار ادا کیا اور الجبرا اور علم مثلثات (Trignometry) میں اختراعات کی بنیاد رکھ دی۔ اس کی سب سے بڑی تصنیف 'الکتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلۃ'

(The Compendious Book on Calculation by Completion and Balancing)

ایک ریاضی کی کتاب ہے جو لگ بھگ 830ء میں لکھی گئی تھی۔ 'الجبرا' کی اصطلاح مساوات کے بنیادی طریق ہائے کار میں سے ایک سے ماخوذ ہے جو الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) نے اپنی کتاب 'الجبر' میں بیان کیا ہے۔ اس کا مطلب 'سابقہ حالت پر واپس لانے کا عمل' (restoration) ہے۔ وہ اس طرح کہ مساوات کی دونوں جانب ایک عدد کا اضافہ کر دیا جاتا ہے تاکہ رقموں کو تقویت دی جائے یا منسوخ کر دیا جائے۔ اس کتاب کا لاطینی میں ترجمہ رابرٹ چسٹر[1] (Robert of Chester, d. n.d.) اور گیراڈ آف کریمونا (Gerard of Cremona, d. 1187) نے Liber algebrae et almucabala کے نام سے کیا۔ کتاب نے کثیر رقمی مساواتوں کو سکینڈ ڈگری تک حل کرنے کا ایک جامع طریقہ پیش کر دیا۔ تقلیل (reduction) کرنے اور متوازن (balancing) کرنے کے بنیادی طریقوں پر بحث کی[2]۔ الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) نے خطی اور چوکور مساواتوں کو بھی حل کیا۔

یونانی تصور ریاضی سے ہٹ کر الجبرا کا آغاز ایک انقلابی اقدام تھا جو اساسی طور پر اقلیدسی (geometrical) تھا۔ الجبرا ایک وحدانی نظریہ تھا جو عددِ ناطق (rational numbers)، عددِ

---

[1]۔ Robert of Chester؛ رابرٹ چسٹر بارہویں صدی کا ماہر مترجم تھا جس نے خوارزمی اور جابر بن حیان کی عربی کتب کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔

[2]۔ The Arabic Hegemony: A History of Mathematics by Carl R Boyer , p. 252

غیر ناطق (irrational numbers) اور اقلیدسی مقداروں (geometrical magnitudes) کو الجبری اعداد کے طور پر لانے کا متقاضی تھا۔ اس نے ریاضی کو نہ صرف کلی طور پر نئی جہت دے دی (جو پہلی جہت سے بہت ہی وسیع تھا) بلکہ اس نے اس مضمون کو مستقبل میں ترقی دینے کے لئے ایک آلہ بھی مہیا کر دیا۔ الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) نے تقلیل (reduction) اور متوازن (balancing) کے لئے بنیادی الجبرائی طریقے متعارف کرائے اور کثیر رقمی مساوات کو سیکنڈ ڈگری تک حل کرنے کے لئے ایک جامع طریقہ مہیا کر دیا۔ اس طرح اس نے ایک طاقتور تجریدی ریاضیاتی زبان تخلیق کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ زبان اب بھی پوری دنیا میں استعمال ہوتی ہے اور اس نے ریاضی کے قضیات (mathematical problems) کا تجزیہ کرنے کا بہتر طریقہ فراہم کر دیا ہے۔

الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) کی دوسری بڑی تصنیف 'کتاب الجمع والتفریق بحساب الہند' تھی جو اندازاً 825ء میں لکھی گئی۔ اس کتاب نے پورے مشرق وسطیٰ اور یورپ میں ہندو عربی نظامِ ہندسہ پھیلا دیا۔ اس کا لاطینی زبان میں نام 'Algoritmi de numero indorum' ہے۔ الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) کا لاطینی زبان میں نام 'الگورتھمی' (Algoritmi) تھا۔ اسی سے 'الگورتھم' (algorithm) کی اصطلاح وجود میں آئی۔ ریاضی کے لئے اس کا اہم ترین کردار یہ تھا کہ اس نے ہندو عربی نظامِ اعداد (9-1 اور O) کی ترویج کے لئے پرزور وکالت کی۔ جس نے ہندوستانی ریاضی کی شکل اختیار کر لی۔ اسے اس نے ایسی قوت اور صلاحیت قرار دیا جس سے ریاضی میں انقلاب آ سکتا ہے۔ اسے پوری دنیا نے اختیار کر لیا۔ اس کی کتاب 'زج سند ہند' (Zij al-Sindhind) میں بھی sines اور cosines کے مثلثاتی تفاعل کے پیمانے (tables) موجود تھے۔ اس کی طرف 'کروی مثلثات' (Spherical trignometry) کی ایک کتاب بھی منسوب ہے۔

الکرجی[1] (al-Karaji, d. 1029) نے الجبرا کو اس کے اقلیدسی (geometrical) ورثے سے آزاد کرا کر اور نظریۂ الجبری علم الاحصاء (Algebric calculus) متعارف کرا دیا۔ اس طرح الجبرا کی سرحدیں مزید آگے دھکیل دی گئیں۔

الکرجی (al-Karaji, d. 1029) اپنے حاصل کردہ نتائج ثابت کرنے کے لئے ریاضیاتی

---

[1] Abu Bakr ibn Muḥammad ibn al Ḥusayn al-Karaji؛ ابوبکر بن محمد بن الحسین الکرجی (953-1029) ایک ماہر ریاضی دان اور انجینیر تھے۔

استقراء (mathematical induction) کا طریقہ استعمال کرنے والا پہلا شخص تھا۔ وہ بتاتا تھا کہ اگر اعداد صحیحہ کا ایک مجموعہ پہلے عدد صحیح تک درست ہے تو اسے زیر بحث عدد صحیح کے معاملے میں بھی درست ہونا چاہیے۔ بہ الفاظ دیگر اعداد کے دیئے گئے مجموعے کا ثبوت پہلے عدد صحیح تک درست ثابت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اگر یہ سابقہ اعدادِ صحیح کے معاملے میں درست ہے تو اسے زیر بحث عدد صحیح کے معاملے میں بھی درست ہونا چاہیے۔ اس نے 'ثنائی مسئلے' (Binominal theorem) کو ثابت کرنے کے لئے ریاضیاتی استقرا (mathematical induction) کو استعمال کیا۔ یہ ایک فارمولا ہے جس کی مدد سے کسی بھی دو عددی جزو کے اضعاف کے بغیر کسی تفصیلی حساب کے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔ یہ صرف جمع تفریق ضرب اور مثبت عددِ سالم کے اوپر لگی ہوئی علامت یا نشانی (جو یہ ظاہر کرے کہ اس کی کتنے درجے کی قوت ہے) سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ مثلاً $(Y+X)^2$۔ عددی سروں (Co-efficients) کی اس وقت ضرورت پڑتی ہے جب ایک دو رقمے (binomial) کو پھیلا کر مثناکل مثلث بنایا جائے۔ اسے عام طور پر 'پاسکل ٹرائینگل' (Pascal's Triangle) کہا جاتا ہے۔ یہ سترہویں صدی عیسوی کے ایک ریاضی دان بلز پاسکل[1] (Blaise Pascal, d. 1662) سے منسوب ہے۔ اگرچہ دیگر ریاضی دانوں نے اس کا صدیوں پہلے مطالعہ کیا تھا جن میں الکرجی (al-Karaji, d. 1029) بھی شامل تھا۔

عمر خیام[2] (Omar Khayyam, d. 1131) نے بارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں جذر اور جذر الکعب نکالنے کے ہندوستانی طریقوں کی تعمیم (generalized) کر کے اس میں چوتھی، پانچویں اور اس سے بڑی بڑی جذریں شامل کر لیں۔ اس نے مکعبی قضیوں (cubic problems) کا باضابطہ تجزیہ کر کے انکشاف کیا کہ دراصل مساوات (equations) کی بہت سی مختلف اقسام ہیں۔ اس نے 1070ء میں ایک نہایت ذی اثر کتاب

'Treatise on Demonstration of Problems of Algebra'

---

[1]۔ Blaise Pascal: بلیز پاسکل (1623ء - 1662ء) ایک فرانسیسی ریاضی دان طبیعیات دان، موجد، مصنف اور مسیحی فلسفی تھا۔ شروع میں اس نے قدرتی اور اطلاقی سائنسز پر کام کیا۔ جس میں اس نے مائعات پر تحقیقات کیں اور دباؤ اور خلا کے تصورات کو واضح کیا۔ اس نے کیلکو لیٹر پر بھی کام کیا۔ پاسکل کے کیلکو لیٹرز اور بعد ازاں پاسکلائنز بنائے جس سے ثابت ہو گیا کہ وہ 'مکینیکل کیلکو لیٹر' کے پہلے دو موجدوں میں سے ایک تھا۔

[2]۔ عمر خیام (1048-1131) علم ہیئت اور علم ریاضی کا بہت بڑا فاضل تھا۔ ان علوم کے علاوہ شعر و سخن میں بھی اس کا پایا بہت بلند ہے۔ اس کے علم و فضل کا اعتراف اہل ایران سے بڑھ کر اہل یورپ نے کیا۔

لکھی جس میں الجبرا کے اصول مرتب کیے گئے تھے جو آخر کار یورپ پہنچ گئے۔ خاص طور پر اس نے مکعبی مساوات کے سوال حل کرنے کے عمومی طریقے وضع کر لیے حتیٰ کہ انہیں اعلیٰ درجوں تک پہنچا دیا۔ اس کتاب میں اس نے دو رقمی مقداروں (binomical coefficients) کی مثلثی ترتیب پر روشنی ڈالی جو آگے چل کر پاسکل کی مثلث کہلانے لگی۔ 1077ء میں خیام (Khayyam, d. 1131) نے 'شرح ما اشکل من مصادرات کتاب اقلیدس' لکھی جس کا انگلش میں ترجمہ 'On the Difficulties of Euclids Definitions' کے نام سے کیا گیا[1]۔

طوسی[2] (d. 1274) علم المثلثات (trigonometry) کو ایک الگ ریاضیاتی شاخ کے طور پر لینے والا پہلا شخص تھا جو فلکیات سے غیر مماثل ہے۔ مثلث میں حادہ زاویئے کے تفاعل (sine) پر یونانی اور ہندوستانی تحریروں کو توسیع دیتے ہوئے کروی مثلثیات (spherical trignometry) کی اولین وسیع تشریح کی۔ جس میں کروی مثلثیات میں قائمۃ الزاویہ مثلث کے چھ واضح غیر مماثل کیسوں کی فہرست شامل تھی۔ ریاضی میں اس کی گرانقدر خدمات میں ایک خدمت یہ تھی کہ اس نے مستوی مثلثوں کے حادہ زاویوں کے تفاعلات (sines) کے مشہور قانون کی تشکیل کی:

(Sin C)/c=(Sin B/b=(Sin A)/a

اگرچہ کروی مثلثوں کے لئے 'sine law' دسویں صدی عیسوی کے ایرانی عالم ابو الوفا[3] (Abu al-Vafa, d. 998) اور ابونصر منصور[4] (Abu Nasr Mansur, d. 1036) دریافت کر چکے تھے۔

---

[1] ۔From Zoroaster to Umar Khayyam; An Anthology of Philosophy in Persia by Prof. S. Hossein Nasr and Prof. Mehdi Aminrazavi, vol. 1

[2] ۔خواجہ محمد بن محمد بن حسن طوسی (1201ء۔1274ء) المعروف محقق طوسی ایک عالم، شاعر اور سائنسدان تھا۔

[3] ۔ابوالوفاء ایک عظیم ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا جس نے بے شمار کتابیں لکھیں اور یونانی زبان سے عربی زبان میں ریاضی کی کتب کا ترجمہ بھی کیا۔

[4] ۔Abu Nasr Mansur: ابونصر منصور بن علی بن عراق (970ء-1036ء) ریاضی اور فلکیات کے ماہر تھے۔ اس کا شمار ابوالریحان البیرونی کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ ان کی کتب رسالہ فی اصلاح شکر من کتاب منلاوس فی الکریات، المجسطی الشاہی اور الدوائر التی تحد الساعات الزمانیہ ہیں۔

ثابت ابن قرا[1] (Thabit ibn Qurra,d. 901) نے ایک عام کلیہ وضع کیا جس سے اعداد متحبہ (Amicable) اخذ کیے جا سکتے تھے۔ یہ ایسے اعداد کا جوڑا ہیں جن کے لئے ایک عدد کے تقسیم کنندوں کا حاصل جمع دوسرے عدد کے مساوی ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر 220 کے صحیح تقسیم کنندے 1، 2، 4، 5، 10، 11، 20، 22، 44، 55 اور 110 ہیں۔ 284 کے صحیح تقسیم کنندے 1، 2، 4، 71 اور 142 ہیں جن کا حاصل جمع 220 ہے۔ اس کلیے کو بعد میں بہت دیر سے فرمیٹ[2] (Fermat, d. 1665) اور 'ڈیکارٹ'[3] (Rene Descartes, d. 1650) دونوں نے از سرنو دریافت کیا۔

ابوالہیثم (ibn al-Haytham, d. 1040) نے بصریات، طبیعیات، الجبرا اور جیومیٹری کے درمیان ربط قائم کرنے پر عظیم الشان کام کرنے کے علاوہ ایک ایسا طریقہ بھی وضع کیا جسے اب 'مسئلہ ابن الہیثم' (Alhazen's problem) کہا جاتا ہے۔ آخر کار اس نے اسے 'چوتھی قوتوں' کے مجموعے کا فارمولا اخذ کرنے کی طرف رہنمائی کی۔ جبکہ اس سے پہلے صرف مربعوں اور مکعبوں کے مجموعے کے فارمولے بیان کیے گئے تھے۔ اس کے طریقے کو فوری تعمیم (generalized) کر کے اعدادِ صحیح کی قوتوں کے حاصلِ جمع کا فارمولا تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس نے انٹیگرل پاورز (integral powers) کے حاصل جمع کے اپنے نتیجے کو اس کام کے لئے استعمال کیا جسے انٹیگریشن (integration) کہا جاتا ہے۔

---

[1] ۔Thabit ibn Qurra؛ ثابت بن قرا (826ء-901ء) ایک عرب ریاضی دان، ماہر طب وفلکیات اور مترجم تھا۔ اس نے الجبرا، جیومیٹری اور فلکیات میں اہم دریافتیں کیں۔ فلکیات میں اسے بطلیموسی نظام کے اولین مصلحین میں شمار کیا جاتا ہے۔ ابن قرا مکینیات کی ایک شاخ سکونیات کا بانی تھا جو حالت توازن کے دوران مادّی نظاموں پر پڑنے والے بوجھ کے تجزیئے سے تعلق رکھتی ہے۔

[2] ۔Pierre de Fermat؛ پائری ڈی فرمٹ (1601ء-1665ء) ایک فرانسیسی قانون دان اور ریاضی دان تھا۔ اس نے تجزیاتی جیومیٹری امکانیات اور بصریات میں قابل ذکر تحقیق کی۔ اس کا سب سے بڑا تعارف 'Fermats last Theorem' ہے جو بیان کرتا ہے کہ کوئی تین مثبت اعدادِ صحیحہ 'a, b, and c' اس مساوات 'cn=bn+an' کو 'n' کی دو سے زیادہ 'Integer value' کو مطمئن نہیں کر سکتی۔

[3] ۔Rene Descartes؛ رینے ڈیکارٹ (1596-1650)، ایک فرانسیسی سائنسدان اور ریاضی دان تھا جس نے ریاضی میں Analytic geometry میں نمایاں کام کیا۔ ڈیکارٹ نے فلسفہ میں شک کا طریقہ کار اپنایا۔ یہ طریقہ صرف انسان کی ذاتی موجودگی کو ثابت کرتا ہے یعنی کہ میں سوچتا ہوں، اس لیے میں موجود ہوں۔

جس میں سالم مربعوں اور 'چوتھی قوتوں' کے حاصل جمع کے فارمولوں نے اس کے لئے 'مکافی مجسم' (paraboliod) کے حجم کو شمار کرنے میں آسانی پیدا کر دی۔

ابو کامل[1] (Abu Kamil, d. 930) نے الجبرا پر کتاب لکھی۔ یہ کتاب مربع مساواتوں کے حل الجبرا کے جیومیٹری پر اور دیافنطسی تحلیل (diophantine equations) کی مساوات پر اطلاق سے متعلق ہے۔ اسے پہلا ریاضی دان سمجھا جاتا ہے جس نے غیر منطقی اعداد کو بطور حل اور مساوات کے 'عددی سر' (coefficients) کے طور پر استعمال اور قبول کیا۔ اس کے ریاضیاتی طریق کار کو بعد ازاں اطالوی ریاضی دان فبیو ناشی[2] (Leonardo Pisano Bigollo, d. 1250) نے اختیار کیا اور اس قابل بنایا کہ وہ یورپ کو الجبرا سے متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کرے۔ وہ پہلا مسلمان ریاضی دان تھا جو الجبرائی مساوات کو بہ آسانی ''X^2'' (تا X^8) حل کرتا ہے اور وہ 'غیر مخطط ہمزاد مساوات' (non-linear simultaneous equations) کو تین متغیرہ مقداروں کے سیٹ حل کر سکتا تھا۔ اس نے سب قضیوں کو خطیبانہ انداز میں لکھا اور اس کی بعض کتابوں میں ریاضیاتی ترقیم موجود نہیں۔ مثال کے طور پر وہ (X^5 (i.e.،X^2X^2X کے لئے عربی اظہار 'مل مل شے' (mal mal shay) (مربع مربع چیز) استعمال کرتا ہے۔ اس نے الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) کی تصانیف کی اصلاح کی اور جیومیٹری کو حروف تہجی کے طور پر مرتب کیا۔ اس کی تحقیق میں چوکور مساوات 'ضرب' الجبرائی مقداریں اور جذروں کی جمع اور منفی بھی شامل ہیں۔

۱۔ Abu Kamil Shuja ibn Aslam: ابو کامل شجاع بن اسلم بن محمد بن شجاع الحاسب (850ء-930ء) ایک مصری انجینئر اور حساب دان (mathematician) تھے۔ انہیں خوارزمی کے بعد سب سے بڑا حساب دان مانا جاتا ہے۔ ان کی ریاضی اور علم فلکیات پر بہت ساری تصانیف ہیں جن میں سے کچھ کے نام کتاب الجمع والتفریق، کتاب الخطاین، کتاب کمال الجبر وتمامہ والزیادہ فی اصولہ (کتاب الکامل)، کتاب الوصایا بالجبر والمقابلہ، کتاب الوصایا بالجذور، کتاب الشامل، کتاب الکفایہ، کتاب المساحہ والہندسہ، کتاب الطیر اور کتاب مفتاح الفلاحہ۔ اس کے علاوہ ان کی جبر اور حساب پر بھی کافی تصانیف ہیں۔ الجبری کلیے حل کرنے اور انہیں ہندسی مسائل حل کرنے کے لیے استعمال کرنے میں وہ اپنے زمانے کے یکتا تھے۔ ابوالکامل تیرہویں صدی عیسوی تک یورپ کے سائنسدانوں کے لیے ریفرنس رہے۔

۲۔ Leonardo Pisano Bigollo: لیونارڈو بوناکسی (1170ء-1250ء) المعروف فبیو ناشی ایک اطالوی ریاضی دان تھا۔ وہ عہد متوسط کا ایک نہایت ذہین ریاضی دان شمار ہوتا تھا۔ اس نے مغربی دنیا میں ہندو عربی شماریاتی نظام متعارف کروایا۔

(6)۔ علم فلکیات (Astronomy)

علم فلکیات خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور میں شروع ہوا۔ یہ 'سریا سدھانتا'[1] (Surya Siddhanta) سے بہت متاثر تھا۔ یہ ایک سنسکرت کی کتاب تھی جو ہندوستان سے بغداد لائی گئی اور اس کا محمد بن ابراہیم الفزاری[2] (d. 796 or 806) اور الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) نے عربی میں ترجمہ کیا۔ اسی زمانے میں عہد ساسانی میں مرتب کردہ پہلوی جدول کے گوشواروں (Pahlavi tables (zij)) اور یونانی علم فلکیات کی کتب کے عربی زبان میں تراجم کیے گئے۔ بطلیموس (Ptolemy, d. 170) کی تصنیف المجسطی[3] (Al-magest) کے بھی عربی میں کئی تراجم ہوئے۔

الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) نے فلکیات پر ایک گرانقدر مقالہ لکھا اور اپنے گوشوارے (zij) مرتب کیے جن پر دو صدیوں کے بعد ایک سپینی ماہر فلکیات مسلمہ المجریطی (Maslama al-Majriti, d. 1007) نے نظرِ ثانی کی اور اڈیلارڈ آف باتھ[4] (Adelord of Bath, d. 1152) نے اس کا لاطینی میں ترجمہ کر دیا۔ یہ گوشوارے (zij) بعد ازاں فلکیاتی سرگرمیوں کی بنیاد بنے جبکہ یونان اور ہندوستان کے فلکیات کے تمام یونانی گوشوارے (zij) کی جگہ نئے گوشوارے نے لے لی۔

مامون الرشید[5] (d. 833) نے اپنی سلطنت میں متعدد مقامات پر جدید ترین آلات سے لیس رصدگاہیں قائم کر رکھی تھیں جن میں سے سورج کے نقاطِ اعتدالین (equinoxes)، گہن، دمدار

---

[1]۔ Surya Siddhanta؛ سُریا سدھانتا ہندوستانی علم فلکیات کے متعلق متعدد مقالوں کا نام ہے۔ اس میں روشنی پھیلانے والی چیزوں کی حرکات کا تعین کرنے کے قواعد بیان کئے گئے ہیں جو آسمان میں ان کے حقیقی مقامات کی تصدیق کرتے ہیں۔

[2]۔ محمد ابن ابراہیم الفزاری ایک مسلمان فلسفی، ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا۔

[3]۔ 'المجسطی' (Al-magest) ایک دوسری صدی کا ریاضیاتی اور فلکیاتی مقالہ ہے جو ستاروں کی ظاہری حرکات اور سیاروی راستوں کے بارے میں ہے۔ یہ رومن عہد کے مصری سکالر بطلیموس نے یونانی زبان میں لکھا۔

[4]۔ Adelard of Bath؛ اڈیلارڈ (1080ء-1152ء) انگلش فلاسفر تھا۔ اس کی وجہ شہرت عربی زبان سے لاطینی اور جرمن میں کتب کے ترجمہ کرنے سے ہے۔

[5]۔ مامون الرشید بن ہارون الرشید (786ء-833ء) ساتواں عباسی خلیفہ تھا۔ اس کی دانائی، عزم، بردباری، علم دوستی، رائے، تدبیر، ہیبت، شجاعت، عالی حوصلگی اور فیاضی کی وجہ سے علم کے مختلف شعبہ جات نے بہت ترقی کی۔

سیاروں کا ظہور اور دیگر آسمانی مظاہر دیکھے جا سکتے تھے۔ زمین کا حجم بحر احمر کے ساحلوں سے ایک زاویہ ناپنے سے معلوم کر لیا جاتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب یورپ پوری دل جمعی سے زمین کے چپٹی ہونے کا دعویٰ کر رہا تھا۔

ابو الحسن کا دور بین ایجاد کرنا فلکیاتی مشاہدات کی طرف نہایت اہم قدم تھا۔ الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) کی کامیابیوں میں سے اہم ترین کامیابی ارض پیمائی (geodetic operation) کے سلسلے میں تھی۔ یہ زمین کے حجم اور اس کے محیط کے تعین کا طریق کار تھا۔ زمین ناپنے کا عمل میدانِ 'سنجر' (ایران) اور 'پامیرا' (شام) میں کیا گیا۔ اس کا حاصل نتیجہ 3256 عربی میل نکلا جو سماوی نصف النہار (meridian) کے ایک درجے (degree) کی لمبائی تھی۔ یہ حیرت انگیز طور پر ایک صحیح نتیجہ تھا۔ یہ اس جگہ کے درجے کی حقیقی لمبائی سے تقریباً 2877 فٹ زیادہ تھا۔ اس پیمائش نے وہ تخمینہ مہیا کر دیا جو زمین کے قُطر کی لمبائی 6500 میل ظاہر کرتا تھا جبکہ اس کا محیط 400,20 میل بنتا تھا[1]۔ یہ حالیہ جدید پیمائش (values)، 111.3 کلومیٹر فی درجہ قطر اور 40,068 کلومیٹر محیط کے بہت قریب تھا[2]۔

جابر بن سنان البتانی[3] (Albategnius, d. 929) ایک ممتاز ماہر فلکیات تھا۔ اس کے گوشواروں (tables) کے ترجمے نے کئی صدیوں تک یورپ کو فلکیاتی تحقیقات کے لئے ایک بنیاد فراہم کی۔

اس نے سورج کے حلقہ نما گرہنوں (annular eclipses) کا امکان ثابت کیا اور دائرۃ البروج کی خمیدگی، مداری سال (tropical year) کی طوالت، موسموں کے اختتام اور سورج کے بیضوی مدار کی اوسط کا نہایت درستی سے تعین کیا۔ فلکیات میں البتانی (Albategnius, d. 929) کے کارہائے نمایاں میں سے ایک شمسی سال کے دورانیے کا صحیح تعین تھا جو 365 دنوں، 5 گھنٹوں، 46 منٹوں اور 24 سکینڈوں پر مشتمل نکلا۔ اس نے بطلیموس (Ptolemy, d. 170) کے اخذ کردہ نتائج کو درست

۱۔ Mathematical Geography by Edward S. Kennedy, p. 187 - 188

۲۔ Mathematical Geography by Edward S. Kennedy, p. 187 - 188

۳۔ Jabir ibn Sinan al-Battani (Albategnius)؛ جابر بن سنان البتانی (858-929) کا شمار دنیا کے عظیم ترین فلکی سائنسدانوں میں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ان کے وہ اہم نظریات ہیں جو انہوں نے اس میدان میں وضع کیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے جبر، حساب اور مثلثات میں بھی کافی نظریات متعارف کروائے۔

کیا اور سورج اور چاند کے نئے گوشوارے (tables) مرتب کیے جو طویل عرصے تک مستند مانے جاتے رہے۔ اس کی بعض پیمائشیں کاپرنیکس[1] (Copernicus, d. 1543) کی لی ہوئی پیمائشوں سے بھی زیادہ درست نکلیں جو کئی صدیاں بعد لی گئی تھیں۔ البتانی (Albategnius, d. 929) کی کتابیں مغرب کی سائنس اور فلکیات کے ارتقاء کے لئے نہایت اہم ذریعہ سمجھی جاتی ہیں۔ کاپرنیکس (Copernicus, d. 1543)، البتانی (Albategnius, d. 929) کے تحقیقی کام کا اتنا معترف تھا کہ اس نے اپنی کتاب De Revolutionibus orbium coelestium میں اس کا 23 بار حوالہ دیا۔ البتانی (Albategnius, d. 929) کا ذکر 'Commentariolus'[2] میں بھی آیا ہے۔ جان کیپلر (Kepler, d. 1630) اور گیلیلیو[3] (Galileo, d. 1645) نے اس کے بعض مشاہدات میں دلچسپی لی اور اس کا معلوماتی مواد (observational data) جیوفزکس (geophysics) میں آج تک استعمال ہو رہا ہے[4]۔

البیرونی[5] (al-Biruni, d. 1048) کی کتاب 'القانون المسعودی' علم فلکیات کی قاموس (encyclopedia) ہے جس میں البتانی (Al-bategnius, d. 929) کے مشاہداتی مواد (observational data) کو بطلیموس (Ptolemy, d. 170) کے 'ساکت شمسی اوج'

---

[1] Nicolaus Copernicus؛ نکولس کاپرنیکس (1473ء-1543ء) ایک معروف ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا۔ اس نے پہلی دفعہ زمین کی بجائے سورج کا کائنات کے مرکز ہونے کا نظریہ پیش کیا۔

[2] 'Commentariolus' 40 صفحوں پر مشتمل نظام اجرام فلکی کے بارے میں ایک مختصر خاکہ ہے جس میں اجرام فلکی کا مرکز زمین کی بجائے سورج قرار دیا گیا ہے۔ کاپرنیکس نے اپنے اس نظریے پر مزید غور وفکر کے بعد 1543ء میں اپنی شاہکار کتاب De revolutionibus orbium coelestium(On the revolutions of the Heavenly Spheres) میں اس نظریے کو بہتر بنایا۔

[3] (Galileo Galilei) گیلیلیو (1564-1642) ایک اطالوی ماہر فلکیات اور فلسفی تھا۔ گیلیلیو نے اشیا کی حرکات، دوربین، فلکیات کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کیں۔ اسے جدید طبیعیات کا باپ کہا جاتا ہے۔

[4] Dictionary of Scientific Biography by William Hartner, Vol.1, p. 507-516

[5] Abu Rayḥan Muhammad ibn Aḥmad Al-Biruni؛ ابوریحان محمد بن احمد البیرونی (973ء-1048) ایک نامور مسلمان محقق اور سائنس دان تھے۔ البیرونی نے ریاضی، علم ہیئت، تاریخ اور جغرافیہ میں ایسی عمدہ کتابیں لکھیں جو اب تک پڑھی جاتی ہیں۔

(immobile solar apogee) کو ردّ کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے گرہن کی **معلومات** (observational data) کو 1749ء میں 'رچرڈ ڈنتھورن'[۱] (Richard Dunthorne, d. 1775) نے چاند کے اسراع (acceleration) کے تعین میں مدد کے لئے استعمال کیا۔ اس کا مشاہداتی مواد(observational data) ڈیٹا وسیع تر فلکیاتی تاریخی ریکارڈ میں شامل ہو گیا اور آج بھی جیوفزکس (geophysics) اور فلکیات میں استعمال ہوتا ہے[۲]۔

ملک شاہ سلجوقی[۳] (Malik Shah- I, d. 1092) نے نیشا پور میں(1974ء یا 1975ء) میں ایک رصدگاہ قائم کی جہاں خیام(Khayyam, d. 1131) اور ابوالفتح الخازنی[۴] (Abu al-Fath al Khazini, d. n.d.) نے ایسے فلکیاتی مشاہدات کیے جن کی بنا پر عیسوی تقویم (Gregorian calendar) سے 600 سال قبل ایک اصلاح شدہ کیلنڈر وجود میں آ گیا تھا۔ اس کیلنڈر (نظام تقویم) کو 'التاریخ جلالی'[۵] (al Tarikh Jalali) کہا جاتا تھا۔ یہ مداری سال

۱۔ Richard Dunthorne؛ رچرڈ ڈنتھورن (1711ء-1775ء) ایک برطانوی ماہر فلکیات اور مساحت کار تھا جو کیمبرج میں کام کرتا تھا۔

۲۔ Historical Eclipses and Earthis Rotation by Francis Stephenson, p. 431

۳۔ Malik Shah- I؛ ملک شاہ سلجوق (1055ء-1092ء) سلجوقی سلطنت کا تیسرا حکمران تھا جو اپنے والد الپ ارسلان کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا اور 1072ء سے 1092ء تک حکمران رہا۔

۴۔ Al-Khazini؛ ابوالفتح عبدالرحمن ابوجعفر الخازنی (گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی) کے ایک عظیم سائنسدان ہیں۔ ان کی ایک کتاب کا نام میزان الحکمہ ہے جس میں تمام پیمانے جمع کیے گئے اور وزن کی وجوہات بیان کی گئیں ہیں۔ اس طرح پیرومیٹر، تھرمومیٹر اور دیگر جدید پیمانوں کی ایجاد کی راہ ہموار ہوئی۔ الخازنی نے فزکس اور میکینکل میں بھی کام کیا اور فلکیاتی ٹیبل بھی بنائے جو الزیج المعتبر السنجاری کے نام سے جانے گئے۔ انہوں نے ہوا اور پانی میں اجسام کا وزن کرنے کے لیے خاص پیمانے بنائے اور اس طرح گویا دباؤ اور درجہ حرارت کے ناپ کی راہ ہموار کرنے والے پہلے سائنسدان بنے۔

۵۔ تاریخ الجلالی المعرف جلالی کیلنڈر دراصل ایرانی قدیم شمسی تقویم (کیلنڈر) کی نئی شکل ہے جسے عمر خیام اور اسکے ساتھیوں نے سلطان جلال الدین ملک شاہ سلجوقی (d. 1092) کے کہنے پر بنایا تھا۔ سلطان جلال الدین (ملک شاہ اول) کے نام پر کیلنڈر کا نام جلالی تقویم کیلنڈر رکھا گیا تھا اور یہ 15 مارچ 1079 سے نافذ کیا گیا تھا۔ عمر خیام نے رسدگاہ میں تحقیق سے دریافت کیا تھا کہ زمین کا سورج کے گرد چکر 365.24219858156 دنوں میں پورا ہوتا ہے۔ اسکا یہ نتیجہ آج بھی اعشاریہ کے بعد چھ ہندسوں تک صحیح مانا جاتا ہے۔ اس پیمائش سے 5500 سالوں میں صرف ایک گھنٹے کی غلطی ہوتی ہے جبکہ عیسوی کیلنڈر جو چار صدیوں بعد استعمال ہونا شروع ہوا، میں محض 3300 سال میں پورے ایک دن کی غلطی ہونے کی گنجائش ہے۔

(tropical year) کی طوالت کے بالکل صحیح تعین پر مبنی ہے۔ عیسوی کیلنڈر (Gregorian calendar) 3,330 سالوں میں ایک دن کی غلطی دکھاتا ہے جبکہ خیام(Khayyam, d. 1131) کا التاریخ جلالی کیلنڈر 5000 سال میں ایک دن کی غلطی گنجائش ہے۔

سمر قند میں ایک فلکیاتی کیلنڈر 'تقویم الغ بیگ'[1] 1437ء میں مرتب کیا گیا۔ یورپ میں اسے بہت پسند کیا گیا اور اٹھارہویں صدی میں انگلستان میں اسے شائع کیا گیا۔ فلکیات کے شعبے میں مسلمانوں کی خدمات ستاروں کے ناموں سے عیاں ہیں۔ کئی ستاروں کے سرکاری نام اور فلکیات کی فنی اصطلاحیں ان کے عربی مخرج سے وضع کی گئی ہیں۔ ان کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:[2]

ستاروں کے نام

ستاروں کے نام/فنی اصلاح	عربی ماخذ
عقرب(Acrab)	عقرب
الگیدی(Algedi)	الجدی-دادا
الطائر(al-Ta'ir)	الطیر-اڑنے والا
دینب(Deneb)	ذنب-دم
فرقد(Pherkad)	فرقد-بچھڑا
نادر(Naadir)	نذیر-مبلغ

علم فلکیات میں عربوں کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault, d. 1948) نے کہا:

[1]۔ مرزا الغ بیگ(1394ء- 1449ء) ایران کی تیموری سلطنت کا تیسرا حکمران اور امیر تیمور کا علم دوست پوتا تھا جو 1447ء سے 1449ء تک حکمران رہا۔ سمرقند کی گورنری کے دوران اس نے ایک عظیم الشان رصدگاہ تعمیر کی۔ اس رصدگاہ میں اس نے علم فلکیات کے نہایت درست نقشے تیار کیے۔ 1650ء میں یہ نقشے لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئے اور آکسفورڈ سے شائع کیے گئے۔ اس نے ایک کیلنڈر بھی ترتیب دیا جو اسی کی طرف منسوب ہو کر تقویم الغ بیگ کہلانے لگا۔

[2]۔The History of Arabs by Phillip Khuri Hitti, p.572 - 573

'Arab astronomy did not forestall Copernicus or Newton, though without it there would have been no Copernicus and Newton'[1].

(اگرچہ عرب ماہرین فلکیات نے کاپرنیکس یا نیوٹن کی پیش بینی نہیں کی تھی لیکن اس کے بغیر کوئی کاپرنیکس اور نیوٹن نہ ہوتا)

علم فلکیات میں عرب دانشوروں نے بہت پیش رفت کی تھی جس کے نتیجے میں نظام بنے اور وہ آج تک موجود ہیں۔

(7)۔ جغرافیہ(Geography)

مسلمانوں نے جغرافیے میں بھی قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ مسلمان جغرافیہ دانوں کی دریافتوں (innovations) کا آغاز ان کی جانب سے زمین کے گول ہونے کا ثبوت لانے سے ہوا۔ یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ زمین 'دائرہ نما چیز' (circular object) ہے اور تمام اطراف سے پانی سے گھری ہوئی ہے۔ سلطنت روما نے اس تصور کو رد کر دیا۔ بعد میں مسیحی کلیسا اور ان کے آباؤاجداد نے 'لاکتانتیوس' (Lactantius, d. 325)[2] کی زیر قیادت زمین کے دائرہ نما چیز ہونے کے نظریئے کو شدت کے ساتھ اختیار کر لیا۔ مسیحی کلیسا نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین چپٹی ہے جبکہ اس کا دوسرا رُخ غیر آباد ہے، ورنہ لوگ خلا میں جا گرتے۔ مسلمانوں نے زمین کی گولائی کا نظریہ زندہ کرنے کی کوشش کی۔ ابن خردادبہ[3]

---

[1]۔ The Making of Humanity by Robert Briffault, p. 190

[2]۔ Lucuis caecilius firmiamus lactanius؛ لاکتانتیوس (250ء-325ء) ایک مسیحی مصنف تھا۔ جو بعد میں پہلے مسیحی رومن بادشاہ قسطنطین اول (Constantine - I, d. 337) کا ایک مشیر بن گیا۔ اس کا کام بادشاہ کی مذہبی پالیسی میں اس کی مدد کرنا تھا۔ لاکتانتیوس بادشاہ کے بیٹے جز وقتی استاد بھی تھا۔

[3]۔ Abu'l-Qasim Ubaydallah ibn Abdallah ibn Khordadbeh؛ ابوالقاسم عبیداللہ بن عبداللہ بن خردادبہ (820ء-912ء) خلافت عباسیہ کا ایک انتظامی جغرافیہ دان، بیوروکریٹ اور مصنف تھا۔ اس کی ایک مشہور کتاب کتاب المسالک والممالک ہے جس میں دنیا کے مختلف علاقوں کے نقشہ جات، تہذیب وتمدن، حالات وواقعات وغیرہ درج ہیں۔

(Ibn Khordadbeh, d. 912) اور الادریسی[1] (al-Idrisi, d.1154) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ''زمین گیند کی طرح گول ہے۔ پانی بھینچ کر اس کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور قدرتی طور پر اس کے اوپر اور تسلسل کے ساتھ رہتا ہے۔ زمین اور پانی دونوں کائنات میں اس حالت میں رہتے ہیں جیسے انڈے کے اندر سفیدی اور زردی رہتے ہیں۔ وہ مرکز میں موجود رہتے ہیں اور انہیں تمام اطراف سے ہوا (فضا) نے گھیرا ہوا ہے[2]۔

الادریسی (al-Idrisi, d.1154) نے دنیا کے نقشے بنائے۔ یہ عہد متوسط میں نقشہ نگاری کے سب سے بڑے نقشے تھے جو مکمل ترین، صحیح ترین اور مفصل نقشے تھے۔ اتنے جامع و مفصل نقشے دنیا میں پہلی بار وجود میں آئے تھے۔ بیشتر مسلم سائنسدانوں کی طرح الادریسی (al-Idrisi, d.1154) نے زمین کے گول ہونے کا ادّعا کیا اور کہا کہ یہ حقیقت نا قابل تردید ہے[3]۔ چنانچہ مسلمانوں نے زمین کی گولائی کا دعویٰ کاپرنیکس (Copernicus, d. 1543) سے بہت پہلے کر دیا تھا۔ الادریسی (al-Idrisi, d.1154) نے سسلی (Sicilly) کے نارمن بادشاہ راجر دوئم[4] (Ruger-ii, d. 1154) کے لئے ایک جدول 'نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق'[5] (Tabula Rogeriana) تیار کی۔ اس نے یہ جدول دربار میں قیام کر کے اٹھارہ سال میں مکمل کی۔ جہاں وہ دن رات نقشہ سازی اور توضیحات نگاری میں مصروف رہتا۔ اس کے نقشوں نے کولمبس[6] (Columbus, d. 1506) اور

۱۔ الادریسی: Abu Abdullah Muhammad al-Idrisi al-Qurtubi al-Hasani as-Sabti (1099–1154) ایک اندلسی عرب نقشہ نویس، جغرافیہ دان اور سیاح تھا۔

۲۔ Nozhat Al Mushtak fi Ikhtrak Al-Afak by al Idrisi, p. 7

۳۔ The Story Of Civilization by Will Durant, Vol. 13. p. 358.

۴۔ Roger II: راجر دوئم (1099–1154) سسلی کا بادشاہ تھا۔

۵۔ 'نزہۃ المشتاق فی اختراق الآفاق' (Tabula Rogeriana) دنیا کی معلومات اور نقشہ جات پر مشتمل کتاب ہے جسے مشہور مسلمان جغرافیہ دان الادریسی (al-Idrisi, d.1154) نے تیار کیا۔

۶۔ Christopher Columbus: کرسٹوفر کولمبس (1451 - 1506) ایک بحری مہم جو تھا جس نے 1492 میں امریکہ کو دریافت کیا۔

واسکوڈے گاما[1] (Vasco da Gama, d. 1524) کے بحری اسفار (tours) میں ان کی بڑی مدد کی۔

مامون الرشید (d. 833) نے زمین کے ابعاد (dimensions) کی پیمائش کا فیصلہ کیا اور یہ کام فلکیات دانوں اور جغرافیہ دانوں کی دو جماعتوں کے سپرد کیا۔ ان جماعتوں کو دو مختلف اطراف، ایک کو مشرق اور دوسری کو مغرب کی جانب بھیجا۔ پھر انہیں طول البلد کا ایک درجہ (ان خطوط کی کل تعداد 360 ہوتی ہے) ناپنے کے لئے کہا۔ ان دو جماعتوں کی اوسط پیمائش تقریباً 56.66 میل نکلی جبکہ موجودہ سائنس کی اوسط پیمائش 56.93 میل ہے۔ ان دو جماعتوں نے قطر (موٹائی) کی بھی پیمائش کی جو تقریباً 41,248 کلومیٹر ہے جب کہ اس وقت کے حساب سے یہ 40,070 کلومیٹر ہے۔ یعنی مامون الرشید (d. 833) کی جماعتوں کی پیمائش میں غلطی 3 فیصد سے زیادہ نہیں[2]۔

ابوعلی حسن مراکشی[3] (d. 1262) نے دنیا کے نقشوں پر طول بلد اور عرض بلد کے خطوط لگائے تاکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو اوقاتِ نماز مقرر کرنے میں مدد ملے اور اس سے انہیں جغرافیائی نقشے میں خطوط لگانے میں آسانی حاصل ہوگئی۔ اسلامی نقشے اور بحری سائنسز (marine sciences) کے بارے میں مسلمانوں کی مطبوعات نے مغربی دنیا کی جہاز رانی کو نمایاں طور پر متاثر کیا ہے۔

علی بن عمر الکاتبی[4] (Ali Ibn Omer al-katibi, d. 1277)، قطب الدین

---

[1]۔ Vasco da Gama؛ واسکوڈے گاما (1460-1524) ایک پرتگالی بحری قزاق تھا جس نے جنوبی افریقہ کے گرد گھوم کر ہندوستان تک کا بحری راستہ دریافت کیا۔

[2]۔ Treasures of Astronomy by Yuhans Fillers, p. 25

[3]۔ Abu Ali al-Hassan al-Marrakushi؛ ابوعلی حسن مراکشی (تیرہویں صدی عیسوی) ایک نامور جغرافیہ دان، حساب دان اور ماہر فلکیات تھے۔ ان کی مشہور کتب ami' al-mabadi' wa'l-ghayat اور Kitab al-Kotua al-Makhruti ہیں۔

[4]۔ علی بن عمر بن علی الکاتبی المعروف نجم الدین الکاتبی القزوینی (1203ء-1277ء) مسلمان جغرافیہ دان، ماہر فلسفہ ومنطق، ماہر علم فلکیات اور ریاضی دان تھا۔ علم منطق پر اس کی کتاب الرسالہ الشمسیہ فی القواعد، سائنسی علوم اور مابعد از طبیعات پر کتاب حکمت العین معروف ہیں۔ اس نے نصیر الدین طوسی (d. 1274) اور دیگر ماہرین فلکیات کے ساتھ مل کر رصد گاہ مراغہ (Maragheh observatory) بنائی جہاں فلکیات پر تحقیقی کام کیا جاتا تھا۔

شیرازی[1] (d. 1311) اور الفراغ علی تاریخ انسانی کے اولین سائنسدان تھے، جنہوں نے سورج کے گرد زمین کی ممکنہ مداروی حرکت (rotation) کا حوالہ دیا اور کہا کہ رات اور دن میں زمین ایک چکر پورا کرتی ہے۔ جارج سارٹن[2] (George Sarton, d. 1956) جسے بیشتر لوگ بابائے تاریخ سائنس سمجھتے ہیں۔ اس نے اپنی کتاب 'Introduction to the History of Science' میں لکھا ہے کہ تیرہویں صدی کے دوران ان تین سائنسدانوں کی تحقیق نوٹس میں آئے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ یہ ان عوامل میں سے ایک ہے جنہوں نے کاپرنیکس (Copernicus, d. 1543) کی 1543ء میں اعلان کردہ تحقیق کو متاثر کیا[3]۔

البیرونی (al-Biruni, d. 1048) نے موجودہ پاکستان کے علاقے (Rohtas Fort) میں زمین کے قطر (radius) کی پیمائش کی جو عہد حاضر کے تسلیم شدہ قطر سے صرف 15 کلومیٹر کم ہے۔

مسلمانوں نے اپنے علم جغرافیہ کی بدولت سمندری راستوں اور سیاحت پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ مشہور پرتگیزی ملاح واسکوڈے گاما (Vasco da Gama, d. 1524) نے ہندوستان اور یورپ کے درمیان وہ بحری راستہ دریافت کر لیا جو راس امید[4] (Cape of Good Hope) کی

---

[1] قطب الدین محمود شیرازی (1236ء-1311) ایک ماہر فلکیات، ریاضی دان، طبیب، ماہر فزکس، ماہر علم موسیقی، فلاسفر اور صوفی تھا۔ اس نے ان تمام شعبہ جات میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

[2] George Alfred Leon Sarton؛ جارج الفریڈ لی اون سارٹن (1884ء-1956ء) ایک امریکی کیمیا دان اور مورخ تھا جسے شعبہ سائنس کی تاریخ کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ اس مشہور زمانہ کتاب Introduction to the History of Science تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

[3] Introduction to the History of Science by George Sarton, vol. 1, p. 46

[4] Cape of Good Hope؛ راس امید جنوبی افریقہ کے ساحلوں پر واقع راس (rocky) ہے۔ یہ علاقہ افریقہ کے جنوبی حد سے محض 150 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ واسکوڈے گاما نے افریقہ کے گرد گھوم کر انڈیا اور یورپ کے درمیان سمندری راستہ دریافت کیا جس کے بعد یہ علاقے یورپی قابض قوتوں کی نو آبادیاں بن گیا۔ راس امید کی اصطلاح اتحاد جنوبی افریقہ کے قیام سے قبل 1652ء میں جزیرہ نما کیپ کے گرد قائم کی گئی کیپ کالونی کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی۔ 1910ء میں یہ پورا علاقہ صوبہ کیپ کا حصہ بنا دیا گیا۔ راس امید جزیرہ نما کیپ کا جنوب مغربی کونا ہے۔ جنوبی افریقہ کا معروف شہر کیپ ٹاؤن راس امید سے 30 کلومیٹر شمال میں جزیرہ نما کے شمالی کونے پر واقع ہے۔ راس امید کا علاقہ اپنے قدرتی حسن کے باعث مشہور ہے۔

طرف سے ہوکر جاتا تھا۔ یہ عظیم بحری دریافت مسلم عرب ملاح احمد بن ماجد[1] (d. n.d.) کی مدد سے ممکن ہوئی تھی جس نے 1498ء میں واسکوڈے گاما (Vasco da Gama, d. 1524) کو افریقہ سے ہندوستان تک پہنچنے میں اس کی رہنمائی کی۔ اسے اس ملاح کی خدمات موزمبیق[2] (Mozambique) کے مسلم سلطان نے فراہم کی تھیں[3]۔

مسلمانوں کا نئی دنیا، امریکہ کی دریافت میں بھی اہم کردار تھا۔ کولمبس (Columbus, d. 1506) نے امریکہ 1506ء میں دریافت کیا تھا۔ امریکی سکالر فلپ ہٹی (Philip Hitti, d. 1978) لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے زمین کے گول ہونے کے نظریے کو جس کے بغیر امریکہ کی دریافت ممکن نہ تھی۔ اس نظریئے کا علمبردار ایک مسلمان سائنسدان ابوعبیدہ مسلم البالینی تھا جس نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کے نظریات دسویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں خوب پھیلے اور مشہور ہوئے۔ اس طرح زمین کے گول ہونے کا نظریہ عربی سے لاطینی میں ترجمہ ہوکر 1410ء میں یورپ میں شائع ہوا۔ اس کو پڑھ کر کولمبس (Columbus, d. 1506) نے اس نظریہ سے واقفیت حاصل کی[4]۔

(8)۔ قانون (Law)

مسلمانوں نے قانون (فقہ) اور اصول قانون (اصول فقہ) کے شعبوں میں بھی نمایاں اور

۱۔ شہاب الدین احمد بن ماجد (پندرہویں صدی عیسوی) ایک عرب جہاز راں تھا جس نے واسکوڈے گاما (Vasco da Gama, d. 1524) کو ہندوستان کا راستہ دریافت کرنے میں اس کی مدد کی۔ اس نے علم بحریات پر ایک ایسی کتاب تصنیف کی تھی جس میں بحر ہند، بحر قلزم، خلیج فارس، بحیرہ چین کے مغربی حصے اور مجمع الجزائر میں جہاز رانی کی ہدایات درج ہیں۔ مورخین اسے اڑتیس کتابوں کا مصنف قرار دیتے ہیں جن میں سے اکثر فلکیات، بحریات اور جہاز رانی کے موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ فرانسیسی مستشرق فیراں لکھتا ہے کہ جہاز رانی اور بحری علوم پر جدید انداز میں لکھنے والا پہلا مصنف ابن ماجد ہے۔ اگر عرض بلد کی ناگزیر غلطیوں کو نظرانداز کیا جائے تو آج بھی جہاز رانی کیلئے اس کی کتب بے مثال ہیں۔

۲۔ جمہوریہ موزمبیق افریقہ کے جنوب مشرق میں واقع ایک ملک ہے جس کا دارالحکومت ماپوتو ہے۔ اس کی سرحدیں مشرق میں بحر ہند، شمال میں تنزانیہ، شمال مغرب میں ملاوی اور زیمبیا، مغرب میں زمبابوے اور جنوب مغرب میں جنوبی افریقا اور سوازی لینڈ سے ملتی ہیں۔

۳۔ Encyclopedia Britannica Vol 7, p. 761.

۴۔ The Arabs: A Short History by Phillip Khuri Hitti, p. 570

قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ سابق تہذیبوں کے اپنے مخصوص طور طریقے ہی قانون ہوتے تھے۔ تاہم قانون اب بطور ایک سائنس (مجرد وجود اور قوانین وقواعد سے جداگانہ تشخص کی حامل) ہے جو اسلام سے پہلے موجود نہیں تھا۔ فقہ خالصتاً ایک مسلم دریافت ہے۔

روم، یونان، چین، ہندوستان اور عراق میں اسلام کی آمد سے بہت پہلے قانون کے کئی شعبے موجود تھے لیکن فقہ، حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) کی تصنیف 'کتاب الرائے' سے شروع ہوئی۔ ان کے شاگرد حضرت امام ابو یوسفؒ[1] (Abu Yusuf, d. 798) نے کتاب الاصول لکھی اور حضرت امام شافعیؒ[2] (d. 820) نے انسانی تاریخ میں پہلی بار اپنی کتاب الرسالہ فی اصول الفقہ میں اصول قانون، قانون سازی، تعبیر کے اصولوں وغیرہ پر باقاعدہ سیر حاصل بحث کی۔

مسلم فقہا نے تاریخ میں پہلی بار 'نیت' (ارادہ) کی اہمیت واضح کی اور اس تصور پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کے بنیادی الفاظ اس حدیث شریف 'إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ'[3] (اعمال کا دارومدار نیت پر ہے) سے ماخوذ ہیں۔ فقہا نے 'سخت مواخذے' (culpability without criminal intention) کی حوصلہ شکنی کی۔ یہ نظریہ 'نیت' ہے اور یہ فوجداری اصول قانون میں ایک مسلمہ حقیقت رکھتا ہے کیونکہ قانون ایسے اقدام کو جرم نہیں مانتا جس میں ارادۂ جرم شامل نہ ہو۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ریاست مدینہ کے لیے اولین تحریری دستور دیا۔ یہ تحریری دستور جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیار کرایا، باون (52) شقوں پر مشتمل ہے۔ اس میں متعدد اصول طے کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً حکمران اور رعیت کے علیحدہ علیحدہ حقوق و فرائض، قانون سازی، انصاف کا قیام، نظام دفاع، غیر مسلم رعایا کے ساتھ سلوک، دوطرفہ بنیاد پر سماجی بیمہ کاری اور اس دور کے دیگر تقاضوں کا بندوبست وغیرہ۔

۱۔ امام ابو یوسفؒ (735ء - 798ء) امام ابوحنیفہؒ کے جلیل القدر شاگرد اور حنفی مذہب کے ایک امام تھے۔ آپؒ کا اصل نام یعقوب بن ابراہیمؒ تھا۔ آپؒ تاریخ اسلام میں وہ پہلے شخص ہیں جن کو قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے خطاب سے نوازا گیا۔ آپ کی مشہور تصنیف کتاب الخراج فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔

۲۔ محمد بن ادریس بن العباس شافعیؒ (768ء-820ء) ایک مشہور و معروف فقیہ تھے۔ جنہوں نے ایک نئے مسلک شافعی کی بنیاد ڈالی۔ آپؒ کی کتاب الرسالہ اصول فقہ کی پہلی کتاب ہے۔

۳۔ صحیح بخاری۔ جلد اول: رقم: 1

مسلمانوں نے ہی پہلی بار مختلف اقوام کے تقابلی قوانین کا باضابطہ مطالعہ کیا۔ انہوں نے متنوع بیرونی قوانین کے بنیادی اصولوں کے اسلامی قوانین سے فرق و امتیاز پر بحث کی۔ نیز اسلام کے قانونی پہلوؤں کی مختلف تعبیرات کے مابین اصول فقہ کے لحاظ سے امتیاز کا بھی جائزہ لیا۔

عام طور پر جنگی حالات میں قانون معطل ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں کسی سے معقول اور منصفانہ رویہ اپنانے کی کم سے کم توقع کی جاتی ہے۔ اس لئے برسرِ پیکار ریاستوں کے فرمانرواؤں نے ہمیشہ اسے اپنا استحقاق سمجھا کہ وہ دشمن کے ساتھ جیسا چاہیں سلوک کریں۔ مسلمانوں نے پہلی بار عمومی بین الاقوامی قانون (Public International Law) کو ریاستی حکمرانوں کی متلون مزاجی پر مبنی قانون سے الگ کیا اور اسے خالصتاً قانونی بنیادوں پر استوار کیا۔ بین الاقوامی قانون کا ضابطہ کار حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) کے ایک استاد حضرت امام زید بن علی زین العابدینؒ (Zaid Ibn Ali, d. 740) نے اپنی تصنیف 'کتاب المجموعہ' میں متعارف کرایا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) کے ایک شاگرد حضرت امام محمد الشیبانیؒ[1] (Muhammad al-Shaybani, d. 805) نے اس موضوع پر دو کتابیں کتاب السیر الصغیر اور کتاب السیر الکبیر لکھیں۔ جن کا انگریزی ترجمہ امریکن یونیورسٹی آف بیروت کے عیسائی پروفیسر مجید خدوری نے کیا اور دستیاب ہے۔ حضرت امام سرخسیؒ[2] (al-Sarakhsi, d. 1093) نے اس کتاب کی شرح چار جلدوں میں لکھی۔ یہ کتاب Oppenheim کی کتاب بین الاقوامی قانون (International Law) سے بھی بڑی ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ بین الاقوامی قانون پر پہلی باقاعدہ کتاب ولندیزی عالم ہوگو گروشیئش[3] (Hogo Grotius, d. 1645) نے 1645ء میں لکھی تھی جس کا نام De Jure Belli ac Pacis (Law of War and Peace) ہے۔

مسلم فقہا نے حقوق اور فرائض کے باہمی تعلق کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ اگر انسان کے حقوق و فرائض کو لازم و ملزوم نہ کیا جائے تو بنی نوع انسان ایک غارت گر جانور، بھیڑیا یا شیطان بن جائے گا۔

۱۔ امام محمد بن حسن شیبانیؒ (749ء-805ء) امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد اور مشیر خاص تھے۔ امام ابو یوسفؒ کے بعد آپؒ جید شاگرد تھے۔ استاد کے نظریات کو تدوین کرنے میں ان کی محنت بھی شامل تھی۔ آپؒ نے بین الاقوامی قانون پر کتاب السیر لکھی۔

۲۔ شمس ائمہ محمد بن احمد ابوبکر امام سرخسیؒ (متوفی 438ہجری) ایک مشہور و معروف حنفی سکالر تھے جن کا تعلق ایران کے شہر سرخس سے تھا۔ اسی شہر کی نسبت سے سرخسی مشہور ہوگئے۔ آپؒ کی مشہور کتاب المبسوط فی الفقہ ہے۔

۳۔ Hogo Grotius؛ ہوگو گروشیئش (1582-1645) ایک ولندیزی ماہر قانون تھا۔

اسلام قوانین کو فطرت انسانی کی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اچھائی او ر برائی کے درمیان فرق و امتیاز کی تصریح کرتا ہے۔ قرآن پاک چند چیزیں لازماً کرنے (معروف) اور چند چیزوں سے لازماً اجتناب کرنے (منکر) کا حکم دیتا ہے۔ معروف کا مطلب ہے کہ 'اچھائی' وہ ہے جس کے اچھا ہونے کا علم ہر کسی کو ہے۔ اس لئے اس کا حکم دیا گیا ہے (یا اسے ترجیح دینے کے لئے کہا گیا ہے) جب کہ منکر کے معنی ایک ایسی چیز ہے جس کی ہر کوئی مذمت کرتا ہے اس لئے وہ ممنوعہ ہے۔ اسلامی قوانین کا بہت بڑا حصہ اسی نظریئے پر استوار ہے۔

عمومی طور پر جو مادی ترغیبات یا موانع (sanctions) ایک قانون کے پیچھے کارفرما ہوتے ہیں، وہ اسلام میں بھی اسی طرح ہیں جیسے دیگر نظامہائے قانون میں ہوتے ہیں۔ تاہم پیغمبر اسلام حضور نبی کریم ﷺ نے ان میں ایک زائد ترغیب شامل کر دی ہے جو مادی ترغیب کی بہ نسبت شاید زیادہ موثر ہے اور وہ روحانی ترغیب ہے۔

اسلام نے انصاف کے نظام کے قیام کے لئے جملہ لوازم فراہم کرتے ہوئے اپنے پیروکاروں کے ذہنوں میں موت کے بعد قائم ہونے والے روزِ محشر، اللہ تعالیٰ کی عدالت کے فیصلوں اور دنیا میں کیے گئے اعمال کے نتیجے میں نجات یا جہنم کے فیصلوں کے تصورات راسخ کیے ہیں۔ اس طرح ایک مومن کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے فرائض پورے کرے جبکہ اسے اس حکم کی خلاف ورزی کرنے کا بھی پورا موقع دیا گیا ہے۔ حرام سے روکا گیا ہے باوجودیکہ حرام میں کئی ترغیبات ہیں۔ مادی جواز اور روحانی جواز، ایک دوسرے کی اثر انگیزی کے لئے باعث تقویت بنتے ہیں۔ روحانی جواز قوانین کی زیادہ سے زیادہ پابندی کرنے اور کروانے، حقوق و فرائض کا زیادہ سے زیادہ احترام کرنے اور کروانے کی ترغیب دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے لئے قرآن پاک وحی الٰہی ہے جو حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی۔ آپ ﷺ نے اس کے مقدس متن کی توضیح و تشریح فرمائی۔ ان توضیحات و تشریحات کو بطور 'حدیث' قلم بند کرنے کی ہدایات دیں۔ قرآن و حدیث کی تعلیمات نا قابل تنسیخ ہیں۔ یہ نظریاتی سختی (doctrinal rigidity) نظریۂ اجتہاد کے تحت اس وقت نرم و لچکدار بن جاتی ہے جب انسانوں کو دِقت طلب واقعات و حالات سے توافق اختیار کرنے کی اجازت دے دیتی ہے۔ قوانین خواہ وہ کتاب الٰہی سے ماخوذ ہوں یا ارشادات نبوی ﷺ سے اخذ کئے گئے ہوں۔ وہ ہرگز یکساں درجے کے

حامل نہیں ہیں۔ ان میں سے صرف چند ایک ہی بطور فریضہ (obligatory) عائد ہوتے ہیں جبکہ دیگر قوانین سفارشات کا درجہ (recommendatory) رکھتے ہیں جو افراد کو خاصی گنجائش دیتے ہیں۔ قانون کی تعبیر وتوضیح کی جا سکتی ہے۔تعبیرات وتوضیحات ایسے امکانات پیدا کر دیتی ہیں کہ قانونِ خداوندی، خصوصی حالات سے موافقت پیدا کر لیتا ہے۔ اکثریت کو جب بھی اور جیسی بھی ضرورت ہو وہ اس کے لئے قانون سازی (legislation) کر سکتی ہے۔حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لئے قاعدہ وضع فرما دیا ہے:

لا تجتمعُ اُمَّتی علی ضلالَۃٍ [۱]

(میری امت کسی غلط رائے پر متفق نہیں ہوگی)

اسلام قانون سازی میں انسانی عقل پر اعتماد کرتا ہے۔ جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو فرمایا: جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو جائے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ پاک کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم اللہ کی کتاب میں وہ مسئلہ نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ مسئلہ سنت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں بھی نہ پاؤ اور کتاب اللہ میں بھی نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کروں گا۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سینہ کو تھپتھپایا اور ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔جس نے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قاصد (معاذ رضی اللہ عنہ) کو اس چیز کی توفیق دی، جس سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) راضی ہیں۔ [۲]

باالفاظ دیگر ایک فرد کی عقل عام پر مبنی کوشش نہ صرف قانون کے ارتقاء کا ذریعہ ہے بلکہ وہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعائے برکات کا مستحق بھی بن جاتی ہے۔

اسلام شہریوں کے مختلف گروہوں کی قانونی خودمختاری کا احترام کرتا ہے۔ یہ ہر مذہبی گروہ کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ اس کی اپنی عدالتیں ہوں جن کی سربراہی ان کے منصفین کریں تا کہ ان کے انسانی معاملات پر ان کے اپنے دیوانی اور فوجداری قوانین کا اطلاق ہو۔

۱۔مشکوٰۃ شریف۔جلد پنجم: رقم:317

۲۔سنن ابوداؤد۔جلد سوم: رقم:199

اسلام نے مسلمانوں کے مابین قیام انصاف کے لئے تزکیۃ الشہود[۱] (purification of witnesses) کا تصور متعارف کرایا تاکہ گواہ کے قابل اعتبار ہونے کا تعین کیا جا سکے۔ مزید برآں قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت کی عصمت سے متعلق کوئی الزام لگاتا ہے اور عدل کے تقاضوں کے مطابق اس کا ثبوت نہیں دیتا تو وہ نہ صرف سزا کا حق دار ہوتا ہے بلکہ اسے ہمیشہ کے لئے عدالتوں کے سامنے گواہی دینے کے لئے بھی نااہل قرار دے دیا جاتا ہے۔[۲]

اسلام نے 'عرف' پر مبنی عام طور پر مقبول 'معروف' کی منظوری دے دی ہے۔ جس سے قانون کا دائرہ وسیع تر ہو گیا ہے۔ 'معروف' کا تصور مسلمانوں کو ان رواجوں اور معمولات سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دیتا ہے جن کا کسی گروہ (community) میں رواج رہا ہے تاکہ مشترکہ بھلائی کے کاموں کو فروغ مل سکے۔ اس 'جاذبانہ رویۓ' (assimilative behaviour) نے اسلامی قانون کو خوبیوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک اعلان کرتا ہے کہ سابقہ انبیا و رسل علیہم السلام پر جو وحی الٰہی اترتی تھی وہ مسلمانوں کے لئے بھی جائز و بجا ہے لیکن اس کا دائرہ صرف اس وحی تک محدود ہے جس کا مستند ہونا شک و شبہے سے بالاتر ہو۔[۳]

(9)۔ دیگر شعبہ جات

مسلمانوں نے فنونِ لطیفہ (fine arts) اور مخصوص قسم کی مصوری (paintings) اور

۱۔ تزکیۃ الشہود کے معنی یہ ہیں کہ عدالت اپنے اطمینان کے لئے گواہ کے قابل اعتماد ہونے کی تحقیقات کر لے۔

۲۔ سورۃ النور: آیت: 4 (وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر چار گواہ پیش نہ کریں ان کو اسّی (80) کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے کیونکہ وہ فاسق ہیں)

۳۔ سورۃ الانعام: آیت: 84 - 85 (وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَاِلْيَاسَ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۔ اور ہم نے ابراہیم (علیہ السلام) کو اسحاق (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) بخشا۔ ہم نے سب کو ہدایت دی اور اس سے پہلے ہم نے نوح (علیہ السلام) کو ہدایت دی اور اس کی اولاد میں سے داؤد (علیہ السلام) اور سلیمان (علیہ السلام) اور ایوب (علیہ السلام) اور یوسف (علیہ السلام) اور موسیٰ (علیہ السلام) اور ہارون (علیہ السلام) ہیں اور اسی طرح ہم نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں۔ زکریا (علیہ السلام) اور یحییٰ (علیہ السلام) اور عیسیٰ (علیہ السلام) اور الیاس (علیہ السلام) سب نیکوکاروں سے ہیں)

خوشنویسی کو بہت ترقی دی ہے۔ انہوں نے کڑھائی (embroidery) اور قالین بافی سے آغاز کیا اور اسے ترقی دی۔ لکڑی، ہاتھی دانت اور ہڈیوں پر کندہ کاری شروع کی۔ مسلمانوں نے خوش نویسی، مصوری، شیشہ گری، ظروف سازی اور پارچہ بافی جیسے بصری فنون کو بے پناہ ترقی دی۔ خطاطی کے نمونے اسلامی آرٹ میں بے حد وحساب موجود ہیں۔ اس کے دو بڑے رسم الخط علامتی کوفی اور نسخ ہیں جنہیں دیواروں، گنبدوں، محرابوں اور منبروں کی اطراف میں طغروں (tughras) اور دھات کاری میں استعمال کر کے ان کے حسن کو بڑھانے میں مدد لی گئی ہے۔ خوشنویسی کے لئے استعمال ہونے والی زبانوں میں زیادہ تر عربی، فارسی (پرانی)، ترکی اور اردو ہیں۔

اسلامی دنیا میں پینٹنگ (رنگوں کے امتزاج اور استعمال) کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ شکل منقش تحریر کا مصغر (miniature) ہے۔ رنگوں اور سونے کے پانی سے مزین مخطوطوں اور قلمی نسخوں کا مصغر، فارسی مصغر کی مقبول روایت ہے جو عثمانی مصغر اور مغل مصغر کو بہت متاثر کرتی ہے۔ توضیحی کتابوں (illustrated) کے بڑے شاہکار، فارسی شاعری کی قدیم کتابیں ہیں۔ ان میں فردوسی کا شاہنامہ اسلام، گلستان سعدی، دیوان حافظ اور دیگر بہت سی دیگر کتب شامل ہیں۔

قالین سازی ایک معروف اسلامی فن ہے۔ ان کی مہارت مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ ہنر، فرش کی پوشش (floor coverings) سے لے کر تعمیراتی تزئین تک اور گدیوں سے لے کر گاؤ تکیوں، تھیلوں اور ہر شکل اور سائز کی بوریوں تک، مذہبی رسومات میں استعمال ہونے والی اشیا بالخصوص جائے نمازوں تک ہر چیز میں اپنے جلوے دکھا رہا ہے۔

قدیم ترین پبلک اسلامی عمارات جیسے کہ قبۃ الصخریٰ[1] (Dome of the Rock) کی اندرونی دیواریں بازنطینی طرز کی کاشی کاری سے مزین کی گئی تھیں مگر ان میں انسانی شکلیں نہیں بنائی گئیں۔ تاہم صیقل شدہ چمکدار رنگوں کی اسلامی روایت کی حامل منفرد ٹائلیں جو اندرونی اور بیرونی دیواروں اور گنبدوں پر لگی ہوئی ہیں وہ نویں صدی عیسوی سے بننا شروع ہوئی تھیں۔ مغل، پچی کاری (parchin

---

[1]۔ قبۃ الصخریٰ (Dome of the Rock) یروشلم/ بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کے قریب موجود ایک تاریخی چٹان کے اوپر سنہری گنبد کا نام ہے۔ روایات کے مطابق معراج کی رات حضور نبی کریم ﷺ اس چٹان سے براق پر سوار ہو کر آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے کثیر سرمائے سے چٹان کے اوپر گنبد تعمیر کرایا جو فن تعمیر کا ایک عظیم اور زندہ شاہکار ہے۔ دنیا اسی گنبد کو قبۃ الصخرہ کے نام سے جانتی ہے۔

kari) کوترجیح دیتے تھے۔ یہ ایسی تزئین تھی جو جڑاؤ نیم گراں بہا پتھروں کے پینلز (panels) سے اور بعض صورتوں میں جڑاؤ جواہرات لگا کر کی جاتی تھی۔ جیسا کہ تاج محل[۱] میں دکھائی دے رہی ہے۔

کاغذ چین میں ایجاد ہوا تھا لیکن 751ء میں 'طلاس' کی جنگ (موجودہ کرغستان) میں چین کی شکست کے بعد یہ کام ساری اسلامی دنیا میں پھیل گیا۔ اسلامی دنیا میں کاغذ کے پہلے کارخانے کی بنیاد سمر قند (ازبکستان) میں ڈالی گئی۔ اس سے کاغذ سازی کے وقت کو کم اور معیار کو بلند تر کر دیا گیا۔ پھر مشینری کو اس قابل بنا دیا گیا کہ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مال بنائے اور کاغذ کی شیٹ کو بھی معقول حد تک دبیز (thicker) بنا دے۔ اس طرح کاغذ سازی ایک بڑی صنعت میں تبدیل ہوگئی۔ شروع شروع میں پانی سے چلنے والی 'پلپ ملیں' (pulp mills) ہوتی تھیں جس میں کاغذ کی تیاری کے لئے 'ٹرپ ہیمر' (trip hammers) (انسان یا جانور کی قوت سے) استعمال ہوتا تھا۔ بعدازاں اس کی جگہ چین کے روایتی کھرل یا ہاون دستے نے لے لی[۲]۔ مسلمانوں نے کاغذ بنانے کے نئے نئے طریقے وضع کر کے انسانیت کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ کاغذ کی تجارتی پیمانے پر تیاری پہلے مراکش میں شروع ہوئی پھر سپین اور یورپ میں چلی گئی۔ کاغذ کے بغیر اتنے وسیع پیمانے پر کتب کی اشاعت ممکن نہ تھی جو علم کی ترقی کا سبب بنیں۔ کاغذ کی پیمائش کا بنیادی پیمانہ 'ream' بھی عربی زبان کا لفظ ہے[۳]۔

اگر موجودہ دور میں آپ اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل (Marriott Hotel) میں جائیں تو آپ کو ہر دوسرا آدمی غیر ملکی صلاح کار (consultant) دیکھنے کو ملے گا۔ ایک وقت تھا کہ جب مغرب کو ماہرین اور مشیر ہم (مسلمان) مہیا کرتے تھے۔ اوفا ریکس (Offa Rex, d. 796) نے سونے کے سکے ڈھلوانے کے لیے بغداد سے سکہ گر بلائے تھے۔ وہ سکے اب بھی برٹش میوزیم لندن میں موجود ہیں جس میں ایک طرف تو بادشاہ کا نام لکھا ہوا ہے تو دوسری طرف عرب سکہ گر کا نام ہے۔

۱۔ تاج محل بھارتی شہر آگرہ میں دریائے جمنا کے جنوبی کنارے پر واقع سفید سنگ مرمر سے بنا ہوا محل ہے جو مغل شہنشاہ شاہجہان نے 1632ء میں اپنی محبوب بیوی ممتاز محل کے مقبرے پر تعمیر کروایا تھا۔ یہ دنیا کے سات عجائب میں شمار ہوتا ہے۔ یہ محل 1643ء میں مکمل ہوا تاہم اس پر کام 1653ء تک جاری رہا۔

۲۔ Papermaking: The History and Technique of an Ancient Craft by Dard Hunter, p. 139

۳۔ http:/www. etymonline, com/index, php? term = ream

3۔ مغرب کو ترسیل علم

علوم کی یہ شاخیں جن کی مسلمانوں نے آبیاری کی، سسلی، سپین اور روم کے راستے یورپ پہنچیں اور پھلی پھولیں۔ گیارہویں صدی سے تیرہویں صدی عیسوی تک عہد متوسط کا یورپ، اسلامی تہذیب کو جذب کرتا رہا جہاں یہ علوم چوٹی پر پہنچے ہوئے تھے۔ یورپ اور اسلامی دنیا کے متعدد نقاط اتصال تھے۔ یورپ کو ترسیلِ اسلامی علوم کے بڑے بڑے مقاماتِ اتصال سسلی اور سپین میں بالخصوص طلیطلہ (Toledo) میں تھے[1]۔ بعدازاں 1085ء میں اس شہر کی سپینی عیسائیوں کے ہاتھوں فتح اور 1091ء میں نورمین[2] (Normans) کے ہاتھوں اس کی استرداد[3] (Reconquista) ہو جانے پر ایک زبردست نورمین عرب بازنطینی کلچر (Norman-Arab-Byzantine culture) وجود میں آ گیا۔ مسلم جغرافیہ دان الادریسی (al-Idrisi, d.1154) نے

The Book of Pleasant Journey into Faraway Lands

(in Arabic, Tobula Rogeriana)

لکھی۔ یہ کتاب عہد متوسط میں عظیم ترین جغرافیائی مقالوں میں سے ہے۔ الادریسی (d.1154) نے یہ کتاب سسلی بادشاہ راجر دوئم[4] (Ruger-ii, d. 1154) کے لئے لکھی تھی۔ صلیبی جنگوں نے بھی یورپ اور لیوانٹ[5] (Levant) کے درمیان تبادلوں میں زیادہ گہما گہمی بڑھا دی۔

---

[1]۔ https://en.wikipedia.org/wiki/Islamic_contributions_to_Medieval_Europe

[2]۔ نورمین (Norman) دسویں اور گیارہویں صدی کا ایک خاندان تھا جس نے فرانس کے علاقے نورمینڈی (Normandy) کو اپنا نام دیا۔

[3]۔ استرداد (Reconquista) عیسائیوں کی ساڑھے سات سو سال طویل ان کوششوں کو کہا جاتا ہے جو انہوں نے جزیرہ نما آئبیریا سے مسلمانوں کو نکالنے اور ان کی حکومت کے خاتمے کے لئے کیں۔ آٹھویں صدی میں بنوامیہ کے ہاتھوں اسپین کی فتح کے بعد استرداد کا آغاز 722ء میں معرکہ کوواڈونگا سے ہوا جبکہ اس کا اختتام 1492ء میں سقوط غرناطہ کے ساتھ ہوا۔

[4]۔ Roger II؛ راجر دوئم (1099–1154) سسلی کا بادشاہ تھا۔

[5]۔ The Levant مشرق وسطیٰ کے ایک بڑے علاقے کے لیے استعمال ہونے والی ایک غیر واضح تاریخی اصطلاح ہے۔ اس میں بحیرہ روم، مشرق میں صحرائے عرب کے شمالی حصوں اور بالائی بین النہرین اور شمال میں کوہ ثور کے درمیان کا علاقہ شامل سمجھا جاتا ہے۔

گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں بے شمار یورپی باشندے حصول علم کے لئے اسلامی مراکز میں آئے۔ جن میں فبیو ناشی (Leonardo Pisano Bigollo, d. 1250)، اڈیلارڈ آف باتھ[1] (Adelord of Bath, d. 1152) اور قسطنطین افریقہ[2] (Constantine the African, d. 1087) جیسے اہل علم شامل تھے۔ ان طلبہ نے طب (medicine)، فلسفہ (philosophy)، ریاضی (mathematics)، تکوین نگاری (Cosmography) اور دیگر علوم و فنون سیکھے اور پڑھے۔ عربوں نے بیت الحکمت (House of Wisdom) میں متعدد یونانی کتب کے تراجم کئے اور انہیں ترقی بھی دی۔ پھر عہد متوسط میں ان علوم کا ازسرنو یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔

ان یونانی کتب کے لاطینی تراجم متعدد مقامات پر کیے گئے۔ طلیطلہ (Toledo)، سپین (Spain) اور سسلی (Sicily) یورپ کو ترسیل علم کے اہم ترین مقامات بنے۔ برگنڈوپی سا[3] (Burgundio of Pisa, d. 1193) نے ارسطو (Aristotle, d. 322BC) کے متعدد مضامین ترکی میں شام کی سرحد کے قریب مقام انطاکیہ[4] (Antioch) سے دریافت کیے اور ان کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔ سٹیفن آف پائزے[5] (Stephen of Pise, d. n.d.) نے لگ بھگ 1127ء میں عربی کے 'مینوئل آف میڈیکل تھیوری' کا (Arab manual of medical theory) لاطینی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

گیراڈ آف کریمونا (Gerard of Cremona, d. 1187) نے ذاتی طور پر عربی زبان کی 87 کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا جن میں الماجسٹ (Al-magest) بھی شامل تھی۔

---

[1]۔ Adelard of Bath: اڈیلارڈ (1080ء–1152ء) انگلش فلاسفر تھا۔ اس کی وجہ شہرت عربی زبان سے لاطینی اور جرمن میں کتب کے ترجمہ کرنے سے ہے۔

[2]۔ Constantine the African: قسطنطین افریقہ (گیارہویں صدی عیسوی) ایک ماہر طبیب تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ شمالی افریقہ اور بقیہ زندگی اٹلی میں گزاری۔

[3]۔ Burgundio of Pisa, d. 1193: برگنڈوپی سا (بارہویں صدی عیسوی) ایک مشہور اطالوی قانون دان تھا۔

[4]۔ https://en.wikipedia.org/wiki/Islamic_contributions_to_Medieval_Europe

[5]۔ Stephen of Pisa or Stephen the philosopher or Stephen of Antioch: سٹیفن آف پائزے (بارہویں صدی) ایک اطالوی مترجم تھا جس نے عربی زبان کی سائنس کی کتب کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا۔

الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) کی کتاب 'الجبرا و المقابلہ'، جابر بن سنان البتانی (Albategnius, d. 929) کی کتاب 'Elementa Astronomica'، الکندی[1] (al-Kindus, d. 873) کی تصنیف 'On Optics'، احمد بن محمد بن کثیر الفرغانی[2] (Alfraganus, d. 870) کی کتاب 'On Elements of Astronomy and the Celestial Motions'، فارابی (al-Farabi, d. 950) کی کتاب 'On the Classification of Sciences'، الرازی (al-Razi, d. 925) کی 'The Chemical and Medical Works'، ثابت ابن قرا[3] (Thabit ibn Qurra,d. 901)، حنین بن اسحاق (Hunayn Ibn Is-haaq, d. 873)، ابراہیم الزرقالی[4] (Ibrahim al-Zarqali, d. 1087)، جابر بن الفلاح[5] (Jabir ibn Aflah, d. 1150)، بنوموسیٰ، ابو کامل الحاسب[6] (Abu Kamil al-Hasib, d. 930)، الزہراوی (al-Zahrawi, d. 1013) اور ابن الہیثم

۱۔ al-Kindus؛ ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی (801ء-873ء) کا شمار اسلامی دنیا کے اوّلین حکما اور فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ فلسفہ کے علاوہ انہوں نے حساب، طب، فلکیات اور موسیقی میں بھی مہارت حاصل کی۔ یعقوب کندی ایک ہمہ گیر شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی تحقیق کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس نے ریاضی، طبعیات، فلسفہ، ہیت، موسیقی، طب اور جغرافیہ جیسے علوم پر اعلیٰ پائے کی کتب تحریر کیں۔

۲۔ Alfraganus؛ ابوالعباس احمد بن محمد بن کثیر افرغانی (805ء-870ء) جو مغرب میں الفرغانی کے نام سے مشہور ہے نویں صدی کے سب سے مشہور ماہرین فلکیات میں سے ایک تھا۔

۳۔ Thabit ibn Qurra؛ ثابت بن قرا (826ء-901ء) ایک عرب ریاضی دان، ماہر طب وفلکیات اور مترجم تھا۔ اس نے الجبرا، جیومیٹری اور فلکیات میں اہم دریافتیں کیں۔ فلکیات میں اسے بطلیموسی نظام کے اولین مصلحین میں شمار کیا جاتا ہے۔ ابن قرا مکینیات کی ایک شاخ سکونیات کا بانی تھا جو حالت توازن کے دوران مادّی نظاموں پر پڑنے والے بوجھ کے تجزیئے سے تعلق رکھتی ہے۔

۴۔ Ibrahim al-Zarqali؛ ابراہیم الزرقالی (1029ء-1087ء) اپنے دور کا سب سے بڑا ماہر فلکیات تھا۔

۵۔ Jabir ibn Aflah؛ جابر بن فلاح (1100ء-1150ء) ایک ماہر فلکیات اور ریاضی دان تھا۔

۶۔ Abu Kamil, Shuja' ibn Aslam ibn Muḥammad Ibn Shuja؛ ابو کامل شجاع بن اسلم بن محمد بن شجاع الحاسب (850ء-930ء) کو الحاسب المصری کے نام سے بھی جانا جاتا ہے جو ایک ماہر انجینئر اور حساب دان تھے۔

(ibn al-Haytham, d. 1040) کی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔ جابر بن حیان (Jabir ibn Hayyan, d. 806) کی کتاب 'الکیمیا' کا ترجمہ رابرٹ آف چیسٹر (Robert of Chester, d. n.d.) نے 1144ء میں کیا تھا۔ Book of Seventy کا ترجمہ گیراڈ آف کریمونا (Gerard of Cremona, d. 1187) نے کیا تھا۔ الکیمیکل ورکس آف محمد ابن زکریا رازی کا لاطینی میں ترجمہ بارہویں صدی کے لگ بھگ کیا گیا تھا[1]۔

الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) کے ریاضی کی کتب کے تراجم نے یورپ کو بہت متاثر کیا۔ یورپ میں الجبرا کی ابتدائی دور کی کتب میں تسلیم کیا گیا کہ اس براعظم میں الجبرا کی بہت سی اولین کتابیں الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) کے تراجم اور دیگر اسلامی مصنفین کی کتابیں تھیں۔ 'الگورتھم' (Algorithm) کے الفاظ الخوارزمی (al-Khwarizmi, d. 850) کے لاطینی نام الگورزمی (Algorismi) اور لفظ الجبرا کی کتاب کے عنوان 'کتاب الجبر والمقابلہ' سے ماخوذ ہیں۔ یہ الفاظ بھی عربی سے مستعار لیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اور دیگر عربی فلکیاتی اور ریاضیاتی تصانیف مثلاً البتانی (Albategnius, d. 929) اور محمد بن ابراہیم الفزاری (d. 796 or 806) کی کتاب Great Sindhind (جو سریا سدھانتا اور براہم گپتا پر مشتمل ہے) کا بارہویں صدی میں لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا تھا[2]۔

ابن معاد الجیانی[3] (Ibn Mu'adh al-Jayyani, d. 1079) کی تصنیف 'The Book of Unknown Arcs of a Sphere' (کروی مثلثیات پر ایک مقالہ) کا یورپی

۱۔ al-Kindus؛ ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندی (801ء-873ء) کا شمار اسلامی دنیا کے اوّلین حکما اور فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ فلسفہ کے علاوہ انہوں نے حساب، طب، فلکیات اور موسیقی میں بھی مہارت حاصل کی۔ یعقوب کندی ایک ہمہ گیر شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی تحقیق کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ اس نے ریاضی، طبیعیات، فلسفہ، ہیت، موسیقی، طب اور جغرافیہ جیسے علوم پر اعلیٰ پائے کی کتب تحریر کیں۔

۲۔ The Crest of the Peacock by G. G. Joseph, p. 306

۳۔ Ibn Mu'adh al-Jayyani؛ ابن معاد الجیانی (989ء-1079ء) ایک ماہر ریاضی دان، اسلامی مفکر و عالم اور اندلس کے قاضی تھے۔ اس نے spherical trigonometry پر پہلی معتبر کتاب لکھی۔

ریاضی پر بہت اثر تھا۔'رگیومنتانوس'[1] (Regiomontanus, d. 1476) کی کتاب 'On Triangles' یقیناً بارہویں صدی میں لکھی گئی تھی کیونکہ اس میں جابر بن الفلاح (Jabir ibn Aflah, d. 1150) کی کتاب میں سے لیا گیا مواد شامل ہے۔ اس امر کی نشاندہی سولہویں صدی عیسوی میں جیرولاموکاردانو[2] (Gerolamo Cardano, d. 1576) نے کی ہے[3]۔

ابوالفتح الخازنی (Abu al-Fath al Khazini, d. n.d.) کی کتاب 'زج السنجری' (Zij Sanjari) فلکیات پر اعلیٰ درجے کی تصنیف ہے۔ اس کا تیرہویں صدی عیسوی میں گریگوری کونیڈیز[4] (Gregory Choniades, d. 1320) نے یونانی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ بازنطینی سلطنت میں اس کا بہت شوق سے مطالعہ کیا جاتا تھا۔ بطلیموسی نظام[5] (Ptolemaic model) میں بے پناہ ترامیم ہوئیں جو البتانی (Albategnius, d. 929) اور ابن رشد(Averroes, d. 1198) نے کیں۔ ان کے نتیجے میں مؤیدالدین العرضی[6] (Mu'ayyad al-Din al-Urdi, d. 1266)، الطوسی (d. 1274) اور ابن الشاطر[7] (Ibn al-Shatir, d. 1375) نے بطلیموسی نظام

۱۔ Regiomontanus؛ رگیومنتانوس (1436ء-1476ء) ایک معروف ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا۔

۲۔ Gerolamo Cardano؛ جیرولاموکاردانو (1501ء- 1576ء) ایک اطالوی ماہر ریاضی، طبعیات، کیمیا، حیاتیات، فلکیات، جغرافیہ، جواہرات اور مصنف تھا۔

۳۔ http://www-history.mcs.st-andrews.ac.uk/Biographies/Al-Jayyani.html

۴۔ Gregory Choniades؛ گریگوری کونیڈیز (1240ء- 1320ء) ایک بازنطینی یونانی ماہر فلکیات تھا جس نے ایران میں قیام کے دوران فارسی زبان، ریاضی اور علم فلکیات سیکھا۔ اس نے ایران سے واپسی پر تبریز میں ایک اکیڈمی بنائی اور یونانیوں سے ان علوم سے روشناس کروایا۔

۵۔ نظام فلکیات کا ایک ایسا نظریہ جس میں زمین کو کائنات کا مرکز تصور کیا جاتا ہے اور تمام اجرام فلکی اس کے گرد گردش کرتے ہیں، کو بطلیموسی نظام کہتے ہیں۔ کیونکہ اس نظریہ کی بنیاد بطلیموس نے ڈالی تھی۔

۶۔ Mu'ayyad al-Din al-Urdi؛ مؤیدالدین العرضی (تیرہویں صدی عیسوی) ایک ماہر فلکیات تھے۔

۷۔ Ibn al-Shatir؛ الحسن بن علی بن ابراہیم بن محمد بن المطعم (1304ء-1375ء) کو ابن الشاطر کے لقب سے جانا جاتا ہے۔ وہ ماہر ریاضی دان، آلات رصد اور فلکیات کے سائنسدان تھے۔

سے منفرد نظام مرتب کیے جن کو بعد ازاں 'کا پرنیکس نظام'[1](Copernican heliocentrism) میں ضم کر دیا گیا۔

ابن سینا (Avicenna, d. 1037) کی القانون فی الطب (The Cannon of Medicine) کا لاطینی زبان میں ترجمہ کر کے پورے یورپ شائع کیا گیا۔ یورپ میں سولھویں صدی عیسوی تک یہ کتاب طب کی نصابی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی رہی۔ یورپ میں اسے پینتیس (35) سے زائد بار چھاپا گیا۔ الرازی (al-Razi, d. 925) نے Comprehensive Book of Medicine (جامع الکتاب الادویہ) لکھی جس میں خسرہ (measles) اور چیچک (small pox) کی محتاط انداز میں تفصیل بیان کر کے ان کے درمیان فرق واضح کیا۔ یہ کتاب بھی یورپ میں بہت مقبول ہوئی۔ الزہراوی (al-Zahrawi, d. 1013) نے کتاب التصریف لکھی جو علم الجراحت (سرجری) کا انسائیکلوپیڈیا تھی۔ اس کا لاطینی میں ترجمہ 1100ء میں غالباً گیراڈ آف کریمونا (Gerard of Cremona, d. 1187) نے کیا۔ یہ کتاب صدیوں تک یورپی میڈیکل سکولوں میں پڑھائی جاتی رہی[2]۔ ابوالہیثم (Ibn al-Haytham, d. 1040) نے کتاب المناظر (Book on Optics) لکھی جس میں اس نے بصارت اور نور کے بارے میں ایک نظریہ وضع کیا۔ اس کے لاطینی ترجمے نے بہت سے متاخر یورپی سائنسدانوں کی تصانیف کو متاثر کیا جن میں راجر بیکن (Roger Bacon, d. 1294) اور جان کیپلر (Kepler, d. 1630) بھی شامل تھے[3]۔

مسلمانوں نے یورپ کو براستہ مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ بہت سے پھلوں اور سبزیوں سے متعارف کرایا اور بعض دور دراز چین اور ہندوستان سے لائی ہوئی اشیا سے بھی انہیں آشنا کرایا جن میں خرشوف (Artichoke)، پالک اور بینگن شامل تھے۔

۱۔ Copernican heliocentrism؛ کاپرنیکس نظام فلکی، عظیم ماہر فلکیات کاپرنیکس کے نظریات پر مشتمل ہے۔ کاپرنیکس کے اس نظام کے مطابق کائنات کا مرکز زمین کی بجائے سورج ہے اور بشمول زمین دیگر اجرام فلکی اس کے گرد گردش کرتے ہیں۔

۲۔ Arabian Medicine and Its Influence on the Middle Ages by D. Campbell, p. 87

۳۔ https://www.jstor.org/stable/230255?seq=1#page_scan_tab_contents

پارچہ بافی کے نئے انداز اور نیا مواد بھی متعارف کرایا گیا جن میں مخمل، ریشمی کپڑا اور ساٹن شامل تھی۔ اسی طرح اسلامی فنونِ زیبائش اور دیگر نہایت بیش قیمت اشیا پورے عہد متوسط میں یورپ کو پہنچائی جاتی رہیں۔

اسلامی ظروف سازی یعنی روزمرہ کے استعمال کے برتن اپنے معیار کے لحاظ سے اتنے اچھے ہیں کہ انہیں اب بھی یورپین برتنوں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے قالین، خواہ وہ سلطنت عثمانیہ، مشرقی بحیرۂ روم یا مصر کی مملوک ریاست مصر یا شمالی افریقہ میں بنتے تھے یورپ میں دولت اور فارغ البالی کی نمایاں علامت سمجھے جاتے تھے۔ ایسے قالین، مشرقی عناصر کے یورپی پینٹنگ کے اندر ادغام اور بالخصوص وہ قالین جو مذہبی موضوعات کے مظہر ہیں بہت دلچسپ مثال پیش کرتے ہیں۔

یورپی موسیقی میں استعمال ہونے والے متعدد جدید آلاتِ موسیقی عرب کے آلات سے متاثر ہیں جن میں 'ریبک' (rebec) (تین تارا، وائلن کی جدّ) جو رباب (rebab) سے ماخوذ ہے۔ قطارہ (qitara) سے گٹار (guitar)، نقارہ (naqareh) سے 'نیکر' (naker) بنا۔ شاہم (shawm) اور گلزینا (dulzaina) جو نرسل سے بننے والا 'ضمر' (zamr) اور 'الزرنا' (al-zurna) ہے، شامل ہیں[1]۔

یورپی عہد متوسط کی ٹیکنالوجی نے اسلامی دنیا کی ٹیکنالوجی کو اختیار کر لیا تھا۔ ان میں مختلف فلکیاتی آلات بھی شامل تھے۔ مثلاً 'یونانی' اصطرلاب (astrolabe) جو دراصل عربوں کا ترقی یافتہ آلہ تھا۔ جسے ایسا نظر فریب بنا دیا گیا تھا کہ یہ 'Quadrans Vetus' کی شکل اختیار کر گیا۔ یہ ایک 'جامع گھنٹہ نما ربع محیط' (Universal horary quadrant) تھا۔ جسے کسی بھی عرض بلد کے لیے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اسی طرح 'سافیۂ' (Saphaea) تھی جو ایک ہمہ گیر اصطرلاب (astrolabe) تھی۔ یہ ابراہیم الزرقالی (Ibrahim al-Zarqali, d. 1087) کی ایجاد تھی۔ یہ فلکیاتی آلۂ سدس (Sextant) تھا۔ اسی طرح مختلف آلاتِ جراحی (بشمول قدیم اشکال کے ترقی یافتہ اوزار) اور مکمل نئے

۱۔ Historical facts for the Arabian Musical Influence by H. G. Farmer, p. 141 - 142

ایجادات، ترقی یافتہ گراری دار آبی گھڑیاں اور خود کار آلات شامل تھے[1]۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی پیچیدہ آبی گھڑیوں اور خود کار آلات نے یورپی ہنرمندوں کو بے حد متاثر کیا۔ جنہوں نے اولین مکینیکل گھڑیال تیرہویں صدی عیسوی میں بنائے تھے[2]۔

مشرق وسطیٰ اور مشرقی نصف کرہ سے بڑے پیمانے پر قدیم اشیا اور نئی ٹیکنالوجی کی درآمد کاری نے نشاۃ ثانیہ (renaissance) سے ہمکنار ہونے والے یورپ پر بہت اچھے اثرات مرتب کیے۔ یہ تاریخ عالم میں ٹیکنالوجیز کی سب سے بڑی منتقلیوں میں سے ایک تھی۔

اینڈریو واٹسن (Andrew M. Watson) کہتا ہے کہ 700ء اور 1100ء کے درمیان ایک زبردست زرعی انقلاب آیا جس نے فصلوں کی بہت بڑی تعداد (اٹھارہ فصلیں) اور ٹیکنالوجیز سپین سے عہد متوسط کے یورپ میں پھیلا دیں۔ مثلاً گنے سے چینی بنانا، آبی گھڑیال، پھل کا گودا محفوظ کرنا، کاغذ سازی، ریشم، فلنگ ملیں، مل ٹیکنالوجی، سکشن پمپ، رہٹ کا پہیہ اور نظام آبپاشی کے لئے چین پمپ وغیرہ۔ زرعی انقلاب کے دوران مسلمانوں کی خدمات نئے آلات کی ایجاد میں کم تھیں بمقابلہ ان کے وسیع پیمانے پر استعمال کے، جو زمانہ قبل از اسلام میں صرف محدود رقبے اور کم پیمانے پر استعمال ہوتے تھے۔ ان دریافتوں نے بڑے صنعتی کام ممکن بنا دیئے جو پہلے انسانی ہاتھوں کی قوت سے یا بوجھ کھینچنے والے جانوروں کی مدد سے کیے جاتے تھے۔ چنانچہ عہد متوسط کے یورپ میں ان میں سے بیشتر کام مشین سے کئے جانے لگے[3]۔

۱۔ Studies in Medieval Islamic Technology: From Philo to Al-Jazari - From Alexandria to Diya Bakr by Donald Routledge Hill; David A. King, p.23.

۲۔ Chiu, Y.C, History of Project management by Y. C. Chiu, p. 5.

۳

۔https://www.jstor.org/stable/40060793?seq=1#page_scan_tab_contents, https://www.wsfcs.k12.nc.us/cms/lib/NC01001395/Centricity/Domain/8062/watson_AAR_and_its_diffusion.pdf

میگوئیل آسن پلاسیوس[1] (Migel Asin Palacios, d. 1944) نے خیال ظاہر کیا ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی ادبی تصنیف دانتے[2] (Dante, d. 1321) کی Divine Comedy میں 'آخرت' کے بہت سے نمایاں اوصاف اور سلسلۂ واقعات براہِ راست یا بالواسطہ اسلامی عقیدہ معاد پر مبنی عربی تصانیف سے ماخوذ ہیں[3]۔ حضور نبی کریم ﷺ کے سفرِ معراج کے بارے میں تصنیف (کتاب المعراج) کا 1264ء میں یا Ladder Liber Scale کی کتاب The Book of Mohammad's Machometi سے پہلے لاطینی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ دانتے (Dante, d. 1321) یقینی طور پر مسلم فلسفے سے آگاہ تھا۔ اس نے فراموش کردہ غیر مسیحی فلسفیوں کی یونانی اور عظیم لاطینی فلاسفروں کے ہمراہ ایک فہرست مرتب کی ہے۔ اس نے ابن رشد سکول آف فلاسفی (Averroism school of philosophy) کے بانی ابن رشد (Averroes, d. 1198) کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ اس نے مغربی یورپ میں سیکولر افکار کے عروج میں نمایاں کردار ادا کیا ہے[4]۔

امام غزالیؒ (al-Ghazali, d. 1111) کا بھی عہد متوسط کے مسیحی فلسفیوں پر بہت گہرا اثر

۱۔ Miguel Asin Palacios: میگوئیل آسن پلاسیوس (1871ء - 1944ء) ایک نامور ہسپانوی مستشرق، اسلامیات اور عربی زبان کا معلم، کیتھولک پادری تھا جس نے ڈیوائن کامیڈی پر تحقیقی کتاب اسلام اور ڈیوائن کامیڈی لکھ کر شہرت حاصل کی۔

۲۔ Durante degli Alighieri: دانتے الیگیری (1265-1321) اٹلی کا مشہور شاعر تھا۔ اس کی شہرہ آفاق تمثیلی نظم طربیہ خداوندی 'ڈیوائن کامیڈی' میں شاعر کی روح دوزخ اعراف اور جنت کا سفر کرتی ہے۔

۳۔ Islam and Divine Comedy by Miguel Asin Palacios, p. 513

۴۔ Islam and Divine Comedy by Miguel Asin Palacios, p. 513

تھا۔صوفی سکالر مارگریٹ سمتھ[۱] (Margaret Smith, d. 1970) کے مطابق اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امام غزالیؒ (al-Ghazali, d. 1111) کی تصانیف ان اولین کتابوں میں سے ہیں جنہوں نے یورپی سکالرز کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ مسیحی مصنفین میں سے سب سے بڑا آدمی جو امام غزالیؒ (al-Ghazali, d. 1111) سے متاثر ہوا، وہ سینٹ ٹامس ایکوناس[۲] (Thomas Aquinas, d. 1274) تھا۔اس نے مسلم مصنفین کے زیر اثر ہونے کا اعتراف کیا۔ دراصل اس نے یونیورسٹی آف نیپلز (University of Naples) میں تعلیم حاصل کی تھی جہاں اس وقت اسلامی لٹریچر اور کلچر غالب تھا[۳]۔

قرآن پاک کا بہت سا حصہ پرانی قوموں کے عروج وزوال سے بحث کرتا ہے اور تاریخ کو علم کا ایک حصہ مانتا ہے۔اس لیے مسلمانوں میں ہیروڈوٹس[۴] (Herodotus, d. 425BC) کے بعد پہلی

۱۔Margaret Smith؛ مارگریٹ سمتھ (1884ء-1970ء) ایک عیسائی صوفی سکالر تھا جس نے ابتدائی عیسائیت اور مسلم تصوف پر لکھا۔ وہ پہلا مغربی مصنف تھا جس نے بصرہ کے صوفی راہبوں کی زندگیوں پر تاریخی اعتبار سے ترتیب دے کر لکھا۔اسی طرح اس نے دیگر صوفیاء اور ان کے عقائد کی مختصر تاریخ مرتب کی۔اس ضمن میں سمتھ کی چار کتب

i. An Early Mystic of Baghdad,

ii. An Introduction to the History of Mysticism,

iii. Rabi'a the Mystic and Her Fellow-Saints in Islam

iv. Studies in Early Mysticism in the Near and Middle East

شائع ہو چکی ہیں۔

۲۔Thomas Aquinas؛ سیٹ ٹامس ایکوناس (1225ء-1274ء) ایک مسیحی فلسفی اور عالم دین تھا۔اس نے اپنے وقت کے بہترین استادوں سے فلسفے کی تعلیم حاصل کی تھی اور شہنشاہ فریڈرک دوئم کا درباری بن گیا۔لیکن 1243ء میں اس نے درویشی اختیار کر لی۔اس نے اپنی مذہبی فلسفیانہ تصانیف میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فطرت پرستی اور عقل پرستی کو مسیحی عقائد سے بہ آسانی ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ Al-Ghazali: The Mystic by Margaret Smith, p. 105 - 132.

۴۔Herodotus؛ ہیروڈوٹس (425BC-481BC) ایک قدیم یونانی مؤرخ تھا جسے ابوالتاریخ یعنی تاریخ کا باپ بھی کہا جاتا ہے۔

بار یعقوبی[1] (al-Yaqubi, d. 897)، طبری[2] (al-Tabari, d. 923)، مسعودی[3] (al-Mas'udi, d. 695)، ابن خلدون[4] (Ibn Khaldun, d. 1406) اور البیرونی (al-Biruni, d. 1048) جیسے تاریخ دان پیدا ہوئے۔ ابن خلدون (Ibn Khaldun, d. 1406) پہلا مسلمان تاریخ دان تھا جس نے فلسفہ تاریخ کے اصول وضع کیے اور تاریخ پر تنقید کے اصول متعارف کرائے۔

ابن خلدون (Ibn Khaldun, d. 1406) نے اپنی کتاب (مقدمہ) میں تاریخ انسانی میں پہلی بار ارتقائے تاریخ کے اصولوں کی توضیح وتشریح کی اور انہیں غور وخوض کے لئے پیش کیا۔ اس نے تاریخ پر موسم، ماحول، اخلاقیات اور روحانیت کے اثرات کا تنقیدی جائزہ لیا اور قوموں کے عروج وزوال کے اصول بھی واضح کیے۔ اس لیے بجا طور پر دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس نے جدید تاریخ اور عمرانیات کی بنیادیں رکھیں۔ ٹائن بی (Arnold Toynbee, d. 1975) کے بقول اس کا 'مقدمہ' اپنی نوعیت کا عظیم ترین کارنامہ ہے جسے کسی ذہن نے کسی زمان ومکان میں تخلیق کیا ہو[5]۔

مسلمانوں کا مغرب پر سب سے بڑا احسان سائنسی (scientific) اور استخراجی (inductive) طریقہ تحقیق ہے۔ رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault, d. 1948) نے لکھا ہے کہ آکسفورڈ یونیورسٹی اور راجر بیکن (Roger Bacon, d. 1294) بنیادی طور پر عربوں کے علم

۱۔ Ahmad ibn Abu Ya'qub ibn Ja'far al-Ya'qubi؛ احمد ابن ابو یعقوب ابن جعفر ابن وہب ابن ودیع الیعقوبی المعروف یعقوبی (897ء وفات) ایک مسلمان جغرافیہ دان اور مسلم دنیا کے قرون وسطی کے پہلے مورخ تھے۔ تاریخ یعقوبی اسلامی تاریخ پر ان کی مشہور ترین کتاب ہے۔

۲۔ Abu Ja'far Muhammad ibn Jarir al-Ṭabari؛ ابوجعفر محمد بن جریر بن یزید الطبریؒ (838ء-923ء) مشہور مسلم مفسر مورخ تھے۔

۳۔ Abu al-Hasan Ali ibn al-Husayn al-Mas'udi؛ ابوالحسن علی بن حسین بن علی مسعودی (896ء-956ء) مشہور مسلم مؤرخ، جغرافیہ دان اور سیاح تھے۔

۴۔ Abd ar-Raḥman ibn Muhammad ibn Khaldun؛ علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون (1332-1406)، ایک مورخ، فقیہ، فلسفی اور کامیاب سیاستدان تھے۔ آپ کو تاریخ اور عمرانیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ مقدمہ فی التاریخ ہے جو مقدمہ ابن خلدون کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تاریخ، سیاست، عمرانیات، اقتصادیات اور ادبیات کا گراں مایہ خزانہ ہے۔

۵۔ A Study of History by Arnold Toynbee, v. 3, p.

کے زیر اثر آگے بڑھے[1]۔

مغرب میں پندرہویں صدی عیسوی تک سائنس اور فلسفہ کی تعلیمات کو مذہب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔اسی لیے ارسطو(Aristotle, d. 322BC)اور ابن سینا(Avicenna, d. 1037) کی تعلیمات یہاں ممنوع تھیں۔ برونو[2](Giordano Bruno, d. 1600) کو جلا دیا گیا۔کیپلر[3] (Kepler, d. 1630)کو سزا دی گئی۔گیلیلیو[4](Galileo, d. 1642)کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے نظریات سے لاتعلقی کا اظہار کرے۔اس کے برعکس مسلمان معاشرے میں سائنس اور مذہب میں ہم آہنگی پیدا کی گئی۔جس کے سبب یہاں سائنس اور فلسفہ نے ترقی پائی اور پھر مغرب نے بھی اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

مغربی دانشور عام طور پر یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ مغرب اسلامی تصوف سے بہت متاثر ہوا ہے۔گوئٹے[5](Goethe, d. 1832) پر ایران کی صوفیانہ شاعری کا بہت گہرا اثر ہے۔اسی طرح دانتے (Dante, d. 1321) کی Divine Comedy پر ابن عربیؒ[6](Ibn Arabi, d.

1۔ Making of Humanity by Robert Stephen Briffault, p.200

2۔Giordano Bruno؛ گیوردانو برونو (1548 - 1600) ایک اطالوی فلسفی اور ریاضی دان تھا جو اپنی جوانی میں راہب تھا لیکن روشن خیالی کے باعث کلیسا نے اس پر کفر کا الزام لگایا اور اسی جرم کی پاداش میں اسے زندہ جلا دیا گیا۔

3۔(Johannes Kepler) جان کیپلر (1571 - 1630) ایک جرمن ماہر فلکیات، ریاضی دان اور سترھویں صدی کے سائنسی انقلاب کی ایک بہت اہم شخصیت تھا۔وہ سیاروں کی حرکت کے قوانین دریافت کرنے کے لیے مشہور تھا جس کی بعد میں آنے والے ماہر فلکیات نے تصدیق کی۔اس کی تحقیق نیوٹن کی تحقیقات کی بنیاد بنی۔

4۔(Galileo Galilei) گیلیلیو (1564 - 1642) ایک اطالوی ماہر فلکیات اور فلسفی تھا۔گیلیلیو نے اشیا کی حرکات، دوربین، فلکیات کے بارے میں بیش قیمت معلومات فراہم کیں۔اسے جدید طبیعیات کا باپ کہا جاتا ہے۔

5۔Johann Wolfgang von Goethe؛ گوئٹے (1749 - 1832) ایک جرمن ادیب تھا جو شاعری، ڈراما، ادب، فلسفہ، الٰہیات، عرض بے شمار اصناف میں لکھتا رہا۔اس کا شمار عالمی ادب کے گنے چنے قافلہ سالاروں میں شمار ہوتا ہے۔

6۔شیخ اکبر محی الدین محمد بن العربی الحاتمی الطائی الاندلسیؒ (1165-1240)، دنیائے اسلام کے ممتاز صوفی، عارف، محقق، قدوہ علما اور علوم کا بحر بیکنار ہیں۔اسلامی تصوف میں آپؒ کو شیخ اکبر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔آپؒ کا قول تھا کہ باطنی نور خود رہبری کرتا ہے۔ آپؒ کی تصانیف میں فصوص الحکم اور الفتوحات المکیہ بہت مشہور ہے اور کتب تصوف میں اس کا درجہ بہت بلند ہے۔

1840) کا اثر ہے[1]۔

مختصراً یہ کہ مسلمانوں کی ذہنی اور تعلیمی کامیابیوں کا مغربی ذہن پر گہرا اثر تھا۔ مسلم دنیا سے منتقل ہونے والے علم نے مغرب پر گہرے اثرات مرتب کیے مثال کے طور پر:

(i)۔ اس سے انسان دوستی کی تحریک (Humanistic Movement) شروع ہوئی۔

(ii)۔ تاریخی علوم (Historical Sciences) شروع ہوئے۔

(iii)۔ سائنسی تجربہ و مشاہدہ شروع ہوا۔

(iv)۔ فلسفہ اور عقیدہ میں باہمی تفہیم پیدا ہوئی۔

(v)۔ تصوف کی تحریک نے جنم لیا۔

(vi)۔ کانٹ (Immanuel Kant, d. 1804) تک مغرب اسلامی فکر سے متاثر رہا وغیرہ۔



[1]۔ A History of Muslim Philosophy by M. M. Sharif, vol. 2, p.1338 - 40

چوتھا باب

تحقیق اور تخلیق

The new Philosophy calls all in doubt,
The Element of fire is quite put out
(فلسفہ نو شبہے کی طرف بلاتا ہے)
(شعلہ آتش ہو چکا ہے ٹھنڈا)

قرون اولیٰ کے مسلمان بڑی کامیابی سے اپنے وقت کے چیلنجوں سے عہدہ برآ ہوئے اور انہوں نے انسانی فکر وعمل کی سرحدوں کو آگے دھکیل کر دم لیا۔ وہ بڑا عرصہ مہذب دنیا پر چھائے رہے اور ذہنی ارتقاء کے تقریباً سب شعبوں میں قائدانہ کردار ادا کرنے لگے۔ لیکن پھر وہ رفتہ رفتہ انحطاط پذیر ہوتے چلے گئے اور بالآخر گہری نیند میں ڈوب گئے۔ جب وہ اپنے زمانے کے چیلنجوں سے مقابلے کی صلاحیت سے محروم ہوئے تو مغرب اور بالخصوص یورپ نے ان کے ذہنی اور سائنسی ورثے سے خوب فائدہ اٹھایا اور ان کی دریافتوں کو مزید آگے بڑھانے لگے۔ بالکل اسی طرح جس طرح مسلمانوں نے یونانی علم میں مہارت حاصل کر کے اسے مزید آگے بڑھایا تھا۔ آیئے اس امر کی تحقیق کریں کہ عہد متوسط اور جدید دور میں مسلمانوں کو کیا کیا چیلنج درپیش تھے۔ ان ادوار میں انسانی افکار اور اقدامات میں کیا کیا پیشرفت ہوئی اور ان ترقیوں کے بارے میں ہمارا کیا ردعمل تھا اور ہم نے اس سلسلے میں کیا کردار ادا کیا۔

1۔ سائنس کا ظہور

جدید مؤرخین کا دعویٰ ہے کہ عالمی نقطۂ نظر سے سائنسی انقلاب ایک انقلابی تبدیلی تھی۔ 1611ء میں انگریز شاعر جان ڈون[1] (John Donne, d. 1631) نے لکھا:

The new Philosophy calls all in doubt,
The Element of fire is quite put out;
The Sun is lost, and th'earth, and no man's wit
Can well direct him where to look for it[2].

---

[1]۔ John Donne؛ جان ڈون (1572ء-1631ء) ایک برطانوی شاعر اور گرجا کا کلرک تھا۔

[2]۔ An Anatomy of the World by John Donne

(فلسفہ نو شبہے کی طرف ہے بلاتا)
(شعلہ آتش ہو چکا ہے ٹھنڈا)
(آفتاب ہو گیا ہے کہیں گم)
(عقل حیراں ہے کہاں سے اسے لائیں)

سائنسی انقلاب سے جدید سائنس کا ظہور ہوا۔ جب ریاضی (Mathematics)، فزکس (Physics)، فلکیات (Astronomy)، حیاتیات (Biology) اور کیمیا (Chemistry) میں ہونے والی پیش قدمی نے انسان، معاشرے اور فطرت کے بارے میں پہلے مرّوج نظریات تبدیل کر دیئے۔ یورپ میں سائنسی انقلاب، نشاۃ ثانیہ[1] (Renaissance) کے اواخر میں آیا اور اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر تک جاری رہا۔ اس نے ذہنی اور معاشرتی تحریک کو متاثر کیا جسے روشن خیالی (Enlightenment) کہا جاتا ہے۔ 1543ء میں کاپرنیکس (Copernicus, d. 1543) کی 'De Revolutionibus Orbium Coelestium' (On the Revolutions of Heavenly Spheres) شائع ہوئی تو اسے عام طور پر سائنسی انقلاب کا آغاز کہا گیا۔ سائنسی انقلاب کا پہلا مرحلہ گیلیلیو (Galileo, d. 1642) کی کتاب 'Dialogue Concerning the Two Chief World Systems' کی اشاعت سے مکمل ہوا۔ نیوٹن[2] (Newton, d. 1727) کی

---

[1]۔ نشاۃ ثانیہ (Renaissance) قرون وسطیٰ میں یورپ سے اٹھنے والی ایک تحریک تھی جو 14ویں سے 17ویں صدی تک جاری رہی۔ اس کی ابتدا اٹلی سے ایک ثقافتی تحریک کے طور پر ہوئی پھر دیکھتے ہی دیکھتے پورے یورپ تک پھیل گئی۔

[2]۔ (Sir Isaac Newton) سر آئزک نیوٹن، (1673-1727) ایک مشہور معروف طبیعیات دان، ریاضی دان، ماہر فلکیات، فلسفی اور کیمیا دان تھا۔ جس کا شمار تاریخ کی انتہائی اہم شخصیات میں ہوتا ہے۔ 1687 میں چھپنے والی اس کی کتاب قدرتی فلسفہ کے حسابی اصول (Philosophiæ Naturalis Principia Mathematica) سائنس کی تاریخ کی اہم ترین کتاب مانی جاتی ہے۔ جس میں کلاسیکی میکینکس کے اصولوں کی بنیاد رکھی گئی۔ اسی کتاب میں نیوٹن نے کشش ثقل کا قانون اور اپنے تین قوانین حرکت بتائے۔ یہ قوانین اگلے تین سو سال تک طبیعیات کی بنیاد بنے رہے۔ نیوٹن نے ثابت کیا کہ زمین پر موجود اجسام اور سیارے اور ستارے ایک ہی قوانین کے تحت حرکت کرتے ہیں۔ اس نے اپنے قوانین حرکت اور کیپلر کے قوانین کے درمیان مماثلت ثابت کر کے کائنات میں زمین کی مرکزیت کے اعتقاد کو مکمل طور پر ختم کر دیا اور سائنسی انقلاب کو آگے بڑھانے میں مدد دی۔

کتاب Principia[1] کی اشاعت کواس انقلاب کی تکمیل سمجھا جاتا ہے۔اس کتاب میں قوانین حرکت اور کششِ ثقل (universal gravitation) کے فارمولے بیان کئے گئے ہیں۔

سائنسی انقلاب یونانی علوم پر مبنی تھا جسے رومن/ بازنطینی (Roman/Byzantine) اور عہد متوسط کے اسلامی علوم نے مزید ترقی ونفاست سے ہمکنار کیا۔اس کا بطور انقلاب اس لئے حوالہ دیا جاتا ہے کہ اس عہد کی بصیرتوں اور دریافتوں نے فطرت کی ایک نئی انقلابی سوچ کو ابھارا اور یونانی سوچ کی جگہ لے لی جسے اس سے پہلے غلبہ حاصل رہا تھا۔

سترہویں صدی عیسوی میں 'سائنسی طریق کار' (systematic experimentation) کی واضح تصریح اور اس کا اطلاق ہو رہا تھا اور اس دور کی عالمی سائنسی برادری میں باضابطہ تجربات کی ایک تحقیقی روایت رفتہ رفتہ جگہ بنا رہی تھی۔ فطرت کو سمجھنے کے لئے ارسطا طالیسی استخراجی طریق کار (Aristotelian deductive approach) کی جگہ استقرائی طریق کار (inductive approach) کے استعمال کا فلسفہ لے رہا تھا۔جس کے نتیجے میں معلوم حقائق (known facts) کی بہتر تفہیم اور مزید آگے بڑھنے کے نئے امکانات پیدا ہونے لگے۔ اس طرح تجربیت (Empiricism)، سائنس کا ایک بہترین جزو بن گئی۔

فرانسس بیکن[2] (Francis Bacon, d. 1626) نے جسے بابائے تجربیت (father of empiricism) کہا جاتا تھا، سائنسی انقلاب کی فلسفیانہ بنیاد وضع کی۔اس نے سائنسی تحقیق کے لئے

---

[1]۔'پرنسپیا' سر آئزک نیوٹن کی ایک بہت معتبر کتاب ہے جس کا پورا نام 'Mathematical Principles of Natural Philosophy' ہے۔ یہ پہلی بار 1787ء میں چھپی تھی۔'پرنسپیا' میں نیوٹن کے قوانین حرکت اور قانون کشش بیان کئے گئے ہیں۔اس کتاب کو بجا طور پر تاریخ سائنس کی اہم ترین کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

[2]۔Francis Bacon؛ فرانسس بیکن (1561ء-1626ء) ایک برطانوی وکیل اور فلسفی تھا۔ وہ 1582 میں بار کا رکن بنا اور 1584 میں رکن پارلیمنٹ منتخب ہوا۔ 1603ء میں اسے برطانیہ اور سکاٹ لینڈ کی یونین کا کمشنر مقرر کیا گیا۔ 1604ء میں اٹارنی جنرل اور 1613ء-1618ء میں لارڈ چانسلر بنا۔اس کی شہرت کی وجہ اس کی فلسفیانہ اور ادبی تحریریں ہیں۔اس نے سترھویں صدی کی سائنسی فکر کو بہت متاثر کیا۔اس کی کتاب The Advancement of Learning میں علوم کی نئی جماعت بندی کی گئی ہے۔ 1624ء میں اس نے اپنی کتاب Norum Organum Scientiarum میں استدلال کیا کہ علم صرف تجربے ہی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

استقرائی طریق ہائے کار قائم کرکے انہیں مقبولیت عامہ کی راہ پر ڈال دیا۔ اسی لئے اسے 'بیکونین طریق کار' (Baconian method) یا صرف 'سائنسی طریقہ' کہا جانے لگا۔ وہ تحصیل علم (سماوی اور انسانی) کے طریق کار کی اصلاح کی پُرزور وکالت کرتا تھا جس کا نام اس نے 'Instauration Magna' (عظیم عمل بحالی) رکھا۔ اس کی کتاب 'Novum Organum'[1] 1620ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اس نے دعویٰ کیا کہ انسان فطرت کا ترجمان اور وزیر ہے۔ 'علم' اور 'قوت انسانی' ہم معنی ہیں۔ اثرات، آلات اور معاونین (helps) سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسان کچھ کرتے ہوئے صرف ایک طریقہ 'لاگو' (apply) کرتا ہے، باقی ماندہ کام فطرت کرتی ہے جو اندرونی طور پر کارکردگی دکھاتی ہے۔ فطرت سے صرف اس وقت کام لیا جاسکتا ہے جب اس کے اصول وضوابط کے مطابق کام کیا گیا ہو اور صرف یہی طریقِ کار ہے جس کے ذریعے 'تخلیق پر انسان کی سلطنت' قائم کی جاسکتی ہے۔

ولیم گلبرٹ[2] (William Gilbert, d. 1603) اس طریقہ کار (methodology) کے ابتدائی وکیلوں میں سے تھا۔ اس نے مروج ارسطا طالیسی فلسفے اور یورنیورسٹی تدریس کے متکلمانہ طریقے کی پُرزور مخالفت کی۔ اس کی کتاب 'De Magnete' میں جو 1600ء میں چھپی سخت گیرانہ طریقے کی حمایت کی گئی ہے اور استقرائی طریق کے تجربات کی وضاحت کرتے ہوئے مقناطیسیت کے قدیم نظریات کو مسترد کیا گیا ہے۔

گیلیلیو (Galileo, d. 1642) نے واضح طور پر کہا کہ قوانین فطرت ریاضیاتی ہیں۔ اس نے اپنی کتاب 'The Assayer'[3] میں لکھا ہے کہ فلسفہ اس عظیم کتاب میں لکھا گیا ہے جسے ریاضی کی زبان میں تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے حروف، مثلثیں (triangles)، دائرے (circles) اور دیگر

---

[1]۔ Novum Organum Scientiarum بیکن کے فلسفیانہ نظریات پر مشتمل کتاب ہے جو پہلی دفعہ 1620 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں وہ منطق کی ایک نئی قسم کی تفصیل بتاتا ہے جسے وہ 'قیاس' کے پرانے طریقوں سے برتر سمجھتا ہے اسے اب 'بیکونین طریقہ' کہا جاتا ہے۔

[2]۔ William Gilbert؛ ولیم گلبرٹ (1544ء۔1603ء) ایک انگریز معالج، ماہر طبیعیات اور فلسفی تھا۔

[3]۔ اسیر (اطالوی: Saggiatore) ایک کتاب تھی جو گیلیلیو نے اکتوبر 1623ء میں روم سے چھپوائی تھی۔ یہ سائنسی طریق کار میں ایک رہبرانہ کردار کی حامل تھی۔

جیومیٹرائی اشکال (geometric figures) ہیں[1]۔ اس کی کتابیں سائنس کی، فلسفہ اور مذہب دونوں سے بالآخر ہونے والی علیحدگی کی طرف ایک قدم تھیں جو کہ انسانی فکر میں ایک اہم قدم تھا۔

سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں یورپی سائنسدان زمین کے طبیعیاتی مظہر کی پیمائش کے لئے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مقداری (quantative) پیمائشوں کا اطلاق کرنے لگے۔ گیلیلیو (Galileo, d. 1642) نے پرزور طریقے سے یہ موقف اختیار کیا کہ ریاضی نے ایک قسم کا ناگزیر تیقن (necessary certainty) مہیا کیا ہے جس کا خدا کے تیقن (necessary certainty) سے تقابل کیا جاسکتا ہے۔

سائنسی انقلاب نے سائنسی تفتیش و تحقیق کی ادارہ سازی کی طرف رہنمائی کی جس کے لئے ایسی سوسائٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا جو ان افکار اور تجربات کی نشر و اشاعت کا بندوبست کریں۔ ایسی اولین سوسائٹی، رائل سوسائٹی آف لندن[2] (Royal Society of London) تھی۔ 'فلاسوفیکل سوسائٹی آف آکسفورڈ' (The Philosophical Society of Oxford) کے نام سے ایک گروپ قائم کیا گیا جو چند قواعد کے تحت کام کرتا تھا۔ یہ گروپ 'بوڈلین' (Bodleian) لائبریری کے تحت ہی تھا۔ 1666ء میں فرینچ اکیڈمی آف سائنسز تشکیل پائی جس کے قواعد 1699ء میں لوئی چودھواں[3] (Louis-XIV, d. 1715) نے وضع کیے۔ اس کے بعد اس کا نام رائل اکیڈمی آف سائنس (Royal Academy of Sciences) رکھ دیا گیا۔ سوسائٹی نے اپنی مطبوعات 'فلاسوفیکل ٹرانزیکشنز' (Philosophical Transactions) کا آغاز 1665ء سے کیا۔ اس طرح اسے دنیا کا قدیم ترین اور طویل ترین سائنسی رسالہ بننے کا اعزاز حاصل ہوگیا۔ یہ پہلا رسالہ تھا جس نے 'ماہرانہ نظرثانی' (peer review) کی روایت قائم کی۔

---

[1]۔ Renaissance Genius: Galileo Galilei & His Legacy to Modern Science by David Whitehouse, p. 219.

[2]۔ فطری علوم کو فروغ دینے کے لئے صدر کونسل اور فیلوز پر مشتمل یہ سوسائٹی جسے عام طور پر رائل سوسائٹی (Royal Society of London) کہا جاتا ہے ایک علمی انجمن برائے سائنس ہے۔ یہ اب تک وجود میں آنے والی تمام سوسائٹیوں سے قدیم ترین ہے۔ اس کی بنیاد کنگ چارلس دوم نے نومبر 1662ء میں رکھی تھی۔

[3]۔ Louis XIV؛ لوئی چودھواں (1638ء-1715ء) فرانس کا بادشاہ تھا جو 1643ء سے لے کر 1715ء تک (72 سال، 3 ماہ اور 18 دِن) حکمران رہا۔ اس کے دورِ حکومت میں فرانس یورپ کا طاقتور ملک رہا۔

چند نئے نظریات نے جن میں سے کچھ اپنے اپنے شعبوں میں انقلابی نوعیت کے تھے، سائنسی انقلاب لانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تقریباً پانچ ہزار برسوں سے زمین کا 'ارض مرکز' (geocentric model) ماڈل بطور مرکز کائنات مقبول چلا آ رہا تھا جسے تمام سائنسدان مانتے تھے۔ کاپرنیکس (Copernicus, d. 1543) کی 1543ء میں لکھی ہوئی کتاب کے 'شمس مرکز تصور' (heliocentric model) کے ذریعے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی کہ سورج مرکز کائنات ہے۔ کیپلر (Kepler, d. 1630) اور گیلیلیو (Galileo, d. 1642) کی دریافتوں نے اس نظریئے کو ثقاہت دے دی۔ کیپلر (Kepler, d. 1630) ایک ماہر فلکیات تھا جس کا نظریہ یہ تھا کہ سورج کے گرد سیارے 'دائروی گردش' (circular orbits) نہیں کرتے بلکہ بیضوی (elliptical) شکل میں گھومتے ہیں۔ اس نے اپنے اس انکشاف کو سیاروی حرکت کے دیگر قوانین کے ساتھ ملا کر نظامِ شمسی کا ایک ماڈل بنایا جو کہ کاپرنیکس (Copernicus, d. 1543) کے اصل سسٹم کی ایک اصلاح تھا۔ گیلیلیو (Galileo, d. 1642) کے اہم کارناموں میں اس کی کتاب 'میکانیات' (Mechanics)، دوربین کی مدد سے اس کے مشاہدات اور 'شمس مرکز نظام' (heliocentric system) کے اثبات کے لئے اس کی تحریریں شامل تھیں۔ کیپلر (Kepler, d. 1630) اور گیلیلیو (Galileo, d. 1642) کی دریافتوں کے مجموعے کی بدولت 'شمس مرکز نظام' نے قبولیت عامہ حاصل کر لی۔

نیوٹن (Newton, d. 1727) کی کتاب 'Principia' نے حرکت اور کششِ ثقل کے قوانین وضع کیے۔ جنہوں نے اگلی تین صدیوں کے لئے طبیعیاتی کائنات (physical universe) سے متعلق سائنسی فکر کو غالب کر دیا۔ نیوٹن (Newton, d. 1727) نے کیپلر (Kepler, d. 1630) کے قوانین حرکتِ سیارگاں سے اشتقاق اور اپنے ریاضیاتی بیانِ کششِ ثقل سے کائنات کے 'شمس مرکز ماڈل' کے بارے میں آخری شکوک بھی رفع کر دیئے۔ اس کے قوانین حرکت نے میکانیات کے لئے ٹھوس بنیاد فراہم کر دی۔ اس کے 'کشش ثقل کے قانون' (law of universal gravitation) نے ارضی اور سماوی میکانیات کو یکجا کر کے ایک عظیم نظام پیش کر دیا جس کی بدولت وہ پوری دنیا کو ایک ریاضیاتی فارمولے میں بیان کرنے کے قابل ہو گیا۔ 'پرنسپیا' (Principia) میں نیوٹن (Newton, d. 1727) نے نظریۂ کششِ ثقل (gravitation) اور حرکت کے تین ہمہ گیر قوانین وضع کیے،

جنہوں نے صنعتی انقلاب کے دوران کئی پیش قدمیاں کیں۔

یونانی طبیب 'جالینوس'[1] (Claudius Galenus, d. 216) یورپی طب پر ایک ہزار سال سے زائد عرصے تک چھایا رہا تاوقتیکہ ایک اطالوی طبیب آندریاس وزالیوس[2] (Andreas Vesalius) نے تجربات پیش کر کے 'جالینوسی ماڈل' (Galenic model) کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ اس کی کتاب 'De humani corpris fabrica' علم تشریح الاعضا برائے انسان کے بارے میں بہت معتبر تصنیف ہے۔ ایسی ہی ایک معتبر کتاب ولیم ہاروے (William Harvey, d. 1657) نے لکھی جو 1628ء میں 'De Motu Cordis' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ ہاروے (Harvey, d. 1657) نے انسانی دل کی ساخت کا تجزیہ کر کے شریانوں کا ایسا نظام پیش کیا اور دکھایا کہ ان کی دھڑکن کا انحصار بائیں مجوف حصے (left ventricle) کے سکڑاؤ پر ہوتا ہے جبکہ دائیں مجوف حصے کا سکڑاؤ اپنے خون کے دباؤ کو 'ریوی شریان' (pulmonary artery) میں دھکیل دیتا ہے۔ ہاروے (Harvey, d. 1657) نے مشاہدہ کیا کہ دونوں جوف تقریباً بیک وقت حرکت کرتے ہیں نہ کہ اپنے اپنے طور پر متحرک ہوتے ہیں جیسا کہ اس کے پیشرووں نے سمجھ رکھا تھا۔

سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کے دوران علم کیمیا (Chemistry)، سائنسی فکر کا اہم پہلو بنتا چلا گیا۔ 'جورجیوس اگریکولا'[3] (Georgius Agricola, d. 1555) نے خام دھاتوں کے استخراج کے پیچیدہ طریق کار پر روشنی ڈالی۔ اس سلسلے میں ایک ضخیم کتاب 'De re Metallica' لکھی جو 1556ء میں شائع ہوئی۔ رابرٹ بوائل[4] (Robert William Boyle, d. 1691) نے

---

[1]۔ Claudius Galenus؛ جالینوس (129ء-216ء) ایک یونانی طبیب اور فلسفی تھا۔ اس نے تقریباً ڈیڑھ سو تصانیف طب، منطق، صرف ونحو، اخلاقیات، فلسفہ اور ادب پر لکھیں۔

[2]۔ Andreas Vesalius؛ آندریاس وزالیوس (1514ء۔1564ء) ایک ماہر تشریح الابدان اور طبیب تھا۔ اسے جدید علم تشریح الابدان کا بانی سمجھا جاتا ہے۔

[3]۔ Georgius Agricola؛ جورجیوس اگریکولا (1494ء-1555ء) ایک جرمن سکالر اور سائنسدان تھا جسے علم المعدنیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

[4]۔ Robert William Boyle؛ رابرٹ بوائل (1627ء-1691ء) ایک برطانوی سائنسدان اور موجد تھا۔ اسے اس کے قانون بوائل کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ رابرٹ بوائل کو جدید کیمیا کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

دھاتوں کو مصفا (صاف) کرنے کے جدید ترین طریقوں کی وضاحت کی۔ 'قانون بوائل' بتاتا ہے کہ مطلق دباؤ (absolute pressure) اور گیس کے حجم میں 'برعکس متناسب' (inversely proportional) تعلق ہوتا ہے بشرطیکہ درجہ حرارت بند نظام کے اندر یکساں رہے۔ اس نے 1661ء میں 'The Sceptical Chymist' لکھی جس میں اس نے بتایا کہ ہر امرِ واقعہ متحرک ذرات کے باہمی ٹکراؤ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں ذرات (ایٹمز) سالمات (molecules) اور کیمیائی تعامل کے چند قدیم ترین تصورات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ جدید کیمسٹری کی تاریخ کی ابتدا بن گئی۔

بصریات (optics) کے شعبے میں کیپلر (Kepler, d. 1630) نے 1604ء میں 'Astronamiae Pars Optica' (Optical Part of Astronomy) لکھی جس میں اس نے 'کلیہ مربعِ معکوس' (inverse-square law) کی تفصیل بیان کی۔ یہ کلیہ روشنی کی شدت (intensity of light)، مسطح اور کروی شیشوں کے انعکاس (reflection by flat and curved mirrors) اور مہین سوراخ والے کیمروں (pinhole cameras) کے اصولوں کا تعین کرتا ہے۔ اسی طرح یہ بصریات (optics) کے فلکیاتی مضمرات مثلاً اختلافِ منظر اور اجرام فلکی کی ظاہری ضخامت کا بھی تعین کرتا ہے۔ 'ولبرورڈ اسنلیوس'[1] (Willebrord Snellius, d. 1626) نے اپنی 1621ء میں لکھی ہوئی کتاب 'Snells law' میں ریاضیاتی قانونِ انعطاف (reflection) ثابت کیا۔ بعد ازاں ڈیکارٹ' (Descartes, d. 1650) نے قانونِ انعکاس دریافت کیا اور نیوٹن (Newton, d. 1727) نے روشنی کے انعطاف کی تحقیق کرتے ہوئے ثابت کیا کہ روشنی ذرّات پر مشتمل ہے جو نسبتاً کثیف مادے کی طرف رفتار بڑھاتے ہوئے منعطف ہوتے ہیں۔ مگر اسے 'انکسارِ روشنی' (differaction of light) کی وضاحت کرنے کے لئے ذرات کو لہروں کے ساتھ ملانا پڑا۔

ولیم گلبرٹ (William Gilbert, d. 1603) نے اپنی کتاب 'De Magnete' میں انکشاف کیا کہ متعدد مادے برقی خصوصیات کے اظہار کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ رابرٹ بوائل (Robert William Boyle, d. 1691) نے ولیم گلبرٹ (William Gilbert, d. 1603) کی بنائی ہوئی اس فہرست میں برقی خصوصیت رکھنے والے کئی اور مادوں کا اضافہ کر دیا۔ 'اوٹو فان

---

[1] Willebrord Snellius؛ ولبرورڈ اسنلیوس (1580ء-1626ء) ایک ماہر ریاضی دان اور فلکیات تھا۔

گوئرک[1] (Otto von Guericke, d. 1681) نے ایک ابتدائی قسم کا ساکت جنریٹر ایجاد کیا۔ سترہویں صدی عیسوی کے آخر میں محققین نے الیکٹروسٹیٹک جنریٹر (electrostatic generator) کی رگڑ سے بجلی پیدا کرنے کے عملی طریقے وضع کر لئے۔ 1729ء میں سٹیفن گرے[2] (Stephen Gray, d. 1736) نے ثابت کر دکھایا کہ بجلی کو دھاتی تاروں (فلامنٹس) میں سے گزارا جا سکتا ہے۔

اس عہد میں سائنسی تحقیق کے لئے متعدد آلات، پیمائش کے پیمانے اور شمار کنندہ (Stephen Gray) بنائے جا چکے تھے جو علمِ سائنس کی توسیع کے لئے مددگار ثابت ہوئے۔ جان نیپئر[3] (John Napier, d. 1617) نے 'لوگارتھم' جدول متعارف کروائے اور 'ایڈمنڈ گنٹر'[4] نے اولین 'اینالاگ آلہ' بنایا جو گنتی کرنا آسان بنا دیتا تھا۔ پاسکل (Blaise Pascal, d. 1662) نے 1642ء میں مشینی کیلکولیٹر ایجاد کیا۔ 1642ء میں مشینی کیلکولیٹروں کو ترقی دینے کی مہم شروع کی، پہلے یورپ میں اور پھر دنیا بھر میں یہ کام شروع کر دیا۔ لائبنیز[5] (Leibniz, d. 1716) مشینی کیلکولیٹروں کے شعبے کے ذہین ترین موجدوں میں سے ایک بن گیا اس نے ثنائی نمبر نظام (binary number system) کو بھی نفاست سے ہمکنار کیا جو عملاً جدید کمپیوٹر سازی کی بنیاد ہے۔

سب سے پہلا ورکنگ سٹیم انجن اس کے موجد 'ٹامس سیوری'[6] (Thomas Savery, d. 1715) نے 1698ء میں پیٹنٹ کرایا اور دعویٰ کیا کہ یہ کانوں میں پانی باہر پمپ کر سکتا ہے جبکہ ٹامس

---

[1] Otto von Guericke؛ آٹو فان گوئرک (1602ء-1681ء) ایک جرمن سائنسدان، مؤجد اور سیاست دان تھا۔

[2] Stephen Gray؛ سٹیفن گرے (1666ء-1736ء) ایک انگریز ماہر فلکیات اور برقیات تھا۔

[3] John Napier؛ جان نیپئر (1550ء-1617ء) ایک ماہر ریاضی دان، طبیعات دان اور ماہر فلکیات تھا۔

[4] Edmund Gunter؛ ایڈمنڈ گنٹر (1581ء-1626ء) ایک انگریز ماہر ریاضی دان، جغرافیہ دان اور ماہر فلکیات تھا جسے لاگرتھم کا آلہ متعارف کروانے کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔

[5] Gottfried Wilhelm Leibniz؛ گوٹفریڈ ویلہم لائبنیز (1646-1716) ایک جرمن ریاضی دان اور فلسفی تھا۔ تاریخ ریاضی اور تاریخ فلسفہ میں اُس کا ایک نمایاں مقام ہے۔ اس نے اور نیوٹن نے ایک ہی دور میں الگ الگ کام کرتے ہوئے حسابان کی دریافت کی اور اس کے شائع ہونے سے آج تک للائبنیز کی علامتیں ہی حسابان میں استعمال ہوتی ہیں۔ اس نے ثنائی اعداد کے نظام کو بھی بہتر کیا جو تقریباً ہر شمارندہ کی بنیاد ہے۔

[6] Thomas Savery؛ ٹامس سیوری (1650ء-1715ء) ایک انگریز انجنیئر اور مؤجد تھا جس نے سب سے پہلے سٹیم انجن متعارف کروایا۔

نیوکامن[1] (Thomas Newcomen, d. 1729) نے پانی نکالنے کے لئے اس سے بہتر عملی سٹیم انجن بنایا جس نے بالآخر صنعتی انقلاب کی طرف رہنمائی کی۔ 1778ء میں جیمز واٹ[2] (James Watt, d. 1819) اور میتھو بولٹن[3] (Matthew Boulton, d. 1809) 'نیوکامن' (Thomas Newcomen, d. 1729) کے سٹیم انجن کی کارکردگی بڑھا کر اسے مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ نیا انجن اس سے صرف 20 سے 25 فیصد زیادہ کوئلہ فی 'ہارس پاور' استعمال کرتا تھا۔ ابراہام ڈاربی اول[4] (Abraham Darby-I, d. 1717) نے بلاسٹ فرنیس میں اعلیٰ درجے کا لوہا تیار کرنے کا طریقہ متعارف کروایا جس میں نباتاتی یا حیوانی مادوں سے بنے ہوئے 'چارکول' کی بجائے معدنی کوئلے سے آگ لگائی جاتی تھی۔ یہ لوہا بنانے کی طرف ایک بڑا قدم تھا۔ یہ لوہا صنعتی انقلاب کے لئے خام مال کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

صنعت کاری نے پارچہ بافی (textile industry) کے شعبے میں انقلاب برپا کر دیا۔ پہلے پہل کپڑا گھروں میں (بطور گھریلو صنعت) بنایا جاتا تھا۔ 1764ء میں 'ہرگریوز'[5] (James Hargreaves, d. 1178) نے گھومنے والا ایسا پرزہ (spinning jenny) بنایا جس سے ایک آدمی بیک وقت دھاگے کی متعدد چرخیاں تیار کرنے کے قابل ہو گیا۔ ادھر ہنری بسمر[6] (Henry

---

[1] Thomas Newcomen: ٹامس نیوکامن (1664ء-1729ء) ایک انگریز مؤجد تھا جس نے پہلا عملی سٹیم انجن متعارف کروایا۔

[2] James Watt: جیمز واٹ (1736ء-1819ء) ایک برطانوی مؤجد اور مکینیکل انجینئر تھا جس نے بھاپ کے انجن کو خاطرخواہ ترقی دی۔

[3] Matthew Boulton: میتھو بولٹن (1728ء-1809ء) ایک انگریز کارخانہ دار اور جیمز واٹ (James Watt, d. 1819) کا کاروباری شراکت دار تھا۔

[4] Abraham Darby-I: ابراہیم ڈاربی اول (1678ء-1717ء) ایک انگریز مؤجد تھا جس نے انتہائی اعلیٰ معیار کا لوہا تیار کرنے کا طریقہ کار متعارف کروایا۔

[5] James Hargreaves: جیمز ہرگریوز (1720ء-1778ء) ایک برطانوی مصور اور مؤجد تھا جس نے پہلے پہل گھومنے والا پرزہ (spinny jenny) متعارف کروایا۔

[6] Henry Bessemer: ہنری بسمر (1813ء-1898ء) ایک انگریز مؤجد تھا جس نے اعلیٰ معیار کا سٹیل تیار کرنے کا طریقہ کار متعارف کروایا۔

(Bessemer, d. 1898) نے 1850ء کے عشرے میں بڑے پیمانے پر فولاد سازی کے لئے ایک سستا طریق کار وضع کرلیا۔ لوہا اور فولاد، دونوں اس صنعت کو مزید بڑھانے کے لئے بہت اہم عناصر تھے جن سے آلات، اوزار، مشینیں، جہاز، عمارتیں اور بنیادی ڈھانچے بننے لگے۔

سٹیم انجن کی ایجاد سے پہلے خام مال اور تیار شدہ ساز و سامان خشکی پر گدھوں اور گھوڑوں سے کھینچے جانے والی ویگنوں کے ذریعے اِدھر سے اُدھر پہنچایا جاتا تھا اور نہروں اور دریاؤں میں کشتیوں کے ذریعے بھیجا جاتا تھا۔ رابرٹ فلٹن[1] (Robert Fulton, d. 1815) نے اوّلین تجارتی پیمانے پر کامیاب طور پر بھاپ سے چلنے والی کشتی بنائی اور اس کے بعد بھاپ سے چلنے والے جہاز بنے جو بحراوقیانوس کے آر پار سامان ڈھونے لگے۔ رچرڈ ٹریویتھک[2] (Richard Trevithick, d. 1833) نے پہلا ریلوے سٹیم 'لوکوموٹیو' (انجن) تیار کیا۔ 1830ء میں لیورپول (Liverpool) اور مانچسٹر (Manchester) ریلوے نے اولین باقاعدہ ٹائم ٹیبل کی حامل پسنجر سروس شروع کی۔ 1850ء میں برطانیہ کے پاس 6000 میل سے زیادہ طویل ریل روڈ ٹریک تھا جبکہ 1820ء کے لگ بھگ جان میک ایڈم[3] (John Loudon McAdam, d. 1836) نے سڑکوں کی تعمیر کا نیا طریق کار وضع کرلیا تھا اس طرح کچے اور کیچڑ والے راستوں کی بجائے ہموار پختہ اور زیادہ دیرپا سڑکیں وجود میں آ گئیں۔

1837ء میں ولیم کک[4] (William Cooke, d. 1879) اور چارلس ویٹ سٹون[5]

---

[1]۔ Robert Fulton؛ رابرٹ فلٹن (1765ء-1815ء) ایک امریکی انجنیئر اور مؤجد تھا جس نے پہلی دفعہ بھاپ سے چلنے والی کشتی متعارف کروائی۔

[2]۔ Richard Trevithick؛ رچرڈ ٹریویتھک (1771ء-1833ء) ایک برطانوی مؤجد اور کان کن انجنیئر تھا۔

[3]۔ John Loudon McAdam؛ جان لودون میک آدم (1756ء-1836ء) ایک سکاٹش انجنیئر اور روڈ بلڈر تھا جس نے سڑکیں تعمیر کرنے کا انتہائی مؤثر طریقہ macadamisation متعارف کروایا۔

[4]۔ William Fothergill Cooke؛ ولیم فوتھرجل کک (1806ء-1879ء) ایک انگریز مؤجد تھا جو برقی ٹیلی گراف کا شریک مؤجد تھا۔ اس نے بطور شراکت دار John Lewis Ricardo کے ساتھ دنیا کی پہلی عوامی برقی ٹیلی گراف کمپنی کی بنیاد رکھی۔

[5]۔ Charles Wheatstone؛ چارلس ویٹ سٹون (1802ء-1875ء) ایک انگریز سائنسدان اور مؤجد تھا جو برقی ٹیلی گراف کا William Fothergill Cooke کے ساتھ شریک مؤجد تھا۔

(Charles Wheatstone, d. 1875) نے پہلی تجارتی برقی ٹیلی گراف پیٹنٹ کرائی اور 1866ء میں بحرِ اوقیانوس کے آر پار ٹیلی گراف کیبل بچھادی گئی۔ صنعتی انقلاب کی بدولت بینکوں اور صنعتی فنانسروں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا اور فیکٹری سسٹم بھی وجود میں آ گیا۔ جن کا دارومدار مالکان اور منتظمین پر تھا۔ 1770ء کے عشرے میں ایڈم سمتھ[1] (Adam Smith, d. 1790) نے 'ویلتھ آف نیشنز' (Wealth of Nations) شائع کردی جس نے آزاد تجارت، ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت اور سرکاری مداخلت سے آزادی پر مبنی اقتصادی نظام کو فروغ دیا۔ صنعت کاری کا عمل وسیع سے وسیع تر ہونے لگا جو برطانیہ سے لے کر یورپ تک، بشمول بلجیئم، فرانس، جرمنی اور امریکہ تک پھیل گیا۔

سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی میں ایک نیا علم طبیعیات (Physics) ظہور پذیر ہوا۔ نیوٹن (Newton, d. 1727) نے طبیعات کے پرانے تصورات کو مکمل طور پر تبدیل کردیا اور حرکت کے قوانین دریافت کر کے سائنسی انقلاب کی بنیادیں ڈال لیں۔ کاپرنیکس (Copernicus, d. 1543) اور گیلیلیو (Galileo, d. 1642) نے نظامِ شمسی اور حرکتِ سیارگاں کے پرانے تصورات تبدیل کردیئے۔ انجن کی ایجاد نے انسان کی زندگی کو آشنائے انقلاب کردیا۔ پرنٹنگ پریس نے عوام کے لئے علم بآسانی دستیاب کردیا۔ پنسلین (Penicillin) جیسی دواؤں نے زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ وسیع تر کردیا۔ فنِ حرب (جنگی اسلحہ) میں 'الفریڈ نوبیل'[2] (Alfred Nobel, d. 1896) کے ایجاد کردہ دھماکہ خیز ہتھیاروں نے تلواروں اور نیزوں کی جگہ لے لی۔ سائنسدانوں نے ذرّے (ایٹم) کا دل چیر کر نیوکلیئر (nuclear) اور تھرمونیوکلیئر انرجی (thermonuclear energy) کو بندھن سے آزاد کردیا۔ بڑے بڑے بحری جہازوں نے چھوٹی بادبانی کشتیوں کی جگہ لے لی اور پھر ہوائی جہاز وجود میں آ گئے۔

---

[1] Adam Smith؛ آدم سمتھ (1723-1790)، ایک برطانوی ماہر معاشیات اور فلسفی تھا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ گلاسگو یونیورسٹی میں فلسفے کا استاد رہا۔ اس کی وجہ شہرت اس کی کتاب The Wealth of Nations ہے۔ سمتھ نے سونے چاندی کی بجائے تعلیم یافتہ، ہنرمند اور محنتی افراد کو کسی ملک کی اصل دولت قرار دیا۔ اس نے پرانے دور کی پابندیوں کی مخالفت کی جو کہ صنعتی انقلاب کی راہ میں رکاوٹ تھیں۔

[2] Alfred Bernhard Nobel؛ الفریڈ نوبل (1833ء-1896ء) سویڈن کا کیمیادان، انجنیئر، فوجی جنگی ساز و سامان تیار اور ڈیزائن کرنے والا اور ڈائنامائیٹ کا موجد تھا۔ نوبل انعام اسی کے نام سے موسوم ہے۔

عراق اور افغانستان کی جنگوں کو لے لیجئے۔ جن طیاروں نے 'تورابورا'[1] پر بمباری کی انہوں نے امریکہ سے اڑان بھری تھی اور راستے میں کہیں رکے بغیر افغانستان میں تباہی و بربادی پھیلا دی۔ امریکہ میں نصب ٹیلی کمیونیکیشن کے ترقی یافتہ آلات کے ذریعے قندھار میں طالبان کی باہمی گفتگو بہ آسانی سنی جانے لگی۔ عراق جنگ میں امریکیوں نے دریائے فرات اور دریائے دجلہ کے صرف ان ستونوں پر بمباری کی جن پر مواصلاتی تاریں لگی ہوئی تھیں۔ انہوں نے یہ کام ایک ماہر سرجن کی طرح کیا جو مریض کا بڑی احتیاط سے آپریشن کرتا ہے اور غیر ضروری چیر پھاڑ سے گریز کرتا ہے۔ ہم مسلمان اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہے کہ وہ طیاروں اور مزائلوں کو تباہ و برباد کر دے اور دشمن کی توپوں میں کیڑے پڑیں اور ان مادی قوانین کو بھول گئے جو اس دنیا پر حکمرانی کرتے ہیں۔ دراصل ہم ان قوانین کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔

مغرب نے اسلامی ثقافت سے حاصل کردہ علم کو استعمال کیا اور اسے بے پناہ ترقی دی۔ مسلمان جہاں کھڑے تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔ مثال کے طور پر ریاضی کی کتاب اقلیدس (Euclid) افغانستان، بنگلہ دیش، بھارت اور پاکستان کے دینی مدارس میں ابھی تک ایک نصابی کتاب کے طور پر پڑھائی جا رہی ہے۔ یہ کتاب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے لکھی گئی تھی۔ نیوٹن (Newton, d. 1727) اور لائبنیز (Leibniz, d. 1716) کے زمانے سے اب تک ریاضی میں بے پناہ تغیرات آ چکے ہیں۔ جدید ریاضی نے انجینیروں کو حیران کن کمالات دکھانے کی اہلیت عطا کر دی ہے لیکن مدارس کے فارغ التحصیل ایسی ہنر مندی اس لئے نہیں دکھا سکتے کہ ان کی تعلیم زمانے سے پیچھے رہ گئی ہے۔ ہم اپنے مدارس کے طلبا کو اب تک یہی پڑھا رہے ہیں کہ کیمیا (chemistry) میں صرف چار عناصر (elements) ہوتے ہیں: آگ، مٹی، پانی اور ہوا جبکہ مغرب ایک سو اٹھارہ (118) سے زائد عناصر دریافت کر چکا ہے۔ ہم ابھی تک ان کے چار ہونے کے نظریئے سے چمٹے ہوئے ہیں۔ مغرب نے ان ایک سو اٹھارہ (118) عناصر میں سے صرف ایک عنصر یورینیم کو پھاڑا ہے۔ اس سے انہوں نے ایٹم بم بنا لیا ہے۔ اس طرح مغرب اور مسلمانوں کا فرق 118:4 کے تناسب سے ہے۔ اس فرق کو مٹی اور یورینیم کا فرق کہا جا سکتا ہے۔

1۔ مشرقی افغانستان میں موجود پہاڑی سلسلے کو تورابورا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں موجود غاروں کو طالبان اپنے ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ امریکہ نے افغانستان پر حملے کے دوران ان پہاڑوں پر انتہائی خطرناک ہتھیاروں کا استعمال کیا۔

آ یئے ہم ایک مثال لیتے ہیں۔حضرت اورنگزیب عالمگیرؒ(d. 1707) تقریباًنصف صدی تک ہندوستان کا شہنشاہ رہا۔ اسے بے پناہ وسائل دستیاب تھے کیونکہ اس وقت کی سلطنتِ مغلیہ، برصغیر دولت مندترین سلطنت تھی۔ وہ برصغیر پراس زمانے میں حکمرانی کر رہا تھا جب مغرب میں جدید سائنسز اور فلسفے کو ترقی دی جارہی تھی۔اس کی بادشاہت اس تعلیم کے اثرات کومحسوس کر رہی تھی۔ واسکوڈے گاما (Vasco da Gama, d. 1524) جس نے مغرب کوایشیا کا راستہ دکھایا وہ ہندوستان کی بندرگاہ کالی کٹ پر 1499ء میں اتر چکا تھا۔1510ء میں پرتگال نے ہندوستان کے ساحلی علاقے گوا پرقبضہ کرلیا تھا۔ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی جس نے بعد میں سراج الدولہ[1](d. 1757)اور ٹیپوسلطان[2](d. 1799) کوشکست دیکر ہندوستان پر سیاسی قبضے کی ابتدا کی، سولہویں صدی سے یہاں کام کر رہی تھی۔ لیکن اورنگزیب (d. 1707) ان خطرناک سیاسی حقائق سے بالکل بے خبر رہا۔ 1620ء میں ہالینڈ (Holland) کے شہر ایمسٹرڈیم (Amsterdam) میں پرنٹنگ پریس(printing press) لگ چکا تھا۔ ہمارے ہاں بادشاہ سلامت اپنے متبرک ہاتھ سے قرآن مجید لکھنا کمال سمجھتے تھے۔ یورپ میں 1455ء میں انجیل مقدس پریس سے چھپ چکی تھی۔اورنگ زیبؒ(d. 1707) سے یہ بھی نہ ہوسکا کہ قرآن پاک کی اشاعت ہی کے لیے پرنٹنگ پریس لگوالیتا۔ پیرس یونیورسٹی(Paris University) اور آکسفورڈ یونیورسٹی (Oxford University) گیارہویں صدی میں بن چکی تھیں جبکہ اورنگزیب (d. 1707) نے یہ کام اٹھارہویں صدی میں بھی نہ کیا[3]۔ اگرچہ اس کا والد اس وقت تاج محل بنوا رہا تھا جبکہ ہارورڈ یونیورسٹی (Harvard University) پہلے ہی بن چکی تھی۔تاج محل کو دیکھنے کے لئے ہر سال لاکھوں سیاح آتے ہیں جبکہ ہارورڈ یونیورسٹی(Harvard University)نے امریکہ کے آٹھ صدور کوزیورِتعلیم سے آراستہ کیا ہے۔اس کے تعلیم یافتگان میں آٹھ(8) نوبل پرائز یافتہ شامل ہیں۔اس سے ہمارے اس وقت کے رہنماؤں کی ترجیحات پر روشنی پڑتی ہے۔

---

[1]۔ مرزا محمد سراج الدولہ المعروف نواب سراج الدولہ(1733ء - 1757ء) بنگال، بہار اور اڑیسہ کے آخری آزاد حکمران تھے۔1757ء میں ان کی شکست سے بنگال میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کا سورج طلوع ہوا۔

[2]۔ ٹیپوسلطان (1750ء-1799ء) ہندوستانی ریاست میسور کا اصلاح وحریت پسند حکمران تھا۔ٹیپوسلطان نے برطانوی سامراج کے خلاف ایک مضبوط مزاحمت کی اور برصغیر کے لوگوں کوغیر ملکی تسلط سے آزاد کرنے کے لیے سنجیدہ وعملی اقدامات کئے۔

[3]۔ Encyclopedia of Britanica, Vol 7, p.761

جدید علوم سے یہ بے خبری تھی کہ 1857ء کی جنگ آزادی میں انگریز فوج کی تعداد صرف پنتالیس ہزار (45000) تھی جبکہ مسلمان فوج کی تعداد اڑہائی لاکھ (250,000) تھی لیکن پھر بھی شکست ہمارا مقدر بنی۔ اس لیے کیونکہ ہم جدید علوم سے بے خبر تھے اور انگریز کے پاس توپ اور ٹیلی گرام (Telegram) تھے۔ یہ بات یاد کر کے زخموں پر نمک پڑ جاتا ہے کہ ہم ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی میں اپنے پیغام کبوتر کے ذریعے بھیجتے تھے۔ برطانوی فوج ٹیلی گرام استعمال کرتی تھی۔ نتیجہ تو یہی نکلنا تھا جس کی توقع کی جا سکتی تھی[1]۔ اس طرح سب سے بڑی مسلم مغل سلطنت کو سات ہزار (7,000) کلومیٹر دور بیٹھی حکومت کی ایک چھوٹی سی فوج نے شکست دے دی۔

2۔ شورائیت

عہدِ روشن خیالی[2] (Enlightenment) کے دوران 'معاہدۂ عمرانی' یا معاہدۂ سیاسی ظہور پذیر ہوا جس میں ماخذ معاشرہ اور فرد پر حاکمیت کے جواز کے بارے میں سوالات ابھرے۔ معاہدۂ عمرانی (social contract) کے علمبرداروں کا نظریہ تھا کہ افراد واضح طور پر یا معنوی طور (tacitly) پر اپنی چند آزادیوں سے رضامندی سے دستبردار ہو کر حکمران یا مجسٹریٹ کے اختیار کے سامنے سرنگوں ہوئے ہیں یا ایک اکثریت کے فیصلے کے سامنے سرنگوں ہوئے ہیں تا کہ ان کے باقی ماندہ حقوق کو تحفظ حاصل رہے۔ اس لئے فطری اور قانونی حقوق کے درمیان تعلق کا سوال، معاہدۂ عمرانی کے نظریئے کا ایک اہم پہلو ہے۔ اسے مجموعی فلاح کے لئے انفرادی قربانی کا اقرار بھی کہا جاتا ہے۔

نظریۂ معاہدۂ عمرانی کے ماخذ رواقی (Stoic) فلسفے اور رومن اور کلیسا کے قانون میں پائے جاتے ہیں۔ تاہم سترہویں صدی عیسوی کے وسط سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے دوران یہ حکومتوں کے سیاسی جوازوں کے سلسلے میں ایک نمایاں نظریئے کے طور پر اُبھر آیا تھا۔ نظریئے کا آغاز انسان کی اس کیفیت کے جائزے سے ہوتا ہے جس میں کوئی سیاسی نظم نہیں (یعنی وہ حالت فطری پر ہے)۔ اس میں فرد

---

[1]۔ فکر اسلامی از وحید الدین خان۔ صفحہ نمبر 180

[2]۔ Enlightenment؛ عہد روشن خیالی، یا محض روشن خیال طرز عمل یا عہد معقولیت 1620ء سے لے کر 1780ء تک کے عشرے کو قرار دیا گیا ہے جس میں مغربی یورپ کی ثقافتی اور ذہنی قوتوں نے حاکمانہ رویے کی بجائے معقولیت، تجزیہ اور انفرادیت کے اظہار پر زور دینا شروع کیا۔

کے کام صرف ان کی ذاتی قوت اور ضمیر کے تابع یا تحت ہوتے ہیں۔ پھر یہ نظریہ ظاہر کرتا ہے کہ ایک معقول فرد اپنی فطری رضامندی کا کیوں اظہار کرے گا یا سیاسی نظام کے فوائد کے حصول کے لئے اپنی آزادی سے کیوں دستبردار ہوگا۔

'فرانسسکو سواریز'[1] (Francisco Suariz, d. 1617) اور ہوگو گروشئیش[2] (Hugo Grotius, d. 1645) کو غالباً معاہدۂ عمرانی (social contract) کے ابتدائی قائلین میں سے سمجھا گیا ہے۔ اس نے فطری قانون کے بارے میں اپنا نظریہ مطلق العنان بادشاہ کے آسمانی حقوق کو محدود کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پیش کیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر کوئی فطری طور پر کسی حکومت کی اطاعت سے مبرا ہے اور یہ کہ عوام 'Sui juris' (اپنی ذاتی عملداری) میں ہیں اور بطور بنی نوع انسان حقوق رکھتے ہیں۔

ٹامس ہابز[3] (Thomas Hobbes, d. 1679) نے اپنی کتاب 'Leviathan' میں کہا کہ حالت فطرت میں افراد کی زندگیاں الگ تھلگ، ناقص، ناگوار، وحشیانہ اور مختصر ہوتی تھیں۔ ان کی ایسی حالت تھی جس میں ذاتی مفاد اور ناپیدگی حقوق و معاہدات کی وجہ سے باہمی روابط یا معاشرت وجود میں آنا ممکن نہیں تھی۔ زندگی نراجیت (anarchic) سے عبارت تھی (بغیر قائد یا تصورِ حاکمیت کے تھی)۔ اس حالت فطرت میں افراد 'غیر سیاسی اور غیر معاشرتی' تھے۔ اس حالت فطرت کے پیچھے پیچھے معاہدۂ عمرانی (social contract) آ گیا۔ یہ معاہدہ ایک ایسا وقوعہ تھا جس کے دوران افراد اکٹھے ہو گئے اور انہوں نے اپنے بعض انفرادی حقوق ترک کر دیئے تاکہ دوسرے بھی اپنے ایسے حقوق ترک کر دیں۔ اس کے نتیجے میں ریاست قائم ہوگئی جو ایک مطلق العنان (sovereign entity) وجود رکھتی تھی جس نے سماجی روابط کو باضابطہ بنانے کے لئے قانون تخلیق کرنا تھے۔ اس طرح انسانی زندگی 'سب کی سب کے

---

[1] Francisco Suarez؛ فرانسیکو سواریز (1548ء-1617ء) سپین کا ایک فلسفی اور ماہر دینیات تھا۔ اس کا شمار تحریک مکتبہ سلمانکا کی نمایاں شخصیات میں شمار ہوتا تھا۔ اس کو ٹامس ایکوناس (Thomas Aquinas) کے بعد سب سے بڑا متکلم سمجھا جاتا تھا۔

[2] Hogo Grotius؛ ہوگو گروشئیش (1582-1645) ایک ولندیزی ماہر قانون تھا۔

[3] Thomas Hobbes؛ ٹامس ہابز (1588ء-1679ء) ایک برطانوی فلسفی تھا جس نے سیاسی فلسفے پر اپنے کام کے باعث شہرت پائی تھی۔

خلاف جنگ'(a war of all against all) نہ رہی۔

جان لاک[1] (John Locke, d. 1704) نے اپنے 'دوسرے مقالۂ حکومت'(Second Treatise of Government) میں اس یقین کا اظہار کیا ہے کہ حالت فطرت میں لوگ لازماً پابند اخلاق ہوں گے۔ اپنی زندگیوں یا املاک کی خاطر ایک دوسرے کو ضرر نہیں پہنچاتے ہوں گے۔ لیکن حکومت کی موجودگی کے بغیر ان کے پاس زخمی کیے جانے، غلامی سے بچنے اور اپنے حقوق کے تحفظ کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ انہیں خوف زدگی کی زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ جان لاک (John Locke, d. 1704) نے دلیل دی کہ افراد کو ایک ایسی ریاست کی تشکیل پر رضا مند ہونا پڑتا تھا جو ان کی زندگیوں، ان کی آزادی اور وہاں آباد لوگوں کی املاک کے تحفظ کے لئے ایک غیر جانبدار جج مہیا کرتی۔ اس نے مزید کہا کہ حکومت کے وجود کا جواز شہریوں کی طرف سے اس اقدام میں سے نکلتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی دفاع کا حق حکومت کو تفویض کر دیتے ہیں۔ اس کے نظریئے کے مطابق حکومت اپنے اختیارات عوام کی منشا میں سے اخذ کرتی ہے (یعنی عوام نے اپنے جو اختیارات حکومت کو تفویض کر دیئے ہوتے ہیں، وہی حکومت کے وجود کا جواز بن جاتے ہیں)۔

ژاں ژاک روسو[2] (Jean-Jacques Rousseau, d. 1778) نے معاہدۂ عمرانی (1762ء) میں آزادی (liberty) کا خاکہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ آزادی صرف اسی وقت ممکن ہے جب عوام کی براہ راست حکومت ہو۔ وہ پوری قانون سازی کر سکتے ہوں۔ جہاں عوامی حاکمیتِ اعلیٰ ناقابلِ تقسیم اور ناقابلِ منتقلی ہو۔ اس کی اشتمالیت (collectivism) اس کے بصیرت افروز تصورِ منشائے عمومی (General Will) میں بھرپور طور پر واضح ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی شہری مغرور و متکبر بنتے ہوئے اپنے حقیقی مفاد کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے اسے اس قانون کی اطاعت کا رویہ اپنانا ہوگا جو شہریوں نے بحیثیت قوم اجتماعی طور پر بنایا تھا۔ اس طرح قانون انفرادی آزادی کو محدود نہیں کرتا بلکہ یہ آزادی کا

---

[1]۔ John Locke؛ جان لاک (1632ء - 1704ء) ایک برطانوی فلسفی اور فزیشن تھا۔ وہ روشن خیالی کے ممتاز علمبرداروں میں سے تھا۔ اس نے 1689ء میں نظریہ تجربیت (Empiricism) پیش کیا جو ایک فلسفیانہ نظریہ ہے۔ اس نظریہ کے مطابق علم کا سرچشمہ تجربہ ہوتا ہے۔ یعنی کہ تجربہ ہی تمام عالم اور ادراک کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ تجربے سے بعید کسی قسم کے علم یا موجودات کے ادراک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہ تجربہ تمام تر شعوری ہوتا ہے۔

[2]۔ Jean-Jacques Rousseau؛ ژاں ژاک روسو (1712-1778) انسانی مساوات کا مبلغ اور ایک فلسفی تھا۔ جس کی تحریریں فرانس میں انقلاب برپا کرنے کا سبب بنیں۔

مظہر ہوتا ہے۔

چارلس لوئی ڈی مونٹیسکیو[1] (Charles-Louis de Montesquieu, d. 1755) نے اپنی کتاب 'The Spirit of the Laws' میں مقننہ (مجلس قانون ساز)، انتظامیہ اور عدلیہ کے مابین تقسیم اختیارات کا نظریہ پیش کیا تا کہ تمام اختیارات ایک ہی بادشاہ یا کسی حکمران کے ہاتھ میں بے جا طور پر مرتکز نہ ہوں۔ اس طرح اس نے تحدید و توازن (checks and balances) کے نظام کی پرزور وکالت کی جس کا دنیا کے متعدد دساتیر میں اہتمام کیا گیا ہے۔

انقلاب فرانس (1789ء-1799ء) نے بادشاہت کا تختہ الٹ دیا اور ان آزادانہ اور انقلابی نظریات سے سرشار ہو کر ایک جمہوریہ قائم کر دی۔ اس انقلاب کو تاریخ انسانی کے اہم ترین واقعات میں سے شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس نے جدید تاریخ کے دھارے پر بے پناہ اثرات مرتب کیے تھے۔ انقلاب فرانس نے جاگیردارانہ نظام پر کاری ضرب لگائی جس کی وجہ سے فرد کو آزادی ملی۔ غیر منقولہ جائیداد کی بڑے پیمانے پر تقسیم عمل میں آئی۔ بالائی طبقے میں جنم لینے (اشرافیہ) کی بنا پر ملنے والی مراعات منسوخ ہوئیں اور مساوات عمل میں آ گئی۔ بعد میں چلنے والی تقریباً تمام تحریکیں انقلاب فرانس کو اپنے لیے روشنی کا مینار سمجھتی رہیں۔ اس کے مرکزی نعرے Liberte, Egalite and Fraternite (آزادی، مساوات اور اخوت) جدید تاریخ کے بڑے بڑے بحرانوں کے دوران (ازمنہ وسطیٰ میں بجائے جانے والے) طُرسم (clarion call) کی آواز بن گئے۔ ان سے 1917ء کے انقلابِ روس نے بھی جوش اور ولولہ حاصل کیا۔

عالمی سطح پر انقلاب فرانس نے جمہوری مملکتوں کے ظہور کی رفتار تیز تر کر دی۔ یہ تمام جدید سیاسی نظریات کے ارتقاء کے لئے نقطۂ ماسکہ (focal point) بن گیا۔ جس نے دیگر نظریات کے علاوہ لوگوں کو کشادہ دلی (Liberalism)، انقلابیت (Radicalism)، قومیت (Nationalism)، اشتراکیت (Socialism)، مساواتِ زن و مرد (Feminism) اور مذہب و ریاست کی علیحدگی

---

[1]۔ Charles-Louis de Montesquieu؛ چارلس لوئی ڈی مونٹیسکیو (1689ء-1755ء) عہد روشن خیالی میں ایک فرانسیسی قانون دان اور سیاسی فلاسفر تھا۔ اسے نظریہ علیحدگی اختیارات کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق قانون بنانے والے (مجلس قانون ساز)، قانون پر عمل درآمد کروانے والے (انتظامیہ) اور اس قانون کے مطابق فیصلہ کرنے والے (عدالت) افراد یا ادارے علیحدہ علیحدہ ہونے چاہیں۔ اس نظریہ پر دنیا کے بہت سے ممالک کے دساتیر میں عمل کیا جاتا ہے۔

(Secularism) کی اشاعت وتبلیغ کی راہ پر گامزن کر دیا۔اس انقلاب سے متعلقہ دستاویزات میں 'اعلانِ حقوقِ انسان' (Declaration of the Rights of Man) کی دستاویز بھی نہایت اہم ثابت ہوئی جس نے حقوق انسانیت کے میدان کو وسیع تر کر کے اس میں عورتوں اور غلاموں کو بھی شامل کر دیا۔اس کے نتیجے میں اگلی صدی میں 'انسدادیت' (Abolitionism) اور عالمگیر حق رائے دہی (universal suffrage) کی تحریکوں کو زبردست تقویت ملی۔

اس ذہنی پس منظر نے آزادخیالی پر مبنی جمہوریت (liberal democracy)، دستوریت (constitutionalism) اور قانون کی حکمرانی (rule of law) کے تصورات کی طرف رہنمائی کی۔لبرل ڈیموکریسی (liberal democracy) ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں ایک نمائندہ حکومت لبرل ازم کے ایسے اصولوں کے تحت کام کرتی ہے جن میں مختلف اور قابل شناخت سیاسی پارٹیوں کے مابین منصفانہ، آزادانہ اور مبنی بر مقابلہ انتخابات (الیکشن) ہوں۔حکومت کے مختلف شعبوں کے مابین اختیارات کی تقسیم ہو۔روزمرہ کی زندگی میں ایک کھلے معاشرے کے طور پر قانون کی حکمرانی ہو۔انسانی حقوق کا مساویانہ تحفظ ہو۔سب کے لئے شہری حقوق، شہری آزادیاں اور سیاسی آزادیاں ہوں۔آزادی پسند جمہوریتیں اختیارات حکومت کے تعین کے لئے دستور پر انحصار کرتیں اور معاہدہ عمرانی کے تقدس کو ملحوظ رکھتی ہیں۔آزادخیالی پر مبنی جمہوریت بیسویں صدی عیسوی کے دوران مسلسل نشوونما پاتی رہی۔اس طرح دنیا کا ایک غالب سیاسی نظام بن گئی۔

قانون کی حکمرانی ایک اصول ہے۔قوم کو اس اصول کی اطاعت کرنی چاہیے۔ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ قوم سرکاری حکام کے من پسند فیصلوں کی اطاعت کرنا شروع کر دے۔یہ اصول ابتداء میں معاشرے کے اندر قانون کو 'حاکمِ مجاز' (authority) ماننے کا ایک حوالہ دیتا ہے۔یہ خاص طور پر رویئے پر ایک قدغن ہوتا ہے جس میں حکومت کا رویہ بھی شامل ہوتا ہے۔اس اصطلاح کو البرٹ وین ڈائسی[1] (Albert Venn Dicey, d. 1922) نے مقبولیت عامہ دلوائی تھی اگرچہ اس کا سراغ ارسطو

---

[1]۔ Albert Venn Dicey: البرٹ وین ڈائسی (1835ء-1922ء) ایک برطانوی قانون دان اور دستوری نظریہ ساز تھا۔اسے اس کی کتاب 'Introduction to the Study of the Law of Constitution- 1885' کی وجہ سے بے حد شہرت حاصل ہوئی۔

(Aristotle, d. 322BC) کے افکار میں تلاش کیا جا سکتا ہے جس نے لکھا تھا کہ 'قانون کو حکمران' ہونا چاہیے[1]۔ قانون کی حکمرانی کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص بشمول قانون سازی کرنے والوں کے، قانون کا تابع ہے۔

1610ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے دارالعوام (House of Commons) نے شاہِ انگلستان جیمز اول[2] (James-i, d. 1625) کو ایک خط بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ ہز میجسٹی (His Majesty) کی رعایا حکمرانی قانون سے رہنمائی پاتی ہے اور وہ اسی کے تابع ہیں جو سربراہ اور ارکان دونوں کو بتاتا ہے کہ کون سا حق ان سے تعلق رکھتا ہے نہ کہ وہ کسی غیر یقینی یا آمرانہ شکل کی حکومت کے تابع اور اس سے ہدایت ورہنمائی پاتے ہیں۔ 1607ء میں چیف جسٹس سر ایڈورڈ کوک[3] (Sir Edward Coke, d. 1634) نے کہا کہ قانون ایک سنہری اصول اور ذریعہ ہے جو رعایا کے مقدمات کے فیصلے صادر کر سکتا ہے اور وہی ہز میجسٹی کو سلامتی اور امن عطا کرتا ہے۔ اس بات پر بادشاہ بہت ناراض ہوا اور بولا پھر اُسے اس قانون کا تابع ہونا چاہیے جس کی توثیق کرنا غداری ہے۔ ایڈورڈ کوک (Edward Coke, d. 1634) نے ایک سابقہ قانون دان ہنری بریکٹن[4] (Henry de Bracton, d. 1266) کے الفاظ میں کہا کہ 'Quod rex non debed esse sub homine sed sub

---

[1]۔ Politics by Aristotle, p. 16

[2]۔ James Charles Stuart؛ جیمز چارلس سٹوارٹ (1566ء-1625ء) سکاٹ لینڈ، انگلستان اور آئرلینڈ کا بادشاہ تھا۔ وہ جیمز ششم (James-vi) کے لقب سے سکاٹ لینڈ کا بادشاہ جبکہ جیمز اول (James-i) کے لقب سے انگلستان اور آئرلینڈ کا بادشاہ بھی تھا۔

[3]۔ Sir Edward Coke؛ سر ایڈورڈ کوک (1552ء-1634ء) ایک برطانوی قانون دان اور جج تھا جو بعد ازاں سیاستدان بن گیا۔

[4]۔ Henry de Bracton؛ ہنری دی بریکٹن (1210ء-1266ء) ایک انگریز قانون دان تھا جس کی وجہ شہرت اس کی تصنیف

De Legibus et Consuetudinibus Angliae (On the Laws and Customs of England)

ہے۔

'Deo et lege' (بادشاہ کوکسی انسان کے تابع نہیں ہونا چاہیے بلکہ خدااور قانون کا تابع ہونا چاہیے)[۱]۔

اس سیاسی سیاق و سباق میں دستوریت (constitutionalism) کے معنی ایک مجموعۂ تصورات (complex of ideas)، رجحانات اور طرز ہائے عمل (patterns of behavior) ہے جو اس اصول کا مظہر ہوتا ہے کہ حکومت کا اختیار ایک مجموعۂ بنیادی قوانین سے ماخوذ اور اسی کے اندر محدود ہے۔ ایک سیاسی تنظیم اس حد تک حسب دستور ہے جہاں تک اس کے اندر شہریوں کے مفادات اور ان کی آزادیاں، بشمول اس میں موجود اقلیت کے حقوق کے تحفظ کے لیے اداراتی میکانیاتِ تحفظ اقتدار (Institutional mechanisms of power control) پائی جاتی ہوں[۲]۔

اس سیاسی فکر کے ظہور کے نتیجے میں مغرب نے حقوق اللہ، رشتہ داریوں اور مذہبی حکومتوں کے سیاسی ہدایت ناموں کا مکمل طور پر قلع قمع کر کے رکھ دیا اور ان کی جگہ مسلسل انتخابات اور تحدید و توازن کے لیے شعبہ ہائے ریاست کے مابین تقسیم اختیارات، عدلیہ کی آزادی، دستوریت اور قانون کی حکمرانی کے اصولوں پر استوار، نمائندہ جمہوریتیں قائم کر لیں۔

3۔ مسلم دنیا اور مغرب

مسلم دنیا مجموعی دنیائے انسانیت کے تقریباً پانچویں حصے کی نمائندگی کرتی ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے مسلمان مراکش (Morocco) سے لے کر منڈاناؤ (Mindanao) تک پھیلے ہوئے ہیں اور دنیا کے وسط پر قابض ہیں۔ یہ ایک طرف امریکہ، یورپ اور روس اور دوسری طرف سیاہ فام افریقہ، بھارت اور چین کے چوراہوں پر براجمان ہیں۔ عباسی خلافت (750ء-1258ء) کے دوران انہوں نے دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی تھی۔ اسلام نے ایک عظیم الشان اور وسیع المنظر تہذیب کی تشکیل کی جو صحیفۂ آسمانی کے

۱۔ بادشاہ جیمز اول (James-i) نے ایک تنازعے میں خود کو ایک جج کی حیثیت دے کر زمین کی ملکیت کے دعویداروں کا موقف سنا اور انہیں سزا دی۔ جب کیس چیف جسٹس آف دی کورٹ آف کامن پلیز (Chief Justice of the Court of Common Pleas)، ایڈورڈ کوک (Edward Coke) کے پاس گیا تو اس نے بادشاہ کے فیصلے کو کالعدم قرار دیتے ہوئے کہا کہ مقدمہ صرف وہ سن سکتا ہے جس نے قانون کی تربیت حاصل کی ہو اور وہ خود بھی قانون کی حکمرانی کے تابع ہوں۔

۲۔ Controlling the State: Constitutionalism from Ancient Athens to Today by Gordon Scott, p. 4

پیغام اور تین براعظموں میں اس کی توسیع کے دوران وجود میں آنے والی ثقافتوں کی حکمت و دانش اور سائنس پر استوار تھی۔ اس نے کئی عظیم سلطنتوں کو جنم دیا جن میں بجانب مغرب عثمانیوں، ایران کے صفویوں اور برصغیر ہند کے مغلوں کی بادشاہتیں شامل تھیں۔

پھر مغرب نے اٹھنا شروع کیا۔ اولین جدید اسلامی دنیا اٹھارویں صدی عیسوی کی روشن خیالی اور انیسویں صدی عیسوی کے صنعتی انقلاب کی آمد سے اقتصادی اور سیاسی طور پر مضبوط و مستحکم ہو جانے والے مغرب کے پیچھے دھڑام سے گر گئی۔ تقریباً 1800ء میں چھوٹی چھوٹی یورپی اقوام (انگلینڈ، فرانس اور ہالینڈ) نے اسلامی دنیا کے بڑے بڑے خطوں پر اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ جنگ عظیم دوئم (WW-II) کے بعد مسلمانوں کے جغرافیائی و سیاسی نقشے پر یورپی طرز پر از سرِ نو منظم ہو جانے والی قومی ریاستیں وجود میں آ گئیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں مسلم اہل دانش پر دو یکسر مختلف رجحانات مسلط ہونے لگے جو معاشرتی اور مذہبی تجدید نو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جدیدیت (Modernism) کے علمبرداروں کی تجویز یہ تھی کہ اسلام کو مغربی تصورات کے مطابق ڈھال دیا جائے جبکہ احیا (revivalism) کے حامی، اسلام کی اصل حرکیات (dynamism) کے جوش و جذبے کو بحال کرنے کی ضرورت پر زور دے رہے تھے۔ ان میں سے کوئی بھی نقطۂ نظر ایک ہمہ گیر اسلامی خلافت کی خیالی دنیا (utopia) کی طرف رہنمائی نہیں کر رہا تھا۔ اب اسلام کو چیلنج دیا جا رہا تھا کہ وہ اپنا اظہار خود مختار قوموں کے ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے کرے۔ جیسا کہ یہ قومیں نسلیت، علاقائیت اور ثقافت پر توجہ مرکوز کرتی ہیں۔

بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں اسلامی دنیا نے صدی کے وسط میں ترکی کے سیکولرازم کی گھن گرج کا مشاہدہ کیا تھا جس سے اسے اواخرِ صدی میں عرب، ایرانی، پاکستانی اور انڈونیشی سیاسی ثقافت میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ سیکولرازم عسکریت پسندی کے رجحانات سے مغلوب ہوتا جا رہا ہے کیونکہ یہاں عوام کی آزادانہ مرضی پر مبنی کوئی حقیقی نمائندہ حکومت نہیں ہے۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں اسلامی سیاسی فکر کی بنیادیں خود رکھیں اور باہمی مشاورت پر مبنی نظامِ مساوات قائم کیا۔ آپ ﷺ کے چار جانشینوں، خلفائے راشدین نے عوامی فلاح و بہبود کی ترغیب دینے کے لئے انتخابی نظام متعارف کرایا۔ بنی امیہ (658ء-750ء) جو حضور نبی کریم ﷺ کے قبیلہ قریش میں سے تھے، آپ ﷺ کے وارث ہونے کی بنا پر خود کو حقدارِ

خلافت سمجھتے تھےلیکن انہوں نے ملوکیت متعارف کرادی۔ اہل تشیع جو قیادت کو خاندانِ رسالت ﷺ کے لیے مخصوص سمجھتے تھے اور خوارج جو انتہائی متقی مسلمان کو مثالی خلیفہ کے طور پر منتخب کرنے کا دعویٰ رکھتے تھے، دونوں نے بنی امیہ کی قیادت کو چیلنج کردیا۔

750ء میں عباسیوں کو خلافت مل گئی اور خلیفہ مذہب اور ریاست کے محافظ کے طور پر اپنے فرائض انجام دینے لگا۔ خلیفہ کو ظل الٰہی تصور کیا جاتا تھا لیکن سیاسی ادارے ابن المقفع[1] (d. 756) کی وجہ سے ایرانی ثقافت کے زیرِ اثر تھے۔ قاضی القضاۃ حضرت امام ابو یوسفؒ (d. 798) نے خلیفہ ہارون الرشید (d. 809) کے حکم پر 'کتاب الخراج' لکھ کر حکمرانی اور مالیاتی امور کے لیے ایک نظیر قائم کردی۔ انہوں نے خلیفہ کے مقام کی صراحت کرتے ہوئے چرواہے اور اس کے ریوڑ کی مثال دی اور بڑوں اور چھوٹوں کے لئے دین الٰہی کا قیام اس کے لئے فرضِ عین قرار دیا۔ خلیفہ مامون الرشید (d. 833) نے اپنے دورِ خلافت (813ء-833ء) میں یونانی تہذیب کے زیرِ اثر مذہبی طبقے پر خلیفہ کی فوقیت کو اپنا نصب العین قرار دے دیا۔ تاہم علماء نے حضرت امام شافعیؒ (d. 820) اور حضرت امام احمد بن حنبلؒ (d 855) کی تحریک پر اسلام کے سنی مکتبہ فکر میں اجماع (concensus) کو بنائے اقتدار (authority) بنانے کا موقف پیش کیا جبکہ اہل تشیع کا موقف یہ تھا کہ اصل اقتدار امامِ معصوم کی ذات میں مضمر ہے۔

فارابی (al-Farabi, d. 950) اور ابن سینا (Avicenna, d. 1037) نے سلطنت کے مرکز کے بارے میں غور کیا اور یونانیوں کے زیرِ اثر تصورِ 'فلسفی بادشاہ' کو جو اخلاقی طور پر ایک کامل فرد ہو، ایک اچھی معاشرت رکھنے والے ملک کی سربراہی کے لئے موزوں ترین قرار دیا۔ فارابی (al-Farabi, d. 950) کا تصورِ شہر (مدینۃ الفاضلہ) ایک کامل معاشرے کا تھا جس میں معقول طرزِ زندگی، حصولِ سعادت کے لئے ایک معروف ذریعہ تھا۔ جیسا کہ ایک جسم پر حکمرانی کے لئے سر ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کو بھی حکمرانی کے لئے ایک سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اس معاشرے کو ایک مثالی معاشرہ بننے کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ابن سینا (Avicenna, d. 1037) نے اپنی کتاب 'الشفاء' میں حکمرانی (سیاسہ) پر ایک باب باندھا ہے۔ اس نے اس باب میں انسانوں کے اصول انحصار باہمی پر زور دیا ہے اور تصورِ قانون دہندہ (law giver) کے لئے فلسفی اور پیغمبر دونوں کی صفات ہونے کو لازم قرار دیا اور کہا کہ ایسا پاکباز شخص ہی دنیوی 'ناموس' اور 'شریعۃ' کی ضمانت بن سکتا ہے۔

---

[1] ۔ ابن مقفع (d. 756) ایک ایرانی النسل مترجم، مصنف اور سکالر تھا جس نے عربی زبان میں کتب لکھیں۔

اہلِ سنت کی سیاسی بصیرت کا مزید اظہار 'ماوردی'[1] (d. 1058) نے اپنی کتاب 'احکام السلطانیہ' اور نظام الملک[2] (d. 1092) نے اپنی کتاب 'سیاست نامہ' میں کیا۔ عہد متوسط کے اسلامی سیاسی افکار کا بھرپور اظہار حضرت امام غزالیؒ (d. 1111) اور حضرت امام فخر الدین الرازیؒ[3] (d 1209) نے کیا۔ سپین میں اسلامی سیاسی فکر ابن رشد (Averroes, d. 1198) نے نمایاں طور پر پیش کی جس نے کہا تھا کہ کتاب اللہ، حدیث رسول ﷺ اور قانون کی بہترین تشریح وتفسیر کرنے کے لئے فلسفی ہونا ضروری ہے کیونکہ ان کے پاس علم اپنی اعلیٰ ترین صورت میں ہوتا ہے اور یہ کہ مؤثر قانون سازی کے لئے نظریاتی اور تجرباتی، دونوں قسم کے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔

شیخ ابن تیمیہؒ (d. 1328) نے قرار دیا کہ مذہب اور ریاست ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ کامل روحانی اور دنیاوی خوشحالی صرف اسی وقت ممکن ہے جب مذہب کو شرعی قانون کے تحت روبہ عمل لایا جائے۔ اس کو نافذ کرنے والا شخص امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے کو بطور ذمہ داری قبول کرتا ہو۔ ابن خلدون (Ibn Khaldun, d. 1406) نے بھی ذہین مدبر اور بابصیرت لوگوں کی حکومت کے قیام پر زور دیا جو مذہبی اصولوں پر مبنی معاشرت کے قیام کے لئے اللہ تعالیٰ کے احکامات اور حضور نبی کریم ﷺ کی ہدایات پر عمل کرے اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طرزِ عمل اپنائے۔

عثمانیوں نے فوج، اہل علم اور بیوروکریسی کو ان کی موروثی ریاست میں مدغم کیا اور صوفیانہ نظاموں اور عوامی سطح کے اسلام کے اثرات کے لئے گنجائش نکالی۔ سلطانوں نے انصاف پر بطور عوام کے حقوق وفرائض عمل درآمد ہوتا دیکھ کر ججوں (قاضیوں) کو اختیار دے دیا کہ وہ شریعت اور اپنے اختراعی اور

---

[1]۔ ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب البصری الماوردی (972-1058) ایک مشہور اسلامی قانون دان تھا۔ جس نے اپنی زندگی میں چیف جسٹس اور سفیر کی خدمات بھی انجام دیں۔

[2]۔ نظام الملک طوسی (1018ء-1092ء) ایک اسلامی سکالر، قانون دان اور سلجوقی حکومت کا وزیر تھا۔ اس نے سلطنت کو قانونی شکل دینے کے لیے ایک نئے نظریے کی بنیاد رکھی۔ اسی ضمن میں اپنی مشہور کتاب سیاست نامہ لکھی۔ نظام الملک نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ کی بنیاد بھی رکھی جو کئی صدیوں تک علم وحکمت کا مرکز رہا۔

[3]۔ حضرت امام فخر الدین رازیؒ (1149ء-1209ء) ایک نامور مفسر قرآن، محدث، متکلم، تاریخ دان، فقیہ اور فلسفی تھے۔ آپؒ کی وجہ شہرت قرآن پاک کی مایہ ناز تفسیر مفاتیح الغیب ہے جسے تفسیر کبیر اور تفسیر رازی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

متوازی دیوانی قانون، دونوں کا انتظام وانصرام کریں۔ ابوالسعود[1] (Hoca Celebi, d. 1574) نے بطور شیخ الاسلام تعینات ہونے کے بعد سلطان کی مطلق فرماں روائی کے تصور کو مستحکم کرنے کے لئے کام کیا جس سے سلطان کو حتمی مذہبی اور سول حاکمیت حاصل ہوگئی۔ شیخ الاسلام کا استدلال تھا کہ قاضی حضرات اپنا دائرۂ اختیار (competence) سلطان کی طرف سے اپنے تقرر سے اخذ کرتے ہیں، جس کی بنا پر وہ اس امر کے پابند ہیں کہ وہ قانونی امور میں اس کے احکامات کی اطاعت کریں۔ کاتب چلبی[2] (Katib Celebi, d. 1657) نے جو خلافت عثمانیہ کا فاضل ترین عالم تھا، جرّی و عادل سلطان کی حکمرانی کی تائید کی اور سلطنت کے مالی امور کو جائز قرار دیا۔

صفویوں[3] کے شاہ اسماعیل (d. 1524) نے پورے ایران کو اپنے قبضے میں لے کر خود کو زمین پر شیعیت کے بارہویں امام مہدی کے نمائندے کے طور پر پیش کیا اور اعلیٰ ترین دنیاوی اور روحانی اختیارات کو یکجا کر کے ایک ہمہ مقتدر حکمران کے منصب میں ضم کر دیا۔ صفوی خاندان کا نادر شاہ[4] (d 1747) کے ظہور کے ساتھ ہی خاتمہ ہو گیا۔ نادر شاہ (d. 1747) نے سارے ایران پر اپنا اقتدار مجتمع کر لیا نتیجتاً قاچار خاندان[5] کی بادشاہت قائم ہوگئی جو 1779ء سے شروع ہو کر 1925ء تک رہی۔

---

[1]۔ Ebussuud Efendi (Hoca Celebi)؛ ابوسعود آفندیؒ (1490ء-1574) ایک نامور مفسر قرآن، فقیہ اور قانون دان تھے جنہیں خلافت عثمانیہ میں شیخ الاسلام بھی نامزد کیا گیا۔

[2]۔ حاجی خلیفہ کاتب چلبی (1609ء-1657ء) کا اصل نام مصطفیٰ بن عبداللہ تھا جو کاتب چلبی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپؒ ایک مشہور ترکی مؤرخ، سکالر اور خلافت عثمانیہ کی کئی مہم وفتوحات کے عینی شاہد تھے۔ اس کی وجہ شہرت مشہور زمانہ تصنیف کشف الظنون سے ہے جسے تمام ایشیائی ممالک میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

[3]۔ شاہ اسماعیل اول (d. 1524) ایران میں قائم ہونے والی صفوی حکومت (1501ء-1722ء) کا بانی تھا جو اپنے جد امجد شیخ اسحاق صفی الدین (d. 1334) کی نسبت سے صفوی کہلواتا تھا۔ اس طرح اس کی قائم کردہ سلطنت کو بھی صفوی سلطنت یا حکومت کہا جانے لگا۔

[4]۔ نادر شاہ (1688ء-1747ء) جسے نادر شاہ افشار، نادر قلی بیگ اور طہماسپ علی خان بھی کہا جاتا ہے، ایران کا بادشاہ اور خاندان افشار کی حکومت کا بانی تھا۔ اپنی عسکری صلاحیتوں کے باعث مورخین اسے ایشیا کا نپولین اور سکندر ثانی کہتے ہیں۔

[5]۔ قاجار خاندان (Qajar dynasty) ایک ترک النسل ایرانی شاہی خاندان تھا جس نے 1785ء سے 1925ء تک ایران پر حکومت کی۔

محقق کرکی[1](d. 1534) کی تصانیف سے شیعی سیاسی نظریہ پھر سے زندہ ہوگیا۔اس نے ایک بڑا اشتعال انگیز دعویٰ کیا کہ وہ امامِ غائب کے نمائندے (النائب العم) کے طور پر بولنے کا اختیار رکھتا ہے۔اس کے نظریات 'اصولی'[2] عالموں نے قبول کیے اور پھیلائے۔ان کا کہنا تھا کہ 'مذہبی اختیار' اصول الفقہ کے عمیق مطالعہ سے ہی اخذ کیا جا سکتا ہے۔ان 'اصولیوں' کو محمد امین الاسترآبادی[3](d. 1627) نے للکارا جسے 'اخباری'[4] کہا جاتا تھا۔اسے خواب میں 'الہام' ہوا تھا کہ قانون کا واحد ماخذ کیا ہے۔'اصولی مجلسی'[5](d. 1700) نے ریاست کو 'مجاز فقہاء' کے تابع قرار دیا اور کہا کہ 'شاہ' (بادشاہ) طبقہ علما کا 'ہتھیار' ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔اسے صرف 'مجتہد' پر انحصار کرنا ہوگا۔

سُنی مسلک مغلوں نے ظہیر الدین محمد بابر[6](d. 1530) کی زیر کمان 1526ء میں ہندوستان

---

[1]۔علی بن حسین بن عبدالعالی کرکی العاملی (1466ء-1534) ایک نامور اہل تشیع فقیہ تھا جسے ایران کے صفی خاندان نے عراق سے ایران بلا لیا تھا تا کہ ایران میں اہل تشیع عقائد وخیالات کی ترویج میں اس سے مدد لی جا سکے۔

[2]۔اصولی، اہل تشیع اثناعشریہ کا ایک ذیلی فرقہ ہے۔

[3]۔محمد امین الاسترآبادی (d. 1627) اہل تشیع فقیہ تھا جس نے اہل تشیع اثناعشریہ میں ذیلی فرقہ اخباری کی بنیاد رکھی اور اصولی فرقہ کی سخت مخالفت کی۔

[4]۔اخباری، اثناعشریہ اہل تشیع میں نمودار ہونے والا ایک ذیلی فرقہ ہے جس کی بنیاد محمد امین الاسترآبادی (d. 1627) نے رکھی۔اس فرقہ کے عقائد کے مطابق قرآن، حدیثِ محمد اور حدیثِ امامیانِ عشریہ کی جانب سے آنے والی خبر پر قیام کیا جاتا ہے۔ان کے مطابق کسی دیگر عالم (علماء) کے اجتہاد کی اہمیت دینی امور میں محض فتاویٰ کی حد تک ہی محدود ہوتی ہے۔اس فرقہ کے برعکس اصولی فرقہ تھا جس میں علما کو امام کے بارے میں اجتہاد کرنے کا حق دیا جاتا ہے۔

[5]۔محمد باقر بن محمد تقی بن المقصود علی مجلسی المعروف علامہ مجلسی (1616ء-1700ء) کا شمار عالم اسلام کے مشہور ترین علماء، فقہا اور محدثین میں ہوتا ہے۔آپ صفوی دور کے بااثر شیعہ حکام میں سے تھے۔آپ کتابِ حدیث بحار الانوار کے مؤلف ہیں۔

[6]۔ظہیر الدین محمد بابر (1483ء-1530ء) ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی تھا۔بابر اپنے والد عمر شیخ مرزا فرغانہ کی طرف سے امیر تیمور اور والدہ قتلغ نگار خانم کی طرف سے چنگیز خان کی نسل سے تھا۔اس طرح اس کی رگوں میں دو بڑے فاتحین کا خون تھا۔اس کا والد ترکستان کا حاکم تھا۔بارہ برس کی عمر میں اس کے باپ کا انتقال ہوگیا۔چچا اور ماموں نے شورش برپا کردی جس کی وجہ سے گیارہ برس تک پریشان رہا۔کبھی تخت پر قابض ہوتا اور کبھی بھاگ کر جنگلوں میں روپوش ہوجاتا۔بالآخر 1504ء میں بلخ اور کابل کا حاکم بن گیا۔یہیں سے اس نے ہندوستان کی طرف اپنے مقبوضات کو پھیلانا شروع کیا اور 1526ء کو پانی پت کی جنگ میں سلطان ابراہیم لودھی کو شکست دے کر ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔

فتح کرلیا۔ اس کے پوتے بادشاہ اکبر (d. 1605) نے اسلام کی روایتی سیاسی فکر سے انحراف کر کے خود کو معصوم عن الخطا بادشاہ قرار دے دیا۔ وہ بقول خود ایک انسانِ کامل تھا جس کی بنا پر اسے مذہبی اور دنیاوی معاملات میں بلند ترین حیثیت حاصل تھی۔ اس نے شریعہ کے فرامین و احکام کو نظر انداز کر کے مذہبی رواداری اور سیاسی مساوات پر مبنی ایک دین اختیار کرلیا۔ شیخ احمد سرہندیؒ (d. 1624) نے جو سلسلۂ نقشبندیہ کے پیروکار تھے بادشاہ اکبر (d. 1605) کے نظریات کو اسلامی قانون اور مذہب کے لئے تباہ کن قرار دیا۔ وہ اسلامی اقدار کو عوام الناس کی دینی اور سیاسی زندگی میں زندہ وفعال بنانے کے متمنی تھے (اسی لئے انہیں مجدد الف ثانی کہا جاتا تھا)۔ حضرت عبدالحق دہلویؒ[1] (d. 1642) شریعت کی سربلندی پر یقین رکھتے تھے اور بادشاہ سے صرف یہ توقع کرتے تھے کہ وہ اپنے آپ کو شریعت کا علم بردار کہلانے تک محدود رکھے۔ سلطان اورنگزیب عالمگیرؒ (d. 1707) نے اکبر (d. 1605) کے فلسفے سے اظہار برأت کیا اور فقہ حنفی پر مبنی عقیدہ اور متفقہ قانونی نظام کو از سر نو متعارف کروایا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ[2] (d. 1762) نے ہندوستان میں شریعہ پر مبنی معاشرت کے قیام کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ زمین اور ریاست کا مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ یہاں کے شہری ان لوگوں کی مانند ہیں جو کسی سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہوں۔ ملکیت کے معنی یہ ہیں کہ دوسروں کے لئے یہ امر ممنوعہ ہے کہ وہ کسی اور کے حق انتفاع (right of benefiting) میں مداخلت کریں۔ تمام انسان برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ ملک کا مالک اور عوام الناس کا بادشاہ بنے۔ سربراہِ ریاست کی حیثیت ایک اثاثے کے منتظم جیسی ہے۔ ہر انسان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ اسے بلا امتیازِ

---

[1] ۔ حضرت عبدالحق محدث دہلویؒ (1551ء - 1642ء) مغلیہ دور میں متحدہ ہندوستان کے مایہ ناز عالم دین اور محدث تھے۔ ہندوستان میں علم حدیث کی ترویج واشاعت میں آپؒ کا کردار ناقابل فراموش ہے۔

[2] ۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (1703ء - 1762ء) برصغیر پاک و ہند کے ایک مشہور مفکر، اسلامی سکالر، محدث فقیہ اور صوفی بزرگ تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ اور ان کے ساتھیوں نے اصلاح کا جو کام شروع کیا تھا آپؒ نے اس کام کی رفتار اور تیز کر دی۔ ان دونوں میں بس یہ فرق تھا کہ مجدد الف ثانیؒ چونکہ مسلمانوں کے عہد عروج میں ہوئے تھے اس لئے ان کی توجہ زیادہ تر ان خرابیوں کی طرف رہی جو مسلمانوں میں غیر مسلموں سے میل جول کی وجہ سے پھیل گئی تھیں لیکن شاہ ولی اللہؒ چونکہ ایک ایسے زمانے سے تعلق رکھتے تھے جب مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا تھا اس لئے انہوں نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر بھی غور کیا اور اس کے علاج کے بھی طریقے بتائے۔ آپؒ نے سب سے پہلے عجمی زبان فارسی میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ بخاری شریف کی شرح لکھی۔ دین اسلام کی عقلی توجیہات پیش کیں۔ حجۃ اللہ البالغۃ آپؒ کی مشہور ترین تصانیف میں سے ایک ہے۔

ذات وعقیدہ روٹی کپڑا اور مکان حاصل ہو۔ اسے شادی کرنے، اپنے بچوں کو تعلیم دلانے اور پرورش کرنے کا بھی حق ہے۔ علاوہ ازیں اسے انصاف، تحفظ زندگی واملاک اور عزت وناموس کی مساوات، حق ملکیت اور یکساں شہری حقوق بھی حاصل ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی کے دوران نصف مسلم دنیا یورپی ممالک کے نوآبادیاتی نظام کے زیر تسلط آ گئی۔ باہر سے مسلط شدہ کنٹرول کے خلاف مسلم اہل دانش کا داخلی ردعمل ان کے اندر احساس اصلاح و احیا پیدا ہو جانے کی صورت میں نمودار ہوا۔ جس کی قیادت ان کے اصحابِ دانش اور سیاسی و معاشرتی مصلحین کر رہے تھے۔ جمال الدین افغانیؒ[1] (d. 1897) نے اپنی پوری زندگی مسلمانوں کے ذہین طبقے اور ان کی معاشرتی زندگی میں تموج (agitated) پیدا کرنے کے لئے وقف کر دی اور ایک اصلاح شدہ مسلم شناخت ابھارنے میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ انہوں نے عوام الناس کو مسلمہ مذہبی عقائد اور ممتاز طبقے کو قانون فطرت پر مبنی معقولیت کا درس دیتے ہوئے ہمہ گیر اسلامی ریاست (پان اسلامک سٹیٹ) کو وجود میں لا کر عظمت اسلام کے لئے متحرک ہونے کی ترغیب دی اور کہا کہ اسلام کا حتمی نصب العین رجوع الی اللہ ہے جو حتیٰ الامکان اعلیٰ ترین سیاسی امت کی تشکیل کے لئے جدوجہد کا درس دیتا ہے۔ جمال الدین افغانیؒ (d. 1897) کے شاگرد شیخ محمد عبدہؒ[2] (d. 1905) اور ان کے رفیق کار رشید رضاؒ[3] (d. 1935) نے اسلام کے قرونِ اولیٰ کی طرف رجوع کرنے کے نصب العین کے لئے جدوجہد کی۔ وہ عمر بھر قرآن وسنت کی تعلیمات اور اجتہاد کے کردار کو بحال کرنے کی اہمیت پر زور دیتے رہے۔ انہوں نے مذہبی فرائض (عبادات) جو ناقابل تغیر خدائی احکامات ہیں اور دیگر انسانوں سے متعلقہ 'معاملات' میں فرق واضح کیا۔ انہوں نے ان کی از سرِ نو تشریح کے لئے قیاس واستدلال کو بروئے کار لانے کی تلقین کی تاکہ

---

[1]۔ سید محمد جمال الدین افغانی (1839ء-1897ء) وحدت عالم اسلام کے زبردست داعی اور دنیائے اسلام کی نمایاں شخصیت تھے۔ آپ نے اسلامی ممالک کو مغربی اقتدار سے آزاد کرانے کی جدوجہد کی۔ آپ کا مقصد مسلم ممالک کو ایک خلیفہ کے تحت متحد کر کے ان کا ایک آزاد بلاک بنانا تھا۔

[2]۔ شیخ محمد عبدہ (1849ء-1905ء) ایک مصری اسلامی سکالر، عالم، فقیہ اور اصلاح کار تھا جس نے اسلامی افکار کی جدیدیت کے لیے کام کیا۔

[3]۔ محمد رشید رضا (1865ء-1935ء) ایک شامی ماہر علم حدیث وتفسیر، ادب اور تاریخ تھے۔ جنہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم طرابلس اور قلمون مین حاصل کی۔ بعد ازاں مصر میں منتقل ہوئے جہاں پر شیخ محمد عبدہ کی شاگردی اختیار کی۔ انہوں نے بیروت سے ایک رسالہ مجلۃ المنار جس میں دینی اصلاح اور عصری تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔

معاشرے کی بہبود (مصلحہ) کے لئے کام کیا جا سکے۔

سلفیوں کی جدید اصلاحی تحریک کو حضرت امام احمد بن حنبلؒ (d. 855) اور شیخ ابن تیمیہؒ (d. 1328) کے افکار سے تقویت ملی۔ جس کا آغاز جمال الدین افغانیؒ (d. 1897)، شیخ محمد عبدہؒ (d. 1905) اور رشید رضاؒ (d. 1935) سے ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری دینی غیرت اور عزتِ نفس صرف اسی وقت بحال ہوگی جب ہم اسلام کو دوبارہ بطور مذہب اور بطور ایک طرزِ زندگی اختیار کر کے مغربی قوتوں کی ثقافتی اطاعت سے نجات پائیں گے اور اپنے داخلی وسائل سے از سر نو قوت حاصل کریں گے۔ سلفیوں نے الجزائر میں عبدالحمید بن بادیسؒ[1] (d. 1940) کی مساعی (کوششوں) سے، مراکش میں محمد علال الفاسیؒ[2] (d. 1974) کی جدوجہد سے اور تیونس میں محمد طاہر بن عاشور[3] (d. 1973) کی قیادت میں گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہابیوں کی تزکیۂ نفس پر مبنی تحریک نے شیخ محمد بن عبدالوہابؒ[4] (d. 1792) کی زیر قیادت اور سعودی عرب کے شاہ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود[5] (d. 1953) کے تعاون وحمایت سے سیاسی بنیاد پرستی کے قوی ترین جذبے اور حکمت عملی سے اپنا کام شروع کیا۔ اس کے زیر اثر اسلامی دنیا کے کئی حصوں میں اس کی مماثل تحریکیں چل پڑیں۔

---

[1]۔ عبدالحمید بن بادیس (1889ء-1940ء) الجزائر میں اسلامی افکار کی اصلاح کی تحریک کی مشہور شخصیت تھے جنہوں نے 1931 میں الجزائر میں مختلف مکتبۂ فکر کے علماء کی ایک تنظیم قائم کی۔ بعد ازاں اس تنظیم نے الجزائر کی سیاسی صورت حال اور آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔

[2]۔ محمد علال فاسیؒ (1910ء-1974ء) مراکش کے ایک معروف سیاستدان، اسلامی سکالر، مصنف، شاعر اور عالم تھے۔

[3]۔ محمد طاہر بن عاشورؒ (1879ء-1973ء) بیسویں صدی کا عظیم اسلامی سکالر، فقیہ اور تعلیمی اصلاح کار تھا۔ اس کی وجہ شہرت قرآن پاک کی تفسیر التحریر والتنویر ہے۔

[4]۔ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ (1703ء-1792ء) موجودہ سعودی عرب کے علاقہ نجد کا معروف اسلامی سکالر، فقیہ اور قائد تھا جس نے وہابی تحریک کی بنیاد رکھی۔ نجد کے ایک شہر درعیہ کے امیر محمد بن سعود (d. 1765) نے اس کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرنے کا عہد کیا اور کتاب وسنت کے بتائے ہوئے طریقوں پر چلنے پر آمادگی ظاہر کی۔ محمد بن عبدالوہابؒ نے پچاس سال تبلیغ کا کام انجام دیا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں کتاب التوحید مشہور ہے۔ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی وہابی تحریک نے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا اور کئی اختلافات بھی جنم دیئے۔

[5]۔ عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن آل سعود (1875ء-1953ء) جدید سعودی عرب کے بانی تھے۔

سرسید احمد خانؒ[1] (d. 1898) ہندوستان میں احیائے اسلام کی ایک بڑی قوت اور مسلم جدیدیت کے بانی بن گئے۔ انہوں نے اسلام کی تشریح اپنے اس کلیے کے مطابق کی کہ خدا تعالیٰ کے افعال اور کلام باہم مماثل ہوتے ہیں یعنی ان میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ اس نے اسلام اور مسلم ثقافت میں معاشرتی اصلاحات کے بارے میں معقولیت پر مبنی طرز فکر اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ حضرت اقبالؒ (d. 1938) نے پوری دنیا کو دعوت دی کہ وہ قرآن وسنت کے صحیح اسلام کی حرکیات (dynamism) کے اندر شامل ہوجائیں۔ ایک ایسی حرکیات، جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ تاریخ کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں ساری انسانیت کی اخلاقی تجدید کے لئے بروئے کار لائے گی۔

1924ء میں مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک[2] (d. 1938) نے شرعی عدالتوں کو منسوخ کر کے نئے دیوانی فوجداری اور تجارتی قواعد نافذ کر دیئے۔ ان سب چیزوں کو لادینیت پر استوار کر دیا جن کی بنا پر ترکی اس وقت مضبوط ترین مسلم سلطنت کہلاتا تھا۔ ترکی ثقافتی اور سیاسی انقلاب کی ایسی مثال بن گیا جو ایک مستبدِ حکومت نے بزور طاقت مسلط کیا تھا۔ بعدازاں ترکی نے بدیع الزمان سعید نورسیؒ[3]

---

[1]۔ سرسید احمد خانؒ (1817 - 1898) برصغیر میں مسلم نشاۃ ثانیہ کے علمبردار تھے۔ انہوں نے مسلمانوں میں بیداری علم کی تحریک پیدا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ سرسید احمد خان انیسویں صدی کے مصلح اور رہبر تھے۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو جمود سے نکالنے اور انہیں باعزت قوم بنانے کے لیے سخت جدوجہد کی۔ سرسید نے مسلمانوں کی اصلاح وترقی کا بیڑا اسوقت اٹھایا جب زمین مسلمانوں پر تنگ تھی اور انگریز اُن کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ وہ توپوں سے اڑائے جاتے تھے، سولی پر لٹکائے جاتے تھے، کالے پانی بھیجے جاتے تھے۔ اُن کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی تھی۔

[2]۔ مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک (1881ء-1938ء) جنگ عظیم اول میں عثمانی دور کا فوجی سالار، جدید سیکولر ترکی کا بانی اور اس کا پہلا صدر تھا۔ کمال اتاترک کے کردار کو اہل اسلام کے ہاں ہمیشہ سے مشکوک تصور کیا جاتا ہے۔ اس نے حتیٰ المقدور ترکی کو اسلامی شعار اور مسلم تہذیب وتمدن سے دور کرنے اور مغربی رنگ میں رنگنے کی پوری پوری کوشش کی۔

[3]۔ شیخ بدیع الزماں سعد نورسیؒ (1877ء- 1960ء) ترکی سے تعلق رکھنے والے، قرآن کریم، حدیث، فقہ، تاریخ، فلسفہ، جغرافیہ ودیگر علوم وفنون کے ماہر اور جذبہ جہاد سے سرشار ایک ممتاز عالم دین اور صوفی بزرگ تھے۔ آپؒ نے کمال اتاترک کے غیر اسلامی اقدامات کی پرزور مخالفت کی جس کی بنا پر آپؒ کو کئی دفعہ قید وسلاسل کی تکالیف بھی برداشت کرنا پڑیں۔

(d. 1960) کے اثرات کی وجہ سے اسلامی ثقافت اور اسلامی طرز زندگی کے لئے عقبی دروازہ کھول دیا۔

بیسویں صدی عیسوی کے آخر میں مصر کے حسن البنّا[1] (d. 1949) اور سید قطب شہیدؒ[2] (d. 1966) اور پاکستان کے مولانا سید ابواعلیٰ مودودی[3] (d. 1979) اور ایران کے آیت اللہ خمینی[4] (d. 1989) کے اثرات کی وجہ سے اسلامی دنیا میں قدامت پسندی غالب آ گئی۔ ان تحریکوں نے اسلام کو ایک سیاسی نظریئے کی شکل دے دی۔ حسن البنّاؒ (d. 1949) نے اخوان المسلمین نامی جماعت قائم کر لی جب کہ سید قطب شہیدؒ (d. 1966) نے اپنے ذاتی نظم وضبط اور تعلیماتِ جہاد کے ذریعہ سیاسی انقلاب کا منشور لکھا اور جمال عبدالناصر کے مصر کو 'جاہلیۃ' قرار دیا۔

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (d. 1979) نے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی اور وہ بیسویں صدی عیسوی میں صف اول کے ترجمانانِ اسلام میں شمار ہونے لگے۔ وہ نظریۂ جہاد کے تحت روحانی اور اخلاقی تعلیمات پر زور دیتے تھے اور مغرب زدگی کے خلاف اپنے شدید جذبات کا اظہار کر کے اسلامی تہذیب کی سربلندی اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے اپنے نظریات کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

۱۔ حسن احمد عبدالرحمن محمد البنّاؒ (1906ء-1949ء) مصر کے ممتاز مذہبی رہنما اور عظیم اسلامی تحریک اخوان المسلمون کے بانی اور صوفی بزرگ تھے جنہوں نے تصوف کے شاذلی طریقہ میں شیخ عبدالوہاب حصافی کی خدمت میں تکمیل کی۔ آپؒ کی شخصیت سازی میں شیخ عبدالوہاب حصافی کا بہت گہرا اثر تھا۔

۲۔ سید قطب شہیدؒ (1906ء-1966ء) ایک ممتاز مصری سکالر، مفسر اور ادیب تھے جو اخوان المسلمین سے وابستہ رہے۔ آپ مصری معاشرے کے اندر ایک ادیب کی حیثیت سے ابھرے۔ سیاسی اور اجتماعی نقاد کے عنوان سے نام پیدا کیا۔ ان کی اہم ترین تصنیف قرآن کریم کی تفسیر ہے جو 'فی ظلال القرآن' کے نام سے عربی میں لکھی گئی ہے اور اس کا ترجمہ بشمول اردو کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ آپؒ کی اخوان المسلمین سے وابستگی حکومت کو بہت زیادہ کھٹکتی تھی اس لیے جمال عبدالناصر کے تاریک دور آمریت میں کئی بار پابند سلاسل کیا گیا۔ ان کو ان کی شہرہ آفاق کتاب معالم فی الطریق لکھنے پر مصری حکومت کے خلاف سازشیں کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور 25 اگست 1966ء کو پھانسی دے دی گئی۔

۳۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903ء-1979ء) ایک مشہور عالم دین اور مفسر قرآن اور جماعت اسلامی کے بانی تھے۔ ان کا شمار بیسوی صدی کے موثر ترین اسلامی مفکرین میں ہوتا ہے۔ ان کی فکر، سوچ اور ان کی تصانیف نے پوری دنیا کی اسلامی تحاریک کے ارتقا میں گہرا اثر ڈالا۔

۴۔ روح اللہ خمینی (1902-1989) ایرانی کی قوم کا مشہور روحانی و انقلابی شیعہ رہنما تھا۔ جس نے 1979 میں ایران میں کامیاب شیعہ انقلاب برپا کیا۔

جناب آیت اللہ خمینی (d. 1989) 1950ء کے عشرے میں آیت اللہ بنے اور 1960ء میں ’مرجع‘ کے مرتبے پر فائز ہوئے۔ خمینی کے والد کو رضا شاہ پہلوی[1] (d. 1944) کے حکم پر قتل کر دیا گیا تھا۔ خود انہیں بھی 1964ء میں عراق میں جلا وطن کیا گیا۔ بعد ازاں جب انہوں نے محمد رضا شاہ پہلوی[2] (d 1980) اور مغرب نوازی کے خلاف بولنا شروع کیا تو انہیں فرانس میں جلا وطن کر دیا گیا۔ انہوں نے جلا وطنی کے دوران ہی سیاسی جدوجہد شروع کر دی۔ جب شاہ کا تختہ الٹ دیا گیا تو وہ یکم فروری 1979ء کو بطور قائد انقلاب ایران واپس آ گئے۔ ایران کے لئے نئے دستور میں شیعہ اسلام کو سرکاری مذہب اور مذہبی لیڈر (ولایت الفقیہ) تسلیم کر لیا گیا۔ اگر چہ ایک منتخب صدر ایگزیکٹو برانچ کا سربراہ تھا لیکن اس کے اختیار کے استعمال کی نگرانی ولایت فقیہ کرتا تھا جسے شیعہ فقہا کی مشاورتی کونسل کی حمایت و تائید حاصل تھی۔

مسلمانوں کے جدید سیاسی مفکرین ابھی تک عہد متوسط کے نظریات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ صرف حضرت محمد اقبالؒ (d. 1938) اس سے مستثنیٰ تھے لیکن روایتی علماء انہیں زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ حضرت اقبالؒ (d. 1938) کا استدلال یہ تھا کہ کسی بھی انسانی معاشرہ کے سیاسی افکار اس معاشرہ کے روحانی اور اخلاقی تصورات کے تابع ہونے چاہئیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا معاملہ ہے ان کے سیاسی افکار اسلام کے روحانی اور اخلاقی افکار کے تابع ہیں اور اسلام کا نصب العین ہر قیمت پر معاشرتی امن کا تحفظ ہے[3]۔ ایسی امت کے لئے بہترین طرز عمل جمہوریت ہوگا۔ جس کا نظریہ یہ ہے کہ ایک فرد کو اس کی فطرت کی تمام صلاحیتوں کو ترقی دینے کا موقع دیا جائے۔ اس کے لئے اسے اتنی آزادی استعمال کرنے کی اجازت ہونی چاہیے جتنی قابلِ عمل ہو اور اس امر سے مشروط ہو کہ اس فرد کی آزادی اس گروہ یا امت کے مفادات کے تابع رہے گی۔

۱۔ رضا شاہ پہلوی (1878ء-1944ء) ایران کا بادشاہ تھا جس نے حکومت حاصل کرنے کے لیے 1925ء میں خاندان قاجار کے بادشاہ احمد شاہ قاجار کے خلاف کامیاب بغاوت کی۔ دوسری جنگ عظیم میں ایران نے جرمنی کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھے۔ اس بنا پر برطانوی اور روسی افواج ایران میں داخل ہو گئیں۔ انگریزوں نے رضا شاہ کو تخت چھوڑنے اور اپنے بیٹے محمد رضا شاہ پہلوی کو حکومت سونپنے پر مجبور کر دیا۔ 1941ء میں رضا شاہ جنوبی افریقہ چلا گیا اور وہیں وفات پائی۔

۲۔ محمد رضا شاہ پہلوی (1919ء-1980ء) ایران کے پہلے پہلوی بادشاہ رضا شاہ کا بیٹا، دوسرا اور آخری پہلوی بادشاہ تھا جس کے خلاف آیت اللہ خمینی نے کامیاب شیعہ اسلامی انقلاب برپا کیا تو وہ شاہ خود ہی ملک چھوڑ کر چلا گیا۔

۳_ Mohammad Iqbal in Thoughts and Reflections of Iqbal, edited by Syed Abdul Vahid, p. 49.

تاہم حضرت اقبالؒ (d. 1938) مغربی جمہوریت کو کلی طور پر قبول نہیں کرتے بلکہ اس کی بجائے انہوں نے جمہوریت کے اپنے فہم کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا اور مذہب اور ریاست کی علیحدگی کے تصور کو باطل ثابت کیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام کی جمہوریت اقتصادی موقع پرستی کی توسیع نہیں ہے۔ یہ ایک روحانی اصول ہے جو اس حقیقت پر مبنی ہے کہ ہر فرد و بشر ایک قوتِ پنہاں (latent power) کا مرکز ہے جس کے امکانات (یا استطاعت) کو ایک خاص قسم کے کردار کی تادیب کے ساتھ فروغ دیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ آگے بڑھ کر اسلام کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں ایک معاشرتی زندگی کی تشکیل کریں اور اس روحانی جمہوریت کو فروغ دیں جو کہ اسلام کا اصلی نصب العین ہے[1]۔

حضرت اقبالؒ (d. 1938) کہتے ہیں کہ تہذیب کی اعلیٰ منزل پر جا کر مطلق شخصی اقتدار (personal absolute authority) قابل عمل دکھائی نہیں دیتا۔ لہٰذا قانونی حاکمیتِ اعلیٰ (legal sovereignty) عوام سے تعلق نہیں رکھتی۔ یہ اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہے۔ اسلام شخصی اقتدار کا کلیتاً مخالف ہے کیونکہ یہ انسان کی انفرادیت کے بھرپور ارتقاء کے لئے ضرر رساں ہے۔ حضرت اقبالؒ (d. 1938) کے لئے اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ عوام کو اپنے نمائندوں کے انتخاب کا اختیار حاصل ہے لیکن عوام اور ان کے نمائندگان، دونوں کو خدا تعالیٰ کے نازل کردہ قانون (شریعت) کے ڈھانچے کے اندر رہ کر کام کرنا ہوگا۔ شریعت کے نقطۂ نظر سے مذہب اور ریاست دو مختلف وجود نہیں ہیں بلکہ یہ ایک ہی چیز ہیں[2]۔ اسلام میں خلیفہ لازمی طور پر اسقف اعظم نہیں ہے۔ وہ روئے زمین پر نمائندہ خدا نہیں ہے۔ وہ دوسرے انسانوں کی طرح پُر خطا (fallible) ہے اور ہر مسلمان کی طرح اسی قانون کے غیر شخصی حاکم کی رعیت ہے۔

شریعت کے عام اصول، اہل ایمان کے نقطۂ نظر سے، خدا کی طرف سے نازل ہوئے ہیں۔ جن کی تفصیلات طے کرنے کا کام فقہاء کرامؒ کی تعبیر کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے تا کہ وہ پیش آمدہ دنیاوی امور کو نازل شدہ وحی کے مطابق طے کر سکیں۔ تاہم اگر کوئی نئے امور سامنے آئیں جن کے لئے اسلامی قانون

۱۔ Mohammad Iqbal in Thoughts and Reflections of Iqbal, edited by Syed Abdul Vahid, p. 51.

۲۔ Mohammad Iqbal in Thoughts and Reflections of Iqbal, edited by Syed Abdul Vahid, p. 51 - 52.

میں پہلے سے کوئی مثال موجود نہ ہوتو پوری امتِ مسلمہ کی منشا (اجماع امت) ایک مزید ماخذ قانون (source of law) بن جاتی ہے[1]۔ حضرت اقبالؒ (d. 1938) نے تجویز کیا کہ ایک نئی منتخب شدہ اسمبلی میں علماء کو مسلم قانون ساز اسمبلی کا اہم حصہ ہونا چاہیے تا کہ وہ قانون سے متعلقہ سوالات پر آزادانہ بحث ومباحثے کی رہنمائی کرسکیں[2]۔ چنانچہ انہوں نے مجلس قانون ساز اور پارلیمنٹ کے تصور کی پوری حمایت کی جو متذکرہ بالا 'اجماع' کے لئے ایک فورم بنے۔

حضرت اقبالؒ (d. 1938) فرماتے ہیں کہ فی الوقت عالمی خلافت نے مسلم ممالک کی دولتِ مشترکہ (Commonwealth of the Muslim countries) کی جگہ لے لی ہے کیونکہ عالمی امامت عملاً فیل ہوچکی ہے۔ یہ تصور قابل عمل نہیں رہا۔ لہٰذا جدید اسلام کے نظم میں یہ ایک زندہ عامل کے طور پر کام نہیں کرسکتا۔ خلافت کا حقیقی اظہار آزاد وخودمختار اکائیوں کے تنوع کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ جن کی نسلی رقابتوں کو ایک مشترکہ روحانی امنگ نے بنا سنوار کر ہم آہنگ کر دیا ہو۔ اسلام نہ تو قومیت (Nationalism) کا حامی ہے اور نہ بادشاہت (Imperialism) کا علمبردار، بلکہ وہ ایک جمعیت اقوام (League of Nations) کا حامی ہے جو مصنوعی حدوں اور نسلی امتیاز کو صرف بحوالہ شناخت تسلیم کرتا ہے جو اس کے ارکان کے معاشرتی افق کو محدود نہ کرتا ہو[3]۔ انہوں نے مزید کہا کہ دو یا اس سے زیادہ خلافتوں کا بقائے باہمی (co-existence) غیر قانونی نہیں ہے بشرطیکہ وہ مختلف ممالک میں قائم ہوں۔ مزید برآں مسلم تاریخ میں دو رقیب خلافتیں بڑے عرصے تک رہ چکی ہیں[4]۔

حضرت اقبالؒ (d. 1938) نے خلیفہ کے منصب کی اہمیت کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ بدلتے ہوئے حالات میں خلیفہ کا ذکر کسی اور نام سے بھی کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس کے نام کی اتنی اہمیت نہیں جتنی اس

---

۱ ۔ Mohammad Iqbal in Thoughts and Reflections of Iqbal, edited by Syed Abdul Vahid, p. 61 - 62.

۲ ۔ Mohammad Iqbal in Thoughts and Reflections of Iqbal, edited by Syed Abdul Vahid, p. 176.

۳ ۔ The Reconstruction of Religious Thought in Islam by Mohammad Iqbal, p. 159.

۴ ۔ The Reconstruction of Religious Thought in Islam by Mohammad Iqbal, p. 65 - 66.

کی شرائطِ منصب (qualifications) کی ہے۔ لہٰذا انہوں نے خلیفہ اور اس کے عمال (وزاراء) کی شرائط منصبی (qualifications) کی تفصیلات بتائیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ شرائط اضافی اور ذیلی ہیں نہ کہ مطلق۔ ان میں حالات کے مطابق ردوبدل اور ترمیم ہوسکتی ہے۔

اس سلسلے میں حضرت اقبالؒ (d. 1938) نے اسلام میں حکمرانی کے ایک اور اہم پہلو، خلیفہ اور اس کی حکومت پر عوامی تنقید اور حکمرانی سے اچھے نتائج برآمد نہ ہونے پر خلیفہ کی برطرفی کا معاملہ پر روشنی ڈالی۔ خلافت کے ابتدائی دور میں جب خلیفہ کی برطرفی یا معزولی یا کسی حاکم کا کردار اسلامی تعلیمات کے مطابق اچھا نہیں پایا جاتا تھا تو اس کے خلاف کارروائی مسجد میں عمل میں لائی جاتی تھی۔ حضرت اقبالؒ (d 1938) کا خیال تھا کہ مسجد مسلمانوں کے لئے ایک مجلس یا کچہری کی حیثیت رکھتی ہے اور روزانہ کی نماز کا یہ ادارہ مسلم معاشروں کی سیاسی زندگی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ روحانی اور معاشرتی کرداروں کے علاوہ یہ ادارہ حکومت اور ریاست پر مسلسل تنقید کے لئے بھی ایک تیار جگہ کا کام دیتا تھا [1]۔

حضرت اقبالؒ (d. 1938) نے منتخب ہونے والوں اور منتخب کرنے والوں کے تعلق کی نوعیت کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ تعلق ایک قسم کا معاہدہ (عقد) ہے جو دونوں فریقوں کو اس امر کے پابند بناتا ہے کہ وہ معاشرے کے کچھ اعلیٰ وارفع مقاصد مل جل کر حاصل کریں۔ خلیفہ چند بنیادی فرائض کا ذمہ دار ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے عالمگیر ہیں۔ مثال کے طور پر اس کا فرض ہے کہ وہ مذہب کی تشریح اور اس کا تحفظ کرے۔ اسلام کے قانون کو نافذ کرے۔ اسلام کے مطابق درآمد و برآمد کے محاصل (levy customs) عائد اور وصول کرے۔ سالانہ تنخواہیں ادا کرے۔ ریاستی خزانے کو صحیح طریقے سے چلنے کی ہدایت کرے۔ حتماً معاشرے میں امن قائم کرے اور خوشحالی لائے۔ اگر وہ ان شرائط کو پورا کرتا ہے تو ان کے حوالہ سے عوام کے دو فرائض ہیں: اس کی اطاعت کریں اور کاموں کی انجام دہی میں اس کی مدد کریں۔

حضرت اقبالؒ (d. 1938) سمجھتے تھے کہ سیاسی حاکمیت عملاً عوام کے زیر تصرف ہوتی ہے اور یہ کہ حلقۂ انتخاب (الیکٹوریٹ) متفقہ پسند کے آزادانہ اقدام کے ذریعہ اس حاکمیت کی ایک معین شخصیت

---

[1]۔ Mohammad Iqbal in Discourses of Iqbal, edited by Shahid Hussain Razzaqi, p. 249.

کے اندر تجسیم کرتا ہے جس کی وساطت سے اجتماعی منشاء کی تخصیص ہو جاتی ہے۔ اس نشستِ اقتدار کو کوئی قانون رعایت نہیں دی جاتی ماسوائے انفرادی مرضیات (Wills) پر قانونی قدغن عائد کرنے کے، جس کا وہ مظہر ہے[1]۔ علاوہ ازیں سیاسی حاکمیتِ اعلیٰ قانون کی نگاہ میں معاشرے کے تمام ارکان کی کلی مساوات کے تحت عوام سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں کوئی مراعات یافتہ طبقہ نہیں، کوئی پاپائیت نہیں ہے اور کوئی نظامِ ذات پات نہیں ہے۔ اسلام ایک مساواتی قوت (levelling force) ہے۔ یہ فرد کو اس کی داخلی قوت (inward power) کا احساس دلاتا ہے اور ان کو بلندی عطا کرتا ہے جو معاشرتی طور پر کمتر ہیں۔

مختصراً یہ کہ مغرب نے گروہوں کی تشکیل نو کے لئے شراکت اور صلاح و مشاورت کے اصول اختیار کئے ہیں۔ 'سنہری انقلاب' (Glorious Revolution, 1688) نے یہ طے کر دیا تھا کہ انگریز بادشاہوں کو اپنے عوام پر غیر معمولی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے اور یہ کہ عوام کا بنایا گیا قانون ہی بالاتر ہوگا۔ اس میں ہمیشہ کے لئے یہ فیصلہ بھی کر دیا گیا کہ بادشاہوں کے خدائی حقوق (Divine Rights) کا کوئی تصور نہیں اور یہ کہ حاکمیتِ اعلیٰ (sovereignty) عوام کے پاس ہوتی ہے۔ اس تصور نے مغربی معاشروں میں حکومتوں اور شہریوں کے موجودہ کردار اور حقوق کی وضاحت کی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کی سیاسی تعلیمات ابھی تک عہد متوسط جیسی ہیں اور ان کی نگاہیں 'امیر' کے اختیارات پر مرتکز چلی آ رہی ہیں۔ اس سیاق و سباق میں شوریٰ (پارلیمنٹ) کو امیر کے تابع بنا دیا گیا ہے کیونکہ اس کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ اسے 'امیر' خود نامزد کرتا ہے۔ جب ایک امیر ارکان شوریٰ کو نامزد کرتا ہے اور اس کے فیصلوں کا اطلاق امیر پر نہیں ہوتا تو مسلم حکمران عراق کے صدام حسین[2] (d. 2006) یا افغانستان کے ملا محمد عمر[3] (d. 2013) کے نقش قدم پر کیوں نہیں چلیں گے؟

---

[1]۔ Mohammad Iqbal in Discourses of Iqbal, edited by Shahid Hussain Razzaqi, p. 58.

[2]۔ صدام حسین (1937ء-2006ء) سابق عراقی مطلق العنان صدر اور بعث پارٹی کا سربراہ تھا جو 1979ء سے 2003ء تک برسر اقتدار رہا۔

[3]۔ ملا محمد عمر (1960ء-2013ء) افغانستان کی طالبان تحریک کا رہنماء اور 1996ء سے 2001ء تک افغانستان کا حکمران تھا۔ پھر امریکی و نیٹو افواج نے ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ 2015ء میں ان کے وفات کی تصدیق ہوئی۔

مسلمان تو عوام کے ساتھ واجب التعمیل مشاورت کے علمبردار ہوتے تھے لیکن اب انہوں نے کبھی ایک بہانے سے اور کبھی دوسرے بہانے سے جمہوریت یا عوام کی حکمرانی کے اس تصور کی مخالفت شروع کر دی۔ مسلمان رہنماؤں نے اپنی ساری قوتیں جمہوریت کی اصلاح کرنے کی بجائے مخالفت کرنے پر ضائع کر دیں۔ ایسا ماحول رہتا تو ٹامس ہابز (Thomas Hobbes, d. 1679)، جان لاک (John Locke, d. 1704)، روسو (Rousseau, d. 1778) اور مونٹیسکیو (Montesquieu, d. 1755) جیسے مفکرین کبھی نہ اُبھر سکتے۔ مسلمانوں کی سیاسی ثقافت میں ابھی تک جاگیردارانہ، اشرافیانہ یا مذہبی حکومت کے تصورات پائے جاتے ہیں جو سماوی حقوق، بادشاہت اور خاندانی حکومت پر مبنی ہیں جن میں انسانی حقوق کم ہوتے ہیں۔ قانون کی حکمرانی اور دستوریت، صحیح معنوں میں نہیں ہوتی۔ اس شعبے میں ابتدائی مراحل میں بہت ترقیوں کے باوجود مسلمان اب تک پوری طرح آزاد نہیں ہوئے اور اپنی حکومتیں بناتے یا توڑتے نہیں ہیں۔ عمومی لحاظ سے مسلم دنیا میں آج کی سیاسی ثقافت زیادہ تر ویسی ہی ہے جیسے انقلاب فرانس (1779ء) سے پہلے مغرب میں ہوتی تھی۔ اس طرح ہم ان قوموں سے تقریباً 250 سال پیچھے چل رہے ہیں۔

4۔ معاشرتی علوم کا عروج

معاشرتی علوم، تعلیم وتعلّم کی وہ شاخ ہے جو معاشرے اور معاشرت کے اندر پائے جانے والے افراد کے باہمی تعلقات پر بحث مباحثہ کرتی ہے۔ ان علوم میں زیادہ اہم معاشیات (Economics)، سیاسیات (Political Science)، جمعیت شناسی (Demography) اور عمرانیات (Sociology) ہیں۔ وسیع مفہوم میں ان میں مطالعۂ انسانیت مثلاً علم البشر، تاریخ اور قانون شامل ہیں۔

جدید معاشرتی علوم[1] کا ماخذ مغربی فلسفے کا مشترک ذخیرہ ہے لیکن یہ یقینی طور پر انیسویں صدی

---

[1]۔ معاشرتی علوم کی اصطلاح پہلی بار William Thompson؛ ولیم تھامپسن (1775ء-1833ء) نے اپنی کتاب An Inquiry into the Principles of the Distribution of Wealth Most Conducive to Human Happiness; Applied to the Newly Proposed System of Voluntary Equality of Wealth. نے استعمال کیا۔

عیسوی کے اوائل میں سائنس کے اثباتی فلسفے کے ساتھ اس بنیاد پر شروع ہوئے کہ معاشرے کا مطالعہ معیار بند اور معروضی انداز میں ہی کیا جا سکتا ہے جبکہ اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ ابتدائی علمِ معاشرت عہد متوسط کے اسلام (ابن خلدون) کی تصانیف میں پایا جاتا ہے لیکن 'انسان' کا سائنسی تجزیہ زیادہ تر عہدِ روشن خیالی (Enlightenment) کے بعد ہونا شروع ہوا تھا اور اس پر عہدِ انقلابات (Revolution) کے نہایت گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے[1]۔ جدید معاشرتی علوم انسانی رویئے کی بین الکلیاتِ (interdisciplinary) علمی اور تقابلِ علمی (cross-disciplinary) کی تحقیقات کا مجموعہ ہیں۔

نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) کے اوائل (14ویں صدی عیسوی) میں 'ژان بوریدان[2]' (Buridanus, d. 1363) اور نکول ارسمہ[3] (Nicole Oresmius, d. 1382) نے زر (money) اور مالیات (finance) پر لکھا اور 'سینٹ اینٹونائن آف فلورنس' (St. Atonine of Florence, d. 1459) نے پندرہویں اور سولہویں صدیوں میں تحقیق کے انہی خطوط کی پیروی کی۔ سترہویں صدی میں ٹامس ہابز (Thomas Hobbes, d. 1679) نے استدلال پیش کیا کہ مسلمات (axioms) سے استخراجی (deductive) دلائل ایک سائنسی نظام کی تخلیق کرتا ہے۔ لہٰذا اس کی تصنیف 'Leviathan' ایک سیاسی دولت مشترکہ کی ایک سائنسی توضیح ہے۔ تاہم اٹھارہویں صدی عیسوی تک معاشرتی علوم کو فلسفۂ اخلاق کہا جاتا رہا۔

آگسٹ کومٹے[4] (Auguste Comte, d. 1857) کا استدلال یہ تھا کہ تصورات تین ترقی پذیر منازل میں سے گزرتے ہیں؛ دینیاتی منزل (theological)، فلسفیانہ منزل (philosophical) اور سائنسی منزل (scientific)۔ اس نے ان منازل کے درمیان فرق و

1۔ The Social Science Encyclopedia by Adam Kuper and Jessica Kuper

2۔ Jean Buridan؛ ژان بوریدان (1295ء - 1363ء) ایک فرانسیسی پادری تھا جس نے یورپ میں کوپرنیکن انقلاب کی بنیاد رکھی۔

3۔ Nicole Oresme؛ نکول ارسمہ (1325ء-1382ء) ایک فرانسیسی فلاسفر تھا جس نے بیک وقت اکنامکس، ریاضی، طبعیات، فلکیات، فلسفہ پر متاثر کن کام کیا۔ اس کے علاوہ وہ ایک بہترین مترجم بھی تھا۔

4۔ Auguste Comte؛ آگسٹ کومٹے (1798ء- 1857ء) ایک فرانسیسی فلسفی تھا جس نے پیراڈوکسی اور مثبتیت کے اصولوں کی بنیاد رکھی۔ اسے جدید معنوں میں سائنس کا پہلا فلسفی سمجھا جاتا ہے۔

امتیاز کی توضیح یہ کی کہ پہلی منزل کی جڑیں مفروضے (assumption) میں پیوست ہوتی ہیں۔ دوسری منزل تنقیدی سوچ میں ہوتی ہے اور تیسری منزل مثبت مشاہدے (positive observation) کے اندر ہوتی ہے۔ کومٹے (Comte, d. 1857) نے تجویز پیش کی کہ معاشرتی برائیوں کی اصلاح 'عمرانیاتی اثباتیت' (sociological positivism) کے ذریعے کی جاسکتی ہے جس کے خدوخال اس نے 'The Course in Positive Philosophy 1842' اور 'A General View of Positivism 1844' میں بیان کردیئے۔ اس نے پیش گوئی کی کہ 'اثباتیت کی منزل' (positivist stage) قیاسی، دینیاتی اور مافوق الطبیعیاتی (metaphysical) منازل کے بعد فہم انسانی کے ارتقاء کا حتمی عہد (final era) ہوگی [1]۔ سوچ کا یہ انداز جس کو ہنوز بہت سے لوگ ماننے سے انکاری ہیں، ایک خلاصہ بیان کرتا ہے۔ جس نے جدید معاشرتی علوم کو آگے بڑھایا تاکہ اس کے لئے ایک تجرباتی بنیاد (empirical basis) تلاش کی جاسکے۔

کارل مارکس [2] (Karl Marx, d. 1883) یہ دعویٰ کرنے والے اولین مصنفوں میں سے تھا کہ اس کے طریق ہائے تفتیش تاریخ کے سائنسی نظریئے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چارلس ڈارون (Charles Darwin, d. 1882) اور گریگر مینڈل [3] (Gregor Mendel, d. 1884) نے معاشرتی نظریئے کے توضیحی بیانیے کو شدید دھچکا قرار دیا۔ ڈارون (Darwin, d. 1882) کے کام میں اس قسم کی تحقیق کو انسانی تعلقات کی تحقیق کے ساتھ جوڑنے کی پہلی کوشش سگمنڈ فرائڈ [4] (Sigmund Freud, d. 1939) نے ذہن کی کارکردگی کے نظریئے میں کی تھی۔ جب کہ ولیم جیمز [5] (William James, d. 1910) نے تجرباتی نفسیات پر اپنے کام میں کی تھی۔ آیئے علوم کی بعض شاخوں کی چند مثالوں پر غور کریں:

۱۔ Dictionary of the Social Sciences, Article: Comte, Auguste

۲۔ Karl Marx، کارل مارکس (1818-1883) ایک مشہور فلاسفر، ماہر معاشیات، صحافی، سوشیالوجسٹ اور سوشلسٹ انقلابی تھا۔ جس نے Das Kapital اور The Communist Manifesto جیسی شاہکار کتابیں لکھیں۔

۳۔ Gregor Mendel؛ گریگور مینڈل (1822ء-1884) ایک سائنسدان تھا جسے جینیاتی سائنس (scienceof genetic) کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

۴۔ Sigmund Freud سگمنڈ فرائڈ (1856-1939) کو جدید نفسیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

۵۔ William James؛ ولیم جیمز (1842ء-1910ء) امریکی ماہر نفسیات، فلاسفر اور سرجن تھا۔

(1)۔ علم البشریات (Anthropology)

علم البشریا 'بشریات' انسان کے بارے میں ایک 'نظریۂ کلیت' (totality of human) ہے یعنی ہستی انسان کی کلیّت کا علم۔ یہ شاخِ علم معاشرتی علوم، انسانی خصوصیات (humanities) اور انسانی حیاتیات (human biology) کے مختلف پہلوؤں کے انضمام (integration) کا مطالعہ کرتی ہے۔ بشریاتی معاشرتی علوم (anthropological social sciences) اکثر اشاراتی درجے کی تفصیلات تک جا پہنچتے ہیں جبکہ اس کے برعکس کیمیاء (Chemistry) یا طبیعیات (Physics) سے ماخوذ عام قوانین سے انسان کے بارے میں عمومی معلومات حاصل ہوتی ہیں یا وہ زیادہ عمومی اصولوں کے ذریعے انفرادی کیسوں میں وضاحت پیش کرتی ہیں۔ جیسا کہ علم نفسیات کے کئی شعبوں میں ہوتا ہے۔ علم کی یہ شاخ، جدید دنیا میں ایک بڑے شعبۂ مطالعہ کے طور پر ظہور پذیر ہو چکی ہے۔ لیکن ہمیں علم کی اس شاخ میں کوئی نمایاں مسلم نام دکھائی نہیں دیتا۔ البیرونی (al-Biruni, d. 1048) نے مشرق وسطیٰ، بحیرۂ روم اور جنوبی ایشیا کے لوگوں، مذاہب اور ثقافتوں کی بشریات کا تفصیلی مطالعہ کیا اور اس پر گرانقدر کتابیں لکھی ہیں[1]۔ ابن خلدون (d. 1406) نے 'جمعیت شناسی' (Demography)، تاریخیائی جغرافیہ (Historiography)، فلسفۂ تاریخ (Philosophy of History)، عمرانیات (Philosophy of Sociology) اور اقتصادیات (Economics) کے شعبوں پر کافی تحقیقی مواد مرتب کیا۔ ابن خلدون (d. 1406) کو اپنی کتاب 'مقدمہ' کی وجہ سے بہت شہرت ملی ہے[2]۔ ابن خلدون (d. 1406) کے بعد کسی مسلمان نے اس شعبے میں قابل ذکر کام نہیں کیا۔

(2)۔ سیاسیات (Political Science)

سیاسیات ایک تعلیمی اور تحقیقی شعبۂ علم ہے جو سیاسیات کے نظریہ اور سیاست کے طریق ہائے کار، سیاسی نظاموں اور سیاسی رویوں کی تفصیلات اور تجزیہ کا مطالعہ کرتا ہے۔

سیاسیات کے شعبے اور ذیلی شعبوں میں سیاسی معیشت، سیاسی نظریہ اور فلسفہ، شہریت

۱۔ J. T. Walbridge (1998), Explaining Away the Greek Gods in Islam', Journal of the History of Ideas 59 (3), p. 389 - 403

۲۔ Dr. S. W. Akhtar (1997), 'The Islamic Concept of Knowledge', Al-Tawhid: A Quarterly Journal of Islamic Thought & Culture 12 (3)

(civics)اور تقابلی سیاسیات، سیاسی ارتقا، بین الاقوامی تعلقات اور عوامی پالیسی (public policy) شامل ہیں۔ سیاسیات میں بین الاقوامی تعلقات اور بڑی طاقتوں اور سپر طاقتوں کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ پچھلے ابواب میں مغرب اور مسلم دنیا میں سیاسی فکر کے ارتقا کی تفصیلات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ مسلم دنیا میں ایک مصنف بھی ایسا نہیں جس کا سیاسی تحریروں کے حوالہ سے ہابز (Thomas Hobbes, d. 1679)، لاک (John Locke, d. 1704) یا روسو (Rousseau, d. 1778) سے موازنہ کیا جا سکے۔ صرف حضرت شاہ ولی اللہؒ (d. 1762) حضرت محمد اقبالؒ (d. 1938) اور محمد اسدؒ[1] (d 1992) نے اپنے عہد میں سیاسی مسائل کا جامع، محتاط اور طریقیاتی تجزیہ (methodological analysis) کیا ہے۔

(3)۔ نفسیات (Psychology)

نفسیات ایک تعلیمی اور اطلاقی شعبہ ہے جس میں رویوں اور ذہنی طریق ہائے کار کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایسے علم کے انسانی سرگرمیوں کے متعدد دیگر دوائر (spheres) پر بھی اطلاق کا حوالہ دیتی ہے جن میں افراد کی روزمرہ کی زندگی کے مسائل اور ذہنی عوارض کا علاج شامل ہے۔ لفظ سائیکالوجی (نفسیات) قدیم یونانی ''ψυχή, psyche'' (سائیکی)۔ روح، ذہن) اور ''logy'' (study) سے ماخوذ ہے۔ 1870ء کے عشرے تک نفسیات فلسفے کی ایک شاخ تھی پھر یہ جرمنی اور امریکہ میں ایک مستقل سائنسی شاخ بن گئی۔ اس کا تجرباتی مطالعہ 1879ء میں اس وقت سے شروع ہوا جب 'ویلہم وونٹ'[2] (Wilhelm Wundt, d. 1920) نے اس کی اولین تجربہ گاہ قائم کی جو جرمنی میں صرف نفسیاتی تحقیق کے لئے مخصوص کر دی گئی۔

جدید علم نفسیات 'رینے ڈیکارٹ' (Rene Descartes, d. 1650) اور برطانوی حامی اصولِ تجربی، براعظمی عقلیت پسند اور داعیٔ مکاتب فلسفہ فرانسس بیکن (Francis Bacon, d.

---

[1]۔ Leopold Weis؛ محمد اسدؒ (1900ء-1992) ایک جرمن مسلم سکالر تھے جنہوں نے یہودی مذہب کو خیر باد کہہ کر اسلام قبول کر لیا تھا اور اسلامی دنیا کو ہی اپنا مسکن بنا لیا۔ محمد اسد اسلامی موضوعات پر کئی تحقیقی کتب کے مصنف بھی ہیں۔

[2]۔ Wilhelm Wundt؛ ویلہم وونٹ (1832ء-1920ء) ایک جرمن ڈاکٹر، فلسفی اور پروفیسر تھے جنہیں بجا طور پر جدید علم نفسیات کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

1626) کی تصانیف سے متاثر ہوا۔ اس کے دورِ متاخر کی تجربی نفسیات پر بے پناہ اثرات تھے۔ جان لاک (John Locke, d. 1704) کے 'An Essay Concerning Human Understanding, (1689)'، جارج برکلے[1] (George Berkeley, d. 1753) کے 'Treatise Concerning the Principles of Human Knowledge, (1710)'، ڈیوڈ ھیوم[2] (David Hume, d. 1776) کے A Treatise of Human Nature (1740)، ڈیوڈ ہرٹلے[3] (David Hartley, d. 1757) کی کتاب Observations on Man (1749)، جان سٹوارٹ مل[4] (John Stuart Mill, d. 1873) کی 'A System of Logic' (1843ء)، بروچ سپینوزا[5] (Baruch Spinoza, d. 1677) کی 'On the Improvement of the Understanding, (1662)'، لائبنیز (Leibniz, d. 1716) کی 'New Essays on Human Understanding, (1765)' علم کی اس شاخ کی پیشرو فاضلانہ کتابیں ہیں۔ ڈنمارک کے فلسفی سورن کیئر کگارڈ[6] (Soren Aabye Kierkegaard, d. 1855) نے بھی اپنی تصانیف 'The Concept of Anxiety (1844)' اور 'The Sickness Unto Death (1844)' کے ذریعے انسان شناسی، متعلق وجود اور جدید مکاتبِ نفسیات کو متاثر کیا۔

---

[1]۔ George Berkeley؛ جارج برکلے (1685ء - 1753ء) ایک آئرش فلاسفر تھا جسے نظریہ عدم مادیت (Immaterialism) کی ترقی کی بنا پر جانا جاتا ہے۔ نظریہ عدم مادیت کائنات کے بارے میں ایک نظریہ ہے جس کے مطابق اس دنیا میں کوئی بھی چیز مادی طور پر اپنا وجود نہیں رکھتی بلکہ تمام اشیاء ہمارے ذہنی خیالات ہیں۔

[2]۔ David Hume؛ ڈیوڈ ھیوم (1711ء-1776ء) ایک سکاٹش فلاسفر، تاریخ دان اور ماہر معاشیات تھا۔

[3]۔ David Hartley؛ ڈیوڈ ہرٹلے (1705ء - 1757ء) ایک انگریز فلاسفر اور Associationist school of psychology کے بانی تھے۔

[4]۔ John Stuart Mill؛ جان سٹوارٹ مل (1806ء۔1873ء) ایک برطانوی فلسفی تھا جس کے تصورِ آزادی نے 'فرد بمقابلہ لامحدود ریاستی کنٹرول' کا جواز پیش کیا۔

[5]۔ Baruch Spinoza؛ بروچ سپینوزا (1632ء-1677ء) ایک ممتاز ولندیزی فلسفی تھا۔

[6]۔ Soren Aabye Kierkegaard؛ سورن اے بی کیئر کگارڈر (1813ء-1855ء) ایک ڈنمارکی فلسفی، شاعر اور مذہبی مصنف تھے۔

کانٹ[1] (Kant, d. 1804) نے اپنی 'Metaphysical Foundations of Natural Science, (1786)' میں دعویٰ کیا کہ نفسیات شاید ایک باقاعدہ فطری سائنس نہیں بن پائے گی کیونکہ دیگر اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کے مشاہدات کا تعین نہیں کیا جا سکتا[2]۔ کانٹ (Kant, d. 1804) نے انسانی سوچ، احساس، خواہش اور عمل کی تجربی تحقیق کے لئے ایک متبادل تصور پیش کیا۔ اس کی تصنیف 'Anthropology from a Pragmatic Point of View (1798)' متعدد پہلوؤں سے ایک تجربی نفسیات کی طرح لگتی ہے۔ ارنسٹ ہینرخ ویبر[3] (Ernst Heinrich Weber, d. 1878) اور گستاف تھیوڈور فیکنر[4] (Gustar Theodor Fechner, d. 1887) نے خارجی تہیجات کی طبعی مقداروں اور ان سے واقع ہونے والی شدتوں (intensities) کے درمیان ریاضیاتی کیفیات کو ناپنے (measure) کی بھی کوشش کی تھی۔

'فزیالوجی' (Physiology) بشمول 'نیوروفزیالوجی' (Neurophysiology) پیشہ ورانہ مہارت کا علم ہے۔ انیسویں صدی عیسوی میں اس سے متعلق چندنئ دریافتیں ہوئیں جو چارلس بیل[5]

۱۔ Immanuel Kant؛ ایمانویل کانٹ (1724ء-1804ء) ایک جرمن فلسفی اور مشہور ترین مفکر تھا۔ کانٹ نے فلسفے کی دنیا میں انقلاب پیدا کیا۔ وقت کی حاکم قوتوں کے بارے میں سوال پیدا کیے۔ عقل اور آزادی کو اپنی سوچ کا محور قرار دیا۔ اسکے خیالات اب بھی مستقبل کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

۲۔ Thomes Strum; Is there a Problem with Mathematical Psychology? A fresh look at Kant,s old argument, Journal of History of Behavioural Sciences, 42 (2006), p. 353- 377.

۳۔ Ernst Heinrich Weber؛ ارنسٹ ہینرچ ویبر (1795ء-1878ء) ایک جرمن ڈاکٹر تھا جسے تجرباتی نفسیات کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

۴۔ Gustav Theodor Fechner؛ گستاف تھیوڈور فیکنر (1801ء-1835ء) ایک جرمن فلسفی، طبیب اور ماہر تجرباتی نفسیات تھا۔ اس کا شمار تجرباتی نفسیات کے بانیوں میں کیا جاتا ہے۔

۵۔ سر چارلس بیل؛ Sir Charles Bell (1774ء-1842ء) ایک سکاٹش سرجن، ماہر علم تشریح (anatomy)، ماہر علم فعلیات (physiologist)، ماہر علم اعصابیات (neurologist)، آرٹسٹ اور فلسفی تھا۔ اسے ریڑھ کی ہڈی میں حسی اعصاب (sensory nerves) اور حرکی اعصاب (motor nerves) کے درمیان فرق دریافت کرنے کی بنا پر بھی یاد کیا جاتا ہے۔

(Charles Bell, d. 1843)، فرینکوائیس میجنڈی[1] (Francois Magendie, d. 1855)، جوہانز ملر[2] (Johannes Muller, d. 1855)، ایمل ڈوبوائس ریمنڈ[3] (Emil du Bois-Reymond, d. 1896)، پائری پال بروکا[4] (Pierre Paul Broca, d. 1880)، کارل ورنیک[5] (Carl Wernicke, d. 1905)، گستاف فرٹش[6] (Gustav Theodor Fritsch, d. 1927)، ایڈورڈ ہٹزگ[7] (Eduard Hitzig, d. 1907)، ڈیوڈ فیریئر[8] (David Ferrier, d. 1928)، ہرمن ہیلمہولٹز[9] (Hermann Helmholtz, d. 1894) اور ویلہم وونٹ (Wilhelm Wundt, d. 1920) کے زیر اثر ہوئی تھیں۔ آخرالذکر نے

۱۔ Francois Magendie؛ فرینکوائیس میجنڈی (1783ء-1855ء) ایک فرانسیسی ماہر فزیالوجسٹ تھا جسے تجرباتی فزیالوجی کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

۲۔ Johannes Peter Muller؛ جوہانز پیٹر ملر (1801ء- 1858ء) ایک جرمن فزیالوجسٹ، comparative anatomist، ichthyologist اور Herpetologist تھے۔

۳۔ Emil du Bois-Reymond؛ ایمل ڈوبوائس ریمنڈ (1818ء-1896ء) ایک جرمن ڈاکٹر اور فزیالوجسٹ تھا جس نے nerve action potential دریافت کیا۔

۴۔ Pierre Paul Broca؛ پائری پال بروکا (1824ء-1880ء) ایک فرانسیسی ڈاکٹر، فزیالوجسٹ اور ماہر علم تشریح (anatomy) تھا۔

۵۔ Carl Wernicke؛ کارل ورنیک (1848ء-1905ء) ایک جرمن ڈاکٹر، ماہر علم تشریح (anatomy)، ماہر نفسیات اور ماہر اعصابی امراض (neuropathologist) تھا۔

۶۔ Gustav Theodor Fritsch؛ گستاف تھیوڈور فرٹش (1838ء- 1927ء) ایک جرمن ماہر علم تشریح الابدان (anatomy)، ماہر عمرانیات، سیاح اور ماہر طبیعات (physiologis) تھا۔

۷۔ Eduard Hitzig؛ ایڈورڈ ہٹزگ (1838ء- 1907ء) ایک جرمن ماہر علم اعصابیات (neurologist) ماہر اعصابی نفسیات (Neuropsychiatry) تھا۔

۸۔ Sir David Ferrier؛ سر ڈیوڈ فریئر (1843ء- 1928ء) ایک سکاٹش ماہر نفسیات اور ہر علم اعصابیات (neurologist) تھا۔

۹۔ Hermann Ludwig Ferdinand von Helmholtz؛ ہرمن لوڈویگ فرڈیننڈ وون ہیلمہولٹز (1821ء-1894ء) ایک جرمن ڈاکٹر اور طبیعیات دان تھا جس نے کئی سائنسی شعبوں میں کام کیا۔

اپنی تاریخی کتاب Grundzuge der physiologischen Psychologie (Principles of Physiological Psychology) 1874میں لکھی اور 1879ء میں ایک لیبارٹری کی بنیاد بھی رکھی جس کا مقصد 'Original Research in Experimental Psychology' تھا۔

سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud, d. 1939) نے مریضوں کے غیر شعوری اور فرضی عقائد وخواہشات کو بے نقاب کرنے اور خوابوں کی تعبیر کرنے کے طریقے وضع کئے۔اس کا خیال تھا کہ اس کے مریضوں کے اعصابی نظام میں گڑبڑ اور جذباتی ہیجانات (hysteria) کا اصل سبب یہی ہیں۔اس نے اس طریق کار کو تحلیل نفسی (psychoanalysis) کا نام دیا۔اور ایک فرد کے جنسی ارتقاء کے سفر، اس کے خفیہ ایجنڈے، بری خواہشات اور احساساتِ جرم کی نوعیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یہ چیزیں کسی فرد کی شخصیت اور اس کے رویئے کے بعض پہلوؤں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔کارل گستاف یونگ[1] (Carl Gustav Jung, d. 1961)،فرائڈ (Freud, d. 1939) کا رفیق کار تھا۔اس نے بعد میں اسے اس بنا پر چھوڑ دیا کہ وہ جنسیت (sexuality) پر بہت زیادہ زور دیتا تھا۔ اس نے 'لاشعور' (unconscious) کے تصورات پر غور کرنا شروع کیا اور ذہن کے اُن کاموں کی تصریح کی۔ جو 'انا' (Ego) سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کی وضاحت کرتے ہیں۔ یہ ہیں: شعورِ ذات (Conscious self)، احساس (Sensation)،قوتِ لامسہ (Feeling)، ذہانت (Intellect) اور وجدان (Intuition)۔ یونگ ایک تجربی نفسیات پر اصرار کرتا تھا۔جس میں نظریات کا حقائق پر مبنی ہونا ضروری تھا نہ کہ نفسیات دان کے مفروضات یا توقعات پر۔

ولیم جیمز (William James, d. 1910) نے 1875ء میں ہارورڈ یونیورسٹی (Harvard University) میں ایک چھوٹی سی تجرباتی نفسیات کی لیبارٹری قائم کی جبکہ اس نے 1878ء میں ایک کتاب 'The Senses and the Brain and their Relations to

[1]۔Carl Gustav Jung کارل گستاف یونگ (1875ء - 1961ء) ایک سوئس ماہر نفسیات تھا جس نے تجزیاتی نفسیات کی بنیاد رکھی۔

Thoughts' لکھی جس میں اس نے یہ استدال پیش کیا کہ شعور کوئی ضمنی علامت نہیں بلکہ ایک ارتقائی عمل ہے ورنہ اس نے طبعاً انسانوں کے اندر پیدا ہونے کو منتخب نہیں کرنا تھا۔ اس کی دوسری کتاب 'The Varieties of Religious Experiences' بعد میں شائع ہوئی تھی۔ بعدازاں جلد ہی کئی یونیورسٹیوں میں تجرباتی نفسیات (experimental psychology) کی لیبارٹریاں کھل گئیں۔ 1890ء میں ولیم جیمز (William James, d. 1910) کی 'The Principles of Psychology' بالآخر شائع ہوگئی۔ جس نے بہت سے ایسے سوالوں کے جوابات کی بنیادیں استوار کر دیں جن پر امریکی ماہرین نفسیات نے آنے والے برسوں میں توجہ مرکوز رکھنا تھی۔

جان ڈیوی[1] (John Dewey, d. 1952)، جیمز ہیڈن ٹفٹس[2] (James Hayden Tufts, d. 1942)، جارج ہربرٹ میڈ[3] (George Herbert Mead, d. 1931) اور جیمز رولینڈ اینجل[4] (James Rowland Angell, d. 1949) نے علم نفسیات کی تشکیلِ نو کرنا شروع کی۔ جس میں معاشرتی ماحول اور ذہن کی فعالیت اور رویے پر بہت زیادہ توجہ دی گئی جبکہ پہلے 'وونٹ' (Wundt, d. 1920) کی نفسی طبیعیات (psychophysics) سے متاثرہ فعلیاتی نفسیات (psychophysics) پر انحصار کیا جاتا تھا۔ پھر انہوں نے مل کر شکاگو سکول آف سائیکالوجی کی بنیاد رکھی۔ 1892ء میں امریکن سائیکالوجیکل ایسوسی ایشن قائم ہو گئی جس سے ساختیت (Structuralism) اور فعلیت (Functionalism) کی صورت گری ہوئی۔ فرانس میں نفسیات کو بنیادی تقویت علم الامراض ذہنی (Psychopathology) کے شعبے سے ملی جبکہ برطانیہ میں پہلا علمی رسالہ جو نفسیات کے موضوع کے لئے مخصوص کیا گیا اس کی بنیاد 1876ء میں ڈالی گئی۔ اس کا عنوان ذہن

---

[1] John Dewey؛ جان ڈیوی (1859ء-1952ء) ایک امریکی فلسفی، ماہر نفسیات، تعلیمی اور سماجی اصلاح کار تھا۔

[2] James Hayden Tufts؛ جیمز ہیڈن ٹفٹس (1862ء-1942ء) ایک بااثر امریکی فلسفی اور شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر تھا۔

[3] George Herbert Mead؛ جارج ہربرٹ میڈ (1863ء-1931ء) ایک امریکی فلسفی، ماہر سماجیات، ماہر نفسیات اور شکاگو یونیورسٹی کے پروفیسر تھا۔

[4] James Rowland Angell؛ جیمز رولینڈ اینجل (1869ء-1949ء) ایک امریکی ماہر نفسیات اور استاد تھا۔

(Mind) تھا۔ 'کرداریت' (Behaviourism) بیسویں صدی عیسوی میں نفسیات میں تحقیق کے لئے ایک مائل بہ عروج تجرباتی ماڈل تھا۔ اس کے زیادہ تر اسباب ایسے مشروط نظریات کی تخلیق اور ان کا کامیاب اطلاق تھا جنہیں انسانی رویئے کے لئے سائنسی ماڈل بنایا گیا تھا۔ تاہم نوم چومسکی[1] (Noam Chomsky) کا دعویٰ تھا کہ زبان محض عملی مشروطیت (operant conditioning) سے نہیں سیکھی جاسکتی۔ عوام فقروں کی بے شمار اقسام وضع کرسکتے ہیں جن کی اپنی اپنی ساخت اور اپنے اپنے معنی ہوسکتے ہیں اور یہ محض فطری زبان کے تجربے سے پیدا نہیں ہوتے۔ لہٰذا یقیناً کچھ داخلی ذہنی ساختیں اور دماغ کی حالتیں ہوتی ہیں جنہیں 'کرداریت' (Behaviourism) نے خیالی قرار دے کر مسترد کردیا ہے۔

یہ ایک مختصر جائزہ ہے کہ جدید دنیا میں نفسیات کو کیسے ترقی حاصل ہوئی اور مسلمانوں نے اس سلسلے میں کیا خدمات انجام دیں؟ جواب یہ ہے کہ کچھ بھی نہیں۔

(4)۔ عمرانیات (Sociology)

عمرانیات یا 'سوشیالوجی' معاشرے اور بنی نوع انسان کے طرزِ عمل کا ایک باضابطہ مطالعہ ہے۔ لفظ 'Socio' لاطینی لفظ 'Socius' بمعنی 'ساتھی' یا عمومی طور پر معاشرہ سے لیا گیا ہے اور اس کا لاحقہ 'logy' یونانی ماخذ (Logos) سے ہے جس کے معنی ہیں 'کا مطالعہ'۔

آگسٹ کومٹے (Auguste Comte, d. 1857) کو عموماً بابائے سوشیالوجی سمجھا جاتا ہے تاہم اس شاخِ علم کی باضابطہ تشکیل ایمل دُرکائیم[2] (Emile Durkheim, d. 1917) نے کی۔ جس کے لئے اس نے 1915ء میں یونیورسٹی آف بورڈو (University of Bordeaux, France) میں اولین یورپین ڈیپارٹمنٹ آف سوشیالوجی قائم کیا اور قواعدِ عمرانیات شائع کئے۔ درکائیم (Durkheim, d. 1917) کی کتاب 'Suicide' (1897ء) نے عمرانیاتی تجزیئے کو نفسیات یا

---

[1]۔ Noam Chomsky؛ نوم چومسکی (1928ء-حیات) ایک یہودی امریکی ماہر لسانیات، فلسفی، مؤرخ، سیاسی مصنف اور لیکچرر ہے۔

[2]۔ David Emile Durkheim؛ ڈیوڈ ایمل درکائیم (1858ء-1917ء) ایک فرانسیسی ماہر سماجیات تھا جس کا نام جدید علم سماجیات کے معمار کارل مارکس (Karl Marx) اور میکس ویبر (Max Weber) کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

فلسفے سے ممیز کیا۔ آج 'درکائیم (Durkheim, d. 1917)، مارکس (Karl Marx, d. 1883) اور میکس ویبر[1] (Max Weber, d. 1920) کا 'سائنس آف سوسائٹی' کے مفہوم میں معاشرتی علم کے تین بڑے معماروں میں ذکر آتا ہے۔ کارل مارکس (Karl Marx, d. 1883) نے آگسٹ کومٹے (Auguste Comte, d. 1857) کی اثباتیت[2] (Positivism) کو مسترد کیا ہے تاہم وہ سائنس آف سوسائٹی کو تاریخی مادیت پر تعمیر کرتا تھا۔ میکس ویبر (Max Weber, d. 1920) اور جیورگ سمل[3] (Georg Simmel, d. 1918) نے 'سوشیالوجیکل اینٹی پازیٹوازم' (sociological anti-positivism) کو فروغ دے کر معاشرتی فکر کے تین طریق ہائے عمل کو مدغم کیا بالخصوص درکائیمین اثباتیت (Durkheimian positivism) اور ساختیاتی فعلیت (Structural functionalism)، مارکس کی تاریخی مادیت (Marxist historical materialism) اور نظریۂ آویزش (conflict theory) اور ویبر کی ضدِ اثباتیت (Weberian antipositivism) اور ورسٹیہن تجزیہ (Verstehen analysis)۔ 1920ء کے عشرے میں شکاگو سکول نے علامتی باہمی تعلقات (Symbolic interactionism) وضع کی اور فرینکفرٹ سکول نے مارکس (Marx, d. 1883)، فرائڈ (Freud, d. 1939) اور نطشے (Nietzsche, d. 1900) کے افکار پر مبنی تنقیدی نظریہ پیش کر دیا۔ عمرانیات جدیدیت مثلاً صنعتی ارتقاء، شہری آبادیوں پر پڑنے والے دباؤ، لادینیت اور بڑھتے ہوئے سلسلۂ توجیہات کے چیلنجز کے علمی ردِعمل کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ مسلمانوں میں سے صرف ابن خلدون (d. 1406) نے عمرانیات پر قابل قدر کام کیا۔

---

[1]۔ Maximilian Carl Emil Weber: کارل ایمیل میکس میلین ویبر (1864ء-1920ء) ایک جرمن فلسفی، ماہر معاشیات اور جدید معاشریات کے بانیوں میں سے ہے۔ اس کے خیالات اور نظریات نے جدید علم معاشرت پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ عموماً میکس ویبر کا نام ایمیل درکائیم (Emile Durkheim) اور کارل مارکس (Karl Marx) کے ساتھ جدید علم معاشرت کے تین بانیوں میں سے ایک کی حیثیت سے لیا جاتا ہے۔

[2]۔ Positivism: مثبتیت یا اثباتیت ایک ایسا فلسفہ ہے جس کے مطابق صرف واقعی علم (Positive Science) کو اصلی علم سمجھا جا سکتا ہے اور وہی علم جو سائنسی طریقہ (Scientific Method) سے حاصل ہو قبول ہو سکتا ہے۔

[3]۔ Georg Simmel: جارج سمل (1858ء-1918ء) ایک جرمن فلاسفر، ماہر سماجیات اور نقاد تھا۔

(5)۔ معاشیات(Economics)

مغرب میں اقتصادیات/ معاشیات علم کی کوئی علیحدہ شاخ نہیں تھی بلکہ یہ صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) تک فلسفے کا ایک حصہ رہی۔ تاہم اقتصادی یا معاشی فکر کی تاریخ قدیم یونانی فلسفیوں سے ماخوذ ہے۔ افلاطون (Plato, d. 347 BC) کے مکالمے (The Republic) میں ایک مثالی شہری ریاست کا تصور دیا گیا ہے۔ جس کا انتظام وانصرام فلسفی بادشاہوں کے ہاتھوں میں تھا۔ اس کتاب میں کارکنوں اور پیداوار کے شعبوں کی تخصیص کی گئی ہے۔ افلاطون (Plato, d. 347 BC) پہلا مفکر تھا جس نے پیسے کا نظریۂ قرض (Credit theory of money) بیان کیا۔ اس نے ایسے معاشرے کے قیام پر بھی زور دیا، جس میں تمام وسائل مشترکہ ملکیت میں ہوں۔ ارسطو (Aristotle, d. 322BC) نے اپنی کتاب'Politics'(350 قبل مسیح) میں طبقۂ امراء کی چندسری حکومت (Oligarchy) کا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ وسائل کی مشترکہ ملکیت طبقۂ امراء کی ایک لعنت (anathema) ہے۔ لہٰذا یہ بہت بہتر ہوگا کہ ساری جائیداد نجی (private) ہو مگر اس کا استعمال عام ہو۔ قانون سازوں کو خصوصی اقدام کے طور پر مردوں میں فیض رسانی (benevolent disposition) کا مزاج پیدا کرنا چاہیے۔ ارسطو (Aristotle, d. 322BC) سود کو سخت ناپسند کرتا اور کہتا تھا کہ اجارہ داری (monopoly) کے ذریعے دولت کمانا ایک ڈھلائی ہوئی تحقیر (cast scorn) ہے۔

ٹامس ایکوناس (Thomas Aquinas, d. 1274) ایک اطالوی ماہر دینیات (theologian) اور معاشیات نویس تھا۔ اس نے اپنے مقالہ'Summa Theologica' میں منصفانہ قیمتوں کے تصور پر روشنی ڈالی۔ ڈنس سکاٹس[1] (Duns Scotus, d. 1308) نے اپنی کتاب 'Sententiae' میں محنت کشوں کی مزدوری، اخراجات اور منصفانہ قیمتوں کے تعین میں عوام کے کردار پر اظہار خیال کیا۔ ژان بوریدان (Jean Buridanus, d. 1363) کا استدلال تھا کہ مارکیٹ پرائس (market price) کا تعین مجموعی، نہ کہ انفرادی مانگ اور رسد کرتی ہیں۔ نکول ارسمہ (Nicole

---

[1]۔ Duns Scotus؛ ڈنس سکاٹس (1266ء-1308ء) زمانہ وسطیٰ کے دینیاتی فلسفہ کے تین ماہرین میں سے ایک تھا جس نے کیتھولک چرچ اور سیکولر سوچ دونوں کو متاثر کیا۔

Oresmius, d. 1382) نے دولت کے ماخذ، نوعیت، قانون اور تبدیلیوں سے متعلق لکھا۔ 'سینٹ اینٹونائن آف فلورنس' (St. Atonine of Florence, d. 1459) نے اپنی کتاب 'Summa Theologica' میں لکھا کہ تجارتی معاملات میں مداخلت کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے کیونکہ وہ اجتماعی مفاد کے لئے کام کرتی ہے۔ غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد اس کی ذمہ داری ہے۔

کولمبس (Columbus, d. 1506) اور دیگر مہم جوؤں نے نئی دنیا اور ایشیا کے ساتھ تجارت کے لئے نئے نئے راستے کھولے۔ جس سے تجارت کو فروغ ملا۔ نئی دولت ہاتھ آنے سے بادشاہوں کو زیادہ طاقتور فوجی ریاست بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی تا کہ وہ 'تجارتی نظریۂ زر'[1] (Mercantilism) کے تحت اپنی حیثیت کو زیادہ سے زیادہ بڑھا سکیں۔ یہ بادشاہ ریاست کی فوجی قوت استعمال کر کے اس امر کی ضمانت حاصل کرنا چاہتے تھے کہ مقامی مارکیٹوں اور رسد کے ذرائع کو ان محاصل کے ذریعے تحفظ ملے تا کہ برآمدات (Export) کی حوصلہ افزائی اور درآمدات (Import) کی حوصلہ شکنی ہو۔ بہ الفاظ دیگر فاضل برآمدات (Export) کے ذریعے ایک مثبت تجارتی توازن قائم ہونا چاہیے۔ جسے اکثر فوجی قوت کی پشت پناہی حاصل ہوتی تھی۔

ٹامس مور[2] (Thomas More, d. 1535) نے اپنی کتاب 'Utopia' میں ایک مثالی معاشرے کا نقشہ پیش کیا۔ جس میں زمین سب کی مشترکہ ملکیت ہے۔ تعلیم ہمہ گیر اور مذہبی رواداری عام ہے۔ اس کتاب نے قانون امدادِ غربا[3] (English Poor Laws) کا جذبہ ابھارا اور کمیونزم

---

[1]۔ اس ماڈل کے مروج ہونے کے باوجود تجارتی نظریۂ زر (Mercantilism) کی اصطلاح 1763ء تک وضع نہیں ہوئی تھی۔ یہ وکٹر میرابیو (Victor Mirabeau, d. 1789) نے استعمال کی اور اسے ایڈم سمتھ (Adam Smith, d. 1790) نے 1776ء میں پھیلایا اور اس کی مخالفت کی۔

[2]۔ Sir Thomas More؛ سر ٹامس مور (1478ء-1535ء) ایک انگریز وکیل، سماجی فلسفی، مصنف اور نشاط ثانیہ کا معروف انسان دوست تھا جسے کیتھولک کلیسا نے اعزازی طور پر سینٹ ٹامس مور کا خطاب بھی دیا تھا۔

[3]۔ English Poor Laws ناداروں کی امداد کا ایک نظام تھا جو انگلینڈ (England) اور ویلز (Wales) میں چلا آ رہا تھا۔ یہ عہد متوسط کے اواخر میں اور ٹیوڈروں (Tudor) کے زمانے میں شروع ہوا اور اسے 98-1587ء میں قانونی شکل ملی۔ 'پوٗر لاء سسٹم' (poor law system) دوسری جنگ عظیم کے بعد جدید فلاحی ریاست کے ظہور تک موجود رہا۔ یہ National Assistance Act 1948 تک رسماً منسوخ نہیں ہوا تھا۔ اس قانون کے بعض اجزا 1967ء تک کتابوں میں موجود رہے۔

(Communism) اور سوشلزم (Socialism) کی تحریک کو تقویت پہنچائی۔ کاپرنیکس (Copernicus, d. 1543) نے 'مقداری نظریہ دولت' اور 'قانونِ گریشم' (بُری دولت اچھی دولت کو دفع کر دیتی ہے) سے متعلق پہلی معروف دلیل پر مبنی کتاب شائع کی۔ ژان بودن[1] (Jean Bodin) نے 'Reply to Malestroit' شائع کی۔ جس میں اس نے افراطِ زر (inflation) کا تجزیہ کیا اور اس کے بارے میں دعویٰ کیا کہ یہ جنوبی امریکہ سے سونا اور چاندی درآمد (import) کرنے کا نتیجہ ہے۔ اس کے ذریعے اس نے مقداری نظریۂ دولت کی تائید کی۔ لیونارڈس لیمیئس (Leonardus Lessius, d. 1623) نے 'On Justice and Law' شائع کی جس میں اس نے کہا کہ انشورنس کی قیمت خطرے پر مبنی ہوتی ہے۔

1622ء میں ایڈورڈ مسیلڈن[2] (Edward Misselden, d. 1654) اور جیرارڈ میلینس[3] (Gerard de Malynes, d. 1641) نے غیر ملکی تبادلے (exchange) کے بارے میں جبکہ ٹامس من[4] (Thomas Mun, d. 1641) نے بیان کیا کہ تجارت دولت بڑھانے کا واحد طریقہ ہے۔ اس سلسلے میں اس نے متعدد طریق ہائے کار پر روشنی ڈالی۔ ولیم پیٹی[5] (William Petty, d. 1687) نے اقتصادیات پر فرانسس بیکن (Francis Bacon, d. 1626) کے استدلال پر سائنسی روایت کا اطلاق کیا جو صرف قابل پیمائش مظاہر کو استعمال کرنے اور مقدار کے ٹھیک اور

---

[1] Jean Bodin؛ ژان بودن (1530ء-1596ء) ایک فرانسیسی قانون دان، سیاسی فلسفی پیرس کی پارلیمنٹ کا رکن اور قانون کا پروفیسر تھا۔

[2] Edward Misselden؛ ایڈورڈ مسیلڈن (1608ء- 1654ء) ایک انگریز تاجر تھا جو Mercantilist group of economic thought گروپ کا ممبر تھا۔

[3] Gerard de Malynes؛ جیرارڈ میلینس (1585ء- 1641ء) غیر ملکی تجارت میں ایک آزاد تاجر، ہسپانوی نیدرلینڈ کا انگریز کمشنر اور تجارتی معاملات پر حکومتی مشیر تھا۔

[4] Sir Thomas Mun؛ سر ٹامس من (1571ء-1641ء) ایک انگریز مصنف برائے معیشت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائریکٹر تھا۔

[5] Sir William Petty؛ سر ولیم پیٹی (1620ء- 1687ء) ایک انگریز ماہر معاشیات، سائنسدان، فلاسفر، مؤجد، برطانیہ کی پارلیمنٹ کا رکن اور رائل سوسائٹی کا چارٹر ممبر تھا۔

صحیح ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس طرح اس کو اولین سائنٹیفک اکانومسٹ (scientific economist) ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ رچرڈ کینٹیلین[1] (Richard Cantillon, d. 1734) نے اپنے 'Essay on the Nature of Commerce in General' میں دلیل دی کہ ایک آزادانہ تصحیح وترمیم پر مبنی منڈیوں کا نظام، متناسب منافع، نظم وضبط کا قیام اور باہمی طور پر قابل قبول قیمتوں کے تعین میں مددگار رہے گا۔

جان لاک (John Locke, d. 1704) نے اپنے دوسرے مقالے Second Treatise On Civil Government میں کہا کہ حکومت کو نہ صرف عوام کی املاک میں مداخلت سے گریز کرنا چاہیے بلکہ اسے مثبت انداز میں ان کے تحفظ کی ضمانت دینے کا بھی بندوبست کرنا چاہیے (باب 5، دفعات 26۔27)۔ ڈیوڈ ھیوم (David Hume, d. 1776) نے اپنی کتاب 'Essays: Moral, Political and Literary' میں زراندوزانہ مفروضات کی مذمت کرتے ہوئے اس دلیل میں یہ بات شامل کی کہ تجارتی توازن کو موافق بنانے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرنا ناپسندیدہ بات ہے۔ 'فرینسوا کوئز'[2] (Francois Quesnay, d. 1774) نے اس یقین کا اظہار کیا کہ تجارت اور صنعت دولت کے ماخذ نہیں بلکہ فاضل زرعی پیداواریں ہیں جو کرایوں، اجرتوں اور خریداریوں کی صورت میں معیشت کے اندر رواں دواں ہیں، وہی حقیقی اقتصادی محرک ہوتی ہیں۔

1776ء میں ایڈم سمتھ (Adam Smith, d. 1790) نے 'An Inquiry into the Nature and Causes of the Wealth of Nations' لکھی جس میں اس نے فطری آزادی کے ایک نظام کے قیام کے لئے کہا۔ جس میں ایک فرد معاشرے کے لئے مفید اشیاء کی تخلیق کرتا

---

[1]۔ Richard Cantillon؛ رچرڈ کینٹیلین (1680ء-1734ء) ایک فرانسیسی ماہر معیشت اور مصنف تھا جسے اس کی کتاب

Essai sur la Nature du Commerce en General (Essay on the Nature of Trade in General)

پہچانا جاتا ہے۔

[2]۔ Francois Quesnay؛ فرینسوا کوئز (1694ء-1774ء) ایک فرانسیسی ماہر معیشت اور ڈاکٹر تھا۔

ہے۔حتیٰ کہ معاشرے کے اندر رہنے والا خودغرض شخص بھی، جب ایک مسابقتی مارکیٹ میں پابندیوں کے تحت کام کررہا ہو، سب کی بھلائی کا کام کررہا ہوتا ہے۔اس کا تصورِ آزاد معیشت، محفوظ املاک، سرمائے کی فراہمی، مارکیٹ کی توسیع اور تقسیم، محنت پر مبنی ہوتا ہے۔اس تاجرانہ نظریۂ زر کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ جبکہ نظریہ زراندوزی تمام شر پسندانہ انسانی کارروائیوں کو منظم کرانے کی کوشش کرتا ہے۔سمتھ (Adam Smith, d. 1790) کے استدلال کے مطابق اتحاد تجار ناپسندیدہ ہوتے ہیں کیونکہ ان میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ اشیا اور خدمات کے معیار اور ان کی پیداوار کی مقدار کو محدود کرلیں۔اس نے اجارہ داری کی حمایت کے لئے ہر قسم کی سرکاری مدد کی مخالفت کی اور کہا کہ غیر مرئی ہاتھ کو بے قید معیشت کے اصولوں پر مبنی اقتصادی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔

جیریمی بینتھم[1] (Jeremy Bentham, d. 1832) نے اقتصادیات میں تصورِ افادیت کا اضافہ کیا۔ ڈیوڈ ریکارڈو[2] (David Recardo, d. 1823) نے اپنی کتاب 'On the Principles of Political Economy and Taxation' میں بین الاقوامی تجارت کی راہ میں رکاوٹوں پر تنقید کرتے ہوئے وہ طریقہ بتایا جس سے آمدنی کو آبادی کے اندر تقسیم کیا جاتا ہے۔اس نے کارکنوں، مالکانِ زمین اور سرمایہ داروں کے درمیان فرق واضح کیا اور کہا کہ کارکن وہ ہوتے ہیں جو ایک سطح پر ایک مقررہ اجرت پاتے ہیں، جس پر وہ زندہ رہ سکتے ہیں۔مالکانِ زمین جو ایک کرایہ کماتے ہیں اور سرمایہ دار جو سرمائے کے مالک ہوتے ہیں اور ایک منافع کماتے ہیں جو کہ آمدنی کا باقی ماندہ حصہ ہوتا ہے۔اس نے زراعت کی پیداوار میں کمی کے اصول کی بھی وضاحت کی۔1848ء میں جان سٹوارٹ مل (John Stuart Mill, d. 1873) نے 'Principles of Political Economy'

---

[1] Jeremy Bentham؛ جیریمی بینتھم (1748ء-1832ء) ایک برطانوی فلسفی، قانون دان اور سماجی اصلاح کار تھا۔اسے جدید افادیت پسندی کا بانی سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس نے اس بنیادی مقولے کا نہایت موثر طریقے سے اظہار کیا تھا کہ صحیح اور غلط کا صحیح معیار یہ ہے کہ 'زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ خوشی نصیب' ہونی چاہیے۔بینتھم کو برطانوی وامریکی فلسفۂ قانون کا ممتاز نظریہ ساز تسلیم کیا گیا اور اس نے فلاح پسندی کے ارتقاء کو بہت متاثر کیا تھا۔

[2] David Ricardo؛ ڈیوڈ ریکارڈو (1772ء-1823ء) برطانوی ماہر معاشیات تھا۔

لکھی جو متعدد یونیورسٹیوں میں بطور نصابی کتاب پڑھائی جاتی رہی۔ جان سٹوارٹ مل (John Stuart Mill, d. 1873) نے تجارت اور فنیاتی ایجادات (technological innovation) کے مسلسل بڑھتے ہوئے مواقع سے متعلق ایڈم سمتھ (Adam Smith, d. 1790) کے نظریئے اور آبادی کی فطری تحدید سے متعلق ٹامس مالتھس[1] (Thomas Malthus, d. 1834) کے نظریئے کا درمیانی میدان تلاش کرنے کی کوشش کی۔

کارل مارکس (Karl Marx, d. 1883) نے متذکرہ بالا ماہرین اقتصادیات کو قدیمی ماہرین معیشت قرار دیتے ہوئے ان کے نظریات کو نظام سرمایہ داری کا نام دیا اور سوشلزم کو ایک متبادل راستے کے طور پر پیش کیا۔ اقتصادی اور سیاسی نظریہ جو 'دی کمیونسٹ مینی فسٹو' (The Communist Manifesto) اور 'داس کیپٹل' (Das Kapital) میں پیش کیا۔ اس میں اس نے انیسویں صدی عیسوی کے نظام سرمایہ داری کا انقلابی نظریہ فراہم کیا۔ 1844ء میں فریڈرک اینجلز[2] (Friedrich Engels, d. 1895) نے 'Conditions of the Working Class in England' شائع کی جس میں مانچسٹر کے محنت کشوں کو 'ہمارے دور کی معاشرتی بدحالی کی انتہائی غیر پوشیدہ حالت' کے طور پر پیش کیا۔

مارکس (Marx, d. 1883) نے 'دی کمیونسٹ مینی فیسٹو' (The Communist Manifesto) میں لکھا کہ اب تک سارے موجود معاشرے کی تاریخ طبقاتی جنگوں کی تاریخ ہے۔ آزاد

---

[1] Thomas Robert Malthus؛ ٹامس رابرٹ مالتھس (1766ء-1834ء) معروف برطانوی ماہر معاشیات تھا۔ اس نے آبادی کے لیے اپنا مشہور نظریہ پیش کیا۔ اس کے مطابق جلد یا بدیر قدرت حرکت میں آتی ہے، تباہی اور زلزلوں کے ذریعے آبادی پھر سے وسائل کے مطابق ہو جاتی ہے۔

[2] Friedrich Engels؛ فریڈرک اینگلز (1820ء-1895ء) جرمنی کا انقلابی مفکر تھا جس نے کارل مارکس (Karl Marx) کے ساتھ مل کر سائنسی سوشلزم کی بنیاد رکھی۔ اس نے 1845ء سے 1850ء تک جرمنی، فرانس، اور بیلجیم میں انقلابی تحریکیں چلائیں اور مارکس کے ساتھ مل کر کئی کتابیں لکھیں۔ جن میں کمیونسٹ مینی فسٹو (1848ء) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اینگلز نے مارکس کی وفات کے بعد اس کی مشہور تصنیف سرمایہ (Das Kapital) کی دوسری اور تیسری جلدیں اس کی یاداشتوں کی مدد سے مرتب کیں۔

آدمی اور غلام، دولت منداور نادار، جاگیرداراور مزارعہ، سرداراور پیادہ، مختصراً، ظالم اور مظلوم ایک دوسرے کے خلاف پیہم برسرِ پیکار رہے۔ جدید بورژوا معاشرے (bourgeois society) نے پرانے طریقوں کی بجائے نئے طبقوں اور نئے حالاتِ جبر کو جنم دے دیا ہے۔ مارکس (Marx, d. 1883) نے یہ سوال کر کے محنت کے لحاظ سے قیمت کے تعین کے نظریئے کو سر کے بل کھڑا کر دیا کہ خود مزدور (کام کرنے والے لوگوں) کو وجود میں لانے کے لئے سماجی طور پر لازماً درکار وقت کتنا ہوتا ہے۔ مارکس (Marx, d. 1883) اس کا یہ جواب دیتا ہے کہ یہ لوگوں کے لئے قلیل ترین مقدار ہے جس کے اندر رہ کر وہ گزارا کرتے ہیں اور معیشت کو رواں کرنے کے لیے مطلوب ہنر وجود میں لاتے ہیں۔ اس کے بعد اس طرح سے لوگوں کو پیداوار کے ثمر سے اور ان ذرائع سے بھی بیگانہ کر دیا جاتا ہے۔ جن سے وہ اپنی قوتِ امکانی (potential) کو بڑھا سکیں اور خود کو نفسیاتی طور پر بحال کر سکیں۔ ان کے ساتھ یہ ناانصافی لیبر مارکیٹ میں انہیں تابع و محکوم رکھ کر کی جاتی ہے۔

آجر اپنے کارکنوں پر جبر کر کے ان سے زیادہ سے زیادہ محنت کراتے ہیں۔ ایسی مشینری بنانے پر سرمایہ کاری کرتے ہیں جن میں مزدور کی ضرورت نہ رہے۔ اپنا منافع بڑھاتے اور پیداوار کو پھیلاتے چلے جاتے ہیں مگر صرف ان لوگوں کو فائدہ پہنچاتے ہیں جو ان ذرائع پیداوار کے اندر نجی ملکیت رکھتے ہیں۔ محنت کش طبقے اس دوران رفتہ رفتہ خستہ حالی سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ جب بے روزگاروں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے تو ان کی ریزروفوج بھی مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ بے روزگاری، مانگ (demand) میں کمی لانا شروع کر دیتی ہے کیونکہ عوام کی اشیاء خریدنے کی سکت (purchasing power) پیچھے رہ جاتی ہے اور فروخت نہ ہو سکنے والی اشیاء کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ اقتصادی کساد بازاری (economic depression) کی صورت میں نکلتا ہے۔ منڈیوں میں ضرورت سے زیادہ بھرے ہوئے مال کی نکاسی ہو جائے تو نئے مال کی آمد کا چکر شروع ہونے سے پہلے معیشت پھر سے برسنا گرجنا شروع کر دے گی۔ مارکس (Marx, d. 1883) کا خیال تھا کہ ہر اتار چڑھاؤ کے ساتھ سرمایہ داروں اور کارکنوں کے دو برعکس رجحانات کے درمیان کشیدگی اور چپقلش میں شدت بڑھتی چلی جائے گی بالآخر مارکس (Marx, d. 1883) کی خیالی تصویر کے مطابق کمیونسٹ پارٹی کی زیر قیادت ایک انقلاب آ

جائے گا اور اس کے نتیجے میں غیر طبقاتی معاشرہ تخلیق ہو جائے گا۔

مارکس (Marx, d. 1883) نے معیشت دانوں میں ایک رجحان پیدا کرنا شروع کر دیا جو عملی اقدام کے قائل ہو گئے۔ ان میں روزا لکسمبرگ[۱] (Rosa Luxemburg, d. 1919)، مارٹا بیٹریس ویب[۲] (Martha Beatrice Webb, d. 1943) اور سڈنی ویب[۳] (Sidney Webb, d. 1947) شامل تھے۔ جنہوں نے فیبین سوسائٹی (Fabian Society) کی بنیاد ڈالی اور لندن سکول آف اکنامکس قائم کیا۔

الفریڈ مارشل[۴] (Alfred Marshall, d. 1924) یونیورسٹی آف کیمبرج کا پہلا پروفیسر تھا جس نے 'Principles of Economics' لکھی۔ یہ اس وقت رائج جان سٹوارٹ مل (John Stuart Mill, d. 1873) کی 'Principles of Political Economy' کی نصابی کتاب کی متبادل تسلیم کر لی گئی۔ اس کتاب میں مارشل (Marshall, d. 1924) نے 'پولیٹیکل اکانومی' (political economy) کی اصطلاح ترک کر کے اپنی 'Economics' کی اصطلاح استعمال کرنا شروع کر دی۔ آج کل اس مضمون کے لئے یہی اصطلاح مروّج ہے۔

۱۔ Rosa Luxemburg؛ روزا لکسمبرگ (1871ء - 1919ء) ایک فلسفی، ماہر معاشیات، پولینڈ اور لیتھویانا (Lithuania) کی سماجی جمہوریت پارٹی، جرمن سماجی وجمہوری پارٹی، جرمنی کی سماج وجمہور پارٹی اور جرمنی کی کیمونسٹ پارٹی کی رکن اور پولینڈ کی یہودی تحریکوں کی کارکن تھی۔ لکسمبرگ، کارل مارکس (Karl Marx) کے نظریہ سے متاثر تھیں۔

۲۔ Martha Beatrice Webb؛ مارٹا بیٹرس ویب (1858ء -1943ء) ایک انگریز ماہر سماجیات، اقتصادیات، سوشلسٹ، مزدوروں کی مؤرخ، سماجی اصلاح کار اور لندن سکول آف اکنامکس کی بانی تھی۔ اس نے فیبین سوسائٹی بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

۳۔ Sidney James Webb؛ سڈنی جیمز ویب (1859ء -1947ء) ایک برطانوی سوشلسٹ، ماہر اقتصادیات، سماجی اصلاح کار اور لندن سکول آف اکنامکس کا شریک بانی تھا۔

۴۔ Alfred Marshall؛ الفریڈ مارشل (1842ء - 1924ء) اپنے دور کا قابل ترین ماہر معاشیات تھا۔ اس کتاب معاشیات کے اصول (Princilpes of Economics) ایک لمبے عرصے تک برطانیہ میں بطور نصابی کتب پڑھائی جاتی رہی۔ الفریڈ نے پہلی دفعہ supply and demand, marginal utility, costs of production کے نظریات سے متعارف کروایا۔

جان مینارڈ کینز[1] (John Maynard Keynes, d. 1946) کیمبرج یونیورسٹی میں الفریڈ مارشل (Alfred Marshall, d. 1924) کا شاگرد تھا اور اس نے ورسائی کانفرنس (Versailles Conference) میں برطانوی حکومت کے مالیاتی نمائندے کے طور پر شرکت کی جہاں اس نے کئے جانے والے فیصلوں سے سخت اختلاف کیا تھا۔ اس کے مشاہدات اس کی کتاب Economic Consequences of Peace (1919)میں ریکارڈ شدہ ہیں۔ کینز (Keynes, d. 1946) نے یہ موقف پیش کیا کہ اگر فاتحین جبر کرکے جنگ کا تاوان شکست خوردہ محوری ممالک پر ڈال دیں تو ایک عالمی بحران آجائے گا۔ یہ بحران ایک نئی عالمی جنگ کا سبب بن جائے گا۔ کینز (Keynes, d. 1946) نے تجویز دی کہ جرمنی پر تاوان کی رقم کم کرکے اسے حقیقی طور پر نیچے کی سطح پر لایا جائے۔ کوئلے کی بڑھتی ہوئی بین الحکومتی انتظامیہ کے تحت براعظمی پیداوار اور انجمن اقوام عالم (League of Nations) کی وساطت سے ایک ٹریڈ یونین کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اتحادی ملکوں کے درمیان قرضے کی مجرائی (ادائیگی اور معافی) کا انتظام کیا جائے۔ بین الاقوامی کرنسی کے تبادلے کی مکمل اصلاح کی جائے۔ ایک بین الاقوامی قرضہ فنڈ قائم کرکے روس اور مشرقی یورپ کے تجارتی تعلقات میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

---

[1]۔John Maynard Keynes؛ جان مینارڈ کینز (1883ء-1946ء) ایک انگریز ماہر معاشیات اور فلسفی تھا۔ اس نے کئی سالوں تک رائل کمیشن برائے ہندوستانی کرنسی اور مالیات کے لیے کام کیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانوی ٹریژری میں جونیئر اکنومک ایڈوائزر مقرر ہوا۔ دوسری جنگ عظیم کے آخری دنوں میں بریٹن اووڈز کا عالمی معاہدہ طے پایا جس میں کینز روح رواں تھا۔ اس کی کوششوں سے آئی ایم ایف وجود میں آیا جس نے تیسری دنیا کے ممالک کو کنگال اور انتہائی مقروض بنا دیا۔ اس کی مشہور زمانہ تصانیف

i. Indian Currency and Finance,

ii. The Economic Consequences of the Peace,

iii. Tract on Monetary Reform,

iv. The General Theory of Employment

v. Interest and Money

ہیں۔

عظیم کساد بازاری (The Great Depression) جو 1929ء سے شروع ہوئی بڑھتے بڑھتے 1939ء میں جنگ عظیم دوئم (WW-II) چھڑنے پر منتج ہوئی۔ یہ جنگ ویسے ہی رونما ہوئی جیسے کینز (Keynes, d. 1946) نے اس کی پیشین گوئی کی تھی۔ عظیم کساد بازاری (The Great Depression) کے دوران ہی کینز (Keynes, d. 1946) نے اپنی نہایت اہم کتاب 'Theory of Employment, Interest and Money 1936' شائع کر دی۔ اس کساد بازاری (The Great Depression) کو وال سٹریٹ کریش آف 1929ء[1] (Wall Street Crash of 1929) نے آگ لگائی تھی۔ اس کے نتیجے میں امریکہ میں بیروزگاری میں زبردست اضافہ ہونے لگا۔ یورپی مقروضوں سے قرضے واپس مانگ لئے گئے اور پوری دنیا میں کھلبلی مچ گئی۔ روایتی معیشت دانوں نے اخراجات کو فوراً سکیڑ (tightening) دینے کا مشورہ دیا اور کہا کہ جب تک تاجروں کا اعتماد اور منافع کی سطح بحال نہیں ہو جاتی یہ سکڑاؤ برقرار رکھا جانا چاہیے۔ لیکن کینز (Keynes, d. 1946) کی دلیل دوسری تھی۔ اس نے پیسے کی سپلائی سے بڑھ کر صارف کے رجحان، سرمایہ کاری کی ترغیب، سرمائے کی ضمنی کارکردگی، سیالیت کی ترجیح (liquidity preference) اور ضارب (multiplier) کے تبدل پذیر اثر کی نشاندہی کی جو کہ معیشت کی مجموعی کارکردگی، روزگار اور قیمتوں کی سطح کا تعین کرتے ہیں۔ کینز (Keynes, d. 1946) نے کہا کہ روزگار کا انحصار 'مجموعی اخراجات' پر ہوتا ہے جو کہ صارف کے روزمرہ کے خرچ اور نجی شعبے میں تجارتی سرمایہ کاری پر مشتمل ہے۔ اس نے سود کی شرح کم کرنے اور بے روزگاری سے نمٹنے کے لئے آسان قرضے دینے کی تجویز دیتے ہوئے کہا کہ خسارے کے اخراجات قرضہ لے کر پورے کیے جائیں جو کہ دھکے سے چلنے والی اقتصادی سرگرمی ہوتے ہیں۔ لہٰذا مالیاتی انتظام اور فعال مالیاتی پالیسی، دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

مداخلت کارانہ مالیاتی اور محاصلاتی پالیسیاں جن کی کینز (Keynes, d. 1946) کے حامی ماہرین معیشت نے سفارش کی شکاگو یونیورسٹی کے ماہرین معیشت کے ایک گروپ کے حملے کا نشانہ بنیں۔

---

[1]۔ Wall Street Crash of 1929؛ وال سٹریٹ کریش 1929ء متحدہ امریکہ کی سٹاک مارکیٹ کے کریش کو کہا جاتا ہے جس میں عظیم کساد بازاری نے یورپی صنعت و حرفت کو بری طرح متاثر کیا اور نتیجتاً امریکی سٹاک مارکیٹ بھی کریش کر گئی۔

جنہیں 1950ء کے عشرے میں مجموعی طور پر شکاگو سکول آف اکنامکس کہا جاتا تھا۔ انہوں نے پھر سے منڈی کی سرگرمیوں کا آزادانہ نقطہ نظر پیش کیا اور کہا کہ لوگوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور انہیں اپنے معاملات خود طے کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ ملٹن فرائڈ مین[1] (Milton Friedman, d. 2006) جو کہ بیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں شکاگو سکول آف اکنامکس کے ممتاز ترین ماہرین میں سے تھا۔ اس نے 'Monetary History of the United States (1963)' لکھی۔ جس میں اس نے کہا کہ عالمی کساد بازاری فیڈرل بنک کی پالیسیوں کا نتیجہ تھی۔ بے قید سرکاری پالیسی معیشت میں سرکار کی مداخلت سے کہیں زیادہ مفید عمل ہے۔ حکومتوں کو غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کرنی چاہیے تاکہ طویل المیعاد اقتصادی افزائش عمل میں آئے اور اس کے لئے پیسے کے پھیلاؤ میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہے۔ چونکہ عمومی قیمتوں کا تعین پیسے سے ہوتا ہے اس لئے فعال مالیاتی (آسان قرضے) یا محاصل (ٹیکس اور اخراجات) پالیسی غیر ارادی منفی اثرات ڈال سکتی ہے۔ معقولیت پسند صارفین جس آمدنی کو اپنی مستقل آمدنی سمجھیں گے، اس میں سے ایک متناسب رقم ہی خرچ کریں گے اور اچانک کہیں سے آجانے والی رقم میں سے بیشتر حصے کو اپنی بچت میں جمع کریں گے اور یہ کہ معقول صارفین پیش بینی کرسکیں گے کہ بعد میں ٹیکسوں میں لازماً اضافہ ہوجائے گا جس سے پبلک مالیات متوازن ہوجائیں گی۔

میں نے دانستہ طور پر مغرب کے عالمی اثر ورسوخ کے پیش نظر اس میں اقتصادیات کے ظہور اور اس کی ترقیوں پر بحث کی ہے۔ آیئے اب مسلم دنیا کے منظر نامے کو زیر بحث لاتے ہیں۔ آٹھویں اور بارہویں صدی عیسوی کے درمیان مسلم دنیا میں متعدد ترقی یافتہ تصورات اور تیکنیکوں نے فروغ پایا۔ ان کا تعلق پیداوار، سرمایہ کاری، مالیات، معاشی ترقی، محاصل اور املاک کے استعمال کے شعبہ جات سے تھا۔ ان پیش قدمیوں میں 'حوالہ' (قدیم طریقۂ ترسیل زر)، وقف، طریقۂ معاہدہ، جس پر تاجروں کو اعتماد ہوتا تھا، مشترکہ کرنسی کا پھیلاؤ، چیک، پرامزری نوٹس (promissory notes)، قدیم معاہدے، بلوں کا تبادلہ (مفوضہ) ترقی یافتہ زرعی طریقے، اعلیٰ شرح خواندگی اور خادموں کا بہترین استعمال شامل تھا۔

---

[1]۔ Milton Friedman؛ ملٹن فرائڈ مین (1912ء-2006ء) امریکی ماہر اقتصادیات تھا جسے اقتصادی سائنس میں نوبل انعام سے نوازا گیا۔

اولین معاشی مفکرین میں ایک حضرت امام ابو یوسفؒ (d. 798) تھے جو حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) کے شاگرد تھے۔ انہوں نے محاصل پر کتاب 'کتاب الخراج' لکھی۔ جس میں محصولات، قومی مالیات اور زرعی پیداوار کے خطوط واضح کئے گئے۔ انہوں نے املاک پر مقررہ ٹیکس کی بجائے، پیداوار پر متناسب محصول کے مسئلے پر بحث کی تاکہ زیادہ سے زیادہ رقبہ زیر کاشت لانے کے لئے اچھی ترغیبات مل سکیں۔ انہوں نے محصولات معاف کرنے کی پالیسیوں پر بھی زور دیا۔ جس سے کاشتکار کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ اس میں بدعنوانیاں کم کرنے کے لئے مرکزی نظامِ محاصل قائم کرنے پر بھی زور دیا گیا۔ حضرت امام ابو یوسفؒ (d. 798) نے محاصل کی آمدنی سے معاشرتی واقتصادی ذیلی ڈھانچے کی تعمیر کی بھی تجویز دی۔ اس میں مختلف قسم کے محاصل بشمول سیلز ٹیکس، اموات ٹیکس اور درآمدی محصول کا بھی ذکر تھا۔

حضرت ابوعبید القاسم بن سلامؒ (d. 837) نے 'کتاب الاموال' لکھی جس میں اسلام کی پہلی دوصدیوں کے دوران عائد محصولات کے قانونی نظائر (precedents) کا صحیح ریکارڈ موجود تھا۔ خاص طور پر اس میں مآخذ محاصل اور سرکاری مصارف کے طور طریقے شامل تھے۔ تاہم اس کتاب کی افادیت ان طریقوں میں مضمر ہے جو مصنف نے تجویز کئے اور ان کا تجزیہ پیش کیا۔ حضرت ابوعبیدؒ (d. 837) نے احادیثِ رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی آراء اور ممتاز فقہاء کرامؒ کے اقوال جمع کر کے ان کا قانونی تجزیہ پیش کیا جو کہ اسلام کے قانونی ادب کا فقید المثال مجموعہ ہے۔

فارابی (al-Farabi, d. 950)، ابن سینا (Avicenna, d. 1037)، حضرت امام غزالیؒ (d. 1111)، طوسی (d. 1274)، ابن خلدون (d. 1406) اور دیگر اہل علم نے گھر، معاشروں، کارخانوں اور اقوام کے حوالوں سے تقسیم محنت (division of labour) پر شرح وبسط کے ساتھ لکھا ہے۔ حضرت امام غزالیؒ (d. 1111) نے نظریۂ مالیات پر روشنی ڈالی۔ شیخ ابن تیمیہؒ (d. 1328) جیسے ابتدائی دور کے اہل علم ودانش طلب ورسد (supply and demand) کی قوت کا کسی حد تک ادراک رکھتے تھے۔ انہوں نے منڈیوں کے قواعد وضوابط کے حوالے سے فلاح عامہ کو ملحوظ رکھنے کے فوائد اور نہ رکھنے کے نقصانات پر لکھا ہے۔

ابن خلدون (d. 1405) نے معاشی نظریئے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ پیداوار کو

فروغ اور ترقی دینے سے طلب اور رسد (supply and demand) دونوں پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں اور یہ کہ طلب و رسد (supply and demand) کی قوتیں ہی ہیں جو اشیاء کے نرخوں کا تعین کرتی ہیں۔ اس نے یہ بھی نوٹ کیا کہ آبادی میں اضافے، انسانی سرمائے کے فروغ اور فنیاتی پیش قدمی کی معاشی ارتقائے کبیر کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ اس نے ایک تصور متعارف کرایا جسے 'Khaldun Laffer Curve' کہتے ہیں۔ جس سے مراد یہ ہے کہ شرح محصول اور آمدنی محاصل کے درمیان تعلق شرح محصول بڑھنے کی وجہ سے کچھ عرصے تک بڑھتا رہتا ہے لیکن پھر شرحِ محصول میں اضافہ محاصل کی آمدنی کو گھٹانا شروع کر دیتا ہے کیونکہ مسلط شدہ محصول معیشت کے پیدا کاروں کے لئے اشیا پر لاگت بڑھا دیتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ (d. 1762) نے معاشی و معاشرتی مسائل پر مفصل اظہار خیال کیا ہے۔ وہ کارل مارکس (Karl Marx, d. 1883) سے بہت پہلے اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ دولت کا بنیادی منبع محنت ہے۔ مزدور اور کسان کمانے والے لوگ ہیں۔ مزدور کاشتکاری کرنے والے اور دماغی محنت کرنے والے ملک کی دولت پر سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں[1]۔ مزدور کی رضامندی اس وقت تک شمار نہیں کی جاسکتی جب تک اس کی مزدوری ادا نہ کی جائے۔ محنت کے دورانیے کی ایک حد مقرر ہونی چاہیے تا کہ مزدوروں کو اتنا وقت میسر آسکے جس میں وہ اپنی اخلاقی اور روحانی اصلاح کر سکیں اور ان میں یہ قابلیت پیدا ہو سکے کہ وہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ بچار کریں[2]۔ تجارت کو صرف تعاون کی بنیاد پر استوار ہونا چاہیے۔ حکومت کے لئے تجارت کی ترقی و خوشحالی میں بھاری ٹیکس لگا کر رکاوٹیں ڈالنا ممنوع قرار دیا گیا ہے[3]۔ جو کاروبار و تجارت عوام کے کسی طبقے کے لئے گردشِ دولت محدود کرے وہ ناپسندیدہ ہے[4]۔

تاہم اس موضوع پر قدیم مسلم مفکرین کی بلند خیالی کے باوجود اقتصادیات پر اعلیٰ درجے کی کتابوں کا صدیوں سے فقدان چلا آ رہا ہے۔ بیسویں صدی عیسوی میں اقتصادی نظریئے پر کچھ لٹریچر لکھا

---

[1]۔ رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ از شاہ ولی اللہؒ: جلد چہارم، باب: تلاش معاش کے سلسلہ کی اصولی باتیں (ابتغاء الرزق)

[2]۔ ایضاً

[3]۔ رحمۃ اللہ الواسعہ شرح حجۃ اللہ البالغہ از شاہ ولی اللہؒ: جلد چہارم، باب: ممنوع معاملات کا بیان (البیوع المنہی عنہا)

[4]۔ حجۃ اللہ البالغہ از شاہ ولی اللہؒ: باب: الرسوم السائرہ

گیا ہے مثلاً سید محمود طالقانی[1] (d. 1979) کی 'اسلام وملکیت' (Islam and Ownership)، سید محمد باقر الصدر[2] (d. 1980) کی 'اقتصادُنا' (Iqtisaduna)، سید ابوالحسن بنی صدر[3] کی 'اقتصادِ توحیدی' (Touhid Economics)، حبیب اللہ پیمان[4] کی 'Some Interpretations of Property Rigthts, Capital and Labor from Islamic Perspective' اور سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (d. 1979) کی 'اسلامی معاشیات' ہے۔

عہد حاضر کی اسلامی معاشی فکر میں ایک مسئلہ ماسوائے سید قطبؒ (d. 1966) کے عمومی طور پر غائب ہے۔ یہ زرعی اصلاحات کا مسئلہ ہے۔ زرعی اصلاحات کی مخالفت نے اسلام پسندوں کی بغاوت میں بھی کردارادا کیا (ایران، 1963ء اور افغانستان 1978ء)۔ سپریم کورٹ آف پاکستان نے 1972ء اور 1977ء کی زرعی اصلاحات (لینڈ ریفارمز) کو غیر اسلامی قرار دے دیا تھا[5]۔

مسلم دنیا میں اقتصادیات پر لٹریچر کے اس جائزے سے یہ نتیجہ آسانی سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اقتصادیات پر ہونے والا تقریباً سارا کام اقتصادی نظریئے (تھیوری) سے تعلق رکھتا ہے۔ اقتصادیات پر بطور سائنس ایک کتاب بھی موجود نہیں۔ جب کہ مغربی دنیا میں پچھلی تین صدیوں میں اس موضوع پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں۔ مزید برآں اس موضوع پر علمی بحث ومکالمہ کے فقدان کے علاوہ مسلمانوں نے زرعی اصلاحات کا رجعت پذیر (retrogressive view) نقطۂ نظر اپنا لیا ہے باوجود اس امر کے کہ

---

[1]۔ Mahmoud Taleghani؛ محمود طالقانی (1911ء-1979ء) ایک ایرانی شیعہ ماہر اقتصادیات، ماہر دینیات، اصلاح کار، جمہوریت کا وکیل اور سنئیر صحافی تھا۔

[2]۔ Muhammad Baqir al-Sadr؛ محمد باقر الصدر (1935ء-1980ء) ایک عراقی شیعہ ماہر اقتصادیات، عالم، فلسفی اور حزب دعوت اسلامی کا بانی تھا۔

[3]۔ Seyyed Abolhassan Banisadr؛ سید ابوالحسن بنی صدر (1933ء- حیات) ایک ایرانی ماہر اقتصادیات اور ایرانی انقلاب 1979ء کے بعد پہلا صدر تھا۔

[4]۔ Habibollah Peyman؛ حبیب اللہ پیمان (1935ء- حیات) ایک ایرانی ماہر اقتصادیات اور سیاست دان ہے جس نے ایران میں ایک اسلامک پولیٹیکل سوشلسٹ پارٹی (Jonbesh Moslamanan Mobarez) کی بنیاد رکھی۔ بعض وجوہات کی بنا کر ایرانی حکومت نے اس پارٹی پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔

[5]۔ مظفر علی قزلباش کیس 1989ء

ایک ملک کی معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے لئے یہ بہت لازمی ضرورت ہیں۔

ایک شعبہ جس میں اقتصادیات کو اسلام کے تابع بنانے پر زیادہ بحث مباحثہ ہوا وہ جدید بنکاری ہے۔ تاہم مسلمانوں نے سود کی ممانعت کے لئے تاحال کسی ایک تعریف یا اس کے متبادل پر اتفاق نہیں کیا۔ اسلامی مالیات اور بنکاری کے طریق ہائے کار تکلیف دہ اور گراں محسوس ہوتے ہیں۔ اب تک جو کچھ ہو سکا ہے وہ زیادہ تر محض عذر (mere justifications) ہیں۔ ان میں کسی قسم کی جدت یا اختراع (innovative) سامنے نہیں آسکی۔

(6)۔ قانون(Law)

قانون، قواعد کا ایک ایسا نظام ہے جو معاشرتی اداروں کے ذریعے انسانی رویئے کو قابو میں لاتا ہے۔ قوانین تین طریقوں سے بنائے جا سکتے ہیں۔ انہیں ایک اجتماعی مجلس قانون ساز، یا اکیلا رکنِ مجلس قانون ساز یا انتظامی اختیارات رکھنے والا حاکم بذریعہ قواعد و احکامات بناتا ہے یا ججز بذریعہ واجب التعمیل نظائر (binding precedents) بناتے ہیں۔ قانون سیاست، اقتصادیات، تاریخ اور معاشرے کو مختلف طریقوں سے متشکل کرتا ہے۔ لوگوں کے مابین تعلقات کو بطور مصالحت کنندہ منضبط کرتا ہے اور بیک وقت وہ معاشرے کی ایک پیداوار بھی ہوتا ہے۔ قانون کو دو بڑے زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ قانون (فقہ) فلسفہ قانون (اصول فقہ) اور مدتوں سے چلا آنے والا مطبوعہ قانون (black letter law)۔

فلسفہ قانون (اصول فقہ) کے ابتدائی آثار مختلف مذہبی کتابوں میں ملتے ہیں جبکہ رسمی مکاتبِ قانون سلطنت روما کے تحت تخلیق ہوئے اور 'Justinian Corpus Juris Civilis' تک جا پہنچے۔ فطری قانون کے قدیم نظریہ سازوں کا دعویٰ تھا کہ کچھ ایسے قوانین ہیں جو کائنات کے اندر مرتسم و منقش (Jus natural) ہیں۔ پس انسان کے بنائے قوانین کو حتی الوسع ان کے قریب ترین ہونا چاہیے۔ یہ نظریہ 'Lex iniusta non est lex' پر مبنی ہے جس کے معنی ہیں کہ ایک غیر منصفانہ قانون، صحیح قانون نہیں ہوتا۔

ٹامس ایکوناس (Thomas Aquinas, d. 1274) نے قوانین کی چار اقسام کی

نشاندہی کی ہے: دائمی، فطری، انسانی اور سماوی۔ اول الذکر ماورائے عقل یا وجدانی قوانین ہوتے ہیں۔ جنہیں صرف خداعزوجل جانتا ہے۔ فطری قانون معقول انسانی مخلوق کی دائمی قانون میں شرکت کے حوالے سے ہوتے ہیں اورانہیں عقل کے ذریعے دریافت کیا جاتا ہے۔ سماوی قانون کا اظہار مذہبی کتابوں کے ذریعے ہوتا ہے اور یہ بنی نوع انسان کے لئے خدا تعالیٰ کا ایک مثبت قانون ہوتا ہے۔ انسانی قانون کو عقل کی مدد حاصل ہوتی ہے اور یہ انسانوں کے مشترکہ مفاد کے لئے بنایا جاتا ہے۔ فرانسسکوڈی ویٹوریا[1] (Francisco de Vitoria, d. 1546) شاید پہلا آدمی تھا جس نے نظریہ "Jus gentium" (عوام کے حقوق) متعارف کرایا اور اس کی وضاحت کی۔ ہوگوگروشیئش (Hugo Grotius, d. 1645) فطری قانون کے خالص عقلی نظام کا بانی تھا۔ اس کا استدلال تھا کہ قانون معاشرتی تحرک اور عقل، دونوں کی پیداوار ہے۔ کانٹ (Kant, d. 1804) کا یقین تھا کہ ایک اخلاقی حکم ایسے قوانین کا متقاضی ہوتا ہے 'جو عالمگیر قوانین فطرت میں سے چنے گئے ہوں'۔

کانٹ (Kant, d. 1804) پر نطشے (Nietzsche, d. 1900) نے تنقید کی اور اصول مساوات کو مسترد کرتے ہوئے اس ایقان کا اظہار کیا کہ قانون رغبتِ اقتدار میں سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس پر اخلاقی یا غیر اخلاقی کا لیبل نہیں لگایا جا سکتا۔ بیسویں صدی عیسوی میں لون لووائس فلر[2] (Lon Luvois Fuller, d. 1978) نے اس امر پر زور دیا کہ قانون میں ایک داخلی اخلاقِ اقتدار ہوتا ہے جوان معاشرتی قواعد کے پار چلا جاتا ہے جن سے جائز قانون بنائے جاتے ہیں۔

---

[1]۔ Francisco de Vitoria؛ فرانسسکوڈی ویٹوریا (1483ء- 1546ء) ایک ہسپانوی رومن کیتھولک فلاسفر، ماہر دینیات اور قانون دان تھا۔ وہ فلسفے کی ایک روایت سکول آف سلامانکا کا بانی تھا۔ اسے خاص طور پر نظریہ منصفانہ جنگ اور بین الاقوامی قانون وجہ سے شہرت حاصل ہوئی تھی۔

[2]۔ Lon Luvois Fuller؛ لون لووائس فلر (1902ء-1978ء) ہارورڈ یونیورسٹی کا ایک ممتاز پروفیسر تھا جس نے 1964ء میں کتاب 'The Moralty of Law' لکھی۔ اس کو امریکی قانون برائے معاہدات کے سلسلے میں اہم کردار کا حامل تسلیم کیا جاتا ہے۔ 'ہارورڈ لا ریویو جلد 71 (Harvard Law Review, Vol. 71) میں فلر کے 'ایچ ایل اے ہارٹ' (H. L. A. Hart) کے ساتھ مباحثے کو قانونی اثباتیت اور فطری قانون کے درمیان جدید کشمکش کی تشکیل میں بہت اہمیت حاصل ہے۔

دوسری طرف اجابیت پسندوں(Positivists) کا استدلال یہ تھا کہ قانون کچھ ایسی چیز ہے جسے حقیقت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔قوانین اس وقت جائز طور پر بنایا جاتا ہے جب وہ معاشرتی لحاظ سے قبول کردہ قواعد سے مطابقت رکھتے ہوں۔ جیریمی بینتھم (Jeremy Bentham, d. 1832) کے نقطۂ نظر کے مطابق قوانین اس طرح وضع کئے جانے چاہئیں کہ وہ ممکنہ طور پر افراد کی سب سے بڑی تعداد کے لئے بہترین نتائج دے سکیں۔اس کے شاگردوں جان سٹوأرٹ مل(John Stuart Mill, d. 1873) اور جان آسٹن[1] (John Austin, d. 1859) نے اس نظریئے کو قبول کرلیا۔جان آسٹن(John Austin, d. 1859) نے قانون کی یہ تصریح کی کہ یہ وہ احکامات ہوتے ہیں،جن کی پشت پر حاکمیت اعلیٰ کی طرف سے سزا کی دھمکی(Threat of Sanctions) ہوتی ہے۔ان احکامات کا رُخ ان عوام کی جانب ہوتا ہے جو اطاعت گزاری کی عادت رکھتے ہیں۔

ہینس کیلسن[2] (Hans Kelsen, d. 1973) قانون کی توضیح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ شیرازہ بند طور طریقے ہیں۔وہ اس کے ساتھ ہی ان طور طریقوں کی قدر و قیمت کا تعین کرنے سے انکار کرتا ہے۔یعنی قانونی سائنس کو قانونی سیاسیات سے علیحدہ رکھا جانا چاہیے۔اس کے' خالص نظریۂ قانون'(Pure Theory of Law) کا مرکز ایک بنیادی قاعدہ(Grundnorm) ایک تصوراتی قاعدہ ہے بلکہ یوں کہیے کہ ایک مفروضہ ہے جسے شاہی نظام کے ایک قانون دان نے دلیل کی بنیاد بنایا ہے۔وہ یہ ہے کہ ایک قانونی نظام کی تمام زیریں سطحیں جو دستوری قانون سے شروع ہوتی ہیں،ان کے بارے میں یہ رائے ہے کہ انہوں نے اپنا اختیار حاکم مجاز سے لیا ہے۔لہٰذا قانونی روایات کے وجوب کو آخری سرے یعنی کسی مافوق الانسان ذریعے مثلاً خدا، ریاست یا قوم تک جا پہنچے بغیر ہی طے شدہ سمجھا جا سکتا ہے۔

---

[1]۔John Austin؛ جان آسٹن(1790ء۔1859ء) ایک برطانوی ماہر قانون تھا،جس کی مطبوعات نے 'برطانوی اصولِ قانون' پر بے پناہ اثرات ڈالے۔ ان مطبوعات میں ' The Province of jurisprudence Determined (1832)'اور''Lectures on Jurisprudence'' جیسی کتابیں شامل ہیں۔

[2]۔Hans Kelsen؛ہینس کیلسن(1881ء-1973ء) ایک آسٹرین قانونی فلسفی اور سیاسی فلسفی تھا جو 1940ء میں ترک وطن کر کے امریکہ چلا گیا تھا۔اس کا عظیم شاہکار(Reine Rechslchre''Pure Theory of Law) ہے۔

تاہم ہربرٹ لایونل ایڈالفس ہارٹ[1] (H. L. A. Hart, d. 1992) جیسے قانونی ایجابیت پسندوں (positivists) نے آسٹن (John Austin, d. 1859) اور کیلسن (Kelsen, d. 1973) پر تنقید کرتے ہوئے یہ استدلال کیا ہے کہ قانون کو معاشرتی اقدار کا ایک نظام سمجھا جانا چاہیے اور یہ کہ تکلفاتِ نافذہ (Sanctions) قانون کے لیے ضروری تھے۔ قانون جیسے معیاری معاشرتی مظہر کی بنیاد غیر معیاری معاشرتی حقائق میں پیوست نہیں کی جاسکتی۔ ہارٹ (Hart,d. 1992) نے مزید کہا کہ قانون ایک مجموعۂ قواعد ہے جو قدیم ترین قواعد (rules of conduct) (طرز ہائے عمل) اور ثانوی قواعد (secondary rules) (ایسے قواعد جو حکام کے لئے ہیں کہ وہ کس طرح قدیم ترین قواعد پر عمل درآمد کرائیں) پر مشتمل ہے۔ ثانوی قواعد طریق ہائے عدل (rules of adjudication) میں منقسم ہیں (تا کہ قانونی تنازعات حل کرائے جاسکیں) ان میں قواعد تغیر (rules of change) (جو قانون میں ردو بدل کرنے کی اجازت دیتے ہیں) اور قاعدۂ شناخت (rule of recognition) (جو قانون کے جائز ہونے کی شناخت کرتا ہے) شامل ہیں۔ قاعدۂ شناخت (rule of recognition) حکام کے روزمرہ کا طرزِ عمل ہے (بالخصوص بیرسٹرز اور ججز کا طرزِ عمل) جو کہ چند حقائق کی نشاندہی کرتا ہے اور فیصلے بطور ماخذ قانون صادر کرتا ہے۔

جان بارڈلے رالس[2] (John Bordley Rawls, d. 2002) کا نظریۂ انصاف ایک خاکے (device) کو استعمال کرتا ہے جسے تخلیقی موقف کہتے ہوئے وہ ہم سے سوال کرتا ہے کہ ہم اپنے معاشرے کے بنیادی اداروں کو باقاعدہ بنانے کے لئے انصاف کے کون سے اصولوں کا انتخاب کریں گے، اگر ہم لاعلمی کے پس پردہ بیٹھے ہوئے ہوتے؟ تصور کیجئے کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ ہم کون ہیں؟ ہماری صنف کیا ہے؟ ہمارے پاس کتنی دولت ہے؟ ہمارا مقام و مرتبہ کیا ہے؟ یا ہماری شناخت کے خدوخال کیا

---

[1] Herbert Lionel Adolphus Hart؛ ہربرٹ لایونل ایڈالفس ہارٹ (1907ء-1992ء) ایک معروف برطانوی قانونی وسیاسی فلاسفر تھا جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں اصول قانون کا پروفیسر اور بریز نیوز کالج آکسفورڈ کا پرنسپل بھی رہا۔ اس کی مشہور کتاب 'The concept of law' ہے۔

[2] John Bordley Rawls؛ جان بارڈلے رالز (1921ء-2002ء) ایک امریکی اخلاقیات اور سیاسی فلسفے کا استاد تھا۔ وہ ہارورڈ اور آکسفورڈ کی پروفیسر شپ پر بھی فائز رہا۔ اس کی کتاب 'A Theory of Justice 1971' نے بہت شہرت پائی ہے۔

ہیں؟ تا کہ ہم اپنے حق میں کسی تعصب سے کام نہ لے سکیں۔ رالس (Rawls, d. 2002) دلیل دیتا ہے کہ اس تخلیقی موقف سے ہم بالکل انہی سیاسی آزادیوں کا ہر ایک کے لئے انتخاب کریں گے مثلاً آزادئ اظہار اور حق رائے دہی وغیرہ۔

فلسفۂ قانون کے اصولوں (Jurisprudential doctrines) کی بنیاد پر قانون کے دو بڑے بڑے نظام ظہور پذیر ہوئے ہیں: شہری قانون (civil law) اور رواجی قانون یا قانون عامہ (common law)۔ اول الذکر قانون ایسا نظامِ قانون ہے جو آج دنیا بھر میں بیشتر ممالک میں استعمال ہوتا ہے۔ اس قانون میں جن ماخذ کو مستند سمجھا جاتا ہے وہ ابتدائی طور پر قانون سازی اور رواج تھے۔ شہری قانون کی تبویب (codification) جو کافی حد تک رومن لاء پر مبنی تھی، اس کے ساتھ ساتھ بعض اثرات مذہبی قوانین (جیسے کہ کلیسا کا قانون) کے بھی تھے جو عہد روشن خیالی (Enlightenment) تک پورے یورپ میں پھیلتے رہے۔ پھر انیسویں صدی عیسوی میں فرانس نے اپنے قوانین کو مع اپنے 'کوڈ سول'[1] (Code Civil des Francais) اور جرمنی نے اپنے قوانین کو مع اپنے 'Burgerliches gesetzbuch'[2] کے جدید بنا لیا ہے۔ ان دو ملکوں کے مجموعہ ہائے قوانین نے براعظم یورپ کے تمام ملکوں (بشمول یونان) کے قانونی نظاموں پر بے پناہ اثرات مرتب کئے بلکہ جاپانی اور کوریائی قانونی روایات کو بھی متاثر کیا۔ آج جن ملکوں میں شہری قانون کے نظام کام کر رہے ہیں ان میں روس اور چین سے لے کر وسطی اور لاطینی امریکہ تک شامل ہیں۔

'قانونِ عامہ' یا 'رواجی قانون' (common law) کے تحت بنے ہوئے قانونی نظاموں میں عدالتوں کے فیصلوں کو قطعی طور پر قانون مانا جاتا ہے۔ جو مجلس قانون ساز (پارلیمنٹ) کے طریق کار کے مطابق بنے قوانین (قوانین موضوعہ) کے مساوی ہوتے ہیں۔ ان کے تحت ضابطے انتظامی شاخ وضع کرتی ہے۔ قانون میں عدالتی فیصلوں کی یہ مساوی حیثیت اصول نظائر (stare decisis) کی رُو سے ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کے فیصلے ماتحت عدالتوں کے لئے واجب التعمیل ہیں اور اسی عدالت کے مستقبل کے فیصلے بھی قابل تعمیل ہوں گے تا کہ مماثل مقدمات (similar cases) کے نتائج بھی مماثل ہونے کی ضمانت حاصل ہو سکے۔

۱۔ فرانس کا سول کوڈ۔

۲۔ جرمنی کا سول کوڈ۔

'قانون عامہ' (Common law) نے ہنری دوم[1] (Henry-ii, d. 1189) کے دور میں (1100ء کے اواخر میں) فروغ پایا۔ جب اس نے ایسے ججوں کو تعینات کیا جو ملک کے لئے ایک مشترکہ اداراتی اور متحدہ نظام قانون وضع کرنے کا اختیار اور صلاحیت رکھتے تھے۔ قانونِ عامہ کے ارتقا کے لئے اگلا بڑا قدم 1215ء کا منشور عظیم میگنا کارٹا[2] (Magna Carta) تھا۔ اس کا تقاضا تھا کہ بادشاہ کے ہمراہی ججوں کی عدالتیں اپنے اجلاس اور فیصلے ایک خاص جگہ پر منعقد کریں نہ کہ ملک کی نا قابل پیشگوئی جگہوں پر اجلاس کر کے اپنی پسند کا انصاف بانٹتے پھریں۔ جب قانونِ عامہ کا نظام نا قابل یقین حد تک ضابطہ بند، سخت گیر اور بے لچک ہو گیا تو اس قانون کے پہلو بہ پہلو ایک باضابطہ ادارۂ نصفت (Equity) بھی وجود میں آ گیا۔ اس نے اپنی کورٹ آف چانسری تشکیل دے دی۔ شروع شروع میں 'نصفت' (Equity) کو اکثر تنقید کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اسے ڈانواڈول قسم کا قانون قرار دیتے ہوئے کہا جاتا کہ اس کا سائز چانسلر کے قدموں کے برابر گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عدالت ہائے نصفت (Equity) ٹھوس اصولوں پر استوار ہوتی چلی گئیں۔

انیسویں صدی عیسوی میں برطانیہ میں دونوں نظاموں کو 'نظام قضا'[3] (Judicature

---

[1]۔ Henry-ii: ہنری دوم (1133ء-1189ء) انگلستان کا بادشاہ تھا جو 1154ء سے 1189ء تک برسر اقتدار رہا۔

[2]۔ میگنا کارٹا (Magna Carta) انسانی تاریخ کی ایک اہم قانونی دستاویز ہے جس میں برطانوی عوام کو بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ دیا گیا ہے۔ یہ قانونی دستاویز جون 1215ء میں برطانوی عوام اور بادشاہ جان کے درمیان رنی میڈ (لندن) کے مقام پر لکھی گئی۔

[3]۔ 'The Judicature Acts' 1870ء کے عشرے میں شروع ہونے والے ایکٹس آف پارلیمنٹ (acts of Parliment) کا ایک سلسلہ تھا۔ جس کا مقصد انگلستان اور ویلز (Wales) کی عدالتوں کے اس وقت تک کے منقسم نظام کو آپس میں ضم کرنا تھا۔ پہلے دو ایکٹس: سپریم کورٹ آف جوڈیکیچر ایکٹ مجریہ 1873ء (Supreme Court of Judicature Act 1873) اور سپریم کورٹ آف جوڈیکیچر مجریہ 1875ء (Supreme Court of Judicature Act 1875) تھے۔ جن کے بعد مزید ترمیمی ایکٹس (کل 12) 1899ء میں جاری ہو گئے تھے۔ ایکٹ آف 1873ء کے تحت کورٹ آف چانسری (Court of Chancery)، کورٹ آف کوئینز بنچ (Court of Queen's Bench) (مذکر بادشاہ آ جانے کی وجہ سے یہ کنگز بنچ ہو جاتا ہے)، کورٹ آف کامن پلینز (Court of Common Pleas)، کورٹ آف ایکسچیکر (Court of Exchequer)، ہائی کورٹ آف ایڈمریلٹی (High Court of Admiralty)، کورٹ آف پروبیٹ (Court of Probate) اور کورٹ آف ڈائیورس اور میٹریمونیل کازز (Court of Divorce and Matrimonial Causes) کو یکجا کر کے سپریم کورٹ آف جوڈیکیچر (Supreme Court of Judicature) اور دو کورٹوں ہائی کورٹ آف جسٹس (High Court of Justice) اور کورٹ آف اپیل (Court of Appeal) میں منقسم کر دیا گیا۔

Acts) کے تحت یکجا کر دیا گیا۔ اس طرح قانونِ عامہ (Common law) اور نصفت (Equity law) کی تاریخی طور پر الگ الگ عدالتیں اکٹھی ہوگئیں۔ قانونِ عامہ نے ابتداً انگلینڈ میں جنم لیا۔ جسے بعد میں بہت سے ملکوں نے اختیار کر لیا۔ ایک دفعہ اسے پوری سلطنت برطانیہ میں آزمانے کے بعد، ماسوائے چند مستثنیات (few exceptions) کے، سب ملکوں نے تسلیم کر لیا۔ امریکہ، آسٹریلیا، ہندوستان اور پاکستان میں بھی یہی قانون رائج ہے۔

قانون کے پیچیدہ ہو جانے کی وجہ سے اس کی متعدد زمرہ بندیاں (classifications) کرنا پڑیں۔ آج عمومی طور پر اسے دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: فوجداری قانون (Criminal law) اور دیوانی قانون (Civil law)۔ اول الذکر قانون اس طرزِ عمل سے متعلق ہے جسے معاشرے کے لئے ضرر رساں سمجھا جاتا ہے جس میں قصور وار فریق کو جیل بھجوا دیا جاتا ہے یا اس پر جرمانہ عائد کر دیا جاتا ہے۔ دیوانی قانون (اس قانون کو متذکرہ بالا شہری قانون کے دائرہ سماعت کے ساتھ گڈ مڈ نہ کیا جائے) افراد یا اداروں کے مابین تنازعات دور کرانے جیسے معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں نقصان کی تلافی کے لئے تعمیل مختص، استقرارِ حق (classifications) اور جیتنے والے فریق کے مالی نقصان کے ازالہ کا انتظام کیا جاتا ہے۔ دیوانی قانون نے معاہدات خاص کو جنم دیا ہے۔ مثلاً قانون معاہدات (Contract law)، قانونِ جائیداد (Property law)، قانونِ وقف (Trust law)، قانون ازالۂ نقصان (Tort law)، قانون دستوری (Constitutional law)، قانون انتظامی (Administrative law) اور بین الاقوامی قانون (International law) وغیرہ مہیا کئے ہیں۔

متذکرہ بالا نظریاتی اور عملی پیش قدمیوں نے خصوصی اداروں کے قیام کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اس کے نتیجے میں ایک نمائندہ پارلیمنٹ (representative parliament)، ایک جوابدہ منتظمہ (accountable executive)، آزاد عدالتیں اور انتظامی معاملات کو مناسب طور پر چلانے والی ایک تنظیم (bureaucracy) اور قانونی پیشہ وجود میں آ گیا۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ دورِ متاخر میں ارتقائے قانون کے لئے مسلمانوں نے کیا کیا۔ ہم اس مسئلے پر سیر حاصل گفتگو کر چکے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنے اوائل کی تاریخ میں فقہ اور قانون کے ارتقاء کے لئے بہت کام کیا تھا (دیکھئے باب 4) تاہم جدید دور میں قانون کی ترقی کے لئے مسلمانوں نے بالکل کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ حضرت امام شافعیؒ (d. 820) کے بعد صرف دو اہل علم و دانش شخصیات تھیں جنہوں

نے اصول قانون (اصول فقہ) کو ترقی سے ہمکنار کیا: حضرت امام شاطبیؒ[1] (d. 1388)۔ جنہوں نے 'الموافقات فی اصول الشرعیۃ' (بنیادی اسلامی قانون میں آہنگی) لکھی اور شیخ ابن تیمیہؒ (d. 1328) نے 'السیاسۃ الشرعیۃ' (اسلامی قانون کی حکمت عملی) لکھی۔ تاہم ان کی یہ خدمات ان ذہنی کاوشوں اور ترقیوں کے مقابلے میں پھیکی پڑ جاتی ہیں جو انہی کے زمانے کے بعد مغرب میں ظہور پذیر ہو چکی ہیں۔

(7)۔ حقوقِ انسانی کا احترام

انسانی حقوق کی اصطلاح کو جنگ عظیم دوئم (WW-II) کے بعد اور اقوام متحدہ (UN) کی بنیاد ڈالے جانے پر بہت شہرت حاصل ہوگئی۔ اس نے 'فطری حقوق' (natural rights) یا 'حقوق انسانی' (rights of man) کی جگہ لے لی۔ انسانی حقوق کے تصور کے تاریخی ماخذ پیچھے قدیم یونان اور روم سے جا ملتے ہیں۔ جہاں اس پر یونان اور یونانی رواقیت (Hellenic Stoicism) کے قبل از جدید فطری قوانین پر مبنی نظریات کے حوالے سے بحث کی جاتی تھی۔ ان نظریات میں اس فطری قانون کی موجودگی کا اعتراف کیا جاتا تھا جو چند ہمہ گیر حقوق کو تسلیم کرتا ہے۔

1215ء کے منشور عظیم میگنا کارٹا (Magna Carta) میں فیصلہ کیا گیا کہ عوام بنیادی حقوق رکھتے ہیں۔ مغربی معاشرے کے قلب ماہیت (metamorphosis) تیرہویں صدی سے شروع ہو کر 'امنِ ویسٹ فالیہ، 1648' (Peace of Westphalia) کے معاہداتِ امن پر دستخط ثبت ہونے تک جاری رہی۔ نشاۃ ثانیہ (Renaissance) شروع ہونے اور جاگیرداری (feudalism) کے انحطاط پذیر (decline) ہونے کے نتیجے میں آزادی اور مساوات کے کشادہ دلانہ تصورات ابھرنے لگے۔ جن سے جدید دور کے تصوراتِ انسانی حقوق کی بنیادیں استوار ہوگئیں۔ ٹامس ایکوناس (Thomas Aquinas, d. 1274) اور ہوگو گروشئیش (Hugo Grotius, d. 1645) کی تعلیمات منشورِ عظیم 'میگنا کارٹا' (Magna Carta)، محضر نامۂ حقوق (Petition of Rights) اور انگلستان کے بندوبستِ دستوری (English Bill of Rights) سب نے اس امر کی توثیق کر دی کہ بنی نوع انسان کو چند دائمی اور ناقابل انتقال حقوق فطری طور پر عطا ہوئے ہیں۔

---

[1]۔ ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ بن محمد اللخمی الشاطبیؒ (1320ء-1388ء) ایک مشہور محدث، فقیہ، لغوی اور جامع العلوم تھے جنہیں مجدد دین اسلام میں بھی شمار کیا جاتا ہے۔ مالکی المسلک تھے۔ آپؒ کی تفسیر شاطبیؒ کا شمار جدید دور کی قرآن پاک کی شاہکار تفاسیر میں ہوتا ہے۔

گیلیلیو(Galileo, d. 1642)اور نیوٹن(Newton, d. 1727) کی دریافتوں، ٹامس ہابز(Thomas Hobbes, d. 1679) کی مادیت، ڈیکارٹ(Descartes, d. 1650) کی عقلیت، فرانسس بیکن (Francis Bacon, d. 1626)اور جان لاک (John Locke, d. 1704) کی تجربیت اور عہدِ روشن خیالی (Enlightenment) میں انسانی عقل پر بڑھتے ہوئے اعتماد نے انسانی معاملات کے تصورِ کاملیت (perfectibility) کی طرف رہنمائی کر دی۔ جان لاک (John Locke, d. 1704)، مونٹیسکیو (Montesquieu, d. 1755)، والٹیئر[1] (Voltaire, d. 1778)اور روسو(Rousseau, d. 1778) جیسے فلسفیوں نے یہ استدلال پیش کیا کہ حالت فطرت کے دوران افراد کو چند حقوق بطور بنی نوع انسان ہونے کے حاصل تھے۔ مہذب معاشرے(سول سوسائٹی) میں داخل ہونے پر(بوجۂ معاہدۂ عمرانی) بنی نوع انسان نے ریاست کو صرف وہ حقوق تفویض کئے تھے جو ان فطری قوانین پر عمل درآمد کے لئے ناگزیر تھے، نہ کہ تمام حقوق ہی اس کے حوالے کر دیئے تھے۔ ان فطری حقوق کے نفاذ میں ریاست کی ناکامی کی صورت میں عامۃ الناس کو بغاوت کا حق حاصل ہوجاتا ہے۔ اس طرح 'نظریۂ ناقابلِ انتقال حقِ انسان' (inalienable right of man)ایک بنیادی اخلاقی اور معاشرتی الہام(social gospel)بن گیا۔

اس بھرپور ذہنی شعور اور گرم جوشی بمعہ 1688ء کے انگلستان میں سنہری انقلاب (Glorious Revolution) کی عملی مثال اور نتیجتاً بندوبستِ دستوری(Bill of Rights) نے انقلابی شورش کی لہر کے لئے منطقی جواز فراہم کر دیا۔ جس نے شمالی امریکہ اور فرانس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ٹامس جیفرسن[2](Thomas Jefferson, d. 1826) نے اعلان کیا کہ اس کے ہم وطن آزاد لوگ ہیں اور وہ اپنے ان حقوق کے دعویدار ہیں جو انہیں قوانین فطرت سے ملتے ہیں۔ یہ کسی چیف

1۔ Francisco de Vitoria؛ فرانسسکو ڈی ویٹوریا (1483ء- 1546ء) ایک سپینی رومن کیتھولک فلاسفر، ماہر دینیات اور قانون دان تھا۔ وہ فلسفے کی ایک روایت سکول آف سلامانکا کا بانی تھا۔ اسے خاص طور پر نظریہ منصفانہ جنگ اور بین الاقوامی قانون وجہ سے شہرت حاصل ہوئی تھی۔

2۔ Thomas Jefferson؛ ٹامس جیفرسن (1743ء-1826ء) امریکہ کا تیسرا صدر تھا جو 1801ء سے 1807 تک برسرِ اقتدار رہا۔ وہ متحدہ امریکہ کا بانی قائد اور اعلان آزادی کو قلمبند کرنے کا اعزاز بھی اسے ہی حاصل ہوا۔ اسی کی صدارت کے دوران میں لوئی زیانا(Louisiana) کی ریاست خریدی گئی اور امریکا میں بردہ فروشی خلاف قانون قرار دی گئی۔

مجسٹریٹ کا عطیہ نہیں ہیں۔شاعرانہ اعلانِ آزادی میں جو 4 جولائی 1776ء کو 13 امریکی نوآبادیوں کی طرف سے ہوا، کہا گیا کہ 'ہم ان صداقتوں کو اظہر من الشّمس قرار دیتے ہیں کہ تمام انسان برابر پیدا کئے گئے اور انہیں ان کے خالق نے چندایک نا قابل انتقال حقوق عطا کئے ہیں۔جن میں زندگی، آزادی اور خوشیوں کی تلاش کے حقوق بھی شامل ہیں۔فرانسیسی اعلانِ حقوق انسان اور حقوق شہریت (The French Declaration of the Rights of Man and of the Citizen) میں انگلستان اور امریکہ کی آزادیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی[1]۔

تحریک عالمگیر حقوقِ انسان (Universal Human Rights Movement)، جنگ عظیم دوئم (WW-II) کے بعد اپنے عروج کو پہنچ گئی۔اس نے چند قانونی دستاویزات کو جنم دیا۔ان میں سے زیادہ نمایاں اقوام متحدہ کا چارٹر (UN Charter)، عالمگیر اعلانِ انسانی حقوق (Universal Declaration of Human Rights, 1948))، بین الاقوامی اقرارِ شہری و سیاسی حقوق (International Covenant on Civil and Political Rights, 1976(ICCPR))، بین الاقوامی حقوق معاش (International Covenant on Economic)، معاشرتی اور ثقافتی حقوق (Social and Cultural Rights, 1976 (ICESCR))، یورپین میثاقِ تحفظ انسانی حقوق (European Convention for the Protection of Human Rights)، میثاق برائے انسداد امتیازات ہمہ اقسام برخلاف حقوقِ نسواں (Convention for Elimination of All Forms of Discrimination Against Women, 1979)، اقرارنامہ برائے انسداد اذیت (Convention Against Torture) مع متعدد معاہدات جو بین الاقوامی تنظیم محنت (International Labour Organization) نے کرائے تھے۔

اقوام متحدہ کا منشور انسانی حقوق کے بارے میں براہ راست کچھ نہیں کہتا۔اس کے اندر چند ایک حوصلہ افزا اور ترغیبی دفعات ہیں۔مثلاً انسانی حقوق کے احترام میں اضافہ، انسانی حقوق کے حصول کے لیے دست تعاون بڑھانا، انسانی حقوق کا عالمی سطح پر احترام بڑھانے کے اقدامات کرنا وغیرہ۔ 1946ء میں اقوام متحدہ کی معاشی و معاشرتی کونسل نے کمیشن برائے انسانی حقوق (یو این کمیشن) قائم کیا۔

---

[1] Encyclopedia Britannica, article: Human Rights

1948ء میں اس کمیشن نے ایک مسودہ برائے ڈیکلریشن تیار کیا جسے بنیاد بنا کر جنرل اسمبلی نے اس سال بطور 'عالمی اعلانِ انسانی حقوق' کی قرارداد تیار کی۔ 48 ممالک نے اس کی حمایت کی اور 8 نے رائے شماری میں حصہ لینے سے گریز کیا۔ (اس وقت اقوام متحدہ کے رکن ممالک کی تعداد 56 تھی)۔ یہ قرارداد (ڈیکلریشن) 1976ء میں 'ICCPR' اور 'ICESCR' کے لئے ایک سپرنگ بورڈ (springboard) تھی۔ یہ سب کارنامے انسانی حقوق کے ان نظریہ سازوں کی انتھک کوششوں کا نتیجہ تھے جن کا سلسلہ ٹامس ہابز (Thomas Hobbes, d. 1679) سے شروع ہو کر آج کل کے علمبردارانِ حقوق انسانی کی مساعی (efforts) کی بدولت آگے بڑھ رہا ہے۔

عالمگیر اعلان انسانی حقوق 'UNDHR' انسانوں کو درج ذیل حقوق اور آزادیوں سے نوازتا اور ان کا اعلان کرتا ہے:

(i)۔ حق برائے زندگی، آزادی اور سلامتی (آرٹیکل 3)
(ii)۔ آزادی از غلامی واطاعتِ جبری ((آرٹیکل 4)
(iii)۔ آزادی از اذیت یا رسوا کن سلوک (آرٹیکل 5)
(iv)۔ حقِ شناخت بطور ایک فرد، بہ نگاہِ قانون (آرٹیکل 6)
(v)۔ حقِ مساوات در نگاہِ قانون ومساوی، تحفظِ قانونی (آرٹیکل 7)
(vi)۔ حقِ مؤثر مداوا، اگر حقوق کی پامالی ہوئی ہو (آرٹیکل 8)
(vii)۔ آزادی از بے جا گرفتاری، نظر بندی یا ملک بدری (آرٹیکل 9)
(viii)۔ حقِ جائز ومروجہ انداز سماعت روبرو غیر جانبدار ٹریبونل (آرٹیکل 10)
(ix)۔ یہ حق کہ جرم ثابت ہونے سے قبل بے گناہ سمجھا جائے اور نافذ بہ ماضی فوجداری قانون سے تحفظ (آرٹیکل 11)
(x)۔ حقِ خلوت، خاندان، گھر یا خط وکتابت اور عزت وناموس کا تحفظ (آرٹیکل 12)
(xi)۔ حقِ آزادی نقل وحرکت اور رہائش (آرٹیکل 13)
(xii)۔ ظلم وستم سے تحفظ کے لئے پناہ گاہ کی تلاش کا حق (آرٹیکل 14)
(xiii)۔ حقِ قومیت (آرٹیکل 15)
(xiv)۔ حقِ شادی بیاہ اور خاندان سازی (آرٹیکل 16)
(xv)۔ حقِ ملکیتِ املاک (آرٹیکل 17)

(xvi)۔ حقِ آزادئ فکر،ضمیر اور مذہب (آرٹیکل 18)
(xvii)۔ حقِ آزادئ رائے اور آزادئ اظہار (آرٹیکل 19)
(xviii)۔ حقِ پُرامن اجتماع اور انجمن سازی (آرٹیکل 20)
(xix)۔ حقِ شمولیت درحکومت (آرٹیکل 21)
(xx)۔ حقِ معاشرتی تحفظ (آرٹیکل 22)
(xxi)۔ حقِ محنت اور انتخابِ ملازمت (آرٹیکل 23)
(xxii)۔ حقِ آرام وتفریحِ طبع (آرٹیکل 24)
(xxiii)۔ حقِ معیارِ زندگی،مناسب صحت اور خوشحالی (آرٹیکل 25)
(xxiv)۔ حقِ تعلیم (آرٹیکل 26)
(xxv)۔ ثقافتی زندگی میں شرکت کا حق (آرٹیکل 27)
(xxvi)۔ معاشرتی اور بین الاقوامی نظم میں سہولت کاری کا حق (آرٹیکل 28)

یہ حقوق اور ان کا ایک ایسی ہمہ گیر دستاویز میں اظہار جو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے تیار کی اور اس پر ووٹ دیا اس سے اس کی عالمی اہمیت کی عکاسی اور ان دانشوروں کی محنت کے عملی اطلاق کا اظہار رہوا۔

تحریک انسانی حقوق بنی نوع انسان کے وقار کے تحفظ اور اس کو سربلند رکھنے کا عزم کئے ہوئے ہے۔ انسانی وقار جس کا اظہار اقوام متحدہ کے منشور کے دیباچے میں بطور ایک نصب العین کیا گیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ 'ہم اقوام متحدہ کے لوگ بنیادی انسانی حقوق،ان کے وقار اور قدرومنزلت کی توثیق کرنے کا پختہ عزم رکھتے ہیں'۔

یہ اصطلاح عالمی اعلانِ انسانی حقوق کے دیباچے اور پہلے آرٹیکل میں بھی شامل ہے: ہرگاہ کہ انسانی خاندان کے تمام ارکان کے پیدائشی وقار کی شناخت یہ ہے (دیباچہ)؛ کہ تمام انسان بلحاظ اپنے وقار اور حقوق کے آزاد اور مساوی پیدا ہوئے ہیں۔ (آرٹیکل 1)۔ وقار (Dignity) لاطینی لفظ 'Dignitas' سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی ہیں 'قدروقیمت'۔ اس کا ایک لُغوی مفہوم قدرتی طور پر موجود ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ افراد سے دوسرے لوگوں کی مرضی کے مطابق محض اوزاروں اور اشیا جیسا سلوک نہ کیا جائے۔ اس کے اندر مضمر معنی یہ ہیں کہ سیاسی،معاشرتی اور قانونی لحاظ سے افراد کے پسندیدہ

عقائد، طرز زندگی، رویوں اور پبلک امور میں ان کے طریق کار کو اولین ترجیح دی جانی چاہیے۔

یہ عقیدہ کہ انسانی حقوق ایک شخص کے وقار میں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس کے دو ضمنی معنی ہیں: یہ تصور کہ بنیادی حقوق کسی اتھارٹی کے عطا کردہ نہیں ہیں۔ اس لئے وہ چھینے نہیں جا سکتے اور یہ تصور کہ ہر فرد کے حقوق ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی انسانی حقوق میں آزادیوں کی مائل بہ طوالت فہرست میں اب یہ امور بھی شامل ہو چکے ہیں: تنخواہ، حالاتِ کار (work conditions)، ٹریڈ یونینز، معیار زندگی، آرام و فراغت، بہبود و معاشرتی تحفظ، عورتوں اور بچوں کے حقوق اور ماحول۔

اسلام اپنے آغاز سے ہی انسانی حقوق کا علمبردار رہا ہے۔ احترام انسانیت کے جس تصور کا اعلان حضور نبی کریم ﷺ نے اپنے آخری حج، حجۃ الوداع کے خطاب میں فرمایا۔ اسلام کے قرونِ اولیٰ سے ہی تحریک حقوقِ انسانی کا رہنما اصول رہا ہے اور اس وقت اسی نے اسلام کو باقی دنیا سے ممیز کر دیا تھا۔ تاہم جدید دنیا میں وسیع مسلم آبادی نے انسانی حقوق کے تصور کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔ جنگ عظیم دوئم (WW-II) کے بعد کے زمانے میں صرف چند ایک مصنفین نے سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ (d 1979) کی طرح اس موضوع پر زورِ قلم دکھایا ہے۔ عصر حاضر کے بیشتر مسلمان انسانی حقوق کو مغرب کا سیاسی ایجنڈا سمجھتے ہیں کیونکہ انہیں مغربی قوتوں نے اپنی خارجہ پالیسی کے آلے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مسلم ریاستوں کے معاملات میں انسانی حقوق کا کوئی کلچر نہیں رہا۔ اگرچہ بعض دساتیر میں پاکستان کے دستور کی طرح بنیادی حقوق کے بہت مفصل ابواب موجود ہیں۔

بالآخر اسلامی کانفرنس کی تنظیم نے 1990ء میں اپنے قاہرہ (مصر) کے اجلاس میں اعلانِ قاہرہ برائے انسانی حقوق (Cairo Declaration on Human Rights in Islam) جاری کیا۔ یہ اعلان انسانی حقوق سے متعلق اسلامی نقشہ فراہم کرتا اور اس امر کی توثیق کرتا ہے کہ اسلامی شریعت ان حقوق کا واحد منبع ہے۔ 'Cairo Declaration on Human Rights in Islam' انسانی حقوق کے میدان میں اپنے ارکان (OIC) کی عمومی رہنمائی کے لئے اپنے نصب العین کا اعلان کرتا ہے۔ اس کو 1948ء میں جاری کردہ عالمی حقوق انسانی کے دستور پر ردعمل کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ یہ اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ UDHR کی قسم کے دیگر بہت سے حقوق کو بھی بیک وقت اسلامی روایات کے مطابق آگے بڑھایا جائے گا۔

باوجود اس طرح کی ایک ترقی پسندانہ تحریک کے، مسلم دنیا اب بھی خوفناک حد تک پیچھے ہے جو اس شعبے میں تحقیق اور انسانی حقوق پر عمل درآمد کی کوتاہی کی غمازی کرتی ہے۔ انسانی حقوق کی تحریک دنیا بھر میں پھیل کر ایک عالمگیر نصب العین بن چکی ہے لیکن ہم مسلمان عہد متوسط میں پھنسے ہوئے ذہنی رجحان کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ہمارے حکمران اپنے عوام کے ساتھ 'شہری' (citizens) کی بجائے اپنی 'رعایا' جیسا سلوک کر رہے ہیں۔ ان ممالک میں قانون کی حکمرانی کا کوئی تصور نہیں بلکہ قانون کی خلاف ورزی وقار اور اقتدار کی علامت بن چکی ہے۔

جمہوریت اور انسانی حقوق نے بنی نوع انسان کو بہت سی بیڑیوں سے آزاد کر دیا ہے۔ جس سے انسان کی غیر محدود امکانی قوت اور صلاحیت کے بند ٹوٹ گئے ہیں۔ اس کی تخلیقی قوتوں کو استعمال کر کے حالات کو بہتر بنایا جا رہا ہے اور ان سے انسانی فلاح و بہبود کے بہت سے کام لئے جا رہے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) برپا کر کے عوام کو غیر معمولی انسانی اور اقتصادی ترقی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ نئے ذرائع مواصلات (communication) نے عالمی تجارت کو بے پناہ فروغ دیا ہے۔ قانون کی حکمرانی اور بینکنگ آپریشنز نے ہر شعبے کو فقید المثال اقتصادی ترقی دی ہے۔ جب کہ ہم اس دنیا کے بہت سے اہم معاملات کو حرام[1] قرار دے رہے ہیں۔

[1]۔ اسلام کی تحریف کردہ تعبیر دنیاوی فوائد کو ممنوع قرار دیتی ہے۔

پانچواں باب

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات[1]

بلاشبہ مسلمانوں نے یورپ سے پہلے دنیا کو تمام علوم وفنون میں گراں قدر سرمایہ عطا کیا لیکن پھر امت خرافات میں کھو گئی اور امتِ مسلمہ کی اس کاہلی اور غفلت نے بالآخر اسے مکافاتِ عمل سے دوچار کر کے چھوڑا۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا[2]

مسلم تہذیب کو طرح طرح کے خطرات درپیش ہیں۔ یہ کوئی اچانک اور غیر متوقع امر نہیں تھا۔ اسے ہو کر ہی رہنا تھا کیونکہ مادی دنیا فطری قوانین کی تابعِ فرمان ہے۔فطرت اپنے قوانین کو تبدیل نہیں کرتی۔قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا [3]

(تم اللہ تعالیٰ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور تم کبھی نہ دیکھو گے کہ اللہ کی سنت کو اس کے مقرر راستے سے کوئی طاقت پھیر سکتی ہے)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ [4]

(حقیقت یہ ہے کہ اللہ عزوجل کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی)

مسلمانوں نے ان قوانین کی اطاعت نہیں کی بلکہ ان قوانین سے سرکشی کی ہے۔اس کے نتیجے میں ان کا سرِ غرور ٹوٹ کر پاتال میں جا گرا اور وہ تحت الثریٰ میں جا پہنچے۔آیئے دیکھتے ہیں کہ یہ کیسے ہوا:

---

[1]۔ابوالعلامعری؛ بال جبریل از محمد اقبالؒ

[2]۔خطاب بہ جوانانِ اسلام؛ بانگ درا از محمد اقبالؒ

[3]۔سورۃ فاطر: آیت:43

[4]۔سورۃ الرعد: آیت:11

1۔ تعلیمی پسماندگی

قرآن مجید میں بیان کردہ واقعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو شیطان (ابلیس) پر علم الاشیاء (مادی چیزوں کا علم) رکھنے کی وجہ سے برتری حاصل تھی۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ[1]

(اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام بتلائے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ؟)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی، اس کا آغاز 'اقراء' (پڑھو) سے ہوا تھا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ[2]

(اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے رب کے نام سے پڑھو جس نے پیدا کیا۔ اس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے۔ جس نے قلم سے تعلیم دی۔ انسان کو اس بات کی تعلیم دی جو وہ نہیں جانتا تھا)

یہ واضح ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک اسلامی روایت علم پر استوار ہے۔ اسلام میں علم پر اتنا زور دیئے جانے کی وجہ سے دنیا میں ایک فقید المثال ذہنی تحریک برپا ہوئی۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی بنیاد اسلام کی مرہون منت ہے[3]۔ حضرت محمد اقبالؒ (d. 1938) نے بالکل بجا کہا:

عہد نو با جلوہ ہا آراستہ
از غبار پائے ما برخاستہ[4]

---

[1]۔ سورۃ البقرہ: آیت: 31

[2]۔ سورۃ العلق: آیت: 1-5

[3]۔ تفصیل کے لیے دیکھیے باب 3

[4]۔ وقت سیف؛ اسرار خودی از محمد اقبالؒ

(یہ جدید تہذیب جو حُسن اور شان وشوکت سے آراستہ ہے، ہمارے قدموں سے اٹھنے والی خاک سے نکلی ہے)

حضرت اقبالؒ (d. 1938) کے اس بیان کو اسلامی تعلیمات کے اعلیٰ ترقی یافتہ قدیمی اداروں کی پُرزور تائید حاصل ہے۔ جامعہ قیروانیہ[1] جس کی بنیاد 859ء میں فاطمہ الفہری[2] اور اس کی ہمشیرہ مریم نے ڈالی تھی، جامعۃ الازہر جو 972ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس میں قانون، فلکیات، فلسفہ اور ادب کے شعبے تھے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں خواجہ نظام الملک[3] (d. 1092) نے متعدد جامعات قائم کیں: نظامیہ البغداد 1065ء میں قائم ہوئی۔ اسی طرح نظامیہ، طوس (ایران)، نیشاپور (ایران)، امول (ایران)، موصل (عراق)، ہرات (افغانستان)، دمشق (شام) اور بصرہ (عراق) میں قائم ہوئیں۔

جب مسلمانوں نے علمی مشاغل کو نظرانداز کرنا شروع کر دیا، مغرب نے شمعِ علم کو آگے بڑھاتے ہوئے پورے یورپ میں یونیورسٹیوں کا جال بچھا دیا۔ انہوں نے 300 سال سے کچھ زائد عرصے میں یونیورسٹی آف بولوگنا (University of Bologna, 1088)، یونیورسٹی آف پیرس، فرانس (University of Paris, 1150)، یونیورسٹی آف آکسفورڈ (University of Oxford, 1167)، یونیورسٹی آف کیمبرج (University of Cambridge, 1209)، یونیورسٹی آف سلامانکا، سپین (University of Salamanca, 1218)، یونیورسٹی آف مانٹپلائر،

---

[1] جامعہ قرویین یا جامعہ قیروانیہ مراکش کے شہر فاس میں واقع ایک جامعہ ہے جسے ایک مسلمان دولت مند تاجر محمد الفہری کی بیٹی فاطمہ الفہری نے 859ء میں تعمیر کروایا تھا۔ یہ جامعہ مسلم دنیا کے اہم تعلیمی مراکز میں سے ایک ہے اور دنیا کی سب سے قدیم جامعہ ہے جہاں آج تک تعلیم دی جاتی ہے۔ گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز اسے اب تک موجود دنیا کا سب سے قدیم تعلیمی ادارہ قرار دیتا ہے۔ جامعہ قیروانیہ نے قرون وسطیٰ میں یورپ اور اسلامی دنیا کے درمیان ثقافتی وراکادمی تعلقات میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ اس میں تعلیم حاصل کرنے والے معروف غیر مسلموں میں یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون (d. 1204) سب سے زیادہ مشہور ہے۔

[2] فاطمہ الفہری (800ء - 880ء) اور مریم الفہری ایک دولت مند عرب مسلم تاجر محمد الفہری کی بیٹیاں تھیں جنہوں نے مراکش کے شہر فاس میں 859ء میں جامعہ قیروانیہ تعمیر کروائی۔

[3] نظام الملک طوسی (1018ء - 1092ء) ایک اسلامی سکالر، قانون دان اور سلجوقی حکومت کا وزیر تھا۔ اس نے سلطنت کو قانونی شکل دینے کے لیے ایک نئے نظریے کی بنیاد رکھی۔ اسی ضمن میں اپنی مشہور کتاب سیاست نامہ لکھی۔ نظام الملک تعلیم نظام کی طرف خصوصی توجہ دیتے ہوئے متعدد تعلیمی ادارے قائم کئے۔

فرانس (University of Montpellier, 1220)، یونیورسٹی آف نیپلز (University of Naples, 1222)، یونیورسٹی آف تلوز، فرانس (University of Toulouse, 1229)، یونیورسٹی آف روم لا سیپانٹزے(University of Rome La Sapienze, 1303)، یونیورسٹی آف پیسا(University of Pisa, 1343)، یونیورسٹی آف ویانا (University of Vienna, 1365)، یونیورسٹی آف لپزنگ، جرمنی (University of Leipzing, Germany, 1409)، یونیورسٹی آف کاتانیا(University of Catania, 1434)، یونیورسٹی آف گلاسگو(University of Glasgow, 1451)، یونیورسٹی آف کوپن ہیگن (University of Copenhagen, 1479)، یونیورسٹی آف ایبرڈین (University of Aberdeen, 1494) میں قائم کر دیں۔ جبکہ یونیورسٹی آف پنجاب، پاکستان (University of Punjab, Pakistan, 1882) بھی ایک برطانوی مستشرق اور پادری جی ڈبلیولٹنر (G.W. Leitner) نے قائم کی تھی۔

مسلمانوں میں شرح خواندگی کے حوالے سے درج ذیل حقائق توجہ طلب ہیں:

(i)۔ آج مسلمان دنیا میں تعلیمی لحاظ سے پسماندہ ترین قوم ہیں۔

(ii)۔ مسلم ممالک میں تعلیم کا معیار اور شرح خواندگی دنیا بھر سے کم ہے۔

(iii)۔ دنیا میں اوسط شرح خواندگی 80 فیصد ہے جب کہ تنظیم اسلامی تعاون (OIC) کے مطابق ان ممالک میں اوسط شرح تعلیم بالغاں 72 فیصد ہے لیکن ذیلی صحرائی افریقہ اور جنوبی ایشیا میں یہ شرح مایوس کن حد تک کم ہے جو علی الترتیب 57 فیصد اور 55 فیصد ہے۔

(iv)۔ تنظیم اسلامی تعاون (OIC) کے ممالک کی مجموعی ملکی پیداوار (GDP) کا اوسطاً 2.7 فیصد تعلیم عامہ پر خرچ ہوتا ہے جبکہ عالمی سطح پر اس کا اوسط 4 فیصد ہے۔

(v)۔ اکیلے جاپان میں یونیورسٹیوں کی تعداد پوری مسلم دنیا کی یونیورسٹیوں سے زیادہ ہے۔ وہاں 778 قومی، پبلک اور نجی یونیورسٹیاں ہیں۔ پوری مسلم دنیا میں یونیورسٹیاں 600 سے کم ہیں جبکہ بھارت میں یونیورسٹیوں کی تعداد 8407 اور امریکہ میں 5758 ہیں۔

(vi)۔ ہارورڈ یونیورسٹی کا سالانہ بجٹ بہت سے اسلامی ممالک میں تعلیم پر خرچ ہونے والے مجموعی بجٹ سے زیادہ ہے۔

(vii)۔ آکسفورڈ یونیورسٹی ایک سال میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں 57 مسلم ممالک کی کل یونیورسٹیوں سے زیادہ تعداد میں جاری کرتی ہے۔

(viii)۔ 6.1 بلین مسلمانوں میں سے 300,000 سے بھی کم افراد سائنسدان بنتے ہیں۔ یہ تناسب فی ملین مسلمانوں میں سے 230 بنتا ہے۔امریکہ (USA) میں 1.1 ملین سائنسدان (4099 فی ملین) جب کہ جاپان میں 700,000 (5095 فی ملین) ہے۔

(ix)۔ مسلمان ممالک اپنے کل GDPs کا بہت کم حصہ تعلیم پر خرچ کرتے ہیں۔انڈونیشیا (3.6 فیصد) پاکستان (2.6 فیصد)، بنگلہ دیش (2.5 فیصد)، نائیجریا (3.4 فیصد) خرچ کرتا ہے۔

(x)۔ تیونس واحد اسلامی ملک ہے جو اپنے کل GDP کا 7.2 فیصد تعلیم پر خرچ کرتا ہے۔ یہ GDP فیصد کے حساب سے ان ممالک سے زیادہ ہے۔اسرائیل (6.3 فیصد)، فرانس (5.7 فیصد) اور برطانیہ (5.5 فیصد) سے زیادہ خرچ کر رہا ہے۔

(xi)۔ تیونس اپنے GDP کا جو 7.2 فیصد تعلیم پر خرچ کر رہا ہے وہ امریکہ کے 5.9 بلین ڈالر کے مساوی ہے۔ جبکہ فرانس اپنے GDP کا 5.7 فیصد تعلیم پر خرچ کر رہا ہے۔ جو امریکہ کے 121.4 بلین ڈالر کے برابر ہے۔ یہ بات صاف ظاہر کرتی ہے کہ 'فیصد' ہرگز پوری کہانی نہیں سناتا۔اس کیس میں فرانس تعلیمی شعبے میں تیونس سے 22 گنا زیادہ خرچ کر رہا ہے۔

(xii)۔ 2008 کی اکیڈمک رینکنگ آف ورلڈ یورنیورسٹیز (ARWU) کے مطابق فرانس کے پاس دنیا کی 500 ٹاپ یونیورسٹیوں میں سے 23 یونیورسٹیاں ہیں، ریپبلک آف کوریا کے پاس 8 اور اسرائیل کے پاس ایسی 6 یونیورسٹیاں ہیں جب کہ ترکی وہ واحد مسلمان ملک ہے جس کے پاس دنیا کی 500 ٹاپ یونیورسٹیوں میں سے ایک یونیورسٹی ہے۔

(xiii)۔ عالمی یونیورسٹیوں کی 'دی ٹائمز ہائر ایجوکیشن رینکنگ' میں آٹھ مسلمان ممالک (ترکی، ملائشیا، انڈونیشیا، پاکستان، سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات) شامل ہیں۔ان کے پاس 500 ورلڈ کلاس یونیورسٹیوں میں سے صرف 18 یونیورسٹیاں ہیں۔

(xiv)۔ یونیسکو کے مطابق تیسرے درجے (ثانوی تعلیم کے بعد) کے علمی اداروں میں داخلے کی سب سے زیادہ شرح (53 فیصد) قازقستان میں ہے۔جس کے بعد ایران اور ترکی (35 فیصد)، تیونس اور سعودی عرب (31 فیصد)، نائجر، برکینا فاسو اور افغانستان میں 2.5 فیصد سے کم ہے۔ جنوبی کوریا، برطانیہ، اسرائیل اور فرانس میں تیسرے درجے کی سطح میں داخلے کی شرح علی الترتیب 93 فیصد، 59 فیصد، 58 فیصد اور 56 فیصد ہے۔

(xv)۔ بیشتر مسلم ممالک میں استاد شاگرد کا تناسب پرائمری سطح پر سب سے زیادہ ہے۔ مالی میں یہ تناسب 56 شاگرد فی استاد تک جا پہنچتا ہے۔ برکینا فاسو میں 46، گنی میں 45، نائجر میں 40، پاکستان اور سینیگال میں ایک استاد کے لئے 39 شاگرد ہیں۔ اس سے بالکل برعکس صورت حال یہ ہے کہ اسرائیل میں ایک استاد کے لئے 14 شاگرد (14:1)، برطانیہ اور فرانس میں یہ تناسب 18:1 ہے جب کہ جنوبی کوریا میں پرائمری سکول میں ہر استاد کو صرف 26 طلبا کو پڑھانا ہوتا ہے۔

افراد پر تعلیم کے اثرات اور ان کے کامیابی کے اعلیٰ ترین سطح پر پہنچنے کی ایک جھلک دیکھنی ہو تو آیئے ہم نوبیل پرائز جیتنے والوں میں مسلمانوں اور مسلم ممالک میں رہنے والوں اور یہودیوں کے تناسب کا ملاحظہ کرتے ہیں:

مسلم دنیا سے نوبیل پرائز جیتنے والے افراد کی فہرست جن کی دنیا میں کل آبادی ایک ارب 60 کروڑ ہے۔ یعنی دنیا کی کل آبادی کا 23 فیصد	**یہودی نوبیل پرائز یافتہ افراد کی فہرست جن کی دنیا میں کل آبادی ایک کروڑ 20 لاکھ ہے۔ یعنی دنیا کی کل آبادی کا 0.2 فیصد**

ادب (Literature)

1988۔ نجیب محفوظ (Naguaib Mahfouz)	1910۔ پال ہیسی (Paul Heyse)
2006۔ ارحان پاموک (Orhan Pamuk)	1927۔ ہنری برگسان (Henri Bergson)
	1958۔ بورس پیٹرناک (Boris Pasternak)

1966۔سیموئل یوسف اگنن
(Shmuel Yosef Agnon)
1966۔نیلی سیکس(Nelly Sachs)
1976۔ساؤل بیلو(Saul Bellow)
1978۔آئزک بشولیس سنگر
(Issac Bashevis Singer)
1981۔الیاس کینیٹی (Elias Canetti)
1987۔جوزف براڈسکی(Joseph Brodsky)
1991۔ناڈین گاڈیمر(Nadine Gordimer)
2002۔ایمرے کرٹسز(Imre Kertesz)
2005۔ہیرالڈ پنٹر (Harold Pinter)
2014۔پیٹرک موڈیانو(Patrick Modiano)

امن (Peace)

1978۔انورالسادات
(Anwar El-Sadat)
1994۔یاسر عرفات
(Yasser Arafat)
2003۔شیریں عبادی
(Shirin Ebadi)
2005۔محمد البرادی
(Mohamed El-Baradei)
2006۔محمد یونس
(Mohammed Yunus)

1911۔الفریڈ فرائیڈ(Alfred Fried)
1911۔توبیاس اسر(Tobias Asser)
1968۔رینے کیسن(Rene Cassin)
1973۔ہنری کسنگر(Henry Kissinger)
1978۔مناہم بیگن(Menachem Begin)

2011۔توکل کامران
(Tawakel Kamran)

2014۔ملالہ یوسف زئی
(Malala Yousafzai)

2015۔تیونسی قومی مذاکراتی ٹیم
(TunisianNational
Dialogue Quarter)

کیمیا (Chemistry)

1999۔احمد زیویل
(Ahmed Zewail)

2015۔عزیز سنکار
(Aziz Sancar)

1986۔ایلی وائزل(Elie Wiesel)

1994۔شمعون پیریز(Shimon Peres)

1994۔یٹشیک رابین(Yitzhak Rabin)

1995۔جوزف روٹبلاک(Joseph Rotblat)

1905۔اڈولف فان بائر(Adolph Von Baeyer)

1906۔ہنری موائسن (Henri Moissan)

1910۔اوٹو والاش(Otto Wallach)

1915۔رچرڈ ولسٹیٹر (Richard Willstaetter)

1918۔فرٹنر ہیبر (Fritz Haber)

1943۔جارج چارلس ڈی ہیورسی
(George Charles de Hevesy)

1961۔میلوین کیلوین(Melvin Calvin)

1962۔میکس فرڈیننڈ پروٹنر
(Max Ferdinand Perutz)

1972۔ولیم ہاورڈ سٹین
(William Howard Stein)

1972۔سی بی الفنسن (C. B. Anfinsen)

1977۔ ایلیا پریگاجن(Ilya Prigogine)

1979۔ ہربرٹ چارلس براؤن

(Herbert Charles Brown)

1980۔ پال برگ(Paul Berg)

1980۔ والٹر گلبرٹ(Walter Gilbert)

1981۔ رونالڈ ہافمین(Ronald Hoffmann)

1982۔ ہارون کلگ (Aaron Klug)

1985۔ ہربرٹ اے ہاپٹمین

(Herbert A. Hauptman)

1985۔ جیردم کارلے(Jerome Karle)

1986۔ ڈڈلے آر ہرشباخ

(Dudley R. Herschbach)

1988۔ رابرٹ ہوبر(Robert Huber)

1989۔ سڈنی آلٹمین(Sidney Altman)

1992۔ روڈولف مارکس(Rudolph Marcus)

1998۔ والٹر کوہن(Walter Kohn)

2000۔ الن جے ہیگر(Alan J. Heeger)

2004۔ اروین روز(Irwin Rose)

2004۔ ہارون ہرشکو(Aaron Hershko)

2004۔ ہارون سیچانوور(Aaron Ciechanover)

2006۔ راجر ڈی کورنبرگ(Roger D. Kornberg)

2008۔ مارٹن چلفائی(Martin Chalfie)

2009۔ ادایوناتھ(Ada Yonath)

2011۔ ڈین شیکٹمین(Dan Shechtman)

2012۔رابرٹ لیفکووٹز(Robert Lefkowitz)
2013۔ایرائی ورشل(Arieh Warshel)
2013۔مائیکل نیوبٹ(Michael Levitt)
2013۔مارٹن کارپلس(Martin Karplus)

اقتصادیات(Economics)

کوئی نہیں

1970۔پال انتھونی سیموئلسن
(Paul Anthony Samuelson)
1971۔سائمن کوزنیٹس(Simon Kuznets)
1972۔کینتھ جوزف آرو
(Kenneth Joseph Arrow)
1973۔واسیلی لیونٹیف(Wassily Leontief)
1975۔لیونیڈ کینٹوروش(Leonid Kantorovich)
1976۔ملٹن فرائیڈ مین(Milton Friedman)
1978۔ہربرٹ اے سائمن(Herbert A. Simon)
1980۔لارنس رابرٹ کلین
(Lawrence Robert Klein)
1985۔فرانکو موڈگلیانی(Franco Modigliani)
1987۔رابرٹ ایم سولو(Robert M. Solow)
1990۔ہیری مارکووٹز(Herry Markowitz)
1990۔مرٹن ملر(Merton Miller)
1992۔گیری بیکر(Gary Becker)
1993۔رابرفوجل(Robert Fogel)
1994۔جوہن ہرسینی(Johan Harsanyi)
1994۔رینہارڈ سیلٹن(Reinhard Selten)

1997۔رابرٹ مارٹن(Robert Merton)

1997۔مائرن شولز(Myron Scholes)

2001۔جارج اکرلوف(George Akerlof)

2001۔جوزف سٹگلٹز(Joseph Stiglitz)

2002۔ڈینیل کاہنمین(Daniel Kahneman)

2004۔رچرڈ ایکسل(Richard Axel)

2005۔رابرٹ جے اومن(Robert J. Aumann)

2007۔لیونیڈ ہروکز(Leonid Hurwicz)

2007۔ایرک مسکن(Eric Maskin)

2007۔راجر مائرسن(Roger Myerson)

2008۔پال کرگمین(Paul Krugman)

2010۔پیٹر ڈائمنڈ(Peter Diamond)

2012۔ایلوین ای روتھ(Alvin E. Roth)

فزیالوجی/میڈیسن (Physiology/Medicine)

کوئی نہیں

1908۔ایلی میچنیکوف(Eli Metchnikoff)

1908۔پال ایرلک(Paul Erlich)

1914۔رابرٹ برینی(Robert Barany)

1922۔اوٹو میرہوف(Otto Meyerhof)

1930۔کارل لینڈسٹینر(Karl Landsteiner)

1931۔اوٹو واربروگ(Otto Warbrug)

1936۔اوٹو لووی(Otto Loewi)

1944۔جوزف ارلینگر(Joseph Erlanger)

1944۔ہربرٹ سپنسر گیسر

(Herbert Spencer Gasser)

1945۔ارنسٹ بورس چین(Ernst Boris Chain)

1946۔ہرمن جوزف مُلر

(Herman Joseph Muller)

1947۔گیرٹی کوری(Garty Cori)

1950۔ٹیڈیس ریشسٹین(Tadeus Reichstein)

1952۔سلمان ابرہام وکسمین

(Selman Abraham Waksman)

1953۔ہینس کربس(Hans Krebs)

1953۔فرٹز البرٹ لپمین

(Fritz Albert Lipmann)

1958۔جوشوا لیڈر برگ(Joshua Lederberg)

1959۔آرتھر کورنبرگ(Arthur Kornberg)

1964۔کونراڈ بلوچ(Konrad Baloch)

1965۔فرینکوائس جیکب(Francois Jacob)

1965۔آندرے لووف(Andre Lwoff)

1967۔جارج ویلڈ(George Wald)

1968۔مارشل ڈبلیو نرنبرگ

(Marshall W. Nirenberg)

1969۔سلواڈور لوریا(Salvador Luria)

1970۔جولیئس ایکسلراڈ(Julius Axelrod)

1970۔سر برنارڈ کاٹز(Sir Bernard Katz)

1972۔جیرالڈ ماریس ایڈلمین

(Gerald Maurice Edelman)

1975۔ڈیوڈ بالیٹمور(David Balimore)

1975۔ہاورڈ مارٹن ٹیمین

(Howard Martin Temin)

1976۔براخ ایس بلمبرگ

(Baruch S. Blumberg)

1977۔روزالین سسمین ییلو

(Rosalyn Sussman Yellow)

1977۔اینڈریو وی شیلی(Andrew V. Schally)

1978۔ڈینیل نتھانس(Daniel Nathans)

1980۔بروج بیناسرّاف(Baruj Benacerraf)

1982۔سرجان وینی(Sir John Van)

1984۔سیزر ملسٹین(Cesar Milstein)

1985۔مائیکل سٹوارٹ براؤن

(Michael Stuart Brown)

1985۔جوزف ایل گولڈسٹین

(Joseph L. Goldstein)

1986۔ریٹالیوی مونٹالسینی

(Rita Levi Montalcini)

1986۔سٹینلے کوہن(Stanley Cohen)

1988۔جرٹروڈ ایلین(Gertrude Elion)

1989۔ہیرالڈ ورمس(Harold Varmus)

1991۔ایروین نیہر(Erwin Neher)

1991۔برٹ سکمان(Bert Sakmann)

1992۔ایڈمنڈ فشر(Edmond Fischer)

1993۔رچرڈ جے رابرٹس(Richard J. Roberts)

1994۔فلپ شارپ(Phillip Sharp)
1994۔الفریڈ گلمین(Alfred Gilman)
1994۔مارٹن روڈ بیل(Martin Rodbell)
1995۔ایڈورڈ بی۔لیوس(Edward B. Lewis)
1997۔سٹینلے بی۔پروزینر(Stanley B. Prusiner)
1998۔رابرٹ ایف۔فرشگاٹ
(Robert F. Furchgott)
2000۔ایرک آر۔کینڈل(Eric R. Kandel)
2000۔پال گرینگارڈ(Paul Greengard)
2002۔سڈنی برینر(Sydney Brenner)
2002۔رابرٹ ایچ۔ہورونز(Robert H. Horvitz)
2004۔رچرڈ ایکسل(Richard Axel)
2006۔اینڈریو فائر(Andrew Fire)
2011۔رالف ایم سٹینمین(Ralph M. Steinman)
2011۔بروس بیوٹلر(Bruce Beutler)
2013۔جیمز ای۔روتھمین(James E. Rothman)
2013۔رینڈی شکمین(Randy Schekman)

طبیعیات (Physics)

1979۔ عبدالسلام
(Abdus Salam)

1907۔البرٹ ابراہام مشلسن
(Albert Abraham Michelson)
1908۔گیبرائل لپمین(Gabriel Lippmann)
1921۔البرٹ آئن سٹائن(Albert Einstein)
1922۔نائلس بوہر(Niels Borh)
1925۔جیمز فرینک(James Franck)

1925۔گستاف ہرٹز(Gustav Hertz)

1943۔گستاف سٹرن(Gustav Stern)

1944۔ایسوڈور آئزک ربی(Isidor Issac Rabi)

1945۔وولف گینگ پالی(Wolf Pauli)

1952۔فلیکس بلوچ(Felix Bloch)

1954۔میکس بارن(Max Born)

1958۔ا یگورٹم(Igor Yevgenyevich)

1958۔الجامیخائیلووچ(Il'ja Mikhailovich)

1958۔ا یگور یوجینی وچ(Igor Yevgenyevich)

1959۔ایمیلیو سگرے(Emilio Segre)

1960۔ڈونلڈ اے گلیزر(Donald A. Glaser)

1961۔رابرٹ ہافسٹیڈٹر(Robert Hofstadter)

1962۔لیوڈیوڈووچ لنڈا

(Lev Davidovich Landau)

1963۔یوجین پی وگنر(Eugene P. Wigner)

1965۔رچرڈ فلپس فینمیں

(Richard Phillips Feynman)

1965۔جولین شونگر(Julian Schwinger)

1967۔ہنیز البرخت بیتھی

(Hans Albrecht Bethe)

1969۔مرے جیل مین(Murray Gell Mann)

1971۔ڈینس گیبر(Dennis Gabor)

1972۔لیون این کوپر(Leon N. Cooper)

1973۔ برہان ڈیوڈ جوزفسن

(Brain David Josephson)

1975۔ بنجمین موٹلسن (Benjamin Mottleson)

1976۔ برٹن رکٹر (Burton Richter)

1978۔ ارنو ایلن پینزیاس

(Arno Allan Penzias)

1978۔ پیٹر ایل کپٹزا (Peter L. Kapitza)

1979۔ سٹیفن وینبرگ (Stephen Weinberg)

1979۔ شیلڈن گلاشو (Sheldon Glashow)

1988۔ لیون لیڈرمین (Leon Lederman)

1988۔ میلوین شوارٹز (Melvin Schwartz)

1988۔ جیک سٹینبرگ (Jack Steinberger)

1990۔ جیروم فرائیڈمین (Jerome Friedman)

1992۔ جارجز چرپک (Georges Charpak)

1995۔ مارٹن پرل (Martin Perl)

1995۔ فریڈرک ریز (Frederick Reines)

1996۔ ڈیوڈ ایم لی (David M. Lee)

1996۔ ڈگلس ڈی اوشروف

(Douglas D. Osheroff)

1997۔ کلاڈ کوہن ٹنوجی

(Claude Cohen-Tannoudji)

2000۔ زہوریز آئی۔ الفروف

(Zhores I. Alferov)

2003۔ ویٹالی جنزبرگ (Vitaly Ginsburg)

2003۔ الیکسی ابریکوسوف (Alexei Abrikosov)

2004۔ ڈیوڈ گراس (David Gross)

2004۔ ایچ ڈیوڈ پولٹزر (H. David Politzer)

2005۔ رائے گلابر (Roy Glauber)

2011۔ ایڈم رائس (Adam Riess)

2011۔ سادل پرلیمٹر (Saul Perlmutter)

2012۔ سرج ہیروشے (Serge Haroche)

2013۔ فرینکوائس اینگلرٹ (Francois Englert)

نوبیل پرائز ایک سالانہ بین الاقوامی انعام ہے جو سب سے پہلے 1901ء میں فزکس، کیمسٹری، فزیالوجی، میڈیسن، لٹریچر اور امن کے سلسلے میں بہترین کارناموں پر دیا گیا تھا۔ اکنامکس پر یہ 1969ء سے دیا جا رہا ہے۔ نوبیل انعامات 850 سے زائد افراد کو دیا گیا ہے۔ ان میں سے کم سے کم 20 فیصد یہودی ہیں باوجود اس حقیقت کے کہ وہ دنیا کی کل آبادی کا 0.2 فیصد سے بھی کم ہیں۔ مجموعی طور پر انہوں نے اکنامکس میں 41 فیصد، میڈیسن میں 28 فیصد، فزکس میں 26 فیصد، کیمسٹری میں 19 فیصد، لٹریچر میں 13 فیصد اور شعبۂ امن میں 9 فیصد یہ انعامات حاصل کئے۔ یہودیوں نے چھ کے چھ زمروں میں یہ انعامات پائے۔ دوسری جانب ایک پاکستانی عبدالسلام نے فزکس میں یہ انعام پایا۔ اس کا تعلق قادیانی/احمدی فرقے سے تھا جس کو 1974ء میں پاکستان کی پارلیمان غیر مسلم قرار دے چکی ہے۔ احمد زیول (مصر) اور عزیز سنکر (ترکی)، مسلم دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر انہوں نے تعلیم اور تحقیق کا کام امریکہ میں کیا ہے۔ مزید برآں دیگر نوبیل انعام یافتہ مسلمان عامۃ المسلمین کی نظر میں غیر عملی قسم کے مسلمان ہیں۔

2۔ غربت

مسلمانوں کے اقتصادی حالات افسوسناک حد تک خراب ہیں۔ 'تنظیم برائے اسلامی تعاون' (OIC) کی معیشت 57 ممالک کی معیشتوں کا مجموعہ ہے جن میں سے 49 ممالک زیادہ تر مسلم ریاستیں ہیں دیگر 8 ممالک میں کافی بڑی مسلم اقلیتیں ہیں۔ ان 57 ملکوں کا مجموعی GDP at Purchasing Power Parity: PPP 7.7 کھرب امریکی ڈالر ہے۔ جاپان کا GDP 4.7 کھرب امریکی

ڈالر ہے۔ امریکہ (US) کا GDP، 18.7 کھرب ڈالر ہے اور چین کا GDP، 16 کھرب امریکی ڈالر ہے۔

پاکستان اور افغانستان کی فی کس آمدنی تقریباً علی الترتیب 5000 (امریکی) ڈالر اور 1900 (امریکی) ڈالر ہے۔ جب کہ سنگاپور اور سوئٹزرلینڈ کی فی کس آمدنی علی الترتیب 83000 (امریکی) ڈالر اور 53000 (امریکی) ڈالر ہے۔

3۔ صحت

مسلم دنیا میں 'متوقع انسانی عمر' (life expectancy) 50 برس ہے جبکہ جاپان اور فرانس میں یہ عمر 80 برس ہے۔ ملاوی میں 43 برس اور افغانستان میں 51 برس ہے۔ مغرب نے سائنسی اور طبی ترقی کی بدولت عمر کو طوالت دینے اور موت کے امکانات کو کم کرنے میں کافی کامیابیاں حاصل کر لی ہیں جبکہ بہت سے مسلمان مناسب علاج معالجے سے بے نیاز ہو کر 'راضی بہ رضائے مولیٰ' ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مناسب علاج کرانا اسلامی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔ زندگی خالقِ ارض و سما کی دی ہوئی ایک امانت ہے اس کی کما حقہ، حفاظت کی جانی چاہیے۔ مسلمانوں کو درج ذیل حقائق پر لازماً غور و فکر کرنا چاہیے۔

(i)۔ مسلم ممالک کے صحت پر اخراجات ان کے GDP کے لحاظ سے فیصد تناسب، دنیا کے اوسط کے تقریباً نصف ہیں۔

(ii)۔ مسلم دنیا کے تقریباً 30 لاکھ افراد ہر سال ٹی بی کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان میں سے نصف موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔

(iii)۔ پانچ مسلم ممالک افغانستان، پاکستان، نائیجیریا، انڈونیشیا اور بنگلہ دیش دنیا کی ان 22 قوموں میں شامل ہیں جن میں ٹی بی کی بیماری سب سے زیادہ پھیلتی ہے۔

(iv)۔ اگر ہم اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے اشاریئے 'HDI' پر نظر ڈالیں تو ترقی یافتہ ممالک ناروے، ڈنمارک، سویڈن، سوئٹزرلینڈ اور نیدرلینڈ اپنے شہریوں کو اعلیٰ ترین درجے کا معیار زندگی فراہم کرتے ہیں۔ جہاں اوسط 'HDI' اشاریہ 0.93 ہے۔ امریکہ، کینیڈا، نیوزی لینڈ اور سنگاپور کا 'HDI' ان سے ذرا نیچے 0.90 ہے۔ اس فہرست میں اسرائیل 18 ویں نمبر پر

قطر 32 ویں نمبر پر، سعودی عرب 39 ویں، متحدہ عرب امارات 41 ویں اور کویت 48 ویں نمبر ہے۔

(v)۔ ایک مسلمان ملک بھی ایسا نہیں جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ اپنے شہریوں کو'HDI' کے شمار (کاؤنٹ) کے اوسط سے کچھ زائد دیتا ہے۔ اگرچہ چھوٹی ریاستیں قطر اور کویت وافر وسائل رکھتی ہیں۔

(vi)۔ یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں جن ممالک کا'HDI' کاؤنٹ سب سے کم ہے ان میں سے زیادہ تر مسلمان ممالک ہیں۔ پاکستان اس فہرست میں ایک بدقسمت اندراج والا ملک ہے، جس کی 'HDI' 0.538 فیصد ہے اور یہ افغانستان، سوڈان، نائیجریا، مالی اور سیرا الیون کا ہمرکاب ہے۔

(vii)۔ ان زیادہ تر نچلے'HDI' والے مسلم ممالک میں متوقع زندگی 62 سال کے اردگرد گھومتی ہے جب کہ سرفہرست 10 ممالک میں اوسط عمر 80 سال تک ہو چکی ہے۔

(viii)۔ صنعتی ترقیاتی اشاریئے کے لحاظ سے مسلم ممالک میں قطر 32 ویں نمبر پر ہے جبکہ سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور اردن اس سے ذرا قریب ہیں۔ تاہم حسبِ توقع بیشتر مسلمان ممالک 188 ملکوں کی اس فہرست میں بنگلہ دیش کے ہمراہ 142 ویں، پاکستان 147 ویں، افغانستان 171 ویں اور سیرا الیون 181 ویں نمبر پر ہیں۔

4۔ تحقیق و ترقی

مسلم ممالک میں تحقیق و ترقی کی صورتِ حال بھی حوصلہ افزا نہیں رہی ہے۔ جس کی عکاسی درج ذیل حقائق سے ہوتی ہے۔

(i)۔ کسی ملک کے مستقبل میں ترقی سے ہمکنار ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس نے تحقیق و ترقی (Research and Development) پر کتنی رقم خرچ کی ہے۔ 80 فیصد ترقی یافتہ ممالک اس کام پر کم و بیش خرچ کرتے ہیں۔ ان میں سے امریکہ 33.5 فیصد، یورپ 23.5 فیصد اور جاپان 13.4 فیصد خرچ کرتا ہے۔

(ii)۔ عالمی سطح پر 2010ء میں تحقیق و ترقی پر مجموعی طور پر ایک کھرب ڈالرز خرچ ہوئے[1] سرفہرست

1۔ www.royalo. country.org

رہنے والے 10 ممالک میں سے امریکہ نے 473 بلین (ارب) جبکہ چین نے 370 ارب ڈالر خرچ کئے۔

(iii)۔ ترکی 15.3 بلین اور پاکستان 2.4 بلین خرچ کرتا ہے۔ تیل کی بدولت سے مالا مال ملک سعودی عرب تحقیق وترقی پر صرف 1.8 ارب ڈالر حقیر رقم خرچ کرتا ہے[1]۔

(iv)۔ اوسطاً صرف 649 مسلم محقق فی دس لاکھ (ملین) آبادی ہیں۔

(v)۔ یہ اعداد وشمار اس وقت مزید پریشان کن دکھائی دیتے ہیں جب ان کا موازنہ یورپ سے کیا جائے جہاں فی ملین آبادی میں اوسطاً 6494 محققین ہیں۔

(vi)۔ تنظیم برائے اسلامی تعاون (OIC) کی رپورٹ ہے کہ اس میں محققین کی کل تعداد میں سے خواتین تقریباً 26.8 فیصد ہیں۔ جب کہ عالمی سطح پر یہ اوسط 29.5 فیصد اور یورپ میں 34.4 فیصد بنتی ہے۔

5۔ عسکری کمزوری

مسلمانوں کو قرآن کریم نے حکم[2] دیا ہے کہ وہ خود کو تیار رکھیں اور اتنی قوت جمع کرتے رہیں کہ اپنے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرسکیں۔ جبکہ اصل صورت حال یہ ہے کہ اس وقت ہم دنیا کی کمزور ترین امت ہیں[3]۔ جیسا کہ ہم افغانستان کو تباہ ہوتے دیکھتے رہے ہیں اگرچہ بعض لوگوں کے قریب یہ ایک صحیح اسلامی ریاست تھی پھر اسے کیا ہوا؟ ذرا 'تورابورا' کو دیکھ لیجئے۔ پہاڑوں تک کو تباہ و برباد کردیا گیا۔ افغانستان کے بعد لیبیا، عراق اور شام بھی تباہ ہوگئے۔ یہ سب اکیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ہوا ہے۔

---

[1]۔ www. sesrtaic.org

[2]۔سورۃ الانفال: آیت: 60 وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (تم سے جس قدر ہو سکے اِن کے لیے فوج اور بندھے ہوئے گھوڑے تیار رکھو جس سے اللہ کے دشمنوں پر اور تمھارے اِن دشمنوں پر تمھاری ہیبت رہے اور اِن کے علاوہ دوسروں پر بھی جنہیں تم نہیں جانتے ہو، اللہ اُنھیں جانتا ہے)

[3]۔امریکہ کا سالانہ دفاعی بجٹ 640 بلین (ارب) ڈالر ہے جبکہ تمام مسلم ممالک کا مجموعی دفاعی بجٹ بھی اس کا صرف نصف بنتا ہے۔

عراق میں مسلمانوں کے بعض مقدس مقامات ہیں: ان میں روضہ ہائے حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) شامل ہیں۔ حالیہ برسوں میں غیر ملکی افواج نے اس ملک کو اپنے قدموں تلے روندا اور ہمارے مقدس مقامات کو برباد کر کے رکھ دیا۔ مسلم ممالک نے امریکیوں کے حملے کی صرف زبانی کلامی مذمت کی۔ تنظیم برائے اسلامی تعاون (OIC) نے اس حملے کی مخالفت میں چند قراردادیں منظور کیں، جو بالکل بے اثر رہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ اس کانفرنس کے چند رکن ممالک نے عراق پر حملے کے لئے اپنے اڈے تک فراہم کر دیئے۔ ذیل کے اعداد و شمار پر نظر ڈالنے سے صورت حال مزید واضح ہو جائے گی۔

(i)۔ دنیا کے دس سرفہرست ممالک ہر سال مجموعی طور پر 1100 بلین ڈالر دفاع پر خرچ کرتے ہیں۔ ان میں سب سے آگے امریکہ ہے جو 598 بلین ڈالر اور اس کے بعد دوسرے نمبر پر چین ہے جو 215 بلین ڈالر خرچ کرتا ہے۔ اس فہرست میں سعودی عرب واحد مسلم ملک ہے جو اپنی افواج پر 87 بلین ڈالر خرچ کرتا ہے۔

(ii)۔ فوجی قوت بہ لحاظ مہارت اور عملیاتی کارکردگی ایک خاص حد تک ان اخراجات کی عکاسی کرتی ہے جبکہ امریکہ، چین اور روس آگے آگے ہیں۔ تاہم مسلم دنیا میں پاکستان بمشکل ہی اس فہرست میں آتا ہے جبکہ سعودی فوج اپنے بے پناہ بجٹ کے باوجود اس کی اہل شمار نہیں ہوتی۔

(iii)۔ ٹینکوں کی لڑائی ہو تو روس کے پاس یہ 22,710 ہیں۔ اس لئے وہ دنیا میں اس شعبے میں اول نمبر پر ہے جبکہ امریکہ اور چین کے پاس 9، 9 ہزار ٹینک ہیں۔ مسلم ممالک میں سے شام کے پاس 4750، مصر کے پاس 4145، پاکستان کے پاس 4000 اور ترکی کے پاس 3760 ٹینکس ہیں۔ مسلمان ملکوں کی جنگی ضروریات اس امر کی متقاضی ہیں کہ ان کے ٹینک تعداد اور معیار کے لحاظ سے امریکہ، برطانیہ اور فرانس کے ہم پلہ ہوں۔ ان ممالک نے یہ معیار ایسے طاقتور آپریشنل یونٹوں کے ذریعے حاصل کیا ہے جو بے حد مستعد، تیز رفتار اور ہیبت ناک ہیں کیونکہ ان کی بنیاد فنیاتی برتری اور اختراع پسندی پر رکھی گئی ہے۔

(iv)۔ مسلمان ملکوں کی فوجیں عشروں پرانے لڑاکا طیاروں کو گھسیٹے جا رہی ہیں جبکہ جدید فوجیں اور ان کی فضائی افواج جست لگا کر بغیر پائلٹ پرواز کرنے والے طیاروں تک جا پہنچی ہیں۔ انہوں

نے دکھائی نہ دینے والے پھرتیلے طیاروں کے ذریعے طویل دورانیہ کی صلاحیت اور انتہائی درست نشانہ بازی کے نئے نئے ریکارڈ قائم کر لئے ہیں۔

6۔ سیاسی جبروتشدد

آیئے اب مسلم دنیا کے سیاسی نظاموں پر ایک نظر ڈالیں۔ ایک بھی ایسا مسلمان ملک نہیں ہے جس کا سیاسی ڈھانچہ مکمل طور پر 'شوریٰ' (باہمی مشاورت) پر استوار ہو۔

افغانستان میں جناب ملا محمد عمر (d. 2013) کی اسلامی ریاست تھی۔ وہ ایک عالم دین تھے جن کا ملک پر مکمل کنٹرول تھا اور وہ بے پناہ اثر ورسوخ رکھتے تھے۔ انہیں اپنی طرز کا اسلامی نظام متعارف کرانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ انہوں نے ایسی شریعت نافذ کی جیسی وہ جانتے تھے۔ مگر انہوں نے کیا کیا تھا؟ انہوں نے سخت گیر احکامات دیئے۔ مثال کے طور پر جس کسی کی داڑھی چھوٹی ہو یعنی مٹھی بھر مقدار سے کم ہوتی تھی اسے سزا ملتی تھی۔ بعض اوقات چھوٹی داڑھی والوں کو ایک کینٹینر میں بند کر دیا جاتا تھا۔ کیونکہ ان کے ہاں جیلوں کی کمی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شمالی اتحاد[1] والے مزار شریف[2] کے علاقے میں انہیں شکست دینے کے بعد طالبان قیدیوں کو کینٹنروں کے اندر بند کر دیتے تھے۔ جہاں وہ پیاس اور دم گھٹنے کی وجہ سے جاں بحق ہو جاتے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظام ہے کہ ظلم سے ظلم جنم لیتا ہے۔

طالبان نے کمال درجے کی بے اعتنائی کے ساتھ ایک مذہبی اقلیت کے مذہبی آثار تباہ کئے۔ یہ بودھ مت کی وہ باقیات تھیں جو ہزاروں سال سے صوبہ بامیان[3] میں ایستادہ تھیں۔ دنیا بھر نے اس توڑ پھوڑ کی شدید مذمت کی مگر طالبان نے کسی کی نہ سنی۔ انہیں یہ بھی خیال نہ آیا کہ افغانستان کو خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دور میں فتح کیا گیا تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ان جلیل القدر صحابہ میں سے تھے جنہوں نے کعبے میں بتوں کو توڑا تھا۔ لیکن یہاں انہوں نے بودھ مت کے ان مذہبی آثار کو تباہ نہیں کیا تھا۔

---

[1]۔ شمالی اتحاد ایک اتحاد کا نام ہے جو اسلامی امارت افغانستان کو ختم کرنے کے لئے مختلف ممالک کے تعاون سے بنایا گیا تھا۔ اس اتحاد کی سربراہی احمد شاہ مسعود اور عبدالرشید دوستم سمیت دیگر لوگ کر رہے تھے۔ شمالی اتحاد کے حق میں تاجکستان، ازبکستان، ترکمانستان، ترکی، روس، بھارت اور امریکہ تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ افغانستان سے طالبان کی حکومت ختم کی جائے۔

[2]۔ مزارِ شریف شمالی افغانستان میں تاجکستان کی سرحد پر آباد فوجی اعتبار سے اہم شہر ہے۔ اسے مزار شریف اس لیے کہتے ہیں کہ یہاں ایک نہایت وسیع مزار ہے جس کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ دفن ہیں۔

[3]۔ بامیان افغانستان کا ایک صوبہ ہے جو ملک کے عین وسط میں واقع ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے بھی ان آثار کو تباہ کرنے کا نہیں سوچا حتیٰ کہ سلطان محمود غزنوی[1] جسے بُت شکن کہا جاتا تھا وہ اسی علاقے میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے ہزاروں میل کا سفر کر کے سومنات (جنوبی ہندوستان کا ایک شہر) کے بت توڑے لیکن قریب رکھے بودھ کے مجسموں کو ہاتھ نہیں لگایا۔

طالبان کا نظریۂ اسلام غیر منطقی تھا۔ انہیں نہ تو تاریخ کا شعور تھا اور نہ اقلیتوں کے حقوق کا کوئی پاس۔ وہ سیرت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی صحیح طور پر واقف نہ تھے۔ ان کا اسلام غاروں کے زمانے کا اسلام تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے تورا بورہ کے غار میں دفن ہو گیا۔ لیکن ان کے تصورِ اسلام نے امتِ مسلمہ پر کاری ضرب لگائی۔

باوجود اس حقیقت کے کہ امتِ مسلمہ سیاسی دباؤ، استبداد (tyranny) اور غیر معقولیت میں سے گزر رہی ہے۔ ہمارے ہاں عوامی حاکمیتِ اعلیٰ (popular sovereignty) یا روشن خیالی (enlightenment) کے قیام کے لئے کوئی موزوں علمی یا سیاسی تحریکیں نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ جو جماعتیں اور گروہ تبدیلی کے متمنی ہیں وہ انفرادی آزادیوں کے مخالف اور فرقہ پرست ہیں۔ ان کے فلسفے غیر معقول (irrational)، بے بہرہ از تاریخ (anachronistic) اور دشمنِ معقولیت (obscurantist) ہیں۔ وہ عوام کو روشنی، امن اور خوشحالی کی طرف لے جانے کی اہلیت نہیں رکھتیں۔

قافلۂ حجاز میں ایک حسین رضی اللہ عنہ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات[2]

'اکانومسٹ انٹیلی جنس یونٹ' (The Economist Intelligence Unit) نے ایک 'جمہوری اشاریۂ' تیار کیا ہے جو 167 ممالک میں کیفیاتِ جمہوریت کو ناپتا ہے۔ یہ اشاریہ 60 'نشانات پر مبنی ہے جو پانچ مختلف زمروں میں منقسم ہے۔ یہ دیگر عوامل کے علاوہ تکثیریت (pluralism)، شہری

---

[1] یمین الدولہ محمود المعروف سلطان محمود غزنویؒ (971ء-1030ء) سلطنت غزنویہ کا حکمران تھا جو 997ء سے 1030ء تک برسر اقتدار رہا۔ اس کی وسیع سلطنت میں موجودہ مکمل افغانستان، ایران، پاکستان کے کئی حصے اور شمال مغربی بھارت شامل تھا۔ اس نے متحدہ ہندوستان پر بائیس (22) حملے کئے اور ہر حملے میں فاتح رہا۔ اس عظیم مجاہد کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہندوستان کے بت کدے لرز اٹھتے تھے۔

[2] ذوق وشوق؛ بال جبریل از محمد اقبالؒ

حقوق، سیاسی کلچر کی بنا پر بھی فیصلے کرتا ہے۔اس فہرست میں پہلے 20 مما لک میں ایک بھی مسلمان ملک شامل نہیں۔انڈونیشیا انچاسویں، تیونس 57ویں، سینیگال 75ویں، البانیہ 81ویں، بنگلہ دیش 86ویں، ترکی 97ویں، مراکش 107ویں، پاکستان 112ویں، الجزائر 118ویں، کویت 121ویں، قطر 134ویں، سوڈان 151ویں اور شام 166ویں نمبر پر ہے۔

7۔ اسلام کی غلط تعبیر

دنیا بھر کے مسلمانوں کی 80 فیصد تعداد ایسے مما لک میں رہتی ہے جہاں وہ اکثریت میں ہے۔ 20 فیصد یا تقریباً 310 ملین (31 کروڑ) اپنے آبائی (غیر مسلم) مما لک میں بطور ایک مذہبی اقلیت آباد ہیں۔ ان میں سے 240 ملین (24 کروڑ) صرف پانچ غیر مسلم مما لک: بھارت میں 161 ملین (16 کروڑ 10 لاکھ)، ایتھوپیا میں 28 ملین (2 کروڑ 80 لاکھ)، چین میں 22 ملین (2 کروڑ 20 لاکھ)، روس میں 16 ملین (ایک کروڑ 60 لاکھ) اور تنزانیہ میں 13 ملین (ایک کروڑ 30 لاکھ) رہتے ہیں۔

10 سے 13 فیصد تک مسلم آبادی شیعہ ہے جو 154 ملین (15 کروڑ 40 لاکھ) تا 200 ملین (20 کروڑ) بنتے ہیں۔شیعہ اثنا عشری، امامیہ، اسماعیلی، دروزی، نصیری، زیدی اور داؤدی بوہرہ میں منقسم ہیں۔ سنی کل مسلم آبادی کے 87 تا 90 فیصد ہیں۔ یہ وہابی، دیوبندی، بریلوی، صوفیوں، مالکیوں، شافعیوں، حنفیوں، اہل حدیث، حنبلیوں، خارجیوں اور ظاہریوں میں منقسم ہیں۔

اسی طرح صوفی نقشبندیوں، چشتیوں، سہروردیوں، مولویوں، اویسیوں، شاذلیوں وغیرہ میں منقسم ہیں۔علم الکلام (Scholasticism) کی رُو سے مسلمان ماتریدی، اشعری، معتزلی، مُرجیہ، قدریہ، جبریہ اور باطنیہ میں منقسم ہیں۔

مسلمان ذاتوں اور فرقوں سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ ہر فرقہ یہ یقین رکھتا ہے کہ صرف وہی صحیح دین کا پیروکار ہے اور باقی سارے فرقے کافر ہیں۔بعض فرقے یہ سمجھے بیٹھے ہیں دوسرے فرقوں کے پیروکاروں کو اپنے فرقے کے اندر لے آنا یا انہیں قتل کر دینا ایک بڑا جہاد ہے۔ جہاد جو اپنی اور معاشرے کی اصطلاح کا مؤثر ترین ذریعہ ہوتا تھا نفرت اور تباہی پھیلانے اور قتل و غارت کرنے کا ہتھیار بن گیا ہے۔

مجھے 1998ء کے ماہ رمضان کی وہ صبح اب تک یاد ہے جب میں پاکستان میں ضلع مظفرگڑھ (پنجاب) میں ضلعی انتظامیہ کے سربراہ کے طور پر تعینات تھا۔ میں سحری کھا کر سونے کے لئے جانے ہی والا تھا کہ مجھے پولیس وائرلیس کے ذریعے ایک مسجد (جو ایک خاص فرقے کی تھی) پر اندھا دھند فائرنگ کی اطلاع ملی۔ میں اور ضلعی پولیس کا سربراہ سیدھے اس مسجد میں پہنچے۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ مقامی لوگ واقعی اور واضح طور پر مشتعل دکھائی دے رہے تھے۔ ہم کسی طرح بھیڑ کو چیرتے ہوئے اندر پہنچے۔ یہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی لوگ فجر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن مجید میں مصروف تھے کہ چند ظالم و بے رحم افراد جو اپنے تئیں 'جذبۂ جہاد' سے سرشار تھے انہوں نے ان تلاوت کرنے والوں پر فائر کھول دیا۔ 22 افراد کو قتل اور دو درجن کو زخمی کر کے بھاگ گئے۔ مسجد میں انسانی اعضا بکھرے ہوئے تھے۔ فرش اور دیواریں خون سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ گولیاں لگنے سے قرآنی اوراق پرزہ پرزہ ہو چکے تھے۔ متاثرہ افراد معصوم اور نیک دل تھے جو بعد از نماز تلاوت قرآن پاک کرنے کے لیے رُکے ہوئے تھے۔ ان کا واحد قصور یہ تھا کہ وہ ایک خاص فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔

ایسا کیوں ہوا؟ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ انتہائی جاہل لوگوں نے جنہیں اسلامی تعلیمات سے کوئی سروکار نہیں، اپنے پیروکاروں کو اشتعال دے کر اس مکروہ حرکت کے لئے بھیجا تھا۔ میں نے اپنی انتظامی خدمات (administrative service) کے دوران (1987ء تا 2002ء) ایک فقہی مسلک کے علماء کے بارے میں کئی بار سنا کہ وہ دوسرے فرقوں کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں۔ میں نے ان سے کئی بار مسائل پر گفتگو کی اور برادر کشی کے اس خوفناک رجحان کے بین الاقوامی مضمرات بتاتے ہوئے کہا کہ اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو ان کا صفایا ہو جائے گا۔ لیکن وہ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ ان کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ دوسرا فرقہ کافر اور جہنمی ہے۔

تصور جہاد کی اس غلط تعبیر نے نہایت غلط قسم کی فرقہ واریت کو جنم دیا ہے جو اپنے سوا سب کو کافر قرار دیتے ہیں۔ ان کی اشتعال انگیزیوں کے باعث صرف پاکستان ہی میں ہزاروں افراد کی جانیں ضائع کر دی گئی ہیں۔ گزشتہ بیس یا اس سے کچھ زیادہ برسوں سے اسلام کی یہ تعبیر دھڑلے سے کی جا رہی ہے۔ یہ ایک انحراف شدہ تعبیر ہے جو بین الاقوامی سطح پر کی جا رہی ہے۔

اسی طرح ہمارا معاشی فلسفہ بھی از کار رفتہ (outdated) ہے جو جاگیرداری اور سرمایہ داری

کے اثرات تلے دبا ہوا چل رہا ہے۔ جنرل ایوب خان[1] (d. 1974) اور ذوالفقار علی بھٹو[2] (d. 1979) کے ادوار میں پاکستان میں جاگیرداری کے اثرات کو کم کرنے کے لئے چند زرعی اصلاحات متعارف کرائی گئیں۔ فیصلہ کیا گیا تھا کہ کوئی شخص قانون کے تحت مقررہ حد سے زیادہ اراضی اپنے پاس نہیں رکھ سکے گا۔ اگر کسی مالک کے پاس اس حد سے زیادہ زمین ہوئی تو وہ بحق سرکار ضبط کر کے کاشتکار مزارعین میں تقسیم کر دی جائے گی۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت اپیلیٹ بنچ نے ان اصلاحات کو قزلباش وقف کیس[3] میں غیر اسلامی قرار دے دیا۔ یہ ایک رجعت پسندانہ اور غلط فیصلہ ہے جس سے غریب کاشتکاروں کا نقصان ہوا اور جاگیرداری مضبوط ہوئی۔

نہ صرف فرقہ پرستی بلکہ اقتصادی پسماندگی، غربت، سیاسی جبر اور فوجی کمزوری بھی ایک حد تک اسلام کی غلط تعبیر کا نتیجہ ہیں۔ ہم نے اسلام کو توہمات اور ترک دنیا کا مذہب بنا کر رکھ دیا ہے جبکہ اسلام درحقیقت ایک ترقی پسند اور سائنٹیفک مذہب ہے جس نے ایک بار ایسی ایک شاندار تہذیب تشکیل دے دی تھی جو دنیا بھر کی قیادت کر رہی تھی۔ موجودہ دور میں اسلام کی غلط تعبیر کا قدرتی طور پر ایک غلط نتیجہ وہ ذلت و رسوائی ہے جس کا ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں ہر لمحہ سامنا کر رہے ہیں۔ اگر وہ موجودہ پسماندگی، غربت، فوجی کمزوری، سیاسی جبر اور فرقہ واریت کا سلسلہ جاری رہا تو دائمی ذلت و رسوائی ہمارا مقدر بن جائے گی۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات[4]

---

[1]۔ محمد ایوب خان (1907ء-1974ء) پاکستان کے سابق صدر، فیلڈ مارشل اور سیاسی راہ نما تھے۔ وہ تاریخ میں پاکستان کے پہلے فوجی آمر کے طور پر بھی جانے جاتے ہیں جنہوں نے 1958ء میں پاکستان میں فوجی حکومت قائم کر کے مارشل لا لگایا۔

[2]۔ ذوالفقار علی بھٹو (1928ء-1979ء) پاکستان کے وزیر خارجہ، صدر، پہلے منتخب وزیر اعظم، پاکستان پیپلز پارٹی کے بانی، آئین پاکستان (1973ء) کے خالق تھے۔

[3]۔ PLD 1990 SC 99

[4]۔ ابوالعلا معری؛ بالِ جبریل از محمد اقبالؒ

حصہ دوم

کسی اور زمانے کا خواب

مسلمان اب اقوام عالم میں انتہائی پسماندہ لوگ ہیں۔ان کے سیاسی نظام قدیم ازمنہ اولیٰ (primitive) سے تعلق رکھنے والے یا نیم شہنشاہانہ ہیں۔عسکری لحاظ سے یہ کمزور اور ڈھیلے ڈھالے (subdued)، اقتصادی لحاظ سے کنگال اور معاشرتی لحاظ سے تقریباً غیر فعال ہیں۔ ہمارے معاشروں میں انسانی حقوق اور قانون کی حکمرانی کو چنداں عزت واحترام کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ معاشرے زیادہ تر فرقوں، قبیلوں اور ذاتوں پر مبنی ہیں۔ ہماری حالت کی اس فارسی شعر سے زیادہ بہتر عکاسی نہیں ہوسکتی:

همه تن داغ داغ شد پنبه کجا کجا نهم

(ساراجسم داغدار ہو چکا ہے، پھاہا کہاں کہاں رکھوں)

اگر مسلمان موجودہ افسوسناک صورت حال سے نکلنے اور شاندار زندگی بسر کرنے کے متمنی ہیں تو انہیں صحیح معنوں میں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ان کے مسائل کیا ہیں؟ وہ کہاں سے پیدا ہوئے ہیں اور انہیں کیسے حل کیا جاسکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ میں مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ وہ اپنی موجودہ زندگی کے اہم پہلوؤں پر توجہ دیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ قارئین حضرات اس مخلص طالب علم اور اسلام کے ایک وفادار پیروکار کی ان عاجزانہ تجاویز پر غور فرمائیں گے:

آب روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب[1]

---

[1] ۔مسجد قرطبہ؛ بال جبرئیل از اقبالؒ



چھٹا باب

یہ سب کچھ باطل نہیں ہے

الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ[1]

(ان ہوشمندوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمانوں کی ساخت پر غور وفکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) 'اے ہمارے پروردگار! یہ سب تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا)

اسلام کے پاس ایک بالکل واضح اور غیر مبہم نظریۂ حیات ہے جو زندگی کی ایک خاص طرز پر تشکیل کرتا ہے۔ اسلام کے مطابق، یہ دنیا بے معنی اور بے مقصد نہیں بلکہ با مقصد اور پُر معنی ہے جس کا قرآن مجید میں متعدد بار ذکر آیا ہے:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا[2]

(اے ہمارے رب تو نے یہ سب فضول و بے مقصد نہیں بنایا ہے)

اس کا ایک آغاز تھا اور ایک اختتام ہے۔ خالق حقیقی نے جو بالاترین اختیار اور حکمرانی کا مالک ہے۔ اسے پیدا فرمایا ہے:

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ[3]

(وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا)

۱۔ سورۃ آلِ عمران: آیت: 191

۲۔ سورہ آلِ عمران: آیت: 191

۳۔ سورۃ الحدید: آیت: 4

کائنات اس کی تابع فرمان ہے:

وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا [1]

(آسمان اور زمین کی ساری چیزیں چار و نا چار اللہ تعالیٰ ہی کی تابع ہیں)

انسان ساری تخلیق کا تاجور ہے اور زمین پر اس کا خلیفہ ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ [2]۔

(ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا)

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً [3]۔

(پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں)

کائنات پر فطرت کے قوانین کے ذریعے حکمرانی کی جاتی ہے:

سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا [4]

(یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آ رہی ہے اور تم اللہ عز وجل کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے)

اسی طرح زندگی کے لئے قانونی ضابطے ہیں اور بنی نوع انسان کے لئے خدا کی طرف سے ہدایت ہے۔ اگر وہ اپنے خالق کے بتائے ہوئے راستے پر چلے تو اسے رہنمائی ملے گی۔ جس سے اسے نہ مستقبل کی فکر ہوگی اور نہ ماضی پر پشیمانی کا سامنا کرنے پڑے گا۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا

---

[1]۔ سورۃ آلِ عمران: آیت: 83

[2]۔ سورۃ التین: آیت: 4

[3]۔ سورۃ البقرہ: آیت: 30

[4]۔ سورۃ الفتح: آیت: 23

هُمْ يَحْزَنُوْنَ[1]

(میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا)

بنی نوع انسان یہ جاننے کی اہلیت رکھتا ہے کہ اس نظریئے کے مطابق اس کے اندر کیا صلاحیتیں اور امکانی قوتیں موجود ہیں۔ درحقیقت ہم پر لازم ہے کہ اس نظریئے کی اتباع کریں۔ اس کے مطابق گزاری جانے والی زندگی ایک نئی شکل اختیار کرے گی۔ انسان اپنے افعال و اعمال کے لئے جوابدہ ہوگا۔ اللہ پاک کے احکامات کے مطابق زندگی بسر کی جائے گی تو اسے اس دنیا اور اگلی دنیا، دونوں میں مسرت و شادمانی اور برکات نصیب ہوں گی۔ اگر اس دنیا کے لئے دی گئی ہدایت پر عمل نہ کیا گیا، اسے طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا اور خدا کے خلاف سرکشی و بغاوت کی راہ پر گامزن رہا تو اس کا دہشت ناک انجام ہوگا۔ اس دنیا میں مادی ترقی عموماً کام کرنے اور محنت کو شعار بنانے سے حاصل ہوتی ہے لیکن یہ سوچنا غلط ہوگا کہ مادی وسائل کی کثرت عزت وقار کی علامت ہے کیونکہ یہ دنیا تو دارالمحن (محنت کا جگہ) اور ایک مقام آزمائش ہے۔ یہاں انسان کو آزمایا جا رہا ہے۔ زندگی اور موت کی تخلیق اس لئے کی گئی ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ انسان کیا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کا براہ راست حوالہ دیتا ہے:

الَّذِىْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا[2]

(جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے)

یہ اسلام دنیا میں لوگوں کے عملی کردار اور عملی رویوں کا نظریۂ حیات ہے۔ جسے مسلمانوں کی اکثریت فراموش کئے بیٹھی ہے یا آگاہی نہیں رکھتی بلکہ جب ہم اس نظریئے پر غور کرتے ہیں تو دکھائی دیتا ہے کہ بنی نوع انسان متعدد گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ ایسا ہے جو سوچتا ہے یہ زندگی تو کیا

---

[1] ۔سورۃ البقرہ: آیت: 38

[2] ۔سورۃ الملک: آیت: 2

پوری کائنات ہی بے مقصد ہے۔ ان کی ذاتی اور اجتماعی زندگیوں میں خدا پاک کا کوئی وجود نہیں اور وہ مرنے کے بعد کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوں گے اور نہ ہی کوئی روزِ حساب منعقد ہونے والا ہے۔ وہ طلبِ ہدایت کے لئے انسانی عقل کے پیچھے جا کر نہیں سوچتے۔ نازل شدہ ہدایتِ خداوندی پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ یہ ایک متنوع گروہ ہے جو دہریوں سے لے کر مالدار حکمرانوں تک چلا گیا ہے۔ یہ سر سے پاؤں تک دنیاوی مشاغل میں پھنسا ہوا ہے اور دنیاوی اقتدار کے نشے میں مدہوش رہتا ہے۔ یہ سوچتا ہے کہ یہ زندگی بلا اعادہ ہے اس لئے اس سے جتنا فائدہ اٹھانا ہے اٹھا لو۔ جتنی خوشیاں سمیٹی جا سکتی ہیں سمیٹ لو۔ لہٰذا وہ ہر موقع اور ہر موڑ پر زیادہ سے زیادہ لذتیں اور مسرتیں ڈھونڈتا ہے۔ ایسے لوگوں کو 'Hedonists' کہا جاتا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ اعلیٰ اخلاقی اصولوں سے ہمارا کوئی سروکار نہیں۔

نو روز و نو بہار و مے و دلبرے خوش است
بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست
(نوروز ہے، بہار کی نوخیزیاں ہیں، شراب ہے اور پیارا سا محبوب ہے)
(بابر، عیش میں سرگرم ہو جا کہ دنیا دوبارہ نہیں ملنے والی)

لوگوں کا ایک اور گروہ ہے جو بہت سے خداؤں پر ایمان رکھتے ہیں۔ مثلاً یہ اقتدار و اختیار دولت اور جائیداد، پیروں، فقیروں اور جاگیرداروں کی پرستش کرتے ہیں۔ ان میں سے 'ہر خدا' کو راضی اور خوش رکھنے کے لئے انہوں نے قسما قسم رسوم و رواج مقرر کر رکھے ہیں۔ ان کا کوئی واضح راستہ ہے نہ راہ عمل اور نہ ہی کوئی مقررہ طریق کار ہے۔ ان کی زندگیاں ضعیف الاعتقادی، توہمات اور کمینہ خصلتی سے عبارت ہیں۔ یہ جھوٹے عقیدوں کے تنکوں کے سہارے جیتے اور جھوٹی امیدوں سے پھلتے پھولتے ہیں۔ انہیں بہت سے خداؤں کی اطاعت کرنا اور بہت سے خداؤں سے خوفزدہ رہنا پڑتا ہے۔ اکثریت اسی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دنیا تکلیفوں، دکھوں اور افسردگیوں سے بھری پڑی ہے۔ انسان روح جسم کے اندر مقید ہے۔ اسے رہائی موت کے وقت ہی ملے گی۔ ان کا عقیدہ ہے کہ تمام انسانی خواہشات،

مادی آسائشیں اور خوشیاں، حتیٰ کہ خود زندگی ایک گناہ ہے۔ وہ اپنے باطن کی صفائی اور روحانی ترقی کے لئے خود کو جسمانی اذیتیں پہنچاتے ہیں اور شدید ریاضت اور مادی اشیا ترک کر کے گوشہ نشین، جوگی اور ملنگ[1] بن جاتے ہیں۔ خود کو تقدیر کے حوالے کر کے اصلاح، احوال کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔ وہ زندگی کو دو الگ الگ شعبوں دنیاوی اور اخروی میں منقسم کر دیتے ہیں۔ اپنے ایمان کو بچانے کے لئے تمام دنیاوی علائق (worldly business) ترک کر دیتے ہیں۔ مختلف روحانی مغالطوں میں پڑ کر خود کو جسمانی اذیتوں سے دو چار کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کی صحیح انقلابی تعلیمات کو طاقِ نسیان پر رکھ کر خوابِ غفلت میں اتر جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے عموماً مذہبی لوگ، عام طور پر اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان مختلف الخیال لوگوں کے عملی کردار اور مختلف النوع رویوں کو دیکھتے ہوئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اصل کامیابی کا راستہ کیا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ ایک صحیح نظریئے کو فروغ دینے کے لئے سب سے پہلے اسلام کے صحیح مفہوم کو ذہن نشین کرنے اور اس کی صحیح سپرٹ (spirit) کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہمیں ہمیشہ پروردگار کے حاضر و ناظر ہونے کو محسوس کرنا چاہیے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحیح تعلیمات سے آگاہی پانا اور زندگی بعد از موت میں حساب کتاب ہونے پر ایمان لانا چاہیے۔ ہمیں اس نظریئے کا غیر مبہم طور پر ادراک کر کے اس نظریئے کے مطالبات پر جو یہ ہم سے کرتا ہے، از سرِ نو غور کرنا چاہیے۔ ہمیں اس کائنات میں اپنی حیثیت اور مقام کو سمجھنا اور اس کے مطابق رویہ اور طریق عمل اختیار کرنا چاہیے۔

ہمیں اپنے اندر حقیقی اسلامی فکر اور جذبہ پیدا کرنا چاہیے۔ ہمیں اس نظریئے سے سرشار اور عملاً ذمہ دار افراد کے طور پر نہ تو مادہ پرستی (materialism) کو اپنا شعار بنانا چاہیے اور نہ ہی زندگی کی لازمی ضروریات کو ترک کرنا چاہیے۔

ہمیں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر معاشرے کی بہتری کے لئے کام کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنی چاہیے کیونکہ وہ بنی نوع انسان کی خدمت کو پسند کرتا ہے۔ ہمیں عیش و عشرت کے طلب گار بنے رہنے سے گریز کرنا اور بے شمار خود ساختہ جھوٹے خداؤں کے در پر بھٹکنے اور سجدہ ریز ہونے کی بجائے صرف اور صرف خدائے بزرگ و برتر کے سامنے سجدہ ریز ہونے والی شخصیت بننا چاہیے۔

---

[1]۔ یہ اردو اصطلاح ان مذہبی لوگوں کے لئے استعمال کی جاتی ہے جو دنیاوی آسائشوں والی چیزوں کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتے۔

غیرضروری ریاضتوں سے پرہیز کرنا چاہیے خواہ یہ جس نام سے یا جس شکل میں بھی ہوں۔ اسی لیے حضرت محمد اقبالؒ (d. 1938) نے ایسی زندگی کے بارے میں یہ کہا تھا:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات[1]



[1] ۔ نماز؛ ضرب کلیم از محمد اقبالؒ

ساتواں باب

صرف اللہ تعالیٰ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ [1]

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کی طرف پھیر دو۔ اگر واقعی تم اللہ عزوجل اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو)

اسلام کے صرف دو مستند ماخذ ہیں: قرآن حکیم اور سنت۔ قرآن مجید آخری کتاب ہے جو اللہ پاک نے قیامت تک آنے والے تمام لوگوں کی ہدایت کے لئے حضور نبی کریم ﷺ پر بذریعہ حضرت جبریل علیہ السلام نازل فرمائی۔ چنانچہ قرآن مجید افراد اور معاشروں کے لئے اور تمام طبقاتِ انسانی کے لئے راہ ہدایت ہے۔ وہ جہاں بھی رہتے ہیں اور جس زمانے سے بھی تعلق رکھتے ہوں اور ان کی پوری زندگی کے لئے ایک مشعل راہ ہے۔ قرآن مجید خود کہتا ہے:

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ [2]۔

(اور اسی طرح یہ کتاب ہم نے نازل کی ہے، ایک برکت والی کتاب۔ پس تم اس کی پیروی کرو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے)

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ۭ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ [3]۔

۱۔ سورۃ النساء: آیت: 59

۲۔ سورۃ الانعام: آیت: 155

۳۔ سورۃ الانعام: آیت: 92

(اسی کتاب کی طرح) یہ ایک کتاب ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے بڑی خیر و برکت والی ہے۔اس چیز کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھی اور اس لئے نازل کی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے تم بستیوں کے اس مرکز (یعنی مکہ) اور اس کے اطراف میں رہنے والوں کو متنبہ کرو جو آخرت کو مانتے ہیں۔ وہ اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں)

الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ[1]

(قرآن مجید انسانوں کے لئے سراسر ہدایت ہے اور ایسی تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں)

قرآن کریم حکم دیتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کی پیروی کی جائے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہی کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا[2]

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پھیر دو۔ اگر واقعی تم اللہ عزوجل اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے)

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ[3]

۱۔سورۃ البقرہ: آیت:185

۲۔سورۃ النساء: آیت:59

۳۔سورۃ النور: آیت:51

(ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ عزوجل اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف بلائے جائیں تا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ کہیں کہ ہم نے سُنا اور اطاعت کی۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے اور کامیاب ہیں)

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا [1]

((اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے رب کی قسم! یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سرِ تسلیم خم کر لیں)

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا [2]

(رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے روک دے، اس سے رک جاؤ)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں تم نے انہیں مضبوطی سے پکڑے رکھا تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے: اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری سنت [3]۔

آیئے دیکھیں کہ حضرات ائمہؒ اربعہ نے سنت کی حیثیت کے بارے میں کیا کہا ہے:

حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) سے پوچھا گیا کہ ہمیں اس وقت کیا کرنا چاہیے جب ہم آپؒ کے کسی قول کو کتاب اللہ کے خلاف پائیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میرے قول کو چھوڑ دو اور کتاب اللہ کی پیروی کرو۔ پھر پوچھا گیا کہ اگر آپؒ کا قول حدیث سے متصادم ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس صورت میں میری قول کو ترک کر دو۔ پھر سوال کیا گیا کہ اگر آپؒ کا قول کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے قول کے منافی ہو؟ انہوں

۱۔ سورۃ النساء: آیت: 65

۲۔ سورۃ الحشر: آیت: 7

۳۔ مشکوٰۃ شریف: جلد اول: رقم: 181

نے جواب دیا کہ صحابی رضی اللہ عنہ کے قول کے سامنے میرے قول کو چھوڑ دو[1]۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) نے یہ اعلان بھی کیا کہ میرا مذہب وہی ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث میں ہو[2] (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول وہ قول ہے جو مستند ثابت ہو جائے)۔

حضرت امام مالکؒ (d. 795) کا مشہور قول ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول کے علاوہ کسی بھی شخص کے قول کو قبول یا مسترد کیا جا سکتا ہے[3]۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ میں ایک فانی انسان ہوں۔ بعض اوقات میں غلط ہوتا ہوں اور بعض اوقات صحیح ہوتا ہوں۔ میری آرا کی جانچ پڑتال کر لیا کرو ان میں سے جو بھی کتاب (قرآن) و سنت کے مطابق ہو، اسے قبول کر لو۔ جو ان کے مطابق نہ ہو اسے رد کر دو[4]۔

ایک دفعہ حضرت امام شافعیؒ (d. 820) نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک قول بیان کیا۔ سامعین میں سے ایک نے کہا کہ کیا آپؒ کی بھی یہی رائے ہے۔ اس پر آپؒ کو غصہ آ گیا۔ آپؒ کا رنگ فق ہو گیا اور کہا کہ افسوس ہے تم پر! تم مجھے کس زمین پر لے جا رہے ہو؟ مجھے کون سا آسمان پناہ دے گا اگر میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک قول بیان کروں اور میری رائے اس کے مطابق نہ ہو؟ کیا تم مجھے زنار (غیر مسلموں کی پہننے والی ایک پٹی) پہنے دیکھ رہے ہو؟ یا تم نے مجھے کلیسا میں سے نکل کر آتے ہوئے دیکھا ہے؟ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایسی بات کیوں بیان کر سکتا ہوں جس سے میں اتفاق نہیں کرتا۔

حضرت امام احمد بن حنبلؒ (d. 855) نے کہا کہ میری بات نہ مانو، نہ حضرت امام مالکؒ (d 795) یا حضرت امام شافعیؒ (d. 820) یا حضرت امام اوزاعیؒ[5] (d. 774) یا حضرت سفیان ثوریؒ[6]

۱۔ القول المفید فی الدلۃ الاجتہاد والتقلید از امام شوکانیؒ

۲۔ ایقاظ از حضرت امام الفلانیؒ۔ صفحہ نمبر 62

۳۔ الیواقیت والجواہر فی بیان عقائد الاکابر از حضرت امام عبدالوہاب الشعرانیؒ۔ صفحہ نمبر 96

۴۔ ایقاظ از امام الفلانیؒ۔ صفحہ نمبر 72

۵۔ حضرت امام اوزاعیؒ (707ء - 774ء) ائمہ تابعین میں سے ہیں۔ آپؒ کا شمار دوسری صدی کے ممتاز مجتہدین میں ہوتا ہے۔ آپؒ نے تقریباً پوری زندگی شام میں بسر کی، اس لیے زیادہ تر شام میں ہی ان کے مسلک کی اشاعت ہوئی اور یہیں سے یہ مسلک اندلس میں پہنچا۔

۶۔ حضرت سفیان ثوریؒ (715ء - 778ء) ایک مشہور و معروف فقیہ و محدث تھے۔ انہیں محدثین کے ہاں امیر المومنین فی الحدیث کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

(d. 778) کی مانو، وہیں سے لو جہاں سے انہوں نے لی ہے (یعنی قرآن اور مستند حدیث سے لو)[1]۔

شریعت کی بنیاد قرآن مجید اور سنت پر ہے۔ جب کہ مسلم علماء کی آراء کو فقہ کہا جاتا ہے۔ عہدِ حاضر کے مسلمان شریعت اور فقہ کو آپس میں گڈمڈ کر جاتے ہیں اور فقہ پر شریعت کے مقابلے میں زیادہ زور دینے لگتے ہیں۔ لفظ شریعت کا مطلب 'قانونی فیصلے' (rulings) نہیں بلکہ طریقے، راستے اور وہ راہیں ہیں جو اختیار کی جانی چاہئیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا [2]

((اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم نے تم کو دین کے معاملے میں ایک صاف شاہراہ پر قائم کیا ہے۔ لہٰذا تم اسی پر چلو)

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا [3]

(تم انسانوں میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل مقرر کی ہے)

عربی زبان میں فعل 'شَرَعَ' کے معنی پنگھٹ یا آبگاہ کے ہیں اور اسم 'شریعہ' کے معنی پانی کا منبع، پانی کا سوراخ، راستہ یا سڑک کے ہیں [4]۔ اس ماخذ سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ شریعت کا مطلب کیا ہے۔ اس میں وہ قانونی ضوابط (قانون سازی) شامل ہے جس کا ذکر قرآن مجید اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال میں آتا ہے۔ ان معنوں کو پھر غلط طریقے سے اس طرح بنا دیا گیا کہ ان میں وضاحتیں، تعبیریں، فتوے اور وہ فیصلے بھی شامل کر دیئے گئے جو ان احکامات کی وضاحت تھے۔ جن کے حوالے سے احکامات کی صحت کا اندازہ لگایا جاتا ہے یا جہاں سے استخراج کر کے ان کا اطلاق کیا گیا۔ یعنی کہ 'فقہ'۔ شریعت تین چیزوں سے وجود میں آئی ہے:

(i)۔ وہ قوانین جن کا حکم قرآن مجید میں ہے۔

---

[1]۔ ایقاظ از امام الفلانیؒ

[2]۔ سورۃ الجاثیہ: آیت: 18

[3]۔ سورۃ المائدہ: آیت: 48

[4]۔ لسان العرب از ابن منظور

(ii)۔ وہ قوانین جن کا حضور نبی کریم ﷺ کے اقوال میں اظہار کیا گیا ہے۔

(iii)۔ وہ قوانین جو سنت رسول ﷺ سے ماخوذ ہیں۔

قرآن مجید اور سنت تبدیل نہیں ہوتے۔ نتیجتاً شریعت تبدیل نہیں ہوتی۔ جس چیز کو بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے جائز (permissible) قرار دیا ہے وہ ہمیشہ جائز رہے گی۔ جس چیز یا حرکت سے منع کیا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ممنوع رہے گی۔ مثال کے طور پر قرآن پاک نے قتل انسان (homicide) سے منع کیا ہے۔ چنانچہ یہ ممنوع تھا اور ہمیشہ ممنوع رہے گا۔

فقہ کے لفظی معنی ہیں 'سچی سمجھ' لیکن اسلامی اصطلاحات میں 'فقہ' میں وضاحتیں تعبیریں اور وہ فتوے اور فیصلے شامل ہیں جو قرآن وسنت کے احکامات کی تشریح کے طور پر جاری ہوئے یا اصولوں سے دیگر احکامات کو جانچا جاتا ہے یا ان سے حالات کے مطابق کچھ اخذ کیا گیا ہے۔ چنانچہ فقہ لازماً قرآن و سنت سے نہیں آئی بلکہ انہی اصل ماخذات سے بالواسطہ طور پر لی گئی ہے۔ اس صورت حال سے یہ بالکل واضح ہے کہ فقہ شریعت پر حاوی نہیں ہوتی۔ فقہ کو ان مسائل اور امور کے لئے قانون سازی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جن کے بارے میں شریعت نے خصوصی طور پر کوئی حکم صادر نہیں کیا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن وسنت میں تمباکونوشی کی واضح طور پر ممانعت نہیں آئی۔ اس صورت حال میں مسلم اہلِ علم حضرات نے رائے دی کہ تمباکونوشی اس لئے ناپسندیدہ چیز ہے کہ یہ بدبودار ہے اور صحت کے لئے خطرناک بھی ہے۔ یہ بات قرآن پاک کی اس شہادت پر مبنی ہے:

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا [1]

(اور خود کو قتل نہ کرو! یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر مہربان ہے)

شریعہ اور فقہ ایک دوسری سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ دونوں اسلامی قانون کے دو پہلو ہیں۔ تاہم ان میں نمایاں فرق ہے:

(i)۔ شریعت قرآن کریم اور سنت سے آئی ہے اور فقہ شریعت سے آئی ہے۔

(ii)۔ شریعت تبدیل نہیں ہوسکتی لیکن فقہ تبدیل ہوسکتی ہے۔ یہ تبدیلی نئی معلومات سامنے آنے پر مبنی ہوتی ہے۔

---

[1]۔ سورۃ النساء: آیت: 29

(iii)۔ شریعت وسیع اور عمومی ہے اور فقہ مخصوص مسائل پر مرتکز ہوتی ہے۔

مسلم اہل دانش اور بالخصوص عام مسلمان، شریعت اور فقہ کے درمیان اس نازک فرق کو نہیں سمجھتے۔ جب مسلمان قانون کو شریعت کے مطابق بنانے پر زور دیتے ہیں تو اس وقت وہ دراصل فقہ کو قانونی شکل دینے پر زور دے رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت شریعت اور فقہ میں فرق سے عدم آگاہی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اس امر کا ادراک نہیں کر رہے ہوتے:

(i)۔ کہ فقہ کے اصول تاریخ کے تمام ادوار میں متشکل ہوتے رہے ہیں اور خاص واقعات کے دوران ایک معروف اصول 'اجتہاد' کے ذریعے تشکیل پاتے رہے۔ فقہ مخصوص معاشرتی اور اقتصادی حالات کی پیداوار ہے۔

(ii)۔ یہ حالات، نئے حالات کے مطابق تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت امام شافعیؒ (d 820) نے اپنی فقہ کو اس وقت تبدیل کر لیا جب انہوں نے عراق سے مصر میں ہجرت کی تھی۔

(iii)۔ فقہ اور نظام انسانی سوچ اور اطلاقات کے مطابق انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ نتیجتاً یہ کسی تقدس کے حامل نہیں ہوتے۔ اس طرح انہیں نئی سوچ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے اور نہ ہی تخلیق کاری (creativity) اور اختراع کی راہ کو مسدود کرنا چاہیے۔

علماء میں قرآن مجید اور سنت کے معنوں میں اختلاف بہت کم ہے جبکہ ان کی تعبیرات کے مابین اختلاف بہت زیادہ ہے۔ لہٰذا فقہ کے پانچ مسلمہ مکاتب فکر کا ظہور ہو گیا: حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور جعفری۔ کچھ اور مکاتب فکر مثلاً ظاہری اور اوزاعی بھی ہیں مگر وہ قدرے کم مسلمہ ہیں۔

ایک بہت اہم نقطہ یہ ہے کہ یہ صرف قرآن مجید ہے جس کی حفاظت کی ضمانت خود اللہ تعالیٰ نے دی ہے اور کسی منبعِ اسلام بشمول سنت کی حفاظت کا ذمہ اللہ عزوجل نے نہیں لیا۔ لہٰذا یہ فطری امر ہے کہ قرآن مجید پر فقہ سے کہیں زیادہ زور دیا گیا ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ [1]

(یقیناً ہم ہی نے قرآن نازل کیا ہے اور ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)

اگرچہ قرآن مجید ہی اسلام کی بنیاد ہے لیکن اسے نظر انداز کر کے زیادہ اہمیت فقہ کو دی جاتی

[1] ۔ سورۃ الحجر: آیت:9

ہے۔حضرت محمد اقبالؒ (d. 1938) نے اس حقیقت پر بہت ہی گریہ وزاری کی ہے۔

خوار از مہجوری قرآن شدی
شکوہ سنج گردشِ دوران شدی[1]
(تم نے قرآن کونظرانداز کر کے خود اپنی تذلیل وتحقیر کی ہے)
(پھر وقت نے تمہیں پیچھے چھوڑ دیا اور تم شکوہ کرتے رہ گئے)

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر[2]

مسلم دنیا کی موجودہ صورتِ حال قرآن مجید کی ترقی پسندانہ تعلیمات کونظرانداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ہم اس کے لئے ہرکسی کواور ہر چیز کوالزام دیتے رہتے ہیں۔اگرہم پیغامِ قرآن پاک کواپنے اندر سمو لیں تو پھر زندگی ہی نہیں بلکہ ہمارے اردگرد کی ساری دنیا تبدیل ہو جائے گی۔حضرت محمد اقبالؒ (d. 1938) نے مندرجہ بالا مصرعوں میں جو کچھ کہا، ذیل کے مصرعوں میں ذرا آگے کی بات کہہ دی:

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق![3]
(خود کونہیں بدلتے بلکہ قرآن کریم کو بدل دیتے ہیں)
(یہ فقہاءِ سُوء اختراعی وتخلیقی صلاحیتوں سے محروم ہیں)

فقیہہ شہر کی باتوں سے نالاں
خدا و محمدؐ و محراب و منبر
(فقیہہ شہر کی باتوں سے ہر کوئی رنجیدہ ہے)
(خدا عزوجل، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ،مسجد اور منبر بھی)

فقہ پر بہت زیادہ زور دینے سے اسلام کا ضابطہ پسندانہ (قانونی) نقطہ نظر سامنے آرہا ہے۔ یہ

۱۔ولم یا کن لہ کفواً: رموز بیخودی از محمد اقبالؒ
۲۔جواب شکوہ؛ بانگ درا از محمد اقبالؒ
۳۔اجتہاد؛ ضرب کلیم از محمد اقبالؒ

ایسا منظر نامہ ہے جس میں اسلام کے حقیقی اخلاقی، معاشرتی اور روحانی پہلو اوجھل ہو گئے ہیں۔ نمازوں کے ضابطہ پسندانہ پہلوؤں پر زیادہ توجہ دی جا رہی ہے بہ نسبت اس کے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑے ہونے کا احساس پیدا کرنے پر توجہ دی جاتی (یعنی کیسے کھڑا ہوا جائے، کیسے اور کب ہاتھ باندھے جائیں وغیرہ وغیرہ لیکن بغیر احساسِ حضوری فریضۂ نماز ادا کر دیا جاتا ہے)۔ مدارس میں فقہ پڑھانے پر قرآن مجید پڑھانے کی بہ نسبت سوگنا زیادہ وقت لگا دیا جاتا ہے۔ مذہبی حلقوں میں قرآنی فہم و بصیرت رکھنے والوں سے کہیں زیادہ مفتی دستیاب ہیں۔ اس کے مسئلے پر حضرت محمد اقبالؒ اپنے دل حزیں سے یوں رقم طراز ہے:

بہ بند صوفی و ملا اسیری
حیات از حکمتِ قرآن نگیری[1]
(اے مسلمان! تمہیں صوفیوں اور ملاؤں نے جکڑ رکھا ہے)
(تمہیں قرآن مجید سے اسباقِ حیات نہیں مل رہے ہیں)

مسلم دنیا کے بعض حصوں، بالخصوص جنوبی ایشیا میں قرآن کریم کی براہِ راست تدریس کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ اس کے لئے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر تم براہ راست قرآن (یعنی/ترجمہ) پڑھو گے تو تمہارے گمراہ ہو جانے کا امکان ہوگا۔ میں جب ایک نوجوان طالب علم تھا تو قرآن مجید کی بعض آیات کا مفہوم نہ جاننے کی وجہ سے کسی نہ کسی عالم سے مدد لینے پہنچ جاتا تھا۔ وہ میری نہایت درشت لہجے میں حوصلہ شکنی کرتے اور کہتے کہ خود نہ پڑھا کرو۔ کسی عالم سے مدد لئے بغیر پڑھو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے۔

مسلمان قرآن پاک سے زندگی کی حقیقی اقدار سمجھنے کی بجائے اکثر تعویذوں اور بے جا رسوم کا سہارا لیتے ہیں۔ ایک مریض ڈاکٹر کے لکھے ہوئے نسخے کے مطابق دوا نہ لے اور نسخے کو بار بار پڑھتا رہے۔ اسے تعویذ بنا کر گلے میں لٹکا لے یا اسے گھول کر پی لے تو اسے کیسے شفا ہو گی؟ ایک نسخہ تو اس وقت کارگر ہو سکتا ہے جب اس پر لکھی ہوئی دوا کو پوری احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ قرآن مجید ہماری روح کی بیماریوں کو کس طرح شفا دے سکتا ہے اگر اسے تعویذ کے طور پر استعمال کیا جائے یا اس کی اعلیٰ

1۔ بہ بند صوفی و ملا اسیری؛ ارمغان حجاز از محمد اقبالؒ

تعلیمات پر عمل کرنے کی بجائے بار بار بہ آواز بلند پڑھا جائے؟

با ایں آتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسینِ آں آساں بمیری
(تم آتشِ قرآن مجید سے نفع نہیں اٹھا سکتے)
(سوائے اس کے تُو اسکی سُورۃ یٰسین پڑھ کر سختیِ نزع کو کم کر سکے)



آٹھواں باب

مغز و پوست

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ [1]

((اے نبی ﷺ) وہی خدا ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔اس کتاب میں دوطرح کی آیات ہیں: ایک محکمات ہیں جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات ہیں)

اسلام ایک عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں 'امن اور اطاعت'۔ اسلام کا نام اللہ تعالیٰ نے خود رکھا ہے۔ اسلام کا مطلب ہے کہ اللہ پاک کی منشا کی کلی اطاعت کے ذریعے اس دنیا میں امن وامان اور بعد میں آنے والی زندگی میں آرام وراحت۔ جو کوئی اطاعت کرتا ہے اور اسلام کے قوانین کی پیروی کرتا ہے، اسے مسلم کہا جاتا ہے۔ اسلام ایک سادہ سا مذہب ہے جس کی تعلیمات بھی سادہ ہیں۔ اسلام کے چھ بنیادی عقائد درج ذیل ہیں۔

(i)۔ ایک خدا پر ایمان: اسلام کی اہم ترین تعلیم یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی پرستش کی جائے۔ جب کہ انتہائی نا قابل معافی گناہ اللہ عزوجل کے علاوہ کسی کی پرستش کرنا ہے (جسے شرک کہا جاتا ہے)۔

(ii)۔ فرشتوں پر ایمان: اللہ تعالیٰ نے کچھ غیر مرئی مخلوق پیدا کی ہے جنہیں فرشتے (ملائکہ) کہا جاتا ہے۔ وہ بغیر کسی تھکاوٹ کے ہمہ وقت اس کی بادشاہت کا انتظام وانصرام چلاتے ہیں۔ وہ ہمیں ہر وقت اپنے گھیرے میں رکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک خصوصی فرض سنبھالے ہوئے ہے۔ ان میں سے کچھ ہمارے لفظوں اور ہمارے کاموں کا ریکارڈ مرتب کرتے رہتے ہیں جو یوم الحساب کو ہمارے سامنے لایا جائے گا۔

(iii)۔ آسمانی کتابوں پر ایمان: مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء ورُسل علیہم السلام کو کتابوں کے ذریعے ہدایت بھیجی۔ جیسے توراۃ (Torah)، زبور (Psalms)، انجیل

---

[1]۔ سورۃ آل عمران: آیت:7

(Gospel) اور قرآن مجید۔

(iv)۔ خدا کے پیغمبروں علیہم السلام پر ایمان: مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ساری امتوں کو اپنی ہدایت پیغمبروں علیہم السلام کے ذریعے پہنچائی ہیں جو کہ انسان ہوتے تھے۔ اس کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا۔ جن میں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شامل ہیں اور آخری رسول و نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

(v)۔ یومِ حساب پر ایمان: اس دنیا میں زندگی اور جو کچھ بھی اس دنیا کے اندر ہے ایک پہلے سے مقررہ دن پر ختم ہو جائے گا۔ اس وقت ہر کسی کو اللہ تعالیٰ فرداً فرداً اکٹھا کرے گا اور اسے اس کے ایمان اور اعمال (اچھے یا برے) کے مطابق جزا اور سزا دے گا۔

(vi)۔ مقدر اور منشائے خداوندی: مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ کوئی واقعہ ظہور میں نہیں آ سکتا ماسوائے اللہ تعالیٰ کی منشا کے اور وہ اس کے پورے علم میں ہوتا ہے[1]۔

ان چھ بنیادی عقائد کے علاوہ اسلام کے پانچ ارکان اہل ایمان کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ ان عقائد کو عملی جامہ پہنائیں۔ یہ ارکان عبادت کے اہم اور لازمی فریضے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ پانچ ارکانِ اسلام درج ذیل ہیں:

(i)۔ اعلان توحید: ایمان کے اظہار کا بیان یہ ہے، لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے رسول ہیں۔ ایمان کا یہ اعلان محض ایک بیان سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اسے اعمال کے ذریعہ حقیقت بنایا جانا چاہیے۔

(ii)۔ روزانہ کی نمازیں (صلوٰۃ): ایک دن میں پانچ نمازیں فرض ہوتی ہیں۔ نماز ایک طریقہ عبادت ہے جس کے ذریعے ایک مسلمان اپنے خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑتا ہے اور روحانی قوت اور دل کا سکون پاتا ہے۔

(iii)۔ زکوٰۃ: مسلمان اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ دولت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کے عوض چند مالی ذمہ داریوں کا تقاضا کیا گیا ہے۔ ہر صاحبِ نصاب

---

[1]۔ یہ عقیدہ آزاد مرضی کے تصور کی تردید نہیں کرتا کیونکہ ہمیں مجبور نہیں کرتا۔ ہماری پسند و ناپسند سے اللہ تعالیٰ پہلے ہی آگاہ ہوتا ہے کیونکہ اس کا علم کامل ہے۔ یعنی وہ پہلے سے ہی جانتا ہے کہ ہم کیا کرنے والے ہیں۔

(دولت مند) شخص پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرے۔

(iv)۔ روزہ (صوم): مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ رمضان کا سارا مہینہ روزہ رکھ کر گزاریں۔ روزے کا دورانیہ سحری سے شروع ہو کر مغرب تک ہوتا ہے۔ اس دوران نہ کچھ کھایا جا سکتا ہے نہ پیا جا سکتا ہے۔

(v)۔ حج: ہر صاحب استطاعت مسلمان مرد اور عورت پر فرض کیا گیا ہے کہ اپنی زندگی میں مکہ مکرمہ کے مقدس مقامات کا کم از کم ایک بار ضرور حج کرلے۔

مذکورہ بالا عقائد اور ارکانِ اسلام کے علاوہ بھی چند بنیادی اخلاقی اور قانونی تعلیمات ہیں جن پر عمل کیا جانا چاہیے:

(i)۔ اعمال کا اندازہ ان کے پیچھے کارفرمانیت سے کیا جاتا ہے۔

(ii)۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کرتا جو پاک نہ ہو۔

(iii)۔ ایک شخص کے اسلام پر اچھی طرح عمل پیرا ہونے کا ایک جزو یہ ہے کہ وہ ایسی چیزوں سے اجتناب کرے جو اس سے تعلق نہیں رکھتیں۔

(iv)۔ کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں جب تک وہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

(v)۔ کسی شخص کو نہ خود کو ایذا دینی چاہیے نہ دوسروں کو۔

(vi)۔ غیر قانونی جنسی تعلقات، چوری، باعصمت خواتین پر بہتان تراشی اور شراب نوشی کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔

(vii)۔ اسلامی شریعت کے مقاصد میں درج ذیل امور شامل ہیں۔ مذہب؛ زندگی؛ جذبات؛ عزت وناموس؛ خاندان؛ اموال اور انصاف کا تحفظ ونگہداشت۔

مسلم علماء ومفکرین نے ہماری سہولت کے لئے اسلامی تعلیمات کی یوں زمرہ بندی کی ہے۔

(i)۔ فرض/ واجب (ناگزیر، نہ کہ اختیاری): اس سے مراد ایسے اعمال ہیں جن کے کرنے سے آپ جزا پاتے ہیں اور نہ کرنے سے سزا کے مستحق ہو جاتے ہیں مثلاً نماز، روزہ اور ان جیسے دیگر امور۔

(ii)۔ مستحب/ سنۃ سے مراد ایسے اعمال ہیں جن کے کرنے سے ثواب ملتا ہے اور ان میں کوتاہی

کرنے سے بندہ ثواب سے محروم ہوجاتا ہے مثلاً مغرب ہوتے ہی روزہ افطار کرلینا، مغرب کے بعد دو رکعت نوافل کی ادائیگی اور مسواک کرنا۔

(iii)۔ مباح: اس کا مطلب ایسا عمل ہے جس کے کرنے سے کوئی ثواب نہیں ملتا اور اسے نہ کرنے سے کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ اگرچہ نیک ارادوں کے ساتھ انہیں بڑھا کر یا گھٹا کر دیگر زمروں میں لایا جاسکتا ہے۔ اس کی مثالوں میں مختلف قسم کے کھانے شامل ہیں۔

(iv)۔ مکروہ (ناگوار) سے مراد ایسا کام ہے جسے کرکے آپ کچھ بھی حاصل نہیں کرتے اور اس سے باز رہنے سے آپ ثواب کما سکتے ہیں۔ اس کی مثالوں میں ایک مثال یہ ہے کہ آپ بعد از نماز عشاء جاگتے رہیں۔

(v)۔ حرام (ممنوع) اس سے مراد وہ فعل ہے جو کرنے سے آپ مستحق سزا ہوجاتے ہیں اور اس سے باز رہنے سے جزا ملتی ہے۔ اس کی مثالوں میں سور کا گوشت کھانا، قتل کرنا اور حرام کاری شامل ہیں۔

ذرا غور و فکر کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلام کی بعض تعلیمات لازمی ہیں اور بعض غیر لازمی ہیں۔ مخلص اہل ایمان کی حیثیت سے ہمیں سنت سے زیادہ فرض/ واجب پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ ہمیں مکروہ کی بہ نسبت حرام سے بچنے کی زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔ یہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ بعض علما غیر ضروری طور پر بال کی کھال اتارنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں اور یہ کہ ان کی گفتگوئیں غیر متعلقہ اور غیر ضروری علمی اور فقہی موضوعات کے گرد گھومتی ہیں۔ اگر ہم پاکستان میں علما کی ایک سو تقریریں 100 گھنٹوں میں سنتے رہیں تو ان کے موضوعات کچھ ایسے ہوں گے: کیا حضور نبی اکرم ﷺ عالم الغیب تھے؟ کیا آپ ﷺ حاضر ناظر رہتے تھے؟ کیا مردے اپنی قبروں میں ہماری باتیں سن سکتے ہیں؟ کیا خوفِ خدا رکھنے والے لوگ (اولیاء) ہمارے مسائل حل کر سکتے ہیں؟ کیا کسی بزرگ کا عرس ہر ماہ منایا جا سکتا ہے؟ کیا نمازوں میں آمین بالجہر کہی جاسکتی ہے؟ نماز میں قیام کے دوران ہمارے ہاتھوں کی پوزیشن کیا ہونی چاہیے؟ کیا نماز کے دوران ہمارا سر ڈھانپا ہوا ہونا چاہیے؟ کیا پائنچے ٹخنوں سے اوپر ہونے چاہئیں یا نہیں؟ بزرگ ترین ہستی کون سی ہے؟ کون سی فقہ برتر ہے؟ کیا فلاں فرقہ کافر ہے؟ کیا وہ مشرک ہے؟ ان کی 100 گھنٹے کی باتوں میں سے 90 گھنٹوں کی طویل تقریروں میں صرف ایسی چیزوں پر ہی باتیں ہوں

گی جبکہ بمشکل 10 گھنٹے بامعنی اسلامی تعلیمات پر صرف ہوتے سنائی دیں گے۔

اس سے یہ صورت حال سامنے آتی ہے کہ ہم اپنے دین کی اصل بنیاد سے کتنے دور جا چکے ہیں۔ اصل مسائل سے ہمارے فاصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم اپنی قوتوں کو بیکار مدرسانہ اور فقہی موشگافیوں پر ضائع کر رہے ہیں۔ ہماری ساری تقاریر ایک دوسرے کی مخالفت اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے بارے میں ہوتی ہیں۔ ہم یگانگت اور وحدت لانے اور علم کی روشنی پھیلانے کی بجائے انتشار اور جہالت کی تاریکیاں پھیلا رہے ہیں۔ ہم عوام کو توحید باری تعالیٰ کی اصل سپرٹ (spirit) نہیں پہنچاتے نہ انہیں سیرتِ نبوی ﷺ سے آگاہ کرتے ہیں۔ نہ ہی ان کے اندر عبادات کا صحیح جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ ہم اپنے رویوں اور طرزِ عمل کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نہیں ڈھالتے اور نہ ہی اپنے اندر اخلاص اور فراخدلی کی اخلاقی قدریں پیدا کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے مذہب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اسلام کے مشعل بردار ہیں اور بار بار اعلان کرتے ہیں کہ یہ دین عنقریب دنیا میں پھیل جائے گا۔ اس سیاق وسباق میں قرآن واضح الفاظ میں کہتا ہے:

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا[1]

(کیا ہم تمہیں بتائیں کہ اپنے اعمال میں سب سے زیادہ ناکام ونامراد لوگ کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی ساری سعی وجہد راہِ راست سے بھٹکی رہی اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ سب کچھ ٹھیک کر رہے ہیں)

قرآن مجید نے اس آیت مبارکہ میں ایک نفسیاتی روگ کی نشاندہی کی ہے۔ جسے جدید علم نفسیات میں خودفریبی کہا جاتا ہے۔ ہم سب انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر خودفریبی کا شکار ہیں۔ اس کا ازالہ صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ ہمیں اپنے مذہبی مباحث میں اسلام کی بنیادی تعلیمات پر توجہ دیں۔ انسانوں کے خلاف فرقہ واریت اور نفرت پھیلانے سے اجتناب کریں۔ ہماری تقاریر سے شائستگی اور محبت کا اظہار ہونا چاہیے۔

ہمارا رویہ ایسا ہونا چاہیے کہ اگر کوئی شخص ہم سے ایک دفعہ ملے تو وہ ہمیں آئندہ بھی ملتا رہے۔

---

[1] سورۃ الکہف: آیت: 103-104

ہماری محبت وشفقت اس کے دکھ درد کو دور کرے۔ وہ اپنی زندگی میں ایمان کی تازگی کو محسوس کرتا رہے۔ اگر کوئی ہم سے نہیں مل سکا یا ہمیں اب تک رسائی نہیں ہو رہی تو وہ اس وقت تک بے چین رہنے کہ جب تک ہماری اس سے ملاقات نہ ہو جائے۔ ہمیں دوسروں کی فلاح اور انہیں راہِ راست پر لانے کے لیے اپنی تمام تر کوششوں کو بروئے کار لانا چاہیے خواہ وہ ہماری طرف متوجہ ہوں یا نہ ہوں۔ ہمیں اپنی جدوجہد اور دعائیں نیکی پھیلانے کے لئے وقف کر دینی چاہئیں۔ انشاءاللہ تعالیٰ وہ وقت ضرور آئے گا جب ہمیں محبت کا جواب محبت سے ملنے لگے گا۔ تب جا کر کرۂ ارض پر اللہ عزوجل کی بادشاہت قائم ہوگی۔



نواں باب

کبھی اے نوجواں مسلم! تدبر بھی کیا تو نے

قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِي الۡاَعۡمٰى وَالۡبَصِيۡرُ[1]

((اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے کیا اندھا اور آنکھوں والا برابر ہوا کرتا ہے؟)

عقلیت پسندی انسانی وجود کا ایک اظہار ہے۔ کائنات میں ایک خاص نظم ہے جسے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر اس کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ قرآن پاک کی متعدد آیات مبارکہ میں اس قبیلے، گروہ یا قوم کو پسند کیا گیا ہے جو سوچ بچار کرتی ہے اور ایسے قبیلے یا قوم کی سرزنش کی گئی ہے جو اپنی عقل کو استعمال نہیں کرتی[2]۔

مزید برآں وہ بے نظیر انسانی کیفیت جو انسان کو باقی ماندہ مخلوق سے ممیز کرتی ہے وہ عقل ہے۔

وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِيۡۤ اٰدَمَ وَحَمَلۡنٰهُمۡ فِي الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ وَرَزَقۡنٰهُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلۡنٰهُمۡ عَلٰى كَثِيۡرٍ مِّمَّنۡ خَلَقۡنَا تَفۡضِيۡلًا[3]

(یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی)

'روشن خیالی' (Enlightenment) کے فلسفے میں عقل خود مختاری اور خود کفالت کا دعویٰ کرتی ہے اور کسی بھی 'بیرونی اختیار' (outside authority) مثلاً تاریخ، روایت یا مذہب کو مسترد کرتی ہے۔ یہ مذہب کو کلیتاً مسترد نہیں کرتی بلکہ اسے انفرادی انسانی عقل کی جانچ پڑتال کے تابع بناتی ہے۔ کانٹ (Kant, d. 1804) نے روشن خیالی کی تصریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ انسان خود مول لی ہوئی تولیت (self incurred tutelage) سے آزادی چاہتا ہے۔ تولیت انسان کی یہ معذوری یا نااہلی ہے کہ وہ اپنی سمجھ کو کسی دوسرے سے ہدایت لئے بغیر استعمال نہیں کرتا۔ کانٹ (Kant, d. 1804) نے روشن

---

[1]۔ سورۃ الرعد: آیت: 16

[2]۔ سورۃ البقرہ: آیت: 164؛ سوۃ المائدہ: آیت: 58؛ سورۃ الرعد: آیت: 4؛ سورۃ النحل: آیت: 12

[3]۔ سورۃ الاسراء: آیت: 70

خیالی کی روح کی یہ تعریف کی ہے کہ یہ اپنے آپ کے بارے میں آزادانہ سوچ بچار کے لئے ایک 'جرأتِ غور وفکر' ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اپنے اندر یہ جرأت پیدا کرو کہ اپنی عقل کو استعمال کر سکو[1]۔

جدید لٹریچر میں مقامِ عقل (place of reason) دو انتہاؤں، 'منطقی ایجابیت' (logical positivism) اور انقلاب پسندانہ تاریخیت (radical historicism) کے درمیان گردش کرتا رہا ہے۔ اول الذکر انتہا 'عقل' کو ایک مطلق لازوال اصول قرار دیتی ہے جو نہ تاریخ سے متاثر ہوتی ہے، نہ رسم ورواج سے اور نہ ہی ایسی دیگر کمزوریوں مثلاً جذبات اور خواہشات سے کوئی اثر لیتی ہے[2]۔

دوسری طرف (دوسری انتہا) انقلاب پسندانہ تاریخیت (radical historicism) ہے جو عقل کو ساختیاتی عمل میں سے گزار کر اسے معاشرتی اور تاریخی طریق کار کی ایک ضمنی پیداوار قرار دیتی ہے۔ تاہم یہ سمجھنا ایک تاریخی غلطی ہوگی کہ عقل کلیتاً 'روشن خیالی' (Enlightment) کی پیداوار ہے کیونکہ مسلمانوں نے عقل و استدلال (reason)، منطق (logic)، سوچ بچار (thinking)، استغراق (contemplation)، سائنسی تحقیق اور ذہنی مشاغل کے بارے میں خود بے پناہ لٹریچر تیار کیا ہے۔ تاہم مسلمانوں کا نظریۂ علمیات (epistemology) عقل کو واحد ذریعۂ علم نہ تسلیم کرتا ہے، نہ قبول کرتا اور نہ ہی واحد ہدایت برائے عمل مانتا ہے[3]۔ مسلم روایتِ علم، عقل کو وحی کے میں شامل سمجھتی ہے۔ اس طرح یہ یورپی روشن خیالی کے دورِ مابعد کی جدید عقلیت کے رجحان کے بالکل برعکس ہے۔

اسلامی روایت میں عقل کا تصور مختلف ہے اور یہ اثباتیت (positivist absolutism) کے کٹڑ پن اور انقلابی اضافیت (radical relativism) کی انتہا پسندیوں کو مسترد کرتا ہے۔ اسلام موجوداتِ کائنات، حالتِ انسان اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں سوچ کا ایک مختلف انداز پیش کرتا ہے۔ یہ عقل کو ایک بڑی حقیقت کے جزو کے طور پر پیش کرتا ہے نہ کہ حسبِ موقع ضابطہ بنا لینے اور اپنی مرضی کے

۱۔ "What is Enlightenment?" in Kant on History by Kant, ed. by Lewis White Beck, p. 3

۲۔ Philosophy and the Human Sciences by Charles Taylor, Volume 2, p. 134.

۳۔ The Virtue of Selfishness by Ayn Rand, p. 25.

حربے استعمال کر لینے کے اصول اختیار کرنے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دیگر انسانی خصوصیات مثلاً محبت، خیرات، دانش، روحانیت اور تخلیق کاری کی طرح، عقلیت بھی ایک بنیادی انسانی خصوصیت ہے جو ہمیں قابلِ فہم نظامِ زیست (intelligible structure) کے ڈھانچے کا پردہ اٹھانے کے قابل بنا دیتی ہے۔ اسلام کے مطابق ایک فرد کو اتنا ضرور عقل مند (عاقل) ہونا چاہیے کہ اپنے افعال کے لئے جوابدہ ہو سکے۔ کیونکہ عقل نہ رکھنے والے آدمی پر کوئی مذہبی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ حضور اکرم ﷺ نے ذہین انسان کی یہ تعریف کی ہے، ذہین شخص (الکیس) وہ ہوتا ہے جو اپنی خود پسندی کو قابو میں رکھتا ہو۔ اپنی آخرت کے لئے تیاری کرتا ہو[1]۔ اس مثال سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اسلام ذہانت، معقولیت، ایمان اور نیکی کے درمیان ایک فطری تعلق قائم کرتا ہے۔

قرآن پاک متعدد ایسی اصطلاحات استعمال کرتا ہے جو عقل، ذہانت اور سوچ سے قریب تر ہیں۔ یہ الفاظ اس موضوع پر کئی طریقوں سے اور کئی بار روشنی ڈالتے ہیں جو اسلام کی اصل بنیادیں ہیں۔ یہ الفاظ یوں ہیں: تدبر (مراقبہ کرنا)، تفکر (سوچ بچار)، قلب (دل)، فواد (اندرونی دل)، عقل (ذہانت)، علم (آگہی)، فہم (سمجھ)، ادراک (گرفت میں لینا)، شعور (ہوشمند)، برہان (مظاہرہ)، حجۃ (شہادت) بینہ (واضح گواہی)، سلطان (غالب/ حاوی شہادت)، ذکر (یاد/ عاجزانہ استمداد)، فرقان (فہمیدگی)، نطق (گفتگو کرنا/سوچنا)، حکم (فیصلہ) اور حکمت (دانائی)۔

قرآن مجید نے یہ جامع اور متنوع ذخیرۂ الفاظ استعمال کر کے عقل پر مبنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن سے ان ذہنی طریق ہائے کار کی تمامیت (completion) کی نشاندہی ہوتی ہے جو تجربی مشاہدے، شعوری تجزیئے، اخلاقی فیصلے اور روحانی لطافت کو یکجا کرتی ہے۔ یہ جامع انداز قرآن پاک کی ان آیات سے واضح ہوتا ہے:

اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنۡتَ تَكُوۡنُ عَلَيۡهِ وَكِيۡلًا ۝ اَمۡ تَحۡسَبُ اَنَّ اَكۡثَرَهُمۡ يَسۡمَعُوۡنَ اَوۡ يَعۡقِلُوۡنَ ؕ اِنۡ هُمۡ اِلَّا كَالۡاَنۡعَامِ بَلۡ هُمۡ اَضَلُّ سَبِيۡلًا[2]

---

[1] ۔ جامع ترمذی: رقم: 25

[2] ۔ سورۃ الفرقان: آیت: 43-44

(کیاتم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا؟ کیاتم ایسے شخص کو راہِ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟ کیاتم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں)

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ○ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ؕ اَفَاَنْتَ تَهْدِى الْعُمْىَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ○ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ[1]

(اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو آپ کی طرف کان لگاتے ہیں، تو کیا آپ بہروں کو سنا سکتے ہیں، جو سمجھ نہ رکھتے ہوں؟ اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جو آپ کی طرف دیکھتے ہیں، تو کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھا سکتے ہیں، اگرچہ وہ نہ دیکھتے ہوں؟ یقیناً اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا اور لیکن لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں)

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ[2]

(اور یہ حقیقت ہے کہ بہت سے جن اور انسان ایسے ہیں جن کو ہم نے جہنم ہی کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان کے پاس دل ہیں مگر وہ ان سے سوچتے نہیں۔ ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے پاس کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں۔ وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں کھوئے گئے ہیں)

۱۔ سورۃ یونس: آیت: 42-44

۲۔ سورۃ اعراف: آیت: 179

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّكُمۡ اِلَيۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ ○ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَـقُّ‌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ ۚ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡكَرِيۡمِ [1]

(کیا تم نے سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے۔ پس اللہ تعالیٰ بلند و بالا اور سچا بادشاہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ عرش کریم کا مالک ہے)

اَيَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ يُّتۡرَكَ سُدًى [2]

(کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی (بغیر حساب کتاب) چھوڑ دیا جائے گا؟)

مندرجہ بالا کیفیات، دیکھنے یا سننے میں ناکامی جسمانی عوارض میں سے برآمد نہیں ہوتیں بلکہ ذہن اور دل کی بندش میں سے جنم لیتی ہیں کہ انسان ان اعضاء سے وہ فائدہ نہیں اٹھاتے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ انہیں دیئے ہیں۔ یہ اعضاء رہنمائی حاصل کرنے کے لئے دیئے گئے ہیں:

اَفَلَمۡ يَسِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ فَتَكُوۡنَ لَهُمۡ قُلُوۡبٌ يَّعۡقِلُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ اٰذَانٌ يَّسۡمَعُوۡنَ بِهَا‌ ۚ فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَى الۡاَبۡصَارُ وَلٰـكِنۡ تَعۡمَى الۡقُلُوۡبُ الَّتِىۡ فِى الصُّدُوۡرِ [3]

(کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سننے والے ہوتے؟ حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں)

معقولیت کے مختلف پہلوؤں کی اہمیت اور اعضائے انسانی کے استعمال کی افادیت کے بارے میں قرآن کی اعلیٰ و ارفع تعلیمات کی کثرت کے باوجود بہت سے مسلمانوں کا عمومی رویہ غیر معقول، غیر متوازن اور سطحی قسم کا ہے۔ قرآن ہمیں ہر لحظہ سوچ و بچار اور فکر کی دعوت دیتا ہے لیکن بہت سے معاملات

---

[1] سورۃ المومنون: آیت: 115-116

[2] سورۃ القیامۃ: آیت: 36

[3] سورۃ الحج: آیت: 46

میں ہمارا طرزِ عمل غیر معقول اور غیر مناسب ہے اور ہم جذبات اور توہمات سے مغلوب رہتے ہیں۔

سابق ادوار کے علما و فضلا نے مذہبی احکامات اور عبادات کی ترجیحات مقرر کرنے پر بہت محنت کی تھی۔ بلا شبہ اس سے معاملات اور عبادات کی اشکال کے بارے میں کچھ سختی پیدا ہوگئی تھی۔ دوسری طرف اس سے ہمارے لئے یہ طے کرنا آسان بھی ہوگیا کہ کون سی چیز زیادہ ضروری ہے اور کون سی کم۔ آیئے عبادات کی اشکال و اقسام پر غور کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ ایک بار اور ہمیشہ کے لیے طے ہو چکا ہے کہ 'فرض' لازمی ہے اور جو 'سنت' اور 'مستحب' ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ اس ترجیحی اہمیت کے ضمنی نتیجے میں فرض، سنت کی بہ نسبت زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ ہم نے اپنی ساری قوت اور توجہ ترجیحی اہمیت پر صرف کر دی اور اصل مقصد پر کوئی توجہ نہیں دی۔ یہ طرزِ عمل غیر معقول اور غیر متناسب ہے اور دین کے اصل تقاضوں کے بالکل منافی ہے۔

نماز کی مثال لے لیجیے۔ نماز کی سپرٹ (spirit) کیا ہے؟ کیا اس کا مطلب ایک خصوصی انداز اختیار کرنا ہے یا دورانِ نماز میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایک خصوصی آگاہی اور اس کی طرف توجہ مرکوز کرنا ہے؟ نماز میں سر اور ٹخنے ڈھانپنے چاہئیں یا نہیں ڈھانپنے چاہئیں۔ 'آمین' بلند آواز (جہری) میں کہی جانی چاہیے یا آہستہ (سرّی) سے کہنی چاہیے؟ یہ فقہ کے بہت چھوٹے چھوٹے مسئلے ہیں۔ نماز کا اصل مادہ یا مفہوم یہ ہے کہ کیا ہم نے ادائیگی کے دوران 'احسان'[1] حاصل کیا ہے یا نہیں؟ ہمیں اپنی نیت کو ٹٹول کر دیکھنا ہے کہ کیا ہم نے نماز پڑھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو یاد کیا ہے یا اس کے دوران اپنی تجارت کے بارے میں سوچتے رہے یا ہمارا ذہن خدا کی بجائے اپنے خاندان و متعلقین کے بارے میں متفکر رہا؟ کیا اللہ عز وجل ہمیں اپنی نماز کے دوران دیکھ رہا ہے یا ہم اسے دیکھتے ہیں؟ عملی طور پر یہ ہوتا ہے کہ جونہی ہم 'اللہ اکبر' (تکبیر اولیٰ) کہہ کر اپنی نماز شروع کرتے ہیں تمام بھولی بسری باتیں ذہن میں آنے لگتی ہیں۔ اس بے توجہی کے بارے میں ایک اشارہ اس حدیث میں ملتا ہے 'بہت سے لوگ جو نماز پڑھتے ہیں انہیں

۱۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر (یہ دھیان میں رکھو کہ) وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے (صحیح بخاری۔ جلد اول: رقم:49 بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ؛ صحیح مسلم۔ جلد اول: رقم:96 بروایت حضرت یحیی بن یعمر رضی اللہ عنہ)

سوائے تھکاوٹ اور تناؤ کے کچھ نہیں ملتا[1]۔حضرت محمد اقبالؒ نے اس ذہنی کیفیت کو درج ذیل شعر میں بڑی خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی، تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں[2]

میں نے نماز پر سینکڑوں تقاریر سنی ہیں۔موضوع عام طور پر نماز کے فقیہانہ مسائل ہوتا ہے۔ شاذونادر (rare) یہ موضوع سننے کو ملتا ہے کہ نماز اصل میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا بہانہ ہے۔ یہ معراج ہے۔ یہ تہذیبی عمل ہے۔انصاف، برابری اور اخوت سکھاتی ہے۔

آپ 100 مساجد میں چسپاں پوسٹروں اور اشتہارات کے بارے میں ایک تحقیق کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ان پوسٹروں پر لکھی عبارات میں سے 99 فیصد مواد فقہی مسائل سے متعلق ہوتا ہے۔کیا کوئی چھوٹی داڑھی والا شخص نماز کی امامت کرنے کا اہل ہوتا ہے؟ کیا جینز پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے؟ کیا ٹی وی پروگرام دیکھنے والا شخص نماز کی امامت کرا سکتا ہے؟ یہ باتیں تو کی جاتی ہیں لیکن جو باتیں نہیں کی جاتیں ان میں ایک یہ ہے کہ نماز میں خشوع وخضوع کس طرح حاصل کیا جائے؟ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کس طرح کھڑا ہوا جائے؟

میں سطحی باتوں کو غیر ضروری اور ناجائز وغیر معقول حد تک اہمیت دینے کے بارے میں ایک ذاتی تجربہ بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میں ولایت (England) میں زیر تعلیم (1997ء) تھا۔لندن کے جنوب مشرقی علاقے کینٹ (Kent) میں رہنے والے میرے ایک دوست نے ہماری دعوت کی۔جس میں اندازاً بیس (20) کے قریب مسلمان طالب علم اور ایک ہندو رات کے کھانے پر مدعو تھے۔میزبان اور اس کے اہل خانہ کھانا پکا رہے تھے۔ولایت کی روایت کے مطابق ہم سب ان کی مدد میں لگ گئے۔ تھوڑی دیر بعد نماز مغرب کا وقت ہو گیا۔ولایت کے رہنے والے تقریباً اٹھارہ (18) نوجوان (جنہوں نے جینز کی پتلونیں پہنیں تھی۔ایک کے علاوہ جن کی داڑھیاں بھی نہ تھیں) وضو میں تھے۔اصرار کرنے

---

[1] سنن دارمی۔رقم:1789

[2] کبھی اے حقیقتِ منتظر؛غزلیات؛بانگ درا از محمد اقبالؒ

لگے میں نماز پڑھاؤں۔ میں نے ولایت میں رہنے والے ایک بائیس (22) سالہ نوجوان کو زبردستی آگے کر دیا۔ جس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تو تھی مگر جینز کی پتلون تھی۔ بڑے بڑے فوجی بوٹ پہن رکھے تھے۔ اس نے بوٹوں سمیت نماز پڑھائی۔ میں نے اتنی پراثر نماز کبھی نہیں دیکھی۔ میں نے بہت سے غزالی زمان اور رازی دوران دیکھے ہیں۔ پیر طریقت دیکھے ہیں مگر ولایت میں رہنے والے اس چھوٹی داڑھی والے بوٹوں سمیت نماز پڑھانے والے کی شان ہی کچھ اور تھی۔ حرمین الشریفین[1] کے علاوہ میں نے نماز میں اور امامت میں اتنی حلاوت کبھی نہیں دیکھی۔

میری منشاء کسی پر تنقید نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اصل شے روحِ بلالی ہے۔ جس کی طرف ہماری توجہ ہی نہیں جاتی۔ ظاہر و باطن کا تناسب ہم نے کھو دیا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ ظاہر بھی لازم ہے۔ اس لیے ظاہر کے بغیر باطن بے کار ہے مگر ظاہر کا مقابلہ روح سے ہوگا تو روح کو ترجیح دینی ہوگی۔

ایک اور مثال لیں، غیبت اسلام میں سخت ناپسندیدہ ہے۔ اپنے بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے۔ سگریٹ پینا اکثر علما کے نزدیک صرف مکروہ ہے لیکن ہماری دینی سوچ عجیب ہے۔ غیبت کرنے والے کو کچھ نہیں کہتے مگر سگریٹ پینے والا بہت برا سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی کہ غیبت بدتر شے ہے۔

میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم نے اسلامی فکر کا توازن کھو دیا ہے۔ مختلف اشیا کے درمیان توازن کھو دیا ہے۔ اہم کو غیر اہم اور غیر اہم کو اہم سمجھنے لگے ہیں۔ نفل کو فرض سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ مکروہ کو حرام سے زیادہ برا سمجھتے ہیں۔ چالیسواں، جمعہ کی نماز سے زیادہ اہم ہے وغیرہ وغیرہ۔ اس غیر متوازن فکر نے ہماری پوری زندگی کو ٹیڑھا کر دیا ہے۔ سماجی و معاشی زندگی بے ہنگم ہوگئی ہے۔ ہستی کیا ہے؟ ترتیب کا نام ہے۔ توازن کا نام ہے۔ برج نرائن چکبست نے کیا خوب کہا ہے:

---

[1] مسجد الحرام اور مسجد نبوی کو مجموعی طور پر حرمین الشریفین کہا جاتا ہے۔

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے، انھی اجزا کا پریشاں ہونا

ان حالات میں ہمارے لیے لازم ہے کہ ٹھنڈے دل سے سوچیں اور اضطرابی طرزِ فکر چھوڑ دیں۔ اضطراب میں چھوٹی شے بڑی نظر آتی ہے اور بڑی شے چھوٹی نظر آتی ہے۔ ہم بھی فکری اضطراب کا شکار ہیں۔ جس کے سبب فکری توازن سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ اس کو بدلنا ہوگا وگرنہ تہذیبی کجی (distortion) برقرار رہے گی۔

آیئے ایک اور مثال لیتے ہیں: فرانس کے ایک مزاحیہ رسالے 'Hebdo'[1] نے حضور نبی کریم ﷺ کے بارے میں چند بے ہودہ کارٹون چھاپے تو دنیا بھر کے مسلمانوں میں ہلچل مچ گئی۔ انہوں نے چارلی ہیبڈو (Charli Hebdo) مطبوعات کے اس شمارے کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ کیونکہ اس رسالے نے ان کے نظامِ عقائد کے دل پر ضرب لگائی تھی۔ دنیا بھر کے شہریوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حق پہنچتا ہے کہ ایسے معاملات اور اقدامات کے خلاف احتجاج کریں جسے وہ توہین آمیز سمجھتے ہیں یا جس سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اس کیس میں ردِعمل مروجہ احتجاجوں سے کئی گنا زیادہ تھا۔ پارلیمنٹ آف پاکستان (قومی اسمبلی) نے ان کارٹونوں کی مذمت کی اور انہیں اشتعال انگیزی، منافرت پھیلانے اور تہذیبوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کی دانستہ کوشش قرار دیا[2]۔ ان کارٹونوں کی اشاعت پر مسلمانوں نے پیرس میں مبینہ طور پر چارلی ہیبڈو (Charli Hebdo) کے دفاتر پر دو دفعہ (2011ء اور 2014ء) حملے کئے۔ دوسرے حملے میں 12 افراد کو جو اس رسالے میں کام کرتے تھے ہلاک کر دیا گیا۔ پوری مسلم دنیا میں مظاہرین اور پولیس کے درمیان جھڑپیں ہوئیں جن میں متعدد افراد زخمی ہو گئے۔ صرف نائیجیریا ہی میں چار افراد جاں بحق اور 45 زخمی ہوئے۔ تین کلیسا تباہ کر دیئے گئے اور فرنچ

---

[1]۔ چارلی ہیبڈو (Charlie Hebdo) ایک فرانسیسی ہفتہ وار مزاحیہ رسالہ ہے جس میں کارٹون، رپورٹیں، بحث ومباحثے اور لطیفے چھپتے ہیں۔ رسالہ خود کو دیگر سب ملحوظات سے پہلے لادین، دہریہ، بائیں بازو کا حامی اور نسل پرستی کا مخالف قرار دیتا ہے۔ یہ انتہائی دائیں بازو، مذہب (کیتھولک ازم، اسلام اور جوڈاازم) سیاسیات، کلچر اور دیگر موضوعات کے بارے میں مضامین چھاپتا رہتا ہے۔

[2]۔ قرارداد، 14 جنوری 2015ء

کلچر سنٹر (French Cultural Centre) کو جلا دیا گیا۔ اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ پرتشدد ردعمل سلمان رشدی کی بدنام زمانہ کتاب کی اشاعت کے خلاف اور بابری مسجد منہدم[1] کرنے پر ہوا تھا۔ اس قسم کے ردعمل خالصتاً جذباتی، غیر معقول اور ناپسندیدہ ہوتے ہیں۔

اس قسم کی صبر آزما صورتِ حال میں ٹھنڈے دل سے سوچنے اور معقول ردعمل کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ دل دکھنے پر احتجاج بھی ہو جائے اور مسلمان بدنام بھی نہ ہوں۔ آج کل تو پرامن احتجاج کے بہت سے مؤثر طریقے رائج ہیں۔ زندگی کے بارے میں جذباتی طرزِ عمل چھوڑ کر معقولیت پسندی کی راہ اختیار کی جانی چاہیے۔ نامعقولیت کے محدب شیشے کے پیچھے سے جھانکنے سے چھوٹی چیزیں بڑی اور بڑی چیزیں چھوٹی نظر آنے لگتی ہیں۔ معقولیت کا طرزِ عمل نہ اپنایا گیا تو امتِ مسلمہ ہمیشہ ذہنی تعطل کا شکار رہے گی اور غلط جذباتی ردعمل بالآخر اس ذہنی اور جذباتی توازن کو برباد کر کے رکھ دے گا جو قرآن مجید نے ہمیں بتایا ہے۔ ہمیں اس غیر معقول طرزِ عمل سے نجات پانا ہوگی، ورنہ ثقافتی انحرافات برقرار رہیں گے اور ہماری اسلامی روایت کو آہستہ آہستہ زائل کرتے رہیں گے۔



[1]۔ بابری مسجد بھارت کے صوبہ اتر پردیش کے علاقہ ایودھیا میں مغل بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر نے 1527ء میں تعمیر کروائی تھی۔ یہ مسجد اسلامی مغل فنِ تعمیر کے اعتبار سے ایک شاہکار تھی۔ بابری مسجد کو 1992ء میں انتہا پسند ہندوؤں کے ہاتھوں شہید/مسمار کر دیا گیا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے ایل کے اڈوانی کی قیادت میں سخت گیر تنظیموں وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل اور شیوسینا کے ساتھ بابری مسجد کی جگہ پر رام مندر کی تعمیر کے لیے ایک تحریک چلائی تھی۔ تحریک کے دوران 6 دسمبر 1992ء کو ہزاروں ہندو کارسیوکوں نے بی جے پی اور وشو ہندو پریشد کے اعلیٰ رہنماؤں اور نیم فوجی دستوں کے سینکڑوں مسلح جوانوں کی موجودگی میں تاریخی مسجد کو منہدم کر دیا تھا۔ جس کے بعد بھارت میں اپنی تاریخ کے بدترین ہندو مسلم فسادات ہوئے۔

دسواں باب

دست بکار، دل بیار

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ[1]

(جو مال اللہ تعالیٰ نے تمہیں دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر)

مسلمانوں کو دنیاوی اور روحانی زندگی کی علیحدگی کا خاتمہ کرنا ہے۔ ہمیں دین و دنیا کی تفریق کو مٹانا پڑے گا۔ یہاں میں اپنی ایک ذاتی مثال کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ بچپن میں جب میں کبھی اعلیٰ تعلیم، اچھی ملازمت، اچھے گھر کی بات کرتا تھا تو میرے ایک انتہائی قریبی اور مذہبی دوست مجھے سگِ دنیا کہتے تھے۔ پہلے تو میں اسے محبت کی ایک رسم سمجھتا رہا بعد میں، میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے مجھے ایک حدیث سنائی کہ دنیا مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں۔ میں نے انہیں عرض کیا کہ اس حدیث کا یہ مفہوم نہیں جو آپ بیان کر رہے ہیں۔ آپ سوچیں کہ ایک دنیاوی ترقی کے خواہش مند طالب علم کو جب آپ اس طرح برا بھلا کہیں گے تو کیا وہ اعلیٰ سائنسدان بننے کی خواہش کرے گا۔ اعلیٰ تعلیم، اعلیٰ کاروبار، اعلیٰ سواری اسے مردار لگیں گی اور وہ دنیا کا کتا نہیں بننا چاہے گا۔ اس کا رویہ دنیا کے خلاف ہو جائے گا۔

دین و دنیا کی تفریق کا تصور مطلقاً غیر اسلامی ہے۔ یورپی نو مسلم عالم دین جناب محمد اسد (d. 1992) نے دنیا کے بارے میں مسلمانوں کے معتدل نقطہ نظر کو یوں بیان کیا ہے:

> اسلام عیسائیت کی طرح دنیا کے متعلق بری رائے نہیں رکھتا۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہم دنیاوی زندگی کی قدر و قیمت میں موجودہ مغربی تہذیب کی طرح مبالغہ نہ کریں۔ عیسائیت دنیاوی زندگی کی مذمت کرتی ہے اور اس سے نفرت رکھتی ہے۔ موجودہ یورپ عیسائیت کی اصل روح کے خلاف ابوالہوس کی طرح زندگی پر گرتا ہے۔ زندگی کو نگلتا ہے مگر اس کی عزت نہیں کرتا۔ اسلام عیسائیت اور مغرب کے برعکس اس کو سکون اور احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسلام زندگی کی پرستش نہیں کرتا لیکن اسے بلند تر زندگی کے سفر کے لیے لازم تصور کرتا ہے مگر اس سے گزر جاتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ

---

[1] سورۃ القصص: آیت: 77

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّفِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً [1]

(اے اللہ! ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی)

یہ اس دنیا کی نعمتیں ہماری روحانی جدوجہد کے راستہ میں رکاوٹ نہیں۔ مادی ترقی نہ تو ہمارا مقصد ہے اور نہ ہی قابل نفرت [2]۔

اسلام دین وحدت ہے۔ توحید ایک مجرد (abstract) تصور نہیں ہے بلکہ عملی نظریہ ہے۔ توحید ایک نظریہ حیات ہے۔ یہ ہر چیز میں وحدت کا (oneness) قائل ہے۔ دنیا و دین کی وحدت، دنیا و آخرت کی وحدت، علم و عمل کی وحدت، روح و جسم کی وحدت، قبائل اور علاقوں میں وحدت، مذہب و علم میں وحدت، امارت و غربت میں وحدت۔ اسلام کے نزدیک خدا ایک ہے۔ علم ایک ہے۔ دنیا ایک ہے۔ انسان ایک ہے۔ انسانی عمل ایک ہے۔ دنیا اور دین ایک ہیں (اچھی طرح سے دنیا میں رہنے کا نام دین ہے اور دین پر عمل کرنے سے دنیا اچھی ہوگی)۔ جدید و قدیم علم کی بحث کم نظری ہے۔ موت و حیات ایک ہے۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام صرف ہمارے جسم کو چھوتا ہے۔ موت سے فنا نہیں آتی بلکہ زندگی شکل بدل لیتی ہے۔ حضرت اقبالؒ فرماتے ہیں:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دُور رہتا ہے [3]

قرآن کریم نے حکم دیا ہے کہ

فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانۡتَشِرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ وَاذۡکُرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا لَّعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ [4]

(جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتے رہو، شاید تم کامیاب ہو جاؤ)

قرآن پاک نے رزق کی تلاش کو اللہ تعالیٰ کا فضل کہا ہے اور حکم دیا ہے کہ نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل کر اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔ گویا کہ اللہ عزوجل کا فضل دنیاوی کمائی اور عبادت دونوں میں

۱۔ سورۃ البقرہ: آیت:201

۲۔ Islam at the Crossroad by Muhammad Asad, p. 26

۳۔ موت؛ ضرب کلیم از محمد اقبالؒ

۴۔ سورۃ الجمعہ: آیت:10

پنہاں ہے اور کسی ایک بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ یہود کا عمل تھا کہ یوم سبت (ہفتہ کے دن) صرف عبادت کرنا ہے۔ دنیا کے دھندے میں نہیں پڑنا۔ اسلام میں جمعہ کی نماز کی عبادت سے فارغ ہو کر رزق کی تلاش کی عبادت میں شامل ہونے کا حکم ہے۔ مسجد میں بیٹھ کر خاموشی سے ذکر کرنے کا حکم نہیں ہے۔ ہم نے دین کا تصور دنیا چھوڑ کر خالص رہبانی (monastic) تصور دین اختیار کر لیا ہے کہ دین الگ ہے اور دنیا الگ ہے۔ درحقیقت ہم نے دنیا میں رہنا ہے اور اس کو مسخر کرنا ہے۔

آیئے میں آپ کو چند مثالیں دوں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ[1] میں شامل تھے۔ ان کی وفات پر بے پناہ سونا ان کے ترکہ میں شامل تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی دنیاوی دولت ان کی مذہبیت کو جلا بخشتی رہی۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے بلکہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ ہمارے تاریخ کا کوئی بھی عالم اور سائنسدان ایسا نہیں تھا جو دنیاوی کاروبار میں مشغول نہ تھا۔

دین و دنیا کی تفریق تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت مٹا دی تھی جب اللہ پاک کی طرف سے سکھائی جانے والی یہ دعا ہمیں ارشاد فرمائی:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً[2]

(اے ہمارے رب! ہمیں دنیا کی بھلائیاں عطا فرما اور ہمیں آخرت کی بھلائیاں عطا فرما)

دین و دنیا کے باہمی رشتہ کے متعلق دو مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ اعلیٰ گھر، اعلیٰ سواری، اعلیٰ کاروبار، سونا اور چاندی دنیا داری نہیں بلکہ دنیاداری اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے کا نام ہے۔ مولانا رومیؒ (d. 1273) فرماتے ہیں:

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نی قماش و نقره و میزان و زن[3]
(دنیا کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے غافل ہونا دنیا ہے)
(اچھا لباس، سونا، چاندی، اولاد اور خاندان دنیا نہیں ہے)

---

[1]۔ وہ دس صحابہ کرام جنہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا میں ہی بار بار جنت کی بشارت دی۔

[2]۔ سورۃ البقرہ: آیت: 201

[3]۔ بیان ترجیح دادن شیر جهد را بر توکل و فوائد جهد را بیان کردن؛ مثنوی رومی از مولانا جلال الدین رومیؒ: جلد اول

اس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک آدمی رات کو تہجد پڑھ رہا ہے اور اس کے دل میں دنیا کی اشیا کی ہوس ہے تو وہ خدا سے غافل ہے لیکن اگر کوئی آدمی ایک ارب روپے کے گھر میں ہے۔ ایک کروڑ روپے کی گاڑی میں ہے اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہے تو وہ دین دار ہے۔ میں نے ایسے دنیادار دصاحب ثروت دیکھے ہیں جو مکمل طور پر خدا مست تھے جبکہ ایسے دین دار بھی دیکھے ہیں جو مکمل طور دنیا کے طالب ہیں اور دعویٰ کے باوجود خدا سے مکمل غافل ہیں اور ان کے ساتھ بیٹھا نہیں جا سکتا۔

دوسری مثال یہ ہے کہ اگر کشتی پانی میں رہے تو ٹھیک ہے بلکہ کشتی کے وجود کے لیے پانی لازم ہے لیکن اگر کشتی کے اندر پانی چلا جائے تو کشتی ڈوب جاتی ہے۔ اگر ہم کشتی کی طرح دنیا پر تیرتے رہیں تو بہت اچھا ہے لیکن اگر دنیا ہمارے دین کی کشتی میں داخل ہو جائے تو پھر تباہی ہے۔ مولانا رومیؒ (d. 1273) فرماتے ہیں:

آب در کشتی ہلاک کشتی است
آب اندر زیر کشتی پشتی است[1]

ہمیں دین و دنیا کی دوئی (duality) کی تعلیم نہیں دینی چاہیے۔ اس تعلیم سے اچھی سوچ والا طبقہ اپنا ایمان بچانے کے لیے دنیا کے کاروبار سے الگ ہو جاتا ہے یا بددلی سے کام کرتا ہے۔ دنیا صحیح معنوں میں سگِ زمانہ کے حوالے ہو جاتی ہے۔ جس سے دین داروں کو اور زیادہ نقصان ہوتا ہے بلکہ بعض حالات میں مذہبی طبقہ اپنی مذہبی رسومات کی ضروریات اور تکمیل تک کے لیے اہل دنیا کا محتاج ہو جاتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی فکر صحیح کریں۔ جب تک یہ فکر صحیح نہیں ہوگی ہم ترقی نہیں کر سکتے۔

کبھی کبھی مجھے ہنسی آتی ہے کہ ایک طرف ہم اپنے ماضی میں اپنی دنیاوی شان و شوکت کا بہت فخر سے اعلان کرتے ہیں اور دوسری طرف دنیا چھوڑنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ دنیا چھوڑنا خالصتاً رہبانی فعل ہے۔ جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر ہم دنیا کو فتح نہیں کریں گے اور اسے حاصل نہیں کریں گے تو دنیا کا رعب ہمارے دلوں کی پنہائیوں (recesses) میں سما جائے گا۔ ہم مانیں یا نہ مانیں ہمارا عمل اس کا شاہد ہوگا کہ ہم دنیا کے بندے ہیں اور دین کا صرف دکھاوا ہے۔ یہ بہت بنیادی بات ہے۔ اس پر توجہ نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہم عہد حاضر کی دوڑ سے خارج ہو چکے ہیں۔ اگر اپنی اصلاح نہ کی تو تاریخ کا قصہ پارینہ بن جائیں گے اور ہمارا ذکر صرف کہانیوں میں رہ جائے گا۔

---

[1]۔ بیان ترجیح دادن شیر جهد را بر توکل و فوائد جهد را بیان کردن؛ مثنوی رومی از مولانا جلال الدین رومیؒ: جلد اول

گیارہواں باب

اصول شورائیت

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ[1]
(اور اپنے کاموں میں ان سے مشاورت کیا کرو اور جب (کسی کام کا) پکا ارادہ کرلو
تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو)

ہمارے سیاسی نظام کی اصلاح کے لئے مشاورت کی بے حد ضرورت ہے۔ ہم اپنے سیاسی نظام میں کوئی اصلاح نہیں لا سکتے جب تک کہ ہم اپنی سیاسی فکر میں تبدیلی نہیں لے آتے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے زمانے میں سرزمین عرب میں جو سیاسی نظام رائج تھا وہ نیم قبائلی اور نیم ملوکانہ (semi-monarchical) تھا۔ جبکہ پڑوسی ممالک ایران اور روم میں موروثیت اور مطلق العنان شہنشاہیت پر مبنی نظام تھے۔ جن میں عام آدمی کو ریاستی معاملات میں بولنے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ اسلام نے عرب سیاسی نظام کو شراکت اور رضامندی پر مبنی سیاسی نظام میں تبدیل کر دیا[2]۔ قرآن مجید نے اعلان کیا:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ[3]
(اور اپنے کاموں میں ان سے مشاورت کیا کرو اور جب (کسی کام کا) پکا ارادہ کرلو
تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو)

یہ ایک واضح حکم ہے جو بغیر کسی ابہام کے حضور نبی اکرم ﷺ تک کے لیے مشاورت کو لازم قرار دیتا ہے۔ اگرچہ آپ ﷺ کو خداوند عالم کی طرف سے غیر معمولی دانش و بصیرت عطا کی گئی تھی۔ آپ ﷺ کا قلب مبارک انسانوں سے محبت اور ان کی فلاح و بہبود اور خیر خواہی سے معمور تھا۔ مزید برآں آپ ﷺ کو بذریعہ وحی بھی تائید و حمایت اور رہنمائی حاصل تھی۔ اس کے باوجود اگر حضور نبی اکرم ﷺ کے لئے بھی مشاورت ضروری تھی تو بعد کے مسلم حکمرانوں کے لئے یہ بدرجہ اتم ضروری تھی۔ قرآن پاک اس لازمی مشاورت کے لیے ایک دلیل دیتا ہے:

۱۔ سورۃ آل عمران: آیت: 159
۲۔ تفصیل کے لیے دیکھیے باب دوم
۳۔ سورۃ آل عمران: آیت: 159

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ [1]

(جولوگ اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں، ہم نے جو رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں)

یہاں شوریٰ کو اہل ایمان کی ایک لازمی خصوصیت اور ان کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ اس خصوصیت کا ان کی دیگر خصوصیات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی، ادائیگی نماز (فرض نماز) اور ادائیگی زکوٰۃ وغیرہ۔ یہ سب مسلمانوں کے مذہبی فرائض کا حصہ ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید نے 'شوریٰ' کو ایک نظام حکمرانی کے طور پر نہیں بلکہ اصولِ حکمرانی کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ فرق بہت اہم ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعے یہ بات مسلمانوں کی آئندہ آنے نسلوں پر چھوڑ دی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے معاملات کو اصولِ شوریٰ کے تحت طے کریں۔

شوریٰ اس امر کی متقاضی ہے کہ فیصلہ سازی میں سنجیدہ اور موثر شراکت کا اہتمام کیا جائے۔ اسے محض ایک رسمی طریق کار نہ بنایا جائے۔ قرآن کریم حضور نبی کریم ﷺ کو جن پر نزول وحی ہوتا تھا، مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جن امور کے بارے میں آپ ﷺ پر کوئی خصوصی وحی نہ آئے، ان کے فیصلے کے لئے 'شوریٰ' پر انحصار کریں۔ لہٰذا تمام اہل ایمان کو اس ہدایت پر عمل کرنے کو کہا گیا ہے تا کہ اللہ عزوجل کے غضب سے بچ سکیں۔ ممتاز مفسرِ قرآن ابن عطیہؒ (d. 1151) اس آیت کے بارے میں اپنی تفسیر میں لکھتا ہے کہ 'شوریٰ' شریعت کی بنیادوں میں سے ہے اور ایک امرِ لازم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس شخص کو عوامی امور طے کرنے کا اختیار دیا گیا ہے وہ اگر علم اور خدا کا خوف رکھنے والوں سے مشورہ لئے بغیر کام کرے تو اسے اس کے عہدے سے برطرف کر دیا جانا چاہیے [2]۔

لہٰذا چاروں خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین عوامی 'بیعت' کے ذریعے عوام کے پاس گئے اور ان سے اپنی حیثیت کی منظوری حاصل کی تھی۔ 'بیعت' ایک باہمی معاہدہ ہوتی ہے جس کے تحت حکمران یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اسلامی قوانین پر عمل کرے گا۔ اس سے متعلق عوام کو مطمئن کرے گا اور عوام کی طرف سے

۱۔ سورۃ الشوریٰ: آیت: 38

۲۔ المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز از ابن عطیہ اندلسیؒ بحوالہ سورۃ شوریٰ: آیت: 38

اس کے ساتھ یہ عہد کیا جاتا ہے کہ وہ حکمران کی تائید وحمایت کریں گے اور اسے مشورے دیتے رہیں گے۔

لہٰذا آئینی طور پر جب پُرامن طریقے سے ممکن ہو تو بیعت کو منسوخ کیا جا سکتا ہے۔ یہ طریق کار 'مواخذے' اور منصب سے معزولی کے مترادف ہوتا ہے۔ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اتفاق رائے سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا جانشین منتخب ہونے کے بعد واضح طور پر اس حق کی توثیق کرائی تھی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے مسجد نبوی میں مسلمانوں کی بیعت لینے کے بعد اپنے خطاب میں فرمایا:

'مجھے تم پر اختیار دیا گیا ہے، مگر میں تم سے بہترین نہیں ہوں۔ تم اپنے معاملات کے انتظام و انصرام کے لئے میری اطاعت کرتے رہنا۔ جب میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے روگردانی کروں تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں رہے گی'۔

اسی انداز میں خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا:

'اگر میں ٹھیک کام کروں تو تم میری مدد کرنا، اگر غلط کروں تو تم مجھے ٹھیک کر دینا'۔

مندرجہ بالا آیاتِ قرآن مجید اور تاریخی نظائر بتاتے ہیں کہ ہر ایک فیصلہ شورائی عمل کا نتیجہ ہونا چاہیے جو کہ اصولِ اکثریت ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور خلفاء الراشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں پائے جانے والے تاریخی نظائر بتاتے ہیں کہ فیصلے اکثریت کی رائے کے مطابق ہو سکتے ہیں، خواہ سربراہ کی رائے اُس رائے سے مختلف ہو۔ اسلام اس اصول کی بنیاد پر سبق دیتا ہے کہ فرد کو معاشرے یا اجتماع (الجماعت) سے متفق ہونا چاہیے جس کی تعبیر اکثریت کی جا سکتی ہے۔ درج ذیل حدیث اسی اصول اکثریت کا اظہار کرتی ہے۔ 'اللہ تعالیٰ میری امت کو کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہونے دے گا اور اللہ کا ہاتھ جماعت کے ہاتھ کے اوپر ہوتا ہے۔ اس لئے اکثریت (سوادِ اعظم) کا ساتھ دیا جانا چاہیے اور جو کوئی ان سے اختلاف کرتا ہے جہنم کی راہ کا راہی بن جاتا ہے'[1]۔

خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وفات کے بعد مسلم حکمرانوں نے رومنوں اور فارسیوں کا راستہ اختیار کر لیا۔ انہی کی سیاسی روایات، اندازِ حکمرانی، استبدادی طور طریقے اور موروثی خانوادے وجود میں آ گئے۔ مسلم حکمرانوں نے ظل اللہ علی الارض ہونے کا دعویٰ کر دیا جو کہ نظریۂ سماوی حقوقِ شاہی تھا۔ اپنی سیاسی تاریخ کو یاد کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے مذہبی سکالرز کی بیشتر کتابوں میں امیر (حکمران) کے مرکزی کردار پر بحثیں ملتی ہیں، نہ کہ عوام کے کردار کو زیر بحث لایا جاتا ہے۔ ان میں اطاعتِ امیر کو عوام

1۔ مستدرک علی الصحیحین۔ رقم: 116

کا فرضِ اولین قرار دیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ شوریٰ (پارلیمنٹ) صرف سفارش کر سکتی ہے۔ 'امیر' شوریٰ کے مشوروں کا پابند نہیں ہے۔

بنو امیّہ کے زمانے سے لے کر آج تک کے اپنے علماء کی کتابوں میں یہی بحثیں ملتی ہیں۔ حکمران اور شوریٰ کے اضافی اختیارات کیا ہیں؟ ان دونوں میں سے کون زیادہ اہم ہے؟ عوام کی نمائندگی شوریٰ کرتی ہے یا امیر کرتا ہے؟ اس کے علاوہ ان کا خیال یہ بھی رہا ہے کہ امیر کو اپنی پسند کے مطابق شوریٰ کا چناؤ کرنے کا اختیار ہے۔

ایک لمحہ بھر اس نقطے پر غور کیجیے۔ کیا یہ خالص شہنشاہی یا آمریت نہیں ہے؟ ایک حریص شخص ایک بار امیر منتخب ہو کر اپنی پسند کی مجلس شوریٰ قائم کر لیتا ہے اور کبھی کبھار اس سے مشورہ کر کے اپنی پسند کے فیصلے مسلط کرنے لگتا ہے اور دعویٰ کر دیتا ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے اور یہ کہ وہ اس وقت تک اقتدار میں رہے گا جب تک اللہ عزوجل چاہے گا کیونکہ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہے ذلیل کر دیتا ہے۔ اس سیاق وسباق میں کیا امیر دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات ہیں۔ اللہ پاک ہی اس کی رہنمائی کرتا ہے اور یہ کہ وہ زمین پر سایۂ خدا ہے جو کوئی اس کی اطاعت کرتا ہے، وہ اللہ عزوجل کی اطاعت کرتا ہے اور جو اس کی توہین کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی توہین کرتا ہے۔

یہ وہ مسخ شدہ تعبیر ہے جو ہمارے حکمران اقتدار پر غاصبانہ قبضے کے لئے پیش کرتے رہے۔ اسی کی آڑ میں اپنی حکمرانی کو طول دیتے رہے ہیں۔ میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ اسلام میں اس سوچ کا کوئی جواز نہیں ہے۔ عہد حاضر میں اگرچہ عمومی فکر تو یہی ہے لیکن کچھ علما اور دینی جماعتوں نے اس فکر کو چیلنج کرنا شروع کر دیا ہے۔ میں صرف چند مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ 1947ء میں جب اسلام کے نام پر پاکستان وجود میں آیا تو یہ بحث شروع ہوگئی کہ سیاسی نظام کیا ہوگا۔ اس پس منظر کے ساتھ 1949ء میں دستور ساز اسمبلی میں قرارداد مقاصد (Objectives Resolution) منظور کی گئی۔ اس قرارداد کو پاکستان کے تقریباً تمام علماء کی حمایت حاصل تھی اور آج تک تمام مذہبی طبقہ اس کو قبول کرتا ہے۔ اس قرارداد نے اقتدار کا صحیح اسلامی تصور پیش کیا۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات پر اصل حاکمیت (soveriengty) اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اس نے اپنا اختیار پاکستان کی ریاست کو تفویض (delegate) کیا ہے۔ جسے پاکستان کے عوام استعمال کریں گے۔ یہ اقتدار ایک مقدس امانت (secred trust) ہے۔ ریاست یہ اختیار عوام کے منتخب نمائندوں (chosen representatives) کے ذریعے استعمال کرے گی۔ اس نظام

میں جمہورت، آزادی، برابری، رواداری اور سماجی انصاف ہوگا۔ جہاں اقلیتوں کے حقوق کا مکمل تحفظ ہو گا۔ بنیادی انسانی حقوق کو یقینی بنایا جائیگا۔

آپ ذرا اس قرارداد پر غور کریں۔ اقتدار کسی بادشاہ کے لیے نہیں ہے۔ کسی صدر اور وزیر اعظم یا امیر المومنین کے لیے نہیں ہے بلکہ پاکستان کے عوام کے لیے ہے۔ جسے عوام اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے استعمال کریں گے۔ علما اور سیاسی لیڈروں کا یہ متفقہ اعلان تھا کہ اصل حکمران عوام ہیں اور وہ حکمرانی انتخاب کے ذریعے حاصل کریں گے۔ کوئی الوہی حقوق (divine rights) نہیں ہوں گے۔ کوئی امیر المومنین عوام کی مرضی کے خلاف نہیں ہوگا۔ کوئی حاکم اپنی مرضی سے اپنی شوریٰ نہیں بنائے گا بلکہ عوام کے منتخب نمائندوں کا پابند ہوگا۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ دولت، خاندان یا بندوق کی طاقت سے عوام کی گردن پر سوار ہو جائے۔

اچھی بات یہ ہے کہ پاکستان کی آج کل کی مذہبی سیاسی جماعتیں بھی اس فکر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ عوام کے ووٹ کے ذریعے منتخب ہو کر آنے کے بعد پارلیمنٹ کی بالادستی کا دعویٰ کرتی ہیں۔ میں مذہبی سیاسی جماعتوں کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ سیاسی جماعتوں کی یہ سوچ اسلامی سوچ ہے۔ اس لیے کہ اسلامی سیاسی فلسفہ حاکم کی بجائے عوام کو اصل مانتا ہے۔ مسلمانوں کے پہلے خلفاء ہر لمحے عوام کے سامنے جوابدہ تھے۔ پارلیمنٹ کی جو بھی ابتدائی شکل تھی۔ وہ اس کے سامنے مکمل طور پر جوابدہ تھے۔

قرارداد مقاصد کے بعد، میں ملائشیا، ترکی اور ایران کی مثال دوں گا۔ ان برادر اسلامی ممالک میں کسی نہ کسی درجے میں عوامی طاقت سے ہی مسلمان حکومتیں بنی ہیں۔

عوام کی حاکمیت کا تصور جو اسلام میں چودہ سو سال سے ہے اور اہل مغرب نے سولھویں صدی میں اختیار کیا ہے۔ ہمارے سیاسی عمل میں آجکل بھی مکمل طور پر عمل پذیر نہیں ہو سکا۔ اکثر اسلامی ممالک میں حکمران عوام کی مرضی کے خلاف عوام کی گردنوں پر سوار ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے اقتدار دیا ہے اور کبھی ہماری تہذیبی سیاسی طاقتیں کسی نہ کسی شکل میں ان کا ساتھ دیتی ہیں۔

اہل اسلام کو سوچ سمجھ کر یہ پختہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ انہیں عوامیت کا علمبردار بننا ہے اور یہ کہ اسٹیبلشمنٹ سے تعلق مناسب نہیں۔ اہل اسلام کو انقلابی طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ عوام کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔ عوامی زبان بولنی چاہیے۔ ظالم حکمرانوں اور مصنوعی اقتدار سے دوری اختیار کرنی چاہیے۔ عملی

طور پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا کردار ادا کرنا چاہیے۔

اہل اسلام کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اسلام کا نام لینے والا ہر طالع آزما (adventurer) اسلام کا نمائندہ نہیں ہے۔ پاکستان کا مرد آہن ضیاء الحق (Zia-ul-Haq, d. 1988) ہو یا سوڈان کا جنرل عمر حسن احمد البشیر اسلام کے نہیں بلکہ اسٹیبلشمنٹ کے لوگ تھے۔ جو عوام کی مرضی کے خلاف ان کی قسمتوں کے مالک بن گئے تھے۔ چونکہ ان کے پاس توپ تھی وہ اسلام کو اپنی حکومت کے استحکام کے لیے استعمال کرتے رہے۔ یہ اہل اسلام کی نفسیاتی بے بسی (helplessness) ہے کہ کوئی بھی مہم جو (adventurer) جب بھی اسلام کا نام لیتا ہے وہ اس کی حمایت کرتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انہیں اپنے اس رویے کو تبدیل کرنا چاہیے۔ انہیں اپنی بے بسی برداشت کرنی چاہیے اور اس بے بسی کو عوام کی حمایت سے طاقت میں بدلنا چاہیے۔ اسٹیبلشمنٹ کی براہ راست (directly) یا بالواسطہ (indirectly) حمایت نہیں کرنی چاہیے۔ ان کی طاقت اور استحکام کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ اس کے برعکس ہر لمحے اور ہر فیصلے کے وقت عوام کو ترجیح دینی چاہیے۔ چاہے اس سے وقتی طور پر نقصان ہو۔ اس سے عوام کی نگاہ میں اہل اسلام کا اعتماد بڑھے گا جو بالآخر فائدہ مند ہوگا۔ ایران اور ترکی کی مثالیں ہمارے کے سامنے ہیں۔ جہاں اہل اسلام خالص عوام کے بل بوتے پر پوری دنیا کی مخالفت کے باوجود اقتدار میں آئے ہیں۔

اس بات کا بھی دھیان رکھنا چاہیے کہ اقتدار میں آنے کے بعد حکومت عوام کی ہونی چاہیے کسی خاص گروہ کی اجارہ داری (monopoly) نہیں ہونی چاہیے بلکہ عام مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیے۔ افغانستان اس ضمن میں مکمل طور پر ناکام ہوا ہے اور اسلام کی جگ ہنسائی کا سبب بنا ہے۔ اس لیے کہ وہاں سیاسی فکر خالصتاً ملوکیت والی تھی کہ ایک فرد یا ایک ٹولہ عوام کی قسمتوں کا مالک ہے۔ وہ فرد چاہے خلیفہ ہو یا امیر المومنین، مسٹر ہو یا مولوی۔ کچھ حد تک یہی صورت حال ایران میں ہے۔ اگر علماء نے ایران میں اقتدار عوام کے سپرد نہ کیا تو آپ چند سالوں میں ایک اور انقلاب دیکھیں گے جو ولایت فقیہ کے تصور کے خلاف ہوگا۔ پھر شاید وہاں عوامی بادشاہت قائم ہو جائے اور اچھا ہے کہ ایران اصلاح کی طرف بڑھ رہا ہے۔ عرب ممالک کو دیکھیں وہاں اسلام کی ابتدا ہوئی۔ ہمارے مقدس ترین مقامات وہاں ہیں۔ وہاں خالص خاندانی ملوکیت ہے۔ عوام کی حاکمیت سے کوئی تعلق نہیں۔ وہاں کے اکثر علماء اس ملوکیت کے محافظ ہیں۔ ملوکیت کے مخالفوں کے سر علماء کے فتوؤں کے بعد تن سے جدا کیے جاتے ہیں۔ اس ساری بحث

کا ایک اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اگر ہم کسی مسلمان بادشاہ کی ملوکیت کے خلاف بات کریں تو ہمیں اسلام کا دشمن سمجھا جاتا ہے۔

میں آپ کو قرآن مجید سے ایک واقع سنانا چاہتا ہوں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کوئی ہزار سال پہلے کی بات ہے۔ یمن میں قوم سبا کی حکومت تھی۔ اپنے زمانے کے یہ سب سے زیادہ تہذیب یافتہ اور امیر لوگ تھے۔ بارش کے پانی کو کنٹرول کرنے کے لیے ڈیم بنا رکھے تھے۔ اپنے خاص جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے مشرق وسطیٰ، افریقہ اور ایشیاء کے مابین تجارت کنٹرول کرتے تھے۔ ملکہ سبا ان کی حکمران تھی۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کی فوجوں نے اس کی سلطنت کا محاصرہ کیا تو ملکہ سبا (Queen of Sheeba) نے اپنے عمائدین (dignitories) کی مجلس بلائی اور سب سے ایک سوال کیا کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ لڑنا چاہیے یا کہ ہتھیار ڈال دینے چاہئیں؟ قرآن پاک کی سورۃ نمل کی آیت نمبر 33 میں عمائدین کا جواب لکھا ہے:

قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِیْدٍ ۙ وَّالْاَمْرُ اِلَیْكِ فَانْظُرِیْ مَاذَا تَاْمُرِیْنَ [1]

(وہ بولے کہ ہم قوت والے لوگ ہیں اور سخت جنگجو ہیں۔ البتہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے جو بھی آپ فیصلہ کریں گی ہمیں قبول ہوگا)

ملکہ سبا نے اپنی تقریر میں کہا:

قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ [2]

(بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس میں فساد پھیلاتے ہیں۔ اس کے عزت والے لوگوں کو بے عزت کر دیتے ہیں اور یہ بھی ایسا ہی کریں گے)

میری رائے میں جدید سیاسی تاریخ میں بادشاہت اور فوجی حکومت کے کردار کے بارے میں یہ سب سے زیادہ واضح بیان ہے۔ علامہ محمد اسد (Leopold Weis, d. 1992) نے اس آیت کی تشریح میں لکھا ہے کہ داخل ہونے سے مراد قوت سے داخلہ ہے۔ چاہے بیرونی حملے کی شکل میں ہو یا کہ

۱۔ سورۃ النمل: آیت: 33

۲۔ سورۃ النمل: آیت: 34

داخلی طور پر طاقت کے بل بوتے پر اقتدار پر قبضہ ہو۔ بادشاہ سے وہ شخص بھی مراد ہے جس نے طاقت کے زور پر اقتدار حاصل کیا ہو اور اپنے لوگوں کو طاقت کے زور پر غلام بنا رکھا ہو[1]۔

سید مودودیؒ (d. 1979) کے خیال میں ناجائز قابض اس لیے یہ کام کرتے ہیں تاکہ قوم بے بس ہو جائے۔ کوئی ان کے خلاف کھڑا نہ ہو سکے۔ وہ عزت نفس ختم کرتے ہیں۔ غلامی، خوشامد، جاسوسی وغیرہ کے کلچر کو رواج دیتے ہیں۔

فساد اور بے عزتی بہت جامع اصطلاحات ہیں۔ قرآن مجید نے یہ دو الفاظ استعمال کر کے غاصبوں (userpurse) کی ذہنیت اور ان کے ہتھکنڈوں (tactics) پر بہت جامع تبصرہ کیا ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کیا پچھلے چار سو سالوں میں آپ کے ساتھ یہی نہیں ہوا؟ ایسٹ انڈیا کمپنی، تاج برطانیہ ہو یا پاکستان کے غاصب حکمران، سب نے یہاں فساد پھیلایا ہے۔ سب نے یہاں بے عزتی کو رواج دیا ہے۔

بظاہر دلچسپ لیکن اس بحث سے متعلقہ نقطہ یہ ہے کہ جب بھی ہم کسی مسلمان ڈکٹیٹر یا بادشاہ کے خلاف بات کرتے ہیں یا بادشاہوں کے حامی نام نہاد مسلم علماء کی تحریروں پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو اس کو اسلام سے عناد قرار دیا جاتا ہے۔ ~~ملوکیت اور ملائیت کا یہ تانا بانا ان دونوں کے طبقاتی~~ مفادات کو مستحکم بنا دیتا ہے لیکن اس سے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو شدید نقصان پہنچتا ہے جو صدیوں کے سیاسی جبر وتشدد، مذہبی جور وستم، غربت و بے چارگی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے کراہتے رہے اور اب بھی آہ وفغاں کر رہے ہیں۔ حضرت محمد اقبالؒ کہتے ہیں:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و مُلاّئی و پیری![2]
(تمہارے ضمیر کے اس صاف آئینے کا ایک ٹکڑا تک باقی نہ رہا)
(افسوس! اس شخص پر جسے بادشاہوں، ملاؤں اور صوفیوں نے کہیں کا نہیں چھوڑا)

۱۔ The Message of The Quran by Muhammad Asad

۲۔ آوازِ غیب؛ ارمغان حجاز از محمد اقبالؒ

بارھواں باب

نیا دینی نظامِ تعلیم

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ [1]

(اس کے بعد اللہ عزوجل نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تمہارا خیال صحیح ہے تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ!)

ہماری مذہبی تعلیم کا نظام نہ صرف اصلاح کا متقاضی ہے بلکہ یہ مکمل طور پر تبدیل کر دیے جانے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے نصابات اور تدریس کے طریقے فوری توجہ اور اصلاح کے محتاج ہیں لیکن ہم مسلمان اس مسئلے کے بارے میں بہت ہی حساس واقع ہوئے ہیں۔ میں شروع میں ہی یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں مدارس کا ایک وکیل اور ان کا حامی ہوں۔ ہمیں تمام مذہبی علوم انہی مدارس کے ذریعے منتقل ہوئے ہیں۔ یہ لاکھوں غریب و نادار طلبا کو مفت تعلیم دیتے ہیں جو ریاستی تعلیمی نظام سے باہر رہ گئے ہوئے ہیں۔ علماء، اسلام کے لئے ہمیشہ تقویت کا منبع رہے ہیں اور وہ مسلم دنیا کی شاندار روایات قائم کرنے کے لیے انتہائی نامساعد حالات کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب حالات و واقعات بہت بدل چکے ہیں۔ ہمیں وقت کا ساتھ دینے کے لیے اپنے اندر تبدیلیاں لانی پڑیں گی۔ اس سیاق و سباق میں غور و فکر کے لئے ذیل میں چند تجاویز پیش کی جا رہی ہیں۔

1۔ پرانے نصاب کی تبدیلی

مدارس نے ایک مفصل نصابِ تعلیم مقرر کر رکھا ہے مگر اس نصاب کی تقریباً ساری کتابیں صدیوں پہلے لکھی گئی تھیں۔ مثال کے طور پر مدارس ایک خاص قسم کی منطق کی کتاب پڑھاتے ہیں جو دو ہزار سال سے زیادہ پرانی ہے [2]۔ وہ اب بھی ارسطو (Aristotle, d. 322BC) کی کاوشوں پر مبنی منطق پڑھا رہے ہیں۔ بلاشبہ وہ اپنے دور کی انتہائی ترقی یافتہ منطق تھی لیکن اب اس کی افادیت باقی نہیں

[1] سورۃ البقرہ: آیت: 31
[2] تفصیل کے لیے اگلے صفحات دیکھیے

رہی کیونکہ جدید فلسفے میں ڈیکارٹ (Descartes, d. 1650) کی تصانیف کی وجہ سے بہت کچھ ظہور پذیر ہو چکا ہے۔ پچھلے پانچ سو برسوں میں انسانی علوم نے بہت ترقی کی ہے لیکن ہم ذہنی تعطل کا شکار ہیں۔ افکار کے اس تعطل میں سے نکلنے کے لئے نئی علمی کاوشوں اور پیش رفتوں کی ضرورت ہے۔ ہمارے مدارس میں منطق کی جو کتب پڑھائی جارہی ہیں وہ کئی صدیوں پہلے لکھی گئی تھیں جب کہ یہ مضمون بالکل تبدیل ہو چکا ہے۔

مدارس میں اقلیدس (Euclid, d. n.d.) کی ریاضی پڑھائی جارہی ہے۔ وہ واقعی ایک عظیم ریاضی دان تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی پہلے گزرا ہے۔ اس کا جدید بیانیہ یا ایک جدید ریاضی اقلیدس (Euclid, d. n.d.) کے اصولوں کی ارتقائی صورت ہے جو آج کل پاکستان میں انٹرمیڈیٹ کی سطح پر پڑھائی جاتی ہے۔ آج کے طلبا انٹرمیڈیٹ کی تعلیم مکمل کر کے انجینئرنگ کالجوں میں داخلے لے رہے ہیں لیکن مدارس کے طلبا جنہوں نے اقلیدس (Euclid, d. n.d.) کی ریاضی پڑھی وہ ان داخلوں کے لئے مطلوبہ اہلیت نہ ہونے کی وجہ سے رہ جاتے ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ انٹرمیڈیٹ کی سطح کی ریاضی میں اس شعبے میں ہونے والی جدید پیش رفتوں کو شامل کر لیا گیا ہے لیکن مدارس نے اس نصاب میں نہ کچھ شامل کیا ہے اور نہ کوئی تبدیلی متعارف کروائی ہے اور وہی ریاضی پڑھا رہے ہیں جو 2300 سال پہلے رائج تھی۔

ادب (Literature) کے معاملہ میں بھی یہی صورت حال ہے۔ مدارس میں جو ادب پڑھایا جاتا ہے، اس میں سے زیادہ تر زمانہ قبل از اسلام (دورِ جاہلیہ) اور عباسی دور (750ء-1258ء) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نصاب میں نشاۃ ثانیہ، عہدِ وکٹوریہ یا دورِ حاضر کی کوئی چیز شامل نہیں ہے۔ بہ الفاظ دیگر مدارس کے طلباء امیر خسروؒ[1] (Amir Khusrow, d. 1325) اور ولی دکنیؒ[2] (Wali Deccani, d. 1707) کو تو پڑھتے ہیں مگر مرزا غالب (Ghalib, d. 1869) حضرت اقبالؒ (Iqbal, d. 1938) اور فیض احمد فیض (Faiz, d. 1984) سے واقف نہیں ہیں۔ عالمی ادب کے سیاق و سباق میں

---

[1]۔ Amir Khusrow؛ امیر خسروؒ (1253ء-1325ء) فارسی اور اردو کے صوفی شاعر اور ماہر موسیقی تھے۔ انہیں طوطی ہند کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

[2]۔ Wali Mohammed Wali Deccani؛ ولی محمد ولی دکنی (1667ء-1707ء) برصغیر پاک و ہند کے کلاسیکل اردو کے شاعر تھے۔

یہ طلباء ہومر[1](Homer, d. 800BC)اور سوفوکلیز[2](Sophocles, d. 406BC)کو پڑھتے ہیں لیکن چاسر[3](Geoffrey Chauncer, d. 1400)شیکسپیئر[4](Shakespeare, d. 1616)، ورڈزورتھ[5](Wordsworth, d. 1850)، جوناتھن سوفٹ[6](Jonathan Swift, d. 1745)، جان کیٹس(John Keats, d. 1821)، چارلس ڈکنز[7](Charles Dickens, d. 1870)یا ٹی ایس ایلیٹ[8](T. S. Eliot, d. 1965)کو نہیں پڑھتے۔

اسی طرح مدارس کے نصاب میں یونانی عہد کے بطلیموس(Ptolemy, d. 170) کی فلکیات پڑھائی جاتی ہے۔ کاپرنیکس(Copernicus, d. 1543)، گیلیلیو(Galileo, d. 1642)اور نیوٹن(Newton, d. 1727) کے انکشافات نے زمین اور کائنات کے بارے میں بنیادی تصورات ہی تبدیل کر دیئے ہیں۔ ان کے انکشافات سے قبل سائنس دانوں کا نظریہ تھا کہ زمین اس پوری کائنات کا مرکز ہے۔ جب کہ آج ہم جانتے ہیں کہ سورج نظام شمسی کے مرکز میں ہے۔ کائنات کے مرکز میں نہیں۔ مسلمان اب بھی دو ہزار سال پہلے والے زمانے میں رہ رہے ہیں۔ ہمارے مسلمانوں میں سے بعض کو یہ

---

[1]۔Homer؛ ہومر(800BC)ایک قدیم یونانی شاعر تھا۔

[2]۔Sophocles؛ سوفوکلیز (406BC-497BC)ایک قدیم یونانی مصنف اور شاعر تھا۔

[3]۔Geoffrey Chaucer؛ جیوفرے چاسر(1340ء-1400ء)ایک عظیم برطانوی شاعر تھا جسے انگریزی شاعری کا باوائے آدم کہا جاتا ہے۔

[4]۔(William Shakespeare)ولیم شیکسپیئر(1564-1616)ایک انگریز مصنف اور شاعر تھا جسے انگریزی زبان میں دنیا کے عظیم ترین مصنفین اور ڈرامہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شیکسپیئر کو انگلستان کا قومی شاعر مانا جاتا ہے۔ اس کی تصانیف میں تقریباً 38 ڈرامے، 154 گیت، دو لمبی نظمیں اور بہت سی چھوٹی نظمیں شامل ہیں۔ اس کے ڈرامے تقریباً دنیا کی سبھی بڑی زبانوں میں ترجمہ ہو چکے ہیں اور کسی بھی دوسرے مصنف کے ڈراموں کی نسبت زیادہ پیش کیے جاتے ہیں۔

[5]۔William Wordsworth؛ ولیم ورڈزورتھ(1770ء-1850ء)ایک مشہور برطانوی رومانوی شاعر تھا۔ اسے ملک الشعرا کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

[6]۔Jonathan Swift؛ جوناتھن سوفٹ(1167ء-1745ء)ایک اینگلو آئرش سیاست دان اور شاعر تھا۔

[7]۔Charles Dickens؛ چارلس ڈکنز(1812ء-1870ء)برطانیہ کا مشہور ناول نویس تھا۔

[8]۔T.S. Eliot؛ ٹی ایس ایلیٹ(1888ء-1965ء)ایک مشہور انگریزی شاعر، ادیب، ڈرامہ نویس، ایڈیٹر اور پروفیسر تھا جسے 1948ء میں ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔

یقین نہیں آتا کہ انسان نے چاند تک رسائی حاصل کر لی ہے کیونکہ پرانی نظریات کے مطابق یہ چوتھے آسمان میں ہے اور آسمانوں میں سے کوئی بھی نہیں گزر سکتا۔

دینی مدارس کا موجودہ نصاب، درس نظامی[1] جو بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان اور دنیا کے دیگر حصوں مثلاً جنوبی افریقہ، کینیڈا، امریکہ، کریبین جزائر اور برطانیہ میں پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے مرتب ملا نظام الدینؒ (d. 1748) تھے۔ جو لکھنؤ (بھارت) کے شہر سہالی کے رہنے والے تھے۔ ان کا شجرۂ نسب صحابی حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے ملتا تھا۔ ملا نظام الدینؒ 1748ء میں وفات پا گئے۔ وہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (d. 1762) کے ہم عصر تھے۔ ان کا 'مدرسہ سہالی' بعد میں ترقی کر کے مدرسۂ فرنگی محل[2] کے نام سے مشہور ہوا اور اس نے ہندوستان کی تعلیمی اور سیاسی تاریخ میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔

ملاّ نظام الدینؒ (d. 1748) نے اس وقت مروج مذہبی تعلیم کی اعلیٰ کتب کو منتخب کیا اور درس نظامی میں تبدیل کر دیا۔ چنانچہ درسِ نظامی کے نصاب میں عقلی (استدلالی) اور نقلی (مروّج منقول نصابی) علوم کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اس کے لئے انہوں نے یہ دلیل دی کہ مختلف عوامل مثلاً نو آبادیاتی نظام کے ظہور

---

[1]۔ یہ نصاب ملا نظام الدینؒ (1677ء - 1748ء) نے ترتیب دیا تھا جو انہی کی نسبت سے درس نظامی کہلانے لگا۔ ملا نظام الدینؒ فاضلِ جید، عارف فنون رسمیہ، ماہر علوم نقلیہ وعقلیہ اور فقیہ اصولی تھے۔

[2]۔ فرنگی محل لکھنؤ میں وکٹوریہ روڈ اور چوک کے درمیان واقع ہے۔ اس عظیم الشان یادگار عمارت کا نام فرنگی محل اس لیے پڑا کیونکہ اس کا پہلا مالک ایک فرانسیسی تاجر نیل (Neil) تھا۔ یہ ہندوستان میں ایک غیر ملکی کی ملکیت تھی۔ جب مغل شہنشاہ نے فرانسیسی تاجروں کو ہندوستان سے بے دخل کیا تو اس محل کو ضبط کر لیا۔ اسی لیے یہ محل فرنگی (انگریز) محل کہلانے لگا۔ اس دور کے ایک ممتاز عالم دین ملا قطب الدینؒ کو 1692ء میں زمین کے تنازعے میں قتل کر دیا گیا تو مغل بادشاہ اورنگزیب نے اظہار ہمدردی اور دلجوئی کے لئے اس کے چار بیٹوں کو لکھنو کا یہ ضبط شدہ محل اور اس سے ملحق اراضی دے دی۔ اس نسبت سے یہ خاندان بھی فرنگی محلی مشہور ہو گیا۔ ان بھائیوں نے اس رہائشی مرکز کو ایک عظیم الشان اسلامی ادارے تبدیل کر دیا تھا جس کی حیثیت اکثر انگلینڈ کے کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے ساتھ مقابلۃً پیش کی جاتی تھی۔ گاندھی جیسے کئی کانگریسی رہنماؤں نے بھی فرنگی محل میں چند دن گزارے۔ فرنگی محل اسلامی ثقافت اور روایات کے تحفظ اور اضافے میں اہم حصہ ادا کرتا آیا ہے۔ 17 ویں اور 18 ویں صدیوں میں اس خاندان کو دو وجوہ کی بنا پر شہرت حاصل تھی: پہلی وجہ یہ تھی کہ اس نے ہندوستانی اسلام کے علم معقولات (عقلی علوم) کو اتنی ترقی دی کہ ان کے لئے مصر اور مغربی ایشیا سے وظائف ملنے لگے۔ 19 ویں صدی کے اوائل میں اس شعبے کو حیاتِ نو حاصل ہو گئی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ درس نظامی کا مدرسہ نصاب مقبولیت عامہ حاصل کر گیا۔

اور لادینیت کے عروج کی وجہ سے قرآن وسنت کی طرف رجوع بے حد ضروری ہے۔ تاہم موجودہ درس نظامی میں خصوصی طور پر 'نقلی' (روایتی متنی) علوم پر زیادہ توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ مثلاً 'تفسیر' (شرح، قرآن مجید)، حدیث، علوم القرآن، تجوید[1]، عقیدہ، فقہ، عربی زبان وادب۔ تاہم یہ دعویٰ پوری طرح درست نہیں ہے کیونکہ اس میں بہت سی منطق، فلسفہ اور مدّرسانہ ذوق (Scholasticism) بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ ذیل میں ہم مختلف موضوعات پر کتابوں کے نام جو معمولی سے ردوبدل کے ساتھ اس نظام کا حصہ بنائی گئی ہیں مختصراً بتا رہے ہیں۔ اس میں مصنفین کے نام اور ان کی وفات کی تاریخیں بھی شامل کر دی ہیں:

تفسیر قرآن مجید

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سنِ وفات
1	تفسیر جلالین	حضرت جلال الدین المحلیؒ	1459ء
		حضرت جلال الدین السیوطیؒ	1505ء
2	الفوز الکبیر	حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ	1762ء
3	مدارک التنزیل	حضرت عبداللہ بن حمد النسفیؒ	1310ء
4	انوار التنزیل	حضرت ناصر الدین البیضاویؒ	1266ء

ہر تفسیر اپنے زمانے کے حساب سے تعبیر ہوتی ہے۔ اب تفسیر جلالین کو چھ سو سال گزر گئے ہیں۔ ہمیں عہد حاضر کی کتب بھی پڑھانی چاہیں۔

حدیث شریف

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سنِ وفات
1	مشکوٰۃ المصابیح	حضرت امام ولی الدین محمد بن عبداللہؒ	1341ء
2	شرح نخبۃ الفکر	حضرت الحافظ ابن حجر عسقلانیؒ	1448ء
3	مقدمہ شیخ عبدالحق	حضرت شیخ عبدالحق دہلویؒ	1462ء
4	صحیح بخاری	حضرت امام اسماعیل بخاریؒ	869ء
5	صحیح مسلم	حضرت امام مسلم القشیریؒ	874ء

[1]۔ قرآن مجید کی تلاوت میں حروف کی صحیح ادائیگی کے اصول وقواعد کو تجوید کہا جاتا ہے۔

6	جامع ترمذی	حضرت امام محمد عیسیٰ ترمذیؒ	892ء
7	سنن ابی داوٗد	حضرت امام سلیمان السجستانیؒ	886ء
8	سنن نسائی	حضرت امام احمد النسائیؒ	915ء
9	سنن ابن ماجہ	حضرت امام محمد القزوینیؒ	886ء
10	شرح معانی الآثار	حضرت امام ابوجعفر احمد بن محمد الطحاویؒ	933ء
11	شمائل ترمذی	حضرت مولانا محمد زکریاؒ	1981ء
12	موطا امام مالک	حضرت امام مالکؒ	795ء
13	موطا امام محمد	حضرت امام محمد بن الحسن الشیبانیؒ	804ء
14	السنن الصغریٰ	حضرت امام شعیب السنائیؒ	915ء

عہد حاضر میں حدیث شریف پر بہت علمی کام ہوا ہے۔ مغربی علمانے بہت علمی تنقید کی ہے۔ مسلمان علماء نے بھی کچھ تحقیق کی ہے۔ ہمیں یہ سب کچھ بھی پڑھانا چاہیے۔

فلسفہ/منطق (Philosophy / Logic)

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سنِ وفات
1	مِرقاۃ	حضرت مولانا فضل امام الخیرآبادیؒ	1829ء
2	شرح تہذیب	حضرت علامہ عبداللہ یزدیؒ	1606ء
3	قطبی	حضرت قطب الدین رازیؒ	1364-5ء
4	کبریٰ	حضرت میر سید شریف جرجانیؒ	1413ء
5	ہدایۃ الحکمت	حضرت اثیر الدینؒ	1261ء
6	ھدیۃ السیدیۃ	حضرت فضل حق خیرآبادیؒ	1861ء
7	حمداللہ (شرح سلام العلوم:II)	حضرت حمداللہ سندیلویؒ	19ویں صدی
8	الشماسیہ	حضرت نجم الدین القزوینیؒ	1099ء
9	القتبیہ	حضرت قطب الدین الریازیؒ	1364ء
10	التہذیب	حضرت التفتازانیؒ	1487ء

11	سلم العلوم لملا حسن	حضرت ملا حسن غلام مصطفیٰؒ	1794ء
12	شرح شمس البازعہ	حضرت محمد الفاروقیؒ	1409ء
13	تیسیر المنطق	حضرت عبداللہ گنگوہیؒ	1921ء

فلکیات (Astronomy)

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سنِ وفات
1	الملخص فی الحیایہ	محمود الخوارزمی	13ویں صدی
2	شرح قاضی	موسیٰ محمود الروحی	1436ء
3	تصریح الافلاک	بہاء الدین آمولی	1620ء
4	شرح التصریح	لطف اللہ المہند ی	1732ء

فقہ

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف	سنِ وفات
1	مختصر القدوری	حضرت امام ابوالحسن احمد بن محمدؒ	907ء
2	شرح وقایہ	حضرت عبیداللہ ابن المسو دالمحبو بی الحنفیؒ	1346ء
3	اصول الشاشی	حضرت علامہ نظام الدین شاشیؒ	936ء
4	ہدایہ	حضرت برہان الدین مرغینانیؒ	1196ء
5	نورالانوار	حضرت شیخ احمد المعروف ملا جیونؒ	1718ء
6	نورالایضاح	حضرت شیخ حسن بن علیؒ	1688ء
7	شرح بر مسلم الثبوت	حضرت ملا حسن فرنگی محلیؒ	18ویں صدی
8	مسلم الثبوت	حضرت محب اللہ بہاریؒ	1707-8ء
9	البدایہ شرح الہدایہ	حضرت علی مرغینانیؒ	1196ء
10	کنزالدقائق	حضرت احمد نسفیؒ	710ء
11	سراجی	حضرت شیخ سراج الدین محمد بن عبدالرشیدؒ	1311ء

آخری کتاب بھی ساڑھے تین سو سال پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔اس طرح آپ عہد حاضر کے مسائل سے کیسے عہدہ برآء ہو سکتے ہیں؟ نہ صرف سماجی فکر میں تبدیلی آئی ہے بلکہ بالکل نئے علوم آ گئے ہیں۔مگر ہم وہیں کے وہیں ہیں۔ نئے عملی مسائل پیدا ہو گئے ہیں جن کے بارے میں ہم اپنے بچوں کو بالکل ہی نہیں پڑھا رہے۔

ادب(Literature)

نمبرشمار	نام کتاب	مصنف	سن وفات
1	نفحۃ العرب	محمد اعزاز علی	1954ء
2	مقاماتِ حریری	ابو محمد القاسم حریری	1122ء
3	دیوان متنبی	ابو الطیب احمد ابن الحسین المتنبّی الکندی	965ء
4	دیوانِ حماسہ	حبیب بن اوس الطائی	845ء
5	مقامات البدیع	بدیع الزمان الہمدانی	1007ء
6	نفحۃ الیمان	احمد الشیروانی	1320ء
7	المعلقات السبع	حماد الروایۃ	771ء
8	مختصر المعانی	مسعود بن عمر تفتازانی	1390ء

نثر و نظم ترقی کرتی رہتی ہے جبکہ ہم نو سو سال پہلے کا ادب پڑھا رہے ہیں۔ہمیں چاہیے کہ ان قدیم کتب کے کچھ حصے پڑھا لیں اور جدید عربی ادب لازمی طور پر نصاب میں شامل کریں۔زبان زندہ ہوتی ہے۔بدلتی رہتی ہے مگر ہم ماضی میں قید ہیں۔

ریاضی(Mathematics)

نمبرشمار	نام کتاب	مصنف	سن وفات
1	خلاصہ فی الحساب	بہاء الدین آمولی	1620ء
2	تحریر اقلیدسی	نصیر الدین طوسی	1273ء

2۔ قرآن مجید کی اہمیت

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو علم و دانش کا عظیم ترین خزانہ ہے لیکن مدارس میں یہ مناسب طریقے سے نہیں پڑھایا جاتا۔ تھوڑا سا ترجمہ، مختصر سی تفسیر (تفسیر جلالین) کے ہمراہ پڑھایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مدارس میں 'تفسیر بیضاوی' کا ایک حصہ پڑھایا جاتا ہے۔ تاہم سوال یہ ہے کہ کیا قرآن مجید اس سے زیادہ پڑھائے جانے کا تقاضا نہیں کرتا؟ خاص طور پر اس طویل نصاب کے ہمراہ؟

تفسیر جلالین بلاشبہ ایک مختصر مگر شاندار تفسیر ہے لیکن یہ پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں لکھی گئی تھی۔ ہر کتاب اپنے زمانے کے معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی سوچ کے اثرات کی حامل ہوتی ہے۔ تاریخی متون کے علاوہ ہمیں طلباء کے لئے چند عصر حاضر کی تفاسیر بھی تجویز کرنی چاہئیں۔

آج کے مدارس میں قرآن مجید کی بہ نسبت حدیث شریف اور فقہ (اسلامی قانون) پر بہت زیادہ وقت اور توجہ صرف کی جاتی ہے۔ نصاب میں حدیث کی کم از کم سات کتابیں شامل ہیں اور فقہ بھی چار سال تک پڑھائی جاتی ہے۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ قرآن مجید اور حدیث پڑھاتے ہوئے سارا وقت ایک فقہی مسلک کی دوسرے فقہی مسلک سے برتری ثابت کرنے پر صرف کر دیا جاتا ہے۔ قرآن مجید اور حدیث شریف کی لازوال تعلیمات کے حسن پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ ہمیں پہلے قرآن مجید اور پھر حدیث شریف پڑھانی چاہیے۔ فقہ آخر میں پڑھانی چاہیے تاکہ ہم حدیث پاک کو قرآن مجید کی روشنی میں سیکھ سکیں اور فقہ کو قرآن مجید اور حدیث شریف دونوں کی روشنی میں سیکھ سکیں۔ لیکن ہم نے اس ترتیب کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم فقہ پہلے پڑھاتے ہیں اور وہ بھی ایک خاص مکتبِ فکر کے نقطۂ نظر کی روشنی میں۔ پھر حدیث کو اس فقہ کی روشنی میں پڑھایا جاتا ہے جس میں اس کے سوا کچھ نہیں ملتا کہ اس خاص مکتبۂ فکر کی فقہ کی توثیق کی جاتی ہے۔ حدیث میں ہم صحیح اور مستند احادیث کے ساتھ ساتھ موضوع احادیث بھی پڑھائے چلے جاتے ہیں۔ آخر میں جا کر ہم قرآن مجید کو حدیث شریف کی روشنی میں پڑھانے لگتے ہیں۔ اس کا نتیجہ صاف ظاہر ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا، لا الہ الا اللہ[1]

---

[1] ۔غزلیں؛ یورپ میں لکھے گئے؛ بالِ جبریل از محمد اقبالؒ

3۔ نیا طریق تدریس

پڑھانے کے تمام طریقے اپنے اندر نمایاں خصوصیات رکھتے ہیں۔ مدارس میں پڑھانے کا طریق کار پرانا ہو چکا ہے۔ دنیا بھر میں اعلیٰ درجے کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تدریس 'لیکچر پر مبنی' ہوتی ہے مگر مدارس میں تدریس متن (Text) پر مبنی ہوتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر استاد نصابی کتاب میں سے ایک سطر یا چند سطریں بلند الفاظ میں پڑھنے کے بعد ان کی وضاحت کرتا ہے۔ اس طرح پوری کتاب کی وضاحت کر دی جاتی ہے۔ جدید تعلیمی اداروں میں سے کوئی ایک بھی علم سکھانے کے لئے یہ طریقہ استعمال نہیں کرتا۔ یہ 'چمچی سے کھلانے' (spoon-feeding) کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ہمارے مدارس میں حافظے (rote learning) پر زور دیا جاتا ہے۔ طالب علم کے ذہن کو مصروف کرنے اور اس کے اندر قوتِ استدلال پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ طلباء میں تخلیقی کام کے لئے ذہن کو استعمال کرنے کا رجحان پیدا نہیں ہوتا۔ جدید سکولوں میں دورانِ تدریس نفسِ مضمون سے متعلق سوال کرنے کی بہت حوصلہ افزائی کی جاتی ہے لیکن مدارس میں سوال کرنے کی نہ صرف حوصلہ شکنی کی جاتی ہے بلکہ اسے بدتمیزی اور گستاخی سمجھا جاتا ہے۔ ایسا تدریسی ماحول جدّت و اختراعِ تخلیق کا دم گھونٹ کر رکھ دیتا ہے۔

ہم نے کچھ روایات کی غلط تعبیر اور ان کا بے جا اطلاق کر کے سوال پوچھنے کو بُرا اور گستاخانہ رویہ قرار دے دیا ہے جب کہ پورا قرآن مجید اس امر کا گواہ ہے کہ اسرارِ کائنات کے بارے میں جاننے اور اپنی لاعلمیوں کے دائرے سے باہر نکلنے کے لئے سوالات پوچھنے کی تربیت دی گئی ہے۔

فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ[1]

(اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھ لو)

اَفَلَا يَنْظُرُوْنَ اِلَى الْاِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ ۝ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ ۝ وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ ۝ وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ[2]

---

[1] ۔ سورۃ الانبیاء: آیت: 7

[2] ۔ سورۃ الغاشیۃ: آیت: 17-20

(تو کیا یہ لوگ اونٹوں کونہیں دیکھتے کہ کیسے بنائے گئے ہیں؟ آسمانوں کونہیں دیکھتے کہ انہیں کیسے اٹھایا گیا ہے؟ پہاڑوں کونہیں دیکھتے کہ کیسے جمائے گئے ہیں؟ اور زمین کونہیں دیکھتے کہ کیسے بچھائی گئی ہے)

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۝ وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۝ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ[1]

(حقیقت یہ ہے کہ ایمان لانے والوں کے لیے آسمانوں اور زمین میں بیشمار نشانیاں ہیں۔ اور تمہاری پیدائش میں اوران حیوانات میں بھی بڑی نشانیاں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ زمین میں پھیلا رہا ہے ان لوگوں کے لیے جو یقین کرنے والے ہیں۔ رات اور دن کے اختلاف میں اوراس رزق میں جسے اللہ تعالیٰ آسمان سے نازل کرتا ہے پھراس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے۔ اور ہواؤں کی گردش میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں)

سوالات پوچھنا ہرگز بے احترامی یا گستاخی نہیں ہے بلکہ یہ ایک مستحسن امر ہے۔علم کے اعلیٰ مدارج تک رسائی، اختراعات وایجادات اورانکشافات، یہ سب سوال کرنے کے مزاج اور مروجہ معلومات کوچیلنج کرنے کی عادت کا نتیجہ ہیں۔

4۔ جدید زبانوں کی تدریس

مدارس میں عربی اور فارسی کے علاوہ کسی زبان کی تدریس نہیں ہوتی۔عربی واقعتاً بڑی سنجیدگی کے ساتھ پڑھائی جاتی ہے لیکن اس کو پڑھانے کا جو طریق کار اختیار کیا جاتا ہے وہ ایسا ہے کہ ان مدارس کا ایک فارغ التحصیل عصر حاضر کی عربی کے چند جملے بھی روانی سے نہیں بول سکتا جبکہ انگلش پبلک سکولوں کے تیسرے گریڈ کے طلباء انگلش روانی سے بول لیتے ہیں۔ مدارس کے عربی زبان کے نصاب میں زیادہ زور

---

[1] سورۃ الجاثیہ: آیت: 3-5

عربی قواعد (گرامر) حفظ کرنے پر دیا جاتا ہے۔

مزید برآں مدارس میں کوئی بھی جدید زبان نہیں پڑھائی جاتی۔ حتیٰ کہ اب فارسی بھی نہیں پڑھائی جاتی ماسوائے بنیادی سطح کی فارسی کے۔ انگلش، جرمن اور فرینچ پڑھانے کو 'گناہ' سمجھا جاتا ہے۔ میرے بچپن کے اساتذہ بھی انگلش سیکھنے کو کفر کہا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ زبان اپنے ساتھ مغرب کی انحطاط پذیر ثقافت بھی لاتی ہے۔ اس لئے اس سے بچنا ہی چاہیے۔

5۔ عہد حاضر کا انداز تحریر

ہماری تمام روایتی اسلامی کتب بہت مشکل زبان میں لکھی ہوئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے مشکل زبان میں لکھنے کو عالمانہ شان کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ نتیجتاً ہماری نوجوان نسل قدیم ادب سے مشکل زبان کی وجہ سے کٹ (لاتعلق ہو) چکی ہے۔ ہم آج افلاطون (Plato, d. 347 BC)، ارسطو (Aristotle, d. 322BC) اور شیکسپیئر (Shakespeare, d. 1616) کو محض اس لئے پڑھ سکتے ہیں کہ ان کے دور کی زبان کو جدید طرز میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ ہمارے علماء اب بھی دقیق اور غیر معمولی اسلوب میں لکھتے لکھاتے ہیں اور اسے ادبی کمال اور علم کا اظہار سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے قرآن مجید کی ایک آیت کی ایک نامور ہندوستانی عالم دین نے کس طرح تشریح کی ہے:

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَانٍ[1]

(وہ ہر آن نئی شان میں ہے)

یعنی ہر وقت اس کارگاہ عالم میں اس کی کارفرمائی کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے اور وہ بے حد و حساب چیزیں نئی سے نئی وضع اور شکل اور اوصاف کے ساتھ پیدا کر رہا ہے۔ اس کی دنیا کبھی ایک حال میں نہیں رہتی۔ ہر لمحہ اس کے حالات بدلتے رہتے ہیں اور خالق ہر بار اسے ایک نئی صورت سے ترتیب دیتا ہے جو پچھلی تمام صورتوں سے مختلف ہوتی ہے۔

لیکن ایک عالم دین نے اس کا ترجمہ یوں کیا۔

'صدورِ افعال لزوم بالذات'

(اجرائے احکام اس کی ذات کا ایک جزوِ لازم ہے)

---

[1]۔ سورۃ الرحمٰن: آیت: 29

ہم اس آیت کے معنی سمجھ سکتے ہیں لیکن یہ ترجمہ/تفسیر سمجھنا ناممکن ہے۔اس لئے یہ لازم ہے کہ اسلام پر لکھی گئی قدیم کتابوں کو آسان زبان میں منتقل کیا جائے۔عربی اور فارسی میں لکھی گئی کتابوں کا بھی مقامی زبانوں میں ترجمہ کیا جانا چاہیے تا کہ عام قاری کو بھی ان تک رسائی حاصل ہو اور وہ ان سے فائدہ اٹھا سکے۔

6۔ تحقیق کی روِش

دینی مدارس میں تحقیق کا کوئی تصور یا رواج نہیں۔ان کے ہاں صدیوں سے بس یہی کام چلا آ رہا ہے کہ کسی قدیم قلمی نسخے یا تحریر کی شرح لکھ دی۔کسی علمی موضوع پر جدید سائنس کی روشنی میں کوئی تخلیقی کام نہیں کیا گیا۔

ایک دفعہ میں نے اسلامی معاشیات پر خود آگہی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ میں نے اس موضوع پر کئی کتابیں اکٹھی کیں مگر ان میں ایسی کتابیں بہت ہی کم تھیں جنہیں بطور نصابی کتاب تجویز کیا جا سکتا یا انہیں پوسٹ گریجویٹ سطح پر پڑھایا جا سکتا۔

یہی صورت حال اسلامی قانون کے بارے میں ہے۔گزشتہ پانچ سو برسوں کے دوران صرف چند ایک ہی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں جبکہ مغرب میں ہر سال قانون کے ہر شعبے سے متعلق کئی نئی کتابیں شائع ہوتی ہیں۔

ہم یہ بات کہہ کر خود کو مطمئن کر لیتے ہیں کہ فلاں فلاں کتاب بہت پرانی ہے مگر اہل مغرب فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ یہ کتاب اس سال چھپی ہے یا یہ اس کا تازہ ترین ایڈیشن ہے۔ یہ معاملہ خصوصاً قانون اور سائنسز کی کتابوں کے سلسلے میں دیکھنے میں آ رہا ہے۔

مغربی سکالرز قرآن مجید، حدیث شریف اور اسلامی قانون پر مسلسل ناقدانہ تبصرے مع تازہ حوالہ جات شائع کر رہے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ اسلامی لٹریچر پر تازہ ترین رائے مسلمانوں، بالخصوص روایتی مذہبی اہل علم تک پہنچ ہی نہیں پاتی۔اگر یہ آراء مسلمانوں تک پہنچ ہی جائیں تو عموماً ایک رُبع صدی (چالیس سال) کے بعد یہ نوبت آتی ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ کسی نے ان میں سے کسی کتاب کا ترجمہ کر دیا ہو۔اس سیاق وسباق میں بھی مسلمان ان آرا پر تعلیمی یا علم و دانش کی بنیاد پر جواب نہیں دیتے۔ صرف یہ اعلان کر دیتے ہیں کہ یہ اسلام کے منافی ہے۔بعض اوقات مسلمان اہل مغرب کو لعن طعن کر کے

مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس کتاب کے اثرات جلدی ختم ہو جائیں گے۔

مسلمانوں کو مغرب کے تیار کردہ اس منفی لٹریچر سے ہماری نوجوان نسل کو پہنچنے والے بے پناہ نقصان کا ذرہ بھر بھی اندازہ نہیں۔ ہمیں نوجوانوں اور تعلیم یافتہ افراد کی طرف سے روزانہ سنگین سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو وہ اسلام کے مختلف پہلوؤں اور ان تعبیرات کے حوالے سے پوچھتے ہیں۔ ان میں سے بہت سوں کو اسلام کے ساتھ بہت گہری محبت ہے مگر وہ اس نام نہاد مذہبی طبقے اور ان کی غیر معقول اور سطحی تعبیراتِ اسلام سے بیزار ہو چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مسلم نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ اس معاملے میں حق بجانب ہے۔ مسلمان اہل دانش نہ تو ان کی سوچ سے آگاہ ہیں اور نہ ہی ان کی تعلیم اور ان کی زبان سے واقف ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ہمیں ان نوجوانوں اور تعلیم یافتہ طبقے سے کوئی ہمدردی بھی نہیں۔ اگر ہمارے علماء کو تعلیم یافتہ لوگوں کے بارے میں ذرہ بھر بھی تشویش ہوتی تو وہ انہیں مذہب کی راہ پر لانے کی کوشش ضرور شروع کر چکے ہوتے یا انہیں مکمل طور پر دائرۂ اسلام کے اندر ہی رکھنے کا کوئی سنجیدہ لائحہ عمل مرتب کر لیتے۔ علماء ان کو ان کی وضع قطع اور لباس میں دیکھتے ہی گمراہ اور منحرف از اسلام قرار دینے لگتے ہیں جبکہ ان میں خاصی تعداد ایسی ہے جو قلبی طور پر مذہب سے محبت رکھتی ہے اور نماز بھی پڑھتی ہے۔ علماء کے لئے لازم ہے کہ وہ خود کو اس نسل کی اصلاح کے لئے تیار کریں کیونکہ اب تک ہم یہ کام کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہے ہیں۔

ایک روز ایک لڑکی میرے پاس انٹرویو کے لئے آئی اور وہ مختصر لباس پہنے ہوئے تھی۔ میں نے اس لباس کی وجہ سے اسے ایک آوارہ لڑکی سمجھا جس کا مذہب سے کوئی تعلق واسطہ نہیں لگتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آج کل کیا پڑھ رہی ہو تو وہ بولی کہ وہ حضرت جلال الدین رومیؒ (d. 1273) پڑھ رہی ہوں۔ اس جواب پر میں ٹھٹکا اور مزید سوال پر اس نے بتایا کہ وہ امریکہ میں رہتی تھی اور اس نے مولانا رومیؒ (d. 1273) کی کتاب کا انگریزی میں ترجمہ پڑھا جس سے وہ بہت متاثر ہوئی۔ کیونکہ مولانا رومیؒ (d. 1273) خدا سے محبت کرتا ہے اور وہ بھی خدا سے محبت کرنا چاہتی ہے۔ اس کے بعد وہ چلی گئی۔ مجھے زبردست جھٹکا لگا کہ میں نے اسے غیر مذہبی اور بے حیا لڑکی سمجھنے کا گناہ کیا تھا۔ میں نے یہ تاثر اس کے ظاہری لباس سے لیا تھا جبکہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کی متلاشی تھی اور اس سے تعلق رکھتی تھی۔

ایک دفعہ کی بات ہے کہ ایک ذہین لڑکی میرے ساتھ کام کرتی تھی۔ وہ مسلمان تھی مگر پلی بڑھی مغربی ملکوں میں تھی۔ اس کا عام رویہ بھی مغربی ثقافت سے متاثر تھا لیکن وہ اکثر مجھ سے اسلام کے بارے

میں سوالات پوچھتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ اسلام کی صحیح سپرٹ (spirit) کی تلاش میں تھی۔ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتی تھی۔ میں نے اسے پر ابوبکر سراج الدین المعروف مارٹن لنگ[1] (Martin Lings, d. 2005) کی لکھی حضور نبی کریم ﷺ کی سیرت مبارک پر ایک کتاب دی۔ کتاب پڑھنے کے بعد جب وہ آئی تو اس موضوع پر اس کی اور میری طویل گفتگو ہوئی۔ اس نے اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ پر اپنے ایمان کی تجدید کی۔ میں اسے سیرت نبی ﷺ پر انگریزی زبان میں کسی روایتی عالم کی لکھی ہوئی اچھی سی کتاب دینا چاہتا تھا مگر نہ مل سکی۔ چنانچہ مجھے مجبوراً ایک اور مغربی نومسلم کی لکھی ہوئی کتاب دینا پڑی۔

اس نئی نسل میں ایمان کا بیج موجود ہے لیکن اس کے ماحول اور تعلیم نے اسے اسلام سے دور رکھا ہے۔ موجودہ دور کے اسلامی لٹریچر میں ان کے لئے کوئی اپیل موجود نہیں ہے۔ ان کے مسائل، ان کے سوالات، ان کی سوچیں مختلف ہیں۔ یہ روایتی اور قدامت پسند علماء کے طرزِ عمل سے بالکل بیزار ہیں۔ میرا سوال یہ ہے کہ اس وحشت زدہ اور بوکھلائی ہوئی نسل کی رہنمائی کون کرے گا اور کون اس کی دیکھ بھال کرے گا؟

میں سید ابوالحسن ندویؒ کی اس رائے سے مکمل طور پر اتفاق کرتا ہوں کہ آج کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ ان کا ذہنی انحطاط ہے۔ مثال کے طور پر شیخ ابن تیمیہؒ (d. 1328) اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (d 1762) کے درمیانی عرصے میں کوئی غیر معمولی ذہانت کی حامل شخصیت پیدا نہیں ہوئی جو اسلامی فکر کی ذہنی اور علمی سطح پر آبیاری کر سکتی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغرب میں متعدد بلند مرتبہ سائنسدان، سکالرز، فلاسفرز اور ماہرین معیشت پیدا ہوئے اور اپنی قوم کو ہر شعبے میں ارتقاء کی منزلوں سے ہمکنار کیا۔ ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ دہلویؒ (d. 1762) کے بعد ان کی سطح کا کوئی نابغہ پیدا نہیں ہو سکا۔

آج مسلمان ذہنی افلاس کا شکار ہیں۔ ان میں افکار اور واقعات کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے۔ ہم حقائق کا تجزیہ کرنے کی بجائے دوسروں کو اپنی غلطیوں اور حماقتوں کا قصوروار ٹھہرا رہے ہیں۔ ہم بے حد جذباتی احتجاج کرنے کے عادی ہو چکے ہیں اور اپنی ناکامیوں کے لئے دوسروں کو ذمہ دار

---

[1]۔ Martin Lings: ابوبکر سراج الدین المعروف مارٹن لنگ (1909ء-2005ء) ایک انگلش مسلمان محقق، مصنف اور سکالر تھا۔ اس کی وجہ شہرت Muhammad: His Life Based on the Earliest Sources ہے۔

قرار دینے لگے ہیں۔لیکن ہمارا اصل مسئلہ ہمارا ذہنی بحران اور ذہانت کا فقدان ہے۔ہم کام نہیں کرتے، محنت سے جی چراتے ہیں اور ذہنوں کو ترقی دینے میں کوتاہی کرتے ہیں۔

آیئے ایک مثال لیتے ہیں۔ بھارت میں دارالعلوم دیوبند[1] دنیائے اسلام کا نہایت مشہور و معروف مدرسہ ہے۔لیکن اس کے پاس ایک بھی تحقیقی پروگرام نہیں ہے۔ہارورڈ سکول آف ڈیوینیٹی (Harvard School of Divinity) جو ہارورڈ (امریکہ) کے بارہ سکولوں میں سے ایک ہے۔ اس میں تحقیق کی مندرجہ ذیل سہولتیں موجود ہیں:

(1)۔ ہارورڈ کے ریسرچ اینڈ رایٹنگ فیکلٹی ممبران کی تحقیق کے خصوصی شعبوں میں بین الکلیاتی تحقیق، ہمکارانہ تحقیق اور رفقائے کار کے ساتھ مکالمہ شامل ہے۔حالیہ منصوبوں میں درج ذیل امور شامل ہیں:

(i)۔ عقیدۂ بشارت الانجیل (Nigerian evangelicalism) کی تفتیش اور اس عقیدہ کے علمبرداروں نے اسرائیل، یورپ اور امریکہ کے بعض حصوں میں جو علاقائی، عالمی اور سیاسی کردار ادا کیا ہے اس کا مطالعہ؛

(ii)۔ اسلامی دنیا کے مختلف اداروں کے تصورات اور ان کے طبی، مذہبی اور ثقافتی نظریاتِ اصناف اور تذکیر و تانیث کے بارے میں ایک تحقیقی منصوبہ۔

(iii)۔ 'ہمزاد' (divine double) سے متعلق نئی تحریریں جن میں زمانۂ قدیم سے مشہور روایت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ان کے مطابق ہر شخص کا ایک 'ہمزاد' (divine double) ہوتا ہے جو اس کے لئے عصر حاضر کے فلسفیانہ خیالات میں مشیر ہوتا ہے اور دینیاتی یادداشتوں کو واپس لانے کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔

(iv)۔ رواں مذہبی ادبی منصوبہ، جو مذہب اور تعلیم کے ماخذات کے بارے میں تحقیق میں مدد دیتا

---

[1]۔ دارالعلوم دیوبند ہندوستان کے شمالی صوبہ اتر پردیش کے ضلع سہارنپور کے ایک قصبہ دیوبند میں واقع ہے۔اس مدرسہ کو ہندوستان میں برطانوی سامراجیت کے دور استبداد میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحریک کو جاری رکھنے، مسلمانانِ ہند کے جداگانہ تشخص کو برقرار رکھنے، مسلک حنفیہ کی مسند تدریس کو منور رکھنے، دشمنان اسلام، مشرکین ہندوستان اور عیسائی مبلغین کے اسلام پر اعتراضات کا جواب دینے کے لیے 1866ء میں مولانا قاسم نانوتوی نے قائم فرمایا۔اسلامی تعلیمات کی تدریس کے لیے الازہر یونیورسٹی، مصر کے بعد اس درس گاہ کو عالمگیر شہرت نصیب ہوئی۔

ہے۔ بالخصوص ایک عالمگیر دنیا میں مذہب، شہریت اور اخلاقی تعلیم کے مابین تعلق کی تحقیق۔

(v)۔ قبطی انجیل پیپرس، یسوع کی بیوی کی انجیل کے بارے میں تازہ ترین تحقیق۔

(2)۔ ہارورڈز کے مراکز اور پروگرام حسبِ ذیل ہیں:

(i)۔ مرکز برائے تحقیق عالمی مذاہب: جس نے مذاہب کے تاریخی اور عصر حاضر کے باہمی تعلقات پر غور وخوض کو فروغ دیا اور مذہبی گروہوں اور آج مذہب کا مطالعہ کرنے والوں کو درپیش دینیاتی فلسفیانہ، تقابلی، سیاسی اور اخلاقی چیلنجوں سے آگاہ کیا۔

(ii)۔ خواتین سے متعلقہ مذہبی مطالعہ وتحقیق کا پروگرام تا کہ پتہ چل سکے کہ مذہبی روایات نے خواتین اور مردوں کے کردار کے تعین میں بنیادی طور پر کیا کردار ادا کیا ہے۔

(iii)۔ منصوبۂ تکثیریت: (pluralism project) یہ امریکہ کے تبدل پذیر مذہبی منظر کی موجدانہ تحقیق ہے تا کہ ہمارے کثیر المذاہب معاشرے کے خدوخال کو ضابطۂ تحریر میں لایا جا سکے۔ بین المذاہب مکالمے کی نئی شکلیں تیار کی جا سکیں۔ شہری زندگی پر مذہبی تنوع کے اثرات کا مطالعہ کیا جائے اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج کو عالمی ڈھانچے کے سیاق وسباق میں رکھ کر دیکھا جا سکے۔

(iv)۔ مذہبی خواندگی کا منصوبہ: یہ ویب سائیٹ تک کھلی رسائی کے ذریعے مذاہب کے عمومی مطالعے کے لئے مواد اکٹھا کرنے، تخلیق کرنے اور خصوصی روایات مرتب کرنے کا منصوبہ ہے جو بنیادی طور پر پبلک سکول ٹیچرز اور ان کے شاگردوں کے استفادے کے لئے ہے۔

(v)۔ سائنس، مذہب اور ثقافت پر مذاکرے، سیمینارز اور ورکشاپس کا انعقاد جن کے ذریعے بین الکلیاتی مباحث ہوتے ہیں اور ہارورڈ یونیورسٹی کے اندر اور باہر کے سکالرز اور طلبا میں روابط کو فروغ ملتا ہے۔

(vi)۔ مذاہب اور عمل امن اس کے متقاضی ہوتے ہیں کہ وہ اپنے پیغام میں نظم وضبط کی تلقین کریں۔ اہل علم کے ساتھ رابطے بڑھائیں اور اس امر کی جستجو کریں کہ دنیا بھر کے افراد اور معاشرے مذہبی اور روحانی وسائل کے ذریعے کس طرح باہمی مفاہمت اور خوشگوار تعلقات، باہمی تعاون، بہبود عامہ کے کام کیے اور اپنے پیغام امن کے ذریعے کس طرح مذہبی، فرقہ وارانہ، قوم پرستانہ ، نسلی اور ثقافتی اختلافات پر قابو پایا اور کس طرح ایسی مساعی عصر حاضر میں قیام امن کے لئے

نظریہ سازی اور عملی اقدامات کو فروغ دے سکتی ہیں۔

(3)۔ ہارورڈ کے پاس درج ذیل باقاعدہ تحقیقی مطبوعات ہیں:

(i)۔ ہارورڈ یونیورسٹی بلٹین (Harvard Divinity Bulletin): اس کا مقصد مذہب کے بارے میں غیر فرقہ وارانہ جائزہ پیش کرنا اور عہد حاضر کی حقیقتوں پر توجہ دینا ہے جس کی وجہ سے اکیڈمی کے اندر اور باہر، دونوں حلقوں میں اظہار پسندیدگی ہو رہا ہے۔ یہ پرچہ دنیا بھر کے 20,000 افراد کے پاس پہنچتا ہے۔

(ii)۔ ہارورڈ تھیالوجیکل ریویو (Harvard Theological Review)، یہ امریکہ میں قدیم ترین علمی اور دینیاتی جرائد میں سے ہے۔ یہ تمام روایات اور ادوار کے بارے میں تاریخ اور مذہبی فکر پیش کرتا ہے جن میں عبرانی بائیبل، عہد نامہ جدید، مسیحیت، یہودیت، تھیالوجی، اخلاقیات، آثار قدیمہ اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ شامل ہے۔

(iii)۔ 'جرنل آف فیمینسٹ سٹڈیز ان ریلیجن' (Journal of Feminist Studies in Religion) یہ ایک ششماہی رسالہ ہے۔ یہ مذہبی تعلیمات کے حوالہ سے قدیم ترین غیر مذہبی نسوانی تعلیمی رسالہ ہے[1]۔

نیدرلینڈ کے انٹر یونیورسٹی سکول آف اسلامک سٹڈیز میں ہر سال سینکڑوں تحقیقی مقالے شائع ہوتے ہیں۔ آیئے حالیہ برسوں کے شماروں میں شائع ہونے والے چند موضوعات پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں:

(i)۔ مسلم اہل دانش اور معاشرہ، 17ویں صدی کے وسطی سوڈانی افریقہ میں۔

(ii)۔ یورپ میں اسلامی طلاقیں: یورپی اور اسلامی قانونی نظاموں کے درمیان خلیج کیسے کم کی جائے۔

(iii)۔ پاکستانی شادیاں اور جرمنی اور انگلینڈ کے پرائیویٹ انٹرنیشنل قوانین۔

(iv)۔ ایک صحرا میں مچنے والا شور: ڈچ مسیحی مبلغ کا جاوا کے اسلام سے مناظرہ 1850ء-1910ء

(v)۔ اسلامی جلدسازی کی روایت:

(vi)۔ نیدرلینڈز اور بیلجئم میں اسلامی طریق تدفین: قانونی، مذہبی اور معاشرتی پہلو۔

---

[1]۔ http: //hds.harvard.edu

(vii)۔ 'ہوسکتا ہے کہ میں اب بھی اس کی بیوی ہوں'۔ ڈچ مراکشی اور ڈچ مصری خاندانوں میں ماورائے قومی سرحدات طلاق۔

(viii)۔ لبنان میں سلفی مسلک: مقامی اور ماورائے سرحدات وسائل۔

(ix)۔ مراکش میں نسوانی مذہبی ایجنٹس: قدیم روایتیں اور نئے مناظر۔

(x)۔ شام میں عائلی قوانین: تعددِ قوانین، طور طریقے اور قانونی روایات۔

(xi)۔ آموزش استناد: سلفی مسلک کے پیروکار جرمن اور ڈچ مسلمانوں کی مذہبی رسوم، مجالس میں اور گپ شپ کے کمروں میں۔

(xii)۔ انڈونیشیا کے جزیرہ میڈورا میں اسلام اور سیاست: علما اور دیگر مقامی رہنما، اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لئے کوشاں۔

(xiii)۔ قدیم مسلم مصر میں آدابِ مسرت اور اظہارِ غم، پودے سے بنے کاغذ پر لکھے ہوئے خطوط، متن اور مندرجات۔

(xiv)۔ قانونی ادب کا طریق تدوین: سوڈان میں نمیری اور بشیر کے دورِ حکومت میں اسلامی فوجداری قانون سازی اور سپریم کورٹ کیس لاء۔

(xv)۔ بہتر مسلمان کیسے بنا جائے: آسیہ (انڈونیشیا) میں اطاعت نافذ کرنے کا اختیار اور اصلاحِ اخلاق۔

(xvi)۔ مابین تاریخ افسانہ: حضرت محمد ﷺ کی سوانح حیات از قلم ابن شہاب الزہریؒ۔

(xvii)۔ شمالی نائیجیریا میں اسلامی فوجداری قانون: سیاست مذہب اور عدالتی طریق کار۔

(xviii)۔ ایک تارک الدنیا جہادی سلفی: ابو محمد المقدسی کا نظریۂ حیات اور اس کے اثرات۔

(xix)۔ اسلامی اصلاح پسندی اور عیسائیت: محمد رشید رضا اور ان کے رفقاء کی تحریروں کا ایک تنقیدی جائزہ۔

(xx)۔ اسلام اور جسمانی معذوری: اسلامی تعلیمات اور فقہ کی روشنی میں۔

کیا ہمارے ہاں اسلامی تعلیمات کا کوئی ایسا ادارہ ہے جو اس درجے کی تحقیق کے لئے کوششیں کر رہا ہو؟ اس کا جواب ہے 'بالکل نہیں'۔

7۔ اختلافِ رائے کا احترام

اسلام تکثیریتِ عقیدہ (pluralism of creeds) اور اعمال کو کھلے دل سے قبول کرتا ہے۔ اس امر کا اعلان اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے۔ مذہبی تکثیریت سراسر منشائے الٰہی کا نتیجہ ہے۔ وہ چاہتا تو بنی نوع انسان کو جبراً ایک ہی عقیدہ اختیار کروا سکتا تھا یا ایک طرزِ عمل پر مجبور کر سکتا تھا۔ جیسا کہ اس نے کائنات کو ایک لگے بندھے طریقے کی پابند کر رکھا ہے۔ تاہم اس نے ہم پر کوئی ایک طریقہ مسلط نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے ہمیں پسند کی آزادی عطا کر رکھی ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّلٰکِنْ یُّضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْئَلُنَّ عَمَّا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ [1]

(اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی (کہ تم میں کوئی اختلاف نہ ہو) تو وہ تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈالتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے اور ضرور تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس ہو کر رہے گی)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (d. 1979) لکھتے ہیں:

'اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا طرف دار سمجھ کر بُرے بھلے طریقے سے اپنے مذہب کو (جسے وہ خدائی مذہب سمجھ رہا ہے) فروغ دینے اور دوسرے مذاہب کو مٹا دینے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی یہ حرکت سراسر اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہے۔ اگر اللہ پاک کی منشا واقعی یہی ہوتی کہ انسان سے مذہبی اختیار چھین لیا جائے اور چارو ناچار سارے انسانوں کو ایک ہی مذہب کا پیروکار بنا کر چھوڑا جائے تو اس کے لئے اللہ عزوجل کو اپنے نام نہاد 'طرف داروں' کی اور ان کے ذلیل ہتھکنڈوں سے مدد لینے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ یہ کام تو وہ خود اپنی تخلیقی طاقت سے کر سکتا تھا۔ وہ سب کو مومن و فرماں بردار پیدا کر دیتا اور کفر و معصیت کی طاقت چھین لیتا۔ پھر کس کی مجال تھی کہ ایمان و اطاعت کی راہ سے بال برابر بھی

---

[1] سورۃ النحل: آیت: 93

جنبش کر سکتا؟[1]'

اسی طرح قرآن پاک یہ بھی کہتا ہے:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ[2]

(اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تمہیں ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ تمہیں اس میں آزماتا ہے جو اس نے تمہیں دیا ہے۔ پس نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ اللہ عزوجل ہی کی طرف تم سب کا لوٹ کر جانا ہے۔ پھر وہ تمہیں بتائے گا جن باتوں میں تم اختلاف کیا کرتے تھے)

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ[3]

(اور اگر آپ کا رب چاہتا تو سب لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا اور وہ ہمیشہ مختلف رہیں گے)

وہ اختلاف رائے پیدا کرنے کے لیے اپنے منصوبے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے انسانوں کو راہ کے انتخاب کا حق دیتا ہے۔ اس نے بنی نوع انسان کو ایک جبلی فطرت ودیعت کی ہے جس کے اندر غلط اور صحیح کے درمیان امتیاز کر سکنے کی صلاحیت موجود ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اعلان کیا گیا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ[4]

(دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔ اس لیے جو

---

[1] تفہیم القرآن از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بحوالہ آیت بالا

[2] سورۃ المائدہ: آیت:48

[3] سورۃ ھود: آیت:118

[4] سورۃ البقرہ: آیت:256

شخص باطل معبودوں کا انکار کر کے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ خوب سننے اور جاننے والا ہے)

نبی علیہ السلام صرف حق بات واضح کر سکتا ہے لیکن لوگوں پر جبر کر کے ان سے اپنے نظریات منوا نہیں سکتا۔ چنانچہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ [1]

(اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نصیحت کرتے رہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان کے ذمہ دار نہیں ہیں)

ان آیات کی وضاحت کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودی (d. 1979) کہتے ہیں:

اگر معقول دلیل سے کوئی شخص بات نہیں مانتا تو نہ مانے۔ تمہارے سپرد یہ کام نہیں کیا گیا ہے کہ نہ ماننے والوں سے زبردستی منواؤ۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کو صحیح اور غلط کا فرق بتا دو اور غلط پر چلنے کے انجام سے خبردار کر دو۔ سو یہ فرض تم انجام دیتے رہو[2]۔

یہ آیات کافی حد تک واضح کر رہی ہیں کہ اختلافات کی موجودگی خالقِ کائنات اللہ تعالیٰ کی ایک سوچی سمجھی سکیم کی وجہ سے ہے جو خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ تمام انسان ایک ہی عقیدے اور سوچ کے حامل ہوں اس لئے اختلاف یا آرا کا الگ الگ ہونا خدائی دانش وحکمت سے گہری مطابقت رکھتا ہے۔ اس دینیاتی تناظر میں سے ایک قدرتی نتیجہ نکلتا ہے۔ وہ یہ کہ خدا نے خود اپنے بندوں کو مختلف آرا رکھنے کا حق دیا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کو ایک الوہی حقیقت کے طور پر قبول کرنا ہوگا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیروکاروں میں اختلافِ رائے کو ہمیشہ گوارا کیا ہے اور اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو کسی خاص مسئلے پر مختلف آراء رکھنے سے منع نہیں کیا۔ اس کی ایک مثال

---

[1]۔ سورۃ الغاشیہ: آیت: 21-22

[2]۔ تفہیم القرآن از سید ابوالاعلیٰ مودودی: بحوالہ مذکورہ بالا

غزوہ خندق میں پیش آئی۔ جنگ خندق سے فارغ ہوکر حضور نبی کریم ﷺ نے ایک گروہ کو حکم دیا کہ وہ بنی قریظہ کی بستی میں جائیں اور وہاں جاکر عصر کی نماز پڑھیں۔ وہ لوگ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وہ جماعت دو حصوں میں بٹ گئی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم راستے میں نماز نہیں پڑھیں گے بلکہ منزل پر پہنچ کر پڑھیں گے۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے الفاظ یہ تھے کہ بنی قریظہ میں جاکر نماز پڑھیں۔ اس کے برعکس کچھ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ نماز میں تاخیر ہو رہی ہے۔ راستے میں نماز پڑھ لی جائے۔ آپ ﷺ نے جو حکم دیا تھا اس کا اصل مطلب یہ تھا کہ جلد از جلد منزل پر پہنچا جائے۔ آپ ﷺ نے دونوں گروہوں کی رائے کو منظور فرمایا[1]۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان قرآن مجید کے احکامات اور حضور نبی کریم ﷺ کے کئی فرمودات کی تعبیر کے بارے میں کئی سنجیدہ اختلافات تھے:

(i)۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مرتد عورتوں کے مسئلے پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اختلاف تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نظریئے سے اختلاف کرتے ہوئے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے دوران ان سب عورتوں کو آزاد کر کے انہیں ان کے سرپرستوں کے حوالے کر دیا۔

(ii)۔ شام اور عراق کے مفتوحہ علاقوں کے بارے میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے تعامل سے اختلاف کرتے ہوئے یہ علاقے فاتح سپاہیوں میں تقسیم نہیں کئے بلکہ انہیں اوقاف قرار دے دیا (اجتماعی مفاد کے لئے ریاستی تحویل میں لے لیا)۔

(iii)۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مابین کئی قانونی مسئلوں پر اختلافات تھے[2] لیکن اس کے باوجود وہ ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے۔

(iv)۔ ایک دفعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا جنگ جمل میں ان کے مقابل مشرکین تھے تو

---

[1] صحیح بخاری۔ جلد دوم: رقم: 1342

[2] اعلام الموقعین عن رب العالمین از امام ابن قیم الجوزیہؒ

انہوں نے جواب دیا:

وہ مشرک نہیں تھے بلکہ شرک سے تو بھاگ کر مسلمان ہوئے تھے۔

پھر پوچھا گیا کیا وہ منافقین تھے؟

آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ منافقین تو اللہ تعالیٰ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔

پھر پوچھا گیا کہ وہ کون تھے؟

آپ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: وہ ہمارے بھائی تھے جنہوں نے ہمارے خلاف بغاوت کر دی تھی[۱]۔

(v)۔ امام حافظ ذہبیؒ کا بیان ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کے جانشینوں کے درمیان اختلاف تا قیامت ختم نہیں ہو سکتا، کیونکہ اسے دور کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے۔ ایک گروہ کو حق پر قائم اور دوسرے کو ناحق پر قائم قرار دے دیا جائے اور یہ ناممکن ہے[۲]۔

ابتدائی دور کے مسلم فقہا میں بھی اختلاف ہوتے رہتے تھے۔ پھر بھی وہ ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ حضرت امام شافعیؒ (d. 820) نمازِ فجر میں دعائے قنوت پڑھنے کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتِ مؤکدہ سمجھتے تھے جب کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) اس نظریئے کی تائید نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت امام شافعیؒ (d. 820)، حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) کے روضے پر گئے اور انہوں نے فجر کی نماز پڑھتے ہوئے دعائے قنوت نہ پڑھی۔ جب ان سے اس کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) کے دربار میں ان سے کیسے اختلاف کر سکتا ہوں[۳]۔

مسلمانوں کو آرا کے ان اختلافات کو ایک قدرتی امر سمجھنا چاہیے اور انہیں ایک حقیقت گردانا چاہیے۔ اہل اسلام کو ان اختلافات کو ختم کرنے کی کوششیں کر کے اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ ایک سعی لاحاصل ہوگی۔ اس کی بجائے انہیں ان اختلافات کو ایک رحمت سمجھ کر پُرامن بقائے باہمی کا فن

۱۔ مصنف ابن ابی شیبہ۔ جلد نہم: رقم:7974؛ سنن کبریٰ للبیہقی۔ جلد نہم: رقم:2869؛ کنز العمال۔ جلد ششم: رقم:1305

۲۔ وحدت امت از مولانا محمد اسحاق۔ صفحہ نمبر 25

۳۔ Fiqh Al-Imam: Key Proofs in Hanafi Fiqh by Abdur-Rahman Ibn Yusuf, p. 24

سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔حضرت اقبالؒ (d. 1938) نے بالکل بجا کہا ہے:

فہم فلسفہ کے میدان میں کسی چیز کو درجۂ کمال حاصل نہیں۔ ہمارے علم کی بنیاد میں وسعت پیدا ہونے اور فکر کے لئے در کھلنے سے بہت سے دیگر خیالات، غالباً ان لیکچرز میں پیش کردہ خیالات سے کہیں زیادہ بہتر، ظہور پذیر ہو جائیں گے۔ تاہم یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم انسانی علم میں ہونے والے اضافے پر نظر رکھیں۔ اس سلسلے میں ہمیں حقِ تنقید کو آزادی سے استعمال کرنا ہوگا[۱]۔

ان تعلیمات کے برعکس تقریباً ہر مدرسہ فرقے پر مبنی ہے۔ ان کا نصاب اور امتحانات فرقہ واریت پر استوار ہیں۔ مثال کے طور پر دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، شیعہ اور جماعت اسلامی، سب کے اپنے اپنے تعلیمی بورڈز ہیں۔ ان مدارس کے اساتذہ کی توانائیاں ایک دوسرے کے عقائد اور نظریات کا رد پڑھانے پر صرف ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان کے عظیم شیخ الحدیث سید انور شاہ کشمیریؒ[۲] کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ ایک بار وہ بہت مغموم بیٹھے تھے۔ ان سے ان کی پریشانی کا سبب پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اپنی ساری زندگی یہ ثابت کرتے کرتے ضائع کر دی ہے کہ فقہ حنفی باقی فقہ پر فوقیت رکھتی ہے۔

مدرسوں کا فارغ التحصیل ہر شخص اپنے آپ کو 'عالم' سمجھتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ صرف وہی (نہ کہ کوئی دوسرا) اسلام کی نمائندگی کا حق ادا کر رہا ہے۔ یہ سر سید احمد خان (d. 1898)، حضرت محمد اقبالؒ

۱۔ The Reconstruction of Religious Thought In Islam by Muhammad Iqbal, Preface.

۲۔ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ (1875ء-1933ء) برصغیر پاک و ہند کے ایک نامور عالم دین، مفسر، محدث اور صوفی بزرگ تھے۔ اپنے کیریئر کے دوران انہوں نے متعدد مشہور اداروں میں پڑھایا جن میں دارالعلوم دیوبند بھی شامل تھا۔ وہ اسلام پر عربی اور فارسی کی متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ان کے شاگردوں میں عظیم محدث، مفسر، فقیہہ، ادیب، خطیب، مؤرخ، شاعر، مصنف اور عارف پیدا ہوئے کہ جن کی نظیر کم از کم پورے برصغیر میں ملنا مشکل ہے۔ دارالعلوم کے اٹھارہ سالہ قیام میں کم از کم دو ہزار طلباء شاہ صاحب سے بلا واسطہ مستفید ہوئے۔

(d. 1938)، ڈاکٹر فضل الرحمان[1](d. 1988)، سید ابوالاعلیٰ مودودی(d. 1979)اور علامہ محمد اسد (Leopold Weis, d. 1992) کو عالم دین (سکالر) نہیں سمجھتے۔ بلکہ انہوں نے سر سید احمد خان (d. 1898)اور ڈاکٹر فضل الرحمان(d. 1988) کو ملحد قرار دے دیا۔ جب کہ مؤخر الذکر کو اپنی جان بچانے کے لئے ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ حضرت محمد اقبالؒ(d. 1938) نے یورپی اہل ایمان میں مقبولیت حاصل کر لی تھی لیکن ہندوستان اور پاکستان کے علماء انہیں مذہبی سکالر تسلیم نہیں کرتے کیونکہ وہ کسی مدرسے کے فارغ التحصیل نہیں تھے۔

یہ کوئی راز نہیں کہ سر ولیم میور[2] (Sir William Muir, d. 1905) نے حضور نبی کریم ﷺ کی جو سوانح حیات لکھی اس میں اس نے حضور نبی کریم ﷺ کی شخصیت کو داغ دار کرنے کی ناپاک جسارت کی تھی۔ اس کے شائع ہونے کے بعد سر سید احمد خان(d. 1898) اپنی ساری جائیداد فروخت کر کے انگلینڈ چلے گئے تا کہ آپ ﷺ کی سیرت پر ایک ایسی کتاب لکھی جائے جس میں ولیم میور(Sir William Muir, d. 1905) کے اعتراضات کا تسلی بخش جواب دیا جائے۔ اس پر انہوں نے کئی سال کی محنت کے بعد 'خطبات احمدیہ' تیار کی۔ یہ اس موضوع پر ایک شاندار کتاب ہے۔ لیکن ہم نے ان پر فطرت پرست اور مرتد ہونے کا الزام لگا دیا۔ علماء نے اسلام اور امت مسلمہ کے لئے ان کی تمام خدمات کو مسترد اور نظر انداز کر دیا محض اس بنا پر کہ ان کے چند نظریات معروف علماء کے خیالات سے

---

[1]۔ ڈاکٹر فضل الرحمان (1919ء - 1988ء) پاکستان کے ایک نامور اسلامی سکالر، فلاسفر اور اسلامی تعلیمی اصلاح کار تھے۔ آپ کی کتب میں

i. Islam;
ii. Prophecy in Islam: Philosophy and Orthodoxy;
iii. Islam and Modernity: Transformation of an Intellectual Tradition;
iv. Major Themes of the Qur'an;
v. Revival and Reform in Islam;
vi Islamic Methodology in History;
vii. Health and Medicine in the Islamic Tradition;
viii. Riba and Interest

قابل ذکر ہیں۔

[2]۔ Sir William Muir؛ سر ولیم میور(1819ء-1905ء) ایک سکاٹش مستشرق تھا۔

مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ ان علماء نے سر سید احمد خان (d. 1898) کی تحریک علی گڑھ کو بھی کوئی اہمیت نہ دی جس نے ہندوستان میں مسلمانوں کی بقاء کے لئے حیات آفریں کردار ادا کیا۔

میں نے علامہ محمد اسد (Leopold Weis, d. 1992) کا وہ خط پڑھا ہے جس میں انہوں نے مغموم دل کے ساتھ یہ الفاظ لکھے ہیں کہ پاکستان میں ایک خاص گروہ نے ان کے خلاف تکفیر کی مہم چلا دی ہے۔ جس پر انہوں نے شکستہ دل ہو کر پاکستان چھوڑ دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مراکش میں آباد ہو گئے۔ میری رائے میں ان کی تفسیر قرآن مجید انگریزی میں اب تک لکھی گئی مختصر تفاسیر میں سے بہترین تفسیر ہے۔ ان کی تفسیر صحیح بخاری اور دیگر کتابیں بھی اسلامی ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ بعض روایتی علماء نے ان پر ارتکابِ کفر کا الزام لگا دیا کیونکہ وہ واقعہ معراج، جنوں اور دیگر نمایاں عقائد اسلام کے بارے میں بعض مروجہ نظریات سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔

ہم صاحبان ایمان لوگ رفتہ رفتہ برداشت اور رواداری ترک کر رہے ہیں۔ ہمیں کیا ہو گیا ہے؟ ہم معمولی سا اختلاف رائے بھی برداشت کرنے سے معذور ہو گئے ہیں۔ پاکستان میں متعدد اہل علم کو اختلاف رائے پر یا اس بنا پر قتل کر دیا گیا کہ کسی مخصوص فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت سے علماء کرام کو پاکستان چھوڑنا پڑا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لئے غیر ممالک میں پناہ گزیں ہو گئے کیونکہ ان کے بہت سے رفقاء کو اسلام کے نام پر وحشیانہ انداز میں قتل کر دیا گیا تھا۔ فتح اللہ گولن نے امریکہ میں پناہ لے لی ہے۔ یہ بالکل غیر علمی اور غیر معقول رویہ ہے جس نے ہم میں علم سے مخاصمت پیدا کر دی ہے۔

8۔ تخصیصِ علوم

اب ماہرین خصوصی کا معاملہ لے لیجئے۔ مدارس کا ایک طالب علم آٹھ سے دس سال درسِ نظامی پڑھنے کے بعد ایک سند (ڈگری) لیتا ہے۔ مزید ایک یا دو سال صرف کر کے مفتی بن جاتا ہے۔ اس سے وہ اسلامی قانون سے متعلقہ کسی مسئلے پر رائے دینے کے قابل سمجھ لیا جاتا ہے۔ پھر وہ عائلی امور، مذہبی معاملات، شخصی قوانین، اقتصادی اور بینکنگ کے معاملات، تجارت اور بزنس سے متعلق فتوے جاری کرنا شروع کر دیتا ہے۔ مدرسے کے ایک فارغ التحصیل کے بارے میں یہ رائے قائم کر لی جاتی ہے کہ وہ قرآن مجید، حدیث شریف، منطق، اسلامی قانون، عربی ادب، فلکیات اور دیگر متعلقہ موضوعات کے بارے میں

مہارت حاصل کر چکا ہے۔ لہٰذا وہ زندگی کے کسی بھی معاملے میں حتمی فیصلہ صادر کرنے کا اہل ہے جو پوری امت مسلمہ پر قابلِ اطلاق ہوگا۔

جدید طریقِ تعلیم اس طریق تعلیم سے کلیتاً مختلف ہے۔ قانون کی مثال لے لیجئے۔ ایک طالب علم چودہ سال کی پڑھائی کے بعد مزید تین سال لگا کر قانون میں بیچلرز ڈگری یعنی ایل ایل بی کرتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ مزید پڑھنا چاہتا ہے تو مزید 3 تا 5 برس میں اپنی پی ایچ ڈی مکمل کرتا ہے۔ اس کا ڈاکٹر کی سطح کا تفصیلی مقالہ (Doctoral dissertation) قانون کے ایک شعبے کے کسی ایک خصوصی موضوع پر ہوتا ہے جو کہ قانون کا صرف ایک پہلو ہوتا ہے۔ پھر وہ نوجوان کسی یونیورسٹی میں بطور لیکچرز تعینات ہوجاتا ہے۔ اس حیثیت سے پوسٹ گریجویشن کی سطح کی تدریس کے تقریباً 30 / 25 سال بعد پروفیسر بنتا ہے۔ اگر آپ اس سے اس کے مخصوص دائرے سے باہر تعلق رکھنے والا کوئی سوال پوچھیں گے تو وہ صرف یہ کہے گا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اس سلسلے میں آپ کسی متعلقہ شخص سے سوال کریں۔

یہ پروفیسر اس سوال کا جواب نہ دے سکنے اور کسی اور کا نام تجویز کرنے پر کوئی شرمندگی محسوس نہیں کرے گا۔ دوسری طرف ایک مدرسے میں دس سال پڑھنے والا نوجوان بغیر کسی جھجک کے زندگی کے تمام مسائل کے بارے میں پورے اعتماد سے اپنا حتمی فیصلہ سنا دے گا اور حرام و حلال پر بھی فوراً رائے دے دے گا۔ یہ رویہ اور طریق عمل آج کے دور میں کام نہیں دیتا۔

ہماری سوچ بڑی عجیب ہے۔ اگر کوئی ہم سے نئی قانونی تحقیق کے بارے میں سوال کرتا ہے تو ہم فوراً جواب دیتے ہیں کہ تمام سوالوں کا جواب اور تمام مسائل کا حل ہمارے گزرے ہوئے فقہاءؒ نے پیش کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت امام مالکؒ (d. 795)، حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772)، حضرت امام شافعیؒ (d. 820)، حضرت امام احمد بن حنبلؒ (d. 855) اور حضرت امام جعفر صادقؒ[1] (d. 765) بلند پایہ فقیہ تھے۔ جنہوں نے اسلامی فقہ کے اصول وضع کر دیئے تھے اور اسلامی فقہ میں ان کی خوب وضاحت کر دی گئی ہے۔ تاہم ان کے اصولوں کو اطلاق کی ضرورت ہے یا عہد حاضر

1۔ امام جعفر صادق بن محمد باقرؒ (702ء-765ء) حضرت زین العابدینؒ بن حسین بن علی رضی اللہ عنہ کے پوتے تھے۔ آپؒ نے زین العابدینؒ سے علم و فیض حاصل کیا۔ آپؒ کا شمار تبع تابعین میں ہوتا ہے۔ اکابرین امت حضرت امام مالکؒ و امام ابوحنیفہؒ نے آپؒ سے احادیث روایت کی ہیں۔ آپؒ کی والدہ محترمہ سیدہ ام فروہؒ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پڑپوتی بھی تھیں۔

میں ان کی نئے سرے سے تعبیر کی جانی چاہیے۔

آج کئی نئے مسئلے کھڑے ہو چکے ہیں جو اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ انہیں انہی اصولوں کی روشنی میں حل کیا جانا چاہیے۔ مثال کے طور پر جہاز رانی، ہوابازی اور بیمہ وغیرہ۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی نے دنیا کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا ہے۔ ان فاضل فقہاءؒ نے ان مسائل پر کوئی بحث نہیں کی کیونکہ ان کے زمانے میں یہ مسائل موجود ہی نہیں تھے۔ مجھے ان موضوعات پر ایک کتاب بھی دیکھنے کو نہیں ملی جو اسلام اور اسلامی اصولوں کے حوالوں سے ان شعبوں میں بزنس کرنے پر روشنی ڈالتی ہو۔ آج اس پایہ کے اسلامی سکالرز کہاں ہیں جو اتنا علم رکھتے ہوں کہ ان مسائل پر روشنی ڈال سکیں؟

ہمیں اپنے اسلاف ہی کے کارہائے نمایاں پر اظہار فخر ومباہات کرتے نہیں رہ جانا چاہیے۔ دنیا نے بے پناہ ترقی کی ہے۔ ہر شعبۂ زندگی ارتقاء کی کئی کئی منزلیں طے کر چکا ہے اور ہم دنیا کی دیگر قوموں سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ پتھر کا زمانہ نہیں بلکہ انٹرنیٹ کا دور ہے۔ یہ گھوڑوں، نیزوں اور تلواروں کا نہیں مزائلوں اور ایٹم بموں کا زمانہ ہے۔ یہ جذباتیت اور شعلہ بیانیوں کا زمانہ نہیں بلکہ عقل اور منطقی دلائل کا زمانہ ہے۔ لیکن ہم اس اذعانی راسخ الاعتقادی (dogmatic intellectual logjam) کے تعطل سے باہر نکلنے اور اپنی فکر وعمل میں تبدیلی لانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ دنیائے اسلام کے اہم ترین دارالعلوم دیوبند میں بھی اسلامی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں کی تخصیص کے لئے موزوں کورسز کا اہتمام نہیں کیا گیا۔ اس میں صرف ایک سال کے تفسیر قرآن مجید، فقہ، دینیات اور ادب کے کورسز کرائے جاتے ہیں۔ ان تخصیصی کورسز کے نصاب، مدرسہ کی ویب سائیٹس پر دستیاب ہیں لیکن ان کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پرانے اور متروک ہیں[۱]۔ دوسری طرف ہارورڈ یونٹی سکول (Divinity School of the Harvard University) کے پاس درج ذیل تخصیصی کورسز ہیں:

ہارورڈ الٰہیاتی سکول (Divinity School of the Harvard University) میں درج ذیل چار ڈگری پروگرام ہیں جو دو سے پانچ سالہ عرصے کے ہیں[۲]:

(i)۔ ماسٹر آف تھیالوجیکل سٹڈیز (Master of Theological Studies)

۱۔ http://www.darululoomdesbnd.com/english

۲۔ http:/hds.harvards.edu

(ii)۔ ماسٹر آف ڈیوینٹی (Master of Divinity)

(iii)۔ ماسٹر آف تھیالوجی (Master of Theology)

(iv)۔ ڈاکٹر آف فلاسفی (Doctor of Philosophy)

9۔ کتابوں کی فراہمی

مسلمانوں نے اپنے آباؤ اجداد کی بھی کتابیں وراثت میں حاصل نہیں کیں۔ حتیٰ کہ ابن سینا (Avicenna, d. 1037)، الزہراوی (al-Zahrawi, d. 1013)، عمر خیام (Khayyam, d. 1131)، الفارابی (al-Farabi, d. 950)، ابن نفیس (Ibn Nafees, d. 1288) اور ابوالہیثم (ibn al-Haytham, d. 1040) کی تصانیف مسلم دنیا میں نہ پرائیویٹ لائبریریوں میں پائی جاتی ہیں اور نہ ہی پبلک لائبریریوں میں۔ ان کے ترجمے بلکہ اصل مخطوطات مغرب کی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ قدیم کتابوں میں سے صرف حضور نبی کریم ﷺ (سیرت ابن اسحاق) ملی ہے۔ اس کی تدوین الفریڈ گیلیوم[1] (Alfred Guillaume, d. 1965) نے کی ہے۔ اگر کوئی مسلمان آج قدیم مسلم فلسفے یا ادب پر تحقیق کرنا چاہیے تو وہ جامعۃ الازہر، دارالعلوم دیوبند یا دارالعلوم بریلی[2] نہیں جائے گا بلکہ یونیورسٹی آف لائیڈن (U niversity of Leiden) یا آکسفورڈ (University of Oxford) جائے گا جہاں سے اسے اپنی تحقیق کے لئے مطلوبہ مواد مل جائے گا۔

لائیڈن یونیورسٹی کی مشرق وسطیٰ سے متعلق جمع کردہ کتب 6000 قلمی نسخوں اور مخطوطات پر مشتمل ہے اور ان سے کہیں زیادہ نایاب مطبوعہ کتابیں مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقہ کی زبانوں میں ہیں جو 1950ء تک کے مغربی مستشرقین کی محنت کا نتیجہ ہیں۔ پہلے کے سکالرز میں سے ایک جوزف جسٹس سکالیگر[3] (Joseph Justus Scaliger, d. 1609) نے اپنی عربی فارسی اور ترکی زبان کے قلمی نسخے اور

---

[1]۔ Alfred Guillaume؛ الفریڈ گیلیوم (1888ء-1965ء) ایک برطانوی عربی دانشور، اسلام، بائبل اور عہد نامہ قدیم کا عالم تھا۔

[2]۔ دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم بریلی برصغیر پاک و ہند کے اسلامی تعلیمات کے دو سب سے بڑے ادارے ہیں۔

[3]۔ Joseph Justus Scaliger؛ جوزف جسٹس سکالیگر (1540ء-1609ء) ایک فرانسیسی مذہبی رہنما اور عالم تھا جس نے پہلی دفعہ قدیم ادبی تاریخ میں یونانی تاریخ کے ساتھ ساتھ ایرانی، بابلی، مصری اور یہودی تاریخ کو بھی شامل کیا۔

مطبوعہ کتابیں بھی لائبریری کو ہدیہ کر دیں۔ لیوینس وارنر[1] (Levinus Warner, d. 1619) نے اپنے پرائیویٹ ذخیرے میں سے 1000 قلمی نسخے جو بیشتر عربی، فارسی اور ترکی زبان میں تھے لائیڈن یونیورسٹی کو دے دیئے۔ 1883ء میں یونیورسٹی لائبریری نے مدینہ منورہ کے عالم امین بن حسن المدنی[2] (d. 1898) سے 700 قلمی نسخوں کا مجموعہ خرید لیا۔ سناوک ہرگرونج[3] (Snouck Hurgronje, d. 1936) نے جو نیدرلینڈز کا غالباً سب سے بڑا مستشرق تھا اپنے آخری وقت میں اپنی ساری پرائیویٹ لائبریری اور تاریخی دستاویزات لائیڈن یونیورسٹی لائبریری کے لیے وقف کر دیں۔ سلطنت عثمانیہ کے خاتمے کے بعد 1960ء کے عشرے میں لائیڈن یونورسٹی کی لائبریری نے عثمانی ترکی کا عظیم ذخیرہ جو غالباً سلطان مراد پنجم[4] (d. 1904) اور اس کے ورثاء کی ملکیت تھا، بھی خرید لیا۔ 2009ء میں یونیورسٹی لائبریری نے پیپلز ری پبلک آف چائنا (People's Republic of China) کے صوبہ سنکیانگ (Xinjiang) سے اسلامی قلمی نسخے حاصل کیئے[5]۔

آپ جامعہ اشرفیہ، جامعہ نعیمیہ (لاہور) کے کتب خانے دیکھ لیں۔ اس سے زیادہ کتابیں تو میں نے مغرب میں کئی پروفیسروں کے گھروں میں دیکھی ہیں۔ ہماری کوئی اچھی اسلامی لائبریری نہیں ہے۔ اسلامی قانون پر کتابیں ملتی ہی نہیں۔ لنکنز ان (لندن) میں، میں نے 1997ء میں ایک بار

---

[1]۔ Levinus Warner؛ لیوینس وارنر (1618ء-1665ء) ایک جرمن مستشرق، مخطوطات اکٹھے کرنے والا اور سلطنت عثمانیہ میں جمہوریہ ہلند (Dutch Republic) کا سفیر تھا۔

[2]۔ امین بن حسن مدنی ایک مسلمان مدینہ منورہ کا رہائشی محقق اور استاد تھا جو کتابوں کا کاروبار بھی کرتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت کلاسیکل ادب اور اسلام کے بارے میں عربی نسخوں کی ایک بڑی تعداد جمع کی جسے لائیڈن یونیورسٹی نے اپنی لائبریری کے لیے خرید لیا۔

[3]۔ Christiaan Snouck Hurgronje؛ کرسچین سناوک ہرگرونج (1857ء-1936ء) نیدرلینڈز کا سب سے بڑا مستشرق، مشرقی تہذیب وتمدن اور زبان کا عالم اور نیدرلینڈز کے حکومت کا مقامی معاملات کا مشیر تھا۔

[4]۔ سلطان مراد پنجم (1840ء-1904ء) سلطنت عثمانیہ کا 33 واں خلیفہ تھا جو 30 مئی 1876ء سے 31 اگست 1876ء تک برسر اقتدار رہا۔

[5]_http://www.library.leiden.edu/ Spical- collection/oriental collections/intro-middle-east.html

احسان (equity) کے قانون پر کتب تلاش کیں۔ جب میں نے کمپیوٹر میں احسان لکھا تو اس نے اپنی سکرین پر 241 کتابوں کی فہرست، ان کے مصنفین کے نام، چھاپے خانے کا نام اور صفحات کی تعداد وغیرہ دس سیکنڈ میں بتادی۔ ہمارے بہترین مدارس میں نہ تو اتنی کتب ہیں اور نہ ہی ان کو ڈھونڈنے کا نظام (کیٹلاگ) ہے۔علم کہاں سے آئے گا؟

اب تو تحقیق مزید آسان ہوگئی ہے۔ بازار میں ستر روپے میں کمپیوٹر کی ایک سی ڈی (CD) ملتی ہے۔جس میں چار قاریوں کی آواز میں پورے قرآن کی تلاوت ہے۔ چار تفاسیر ہیں۔صحاح ستہ (حدیث کی چھ بڑی کتب) ہیں۔فقہ کی کئی کتابیں ہیں۔سیرت پر کئی کتب ہیں۔تلاش اتنی آسان ہے کہ آپ وضو کا لفظ لکھیں تو قرآن کی تمام متعلقہ آیات، تمام کتب احادیث میں موجود متعلقہ احادیث، فقہ کی کتب سے آرا دس سیکنڈ میں آپ کے سامنے آجائیں گیں۔اس کے بعد آپ سب کو پڑھ کر جو چاہیں رائے بنائیں۔ یہ تلاش اگر میں دارالعلوم کراچی کی لائبریری میں کرنا چاہوں تو مجھے ایک ماہ (26 لاکھ سیکنڈ) لگیں گے۔ یہی فرق ہمارا اور مغرب کا ہے۔انٹرنیٹ نے تو معاملہ مزید آسان کردیا ہے۔

دوسری مثال لیں۔ امریکہ کی ایک یونیورسٹی، یونیورسٹی آف مینی سوٹا (University of Minnesota) کی انٹرنیٹ کی ایک ویب سائٹ پر حقوق انسانی سے متعلق چھ ہزار سے زائد دستاویزات ہیں۔ جو ہمیں مکمل مفت مل جاتی ہیں۔ دیکھیں قانون اور سیاست کے ایک پہلو یعنی حقوق انسانی پر ایک یونیورسٹی نے ہوا میں اتنی کتابیں ہم سب کے لیے مفت رکھی ہیں۔

میں جب علما سے اس مسئلے پر بات کرتا ہوں تو سادہ سا جواب ملتا ہے کہ ہمارے وسائل نہیں ہیں۔ مجھے اس دلیل سے بالکل اتفاق نہیں ہے۔مسجد پر اگر ہم ایک چھوٹا سا مینار بنالیں۔ چار بڑے مینار نہ بنائیں تو اسی مسجد میں ایک چھوٹی سی لائبریری قائم ہوسکتی ہے۔آپ جانتے ہیں کہ مسجد نبوی کے مینار نہ تھے۔ بیت اللہ شریف کے مینار نہ تھے۔ یہ بعد میں شناخت کے لیے بنے ہیں۔کیا شناخت کے لیے ایک چھوٹا سا خوبصوت سا مینار کافی نہیں ہے؟ حج ایک فرض ہے۔ میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو ہر سال حج پر جاتے ہیں۔فرض حج کے علاوہ ہر سال اربوں روپے ہم حج وعمرہ پر صرف کرتے ہیں کیا اس رقم کا استعمال لائبریری بنانے پر ہوسکتا ہے؟ حالانکہ تحصیل علم بہت اعلیٰ عبادت ہے۔ہم عالم کی ایک رات

عابد کی سوراتوں سے بہتر سمجھتے ہیں[1]۔ اس کو بھی چھوڑ دیں۔ آپ ایک سال میں غیر ضروری مذہبی جلسے جلوسوں پر اٹھنے والے اخراجات کا جائزہ لیں تو وہ کروڑوں میں ہوں گے جو ایک شاندار لائبریری بنانے کے لیے کافی ہیں۔

ہمارے بڑوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی تحقیق کی ہے۔ کیا یہ تاریخی حقیقت نہیں کہ تیس جلدوں پر محیط کتاب المبسوط امام سرخسیؒ[2] نے جیل کے اندر ایک کنویں میں بیٹھ کر لکھی ہے[3]۔ جہاں انہیں زندگی کی کوئی سہولت حاصل نہ تھی اور نہ کسی اچھی لائبریری تک رسائی حاصل تھی۔ ان کے پاس علم کی پیاس اور اپنے مقصد کی لگن تھی۔ حضرت اقبالؒ (d. 1938) کہتے ہیں:

نقش ہیں سب ناتمام خُونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خُونِ جگر کے بغیر[4]

(عظیم فن کسی آرام طلب فنکار کے اندر جنم نہیں لیتا۔ یہ آنسوؤں، اذیتوں اور ذہنی کاوشوں کا ثمر ہوتا ہے جو ہر اس سچے فنکار کی جھولی میں آ گرتا ہے جو انسانیت کے جذبے سے سرشار ہو)

---

[1]۔ کنز العمال۔ جلد پنجم: رقم: 4278 (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک عالم، عابد پر ستر درجے فضیلت رکھتا ہے اور ہر دو درجوں کے درمیان تیز رفتار گھوڑے کی سو سالہ مسافت کے برابر ہے)

[2]۔ شمس ائمہ محمد بن احمد ابو بکر امام سرخسیؒ (متوفی 438 ہجری) ایک مشہور و معروف حنفی سکالر تھے جن کا تعلق ایران کے شہر سرخس سے تھا۔ اسی شہر کی نسبت سے سرخسی مشہور ہو گئے۔ آپؒ کی مشہور کتاب المبسوط فی الفقہ ہے۔

[3]۔ فرغانہ کے حاکم نے اپنی ایک کنیز کو آزاد کر کے عدت سے پہلے ہی اس سے نکاح کر لیا۔ امام سرخسیؒ نے اس پر اعتراض کیا تو حاکم وقت نے انہیں ایک کنواں نما گھڑے میں قید کر دیا۔ آپؒ کے شاگردوں کو اس واقعے کا بہت زیادہ دکھ ہوا۔ انہوں نے اپنے استاد سے وابستگی کے لیے درخواست کی کہ ہم روزانہ اس کنویں کے منہ پر آجایا کریں گے۔ آپؒ ہمیں کچھ املا کرا دیا کریں۔ چنانچہ آپؒ نے اس کنویں سے اپنی عظیم کتاب المبسوط فی الفقہ املا کرانی شروع کی اور علم کی تاریخ کا یہ منفرد شاہکار کنویں نما قید خانے سے املا کروائی جو 30 ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔

[4]۔ مسجد قرطبہ؛ بال جبریل از محمد اقبالؒ



تیرہواں باب

تسخیر کائنات

اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ[1]

بیشک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات دن کے باری باری آنے جانے میں ان عقل والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔

مسلمانوں کو اس صورت حال کو بغور دیکھنا چاہیے کہ آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں ہم کہاں کھڑے ہیں؟ مسلم اکثریت کے حامل 57 ممالک کے پاس اوسطاً 10 یونیورسٹیاں فی ملک ہیں۔ ایک ارب ساٹھ (60) کروڑ افراد کے لئے 600 سے کچھ کم یونیورسٹیاں ہیں۔ دیگر ملکوں میں یہ تناسب اس سے کہیں زیادہ ہے۔ بھارت کے پاس 8407 اور امریکہ کے پاس 5780 یونیورسٹیاں ہیں۔ ایک ارب ساٹھ (60) کروڑ مسلمانوں میں 300,000 سے کچھ کم افراد سائنسدان کہلا سکتے ہیں۔ یہ تناسب 530 سائنسدان فی ملین مسلمان آبادی بنتا ہے۔ امریکہ کے پاس گیارہ لاکھ سائنسدان (4099 فی ملین) ہیں۔ جبکہ جاپان کے پاس 700,000 سائنسدان (5095 فی ملین) ہیں۔

مسلمانوں کی کل آبادی ایک ارب 60 کروڑ ہے۔ جو دنیا بھر کی آبادی کا 22 فیصد بنتا ہے۔ جب کہ یہودی صرف 14 ملین (ایک کروڑ 40 لاکھ) ہیں جو دنیا کی آبادی کا صرف 0.22 فیصد بنتا ہے۔ اب تک صرف 2 مسلمانوں کو سائنس میں نوبیل پرائز ملا ہے جبکہ یہودی سائنسدانوں کو 194 نوبیل پرائز ملے ہیں۔ جن دو مسلمانوں کو یہ قابل فخر ایوارڈ ملا ہے ان میں ایک احمد زویل تھا جسے 1999ء میں کیمسٹری میں نوبیل پرائز ملا۔ دوسرا ایک ترکش امریکن عزیز سنکار تھا۔ اسے 2015ء میں نوبیل پرائز ملا۔ دونوں امریکہ میں آباد ہو چکے ہیں۔

مسلم دنیا میں سائنسی اور بائیومیڈیکل جرائد کافی کم تعداد میں ہیں۔ ان میں سے بھی بہت سوں میں میجر ببلیوگرافک، ڈیٹابیسز کا اشاریہ شامل نہیں کیا گیا۔ اس لئے ان تک 'آن لائن' نہیں پہنچا جا سکتا۔ عرب دنیا سائنسی تحقیق میں صرف 0.5 فیصد شراکت دار ہے جو 200 اہم میڈیکل جرائد میں شامل ہو جاتی ہے۔

---

[1] سورۃ آل عمران: آیت: 190

ہمارے تعلیمی ادارے، ہماری لائبریریاں اور ہماری لیبارٹریاں، مغرب کے اداروں، لائبریریوں اور لیبارٹریوں سے کہیں پیچھے ہیں۔ اگر ہم ریسرچ جاری رکھنا چاہیں تو ہمیں مغرب کی ان سہولتوں سے فائدہ اٹھانا ہوگا۔ کسی بھی خصوصی سائنسی موضوع کے بارے میں تازہ ترین معلومات اور مواد کے لئے ہمیں مغرب کے تحقیقی جرائد سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔

مسلم ممالک کو پہلے سائنس کے بارے میں اپنی سوچ اور رویہ تبدیل کرنا چاہیے۔ انہیں یہ امر ذہن نشین کر لینا ہوگا کہ سائنس ان کی وراثت ہے۔ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے سائنس کو ترقی و نشوونما دی اور اس سے دنیا کو متعارف کرایا۔ آج ہم اسے مغربی علم کے طور پر لیتے ہیں۔ مذہبی ذہن رکھنے والے مسلمان جدید سکولوں اور یونیورسٹیوں کو چھوڑ کر ایک ایسے مدرسے میں داخل ہونے کو بھی ترجیح دے دیتے ہیں جس کا نصاب بہت پرانا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو سائنسی علم کے حصول کو اتنا ہی اہم سمجھنا چاہیے جتنا ہم فقۂ اسلام کی تعلیم کو اہم سمجھتے ہیں۔

ہمیں سائنسی مضامین کو دینی مدرسوں کے نصابات میں شامل کرنا چاہیے۔ سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے لئے شایان شان تعلیمی اور تحقیقی ادارے قائم کرنے چاہئیں۔ جن میں یہ موضوعات شامل ہوں: کائنات کو کیسے مسخر کیا جائے، چاند اور عطارد پر کیسے پہنچا جائے، ایٹم کو کیسے پھاڑا جائے اور روح اور مادے کو کیسے ضم کیا جائے اور ان جیسے موضوعات پر آزادانہ اور بکثرت بحثیں کی جانی چاہیں۔ مسلمانوں کو نئی دریافتوں کو بنی نوع انسان کے فائدے کے لئے استعمال کرنے، نا قابل علاج اور مہلک بیماریوں کا علاج دریافت کرنے اور عمومی صحت اور خوراکوں کو بہتر بنانے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ یہ ایک فریضہ بھی ہے اور مسلمانوں پر انسانیت کا ایک قرضہ بھی ہے۔ یہ بہبودِ انسانیت ہے اور اسلامی کی تعلیم بھی۔

میری قابل احترام علماء سے استدعا اور ایک دردمندانہ اپیل ہے کہ وہ مسلم معاشرے میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ اور اس کے کلچر کے لئے ذوق پیدا کریں۔ اگر مسلمان افغانستان اور عراق کی جنگوں سے سبق نہیں سیکھتے تو انہیں مٹا کر رکھ دیا جائے گا۔ علماء اُمت کو ترغیب دیں کہ وہ مذہب کے نام پر غیر ضروری رسموں اور جلسوں جلوسوں پر بے جا خرچ کرنے کی بجائے اپنی دولت کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ پر خرچ کرے۔

ہم ہر سال ایسے مذہبی جلسوں اور جلوسوں پر اربوں روپے خرچ کر ڈالتے ہیں جن کا اسلام کی حقیقی روح سے کوئی تعلق نہیں۔ کیا علماء کے لئے ایسا فتویٰ جاری کرنا ممکن نہیں ہے کہ دولت کو غیر ضروری

رسوم پر خرچ کرنے کی بجائے سائنس کے طالب علموں کی فیس ادا کرنے کے کام میں لایا جائے۔ اسی طرح دوسری بار حج اور عمرہ کرنے کی بجائے اس رقم کو اپنے قریب واقع انجینئرنگ یونیورسٹی کے ایک طالب علم کو ایک مکمل سال کی فیس کے لئے بروئے کار لایا جائے۔ میں پورے وثوق سے کہتا ہوں اور ایمان رکھتا ہوں کہ ایسا کرنے سے وہ اللہ پاک کو خوش کر سکتے ہیں اور ان کا زائد حج اور عمرہ ویسے ہی قبول ہو جائے گا جیسے انہوں نے واقعی کر لیا ہو۔ ساتھ ہی ایک قابل طالب علم سائنس کا علم حاصل کر لے گا۔

آیئے ہم درج ذیل امور پر غور کریں:

(i)۔ مسلم محقق سائنسدانوں اور انجینئروں کی تعداد دولت مند ملکوں اور لاطینی امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کے سائنسدانوں اور انجینئروں کی تعداد سے بہت کم ہے۔

(ii)۔ دنیا بھر کے سائنسی لٹریچر کا 80 فیصد حصہ انگریزی زبان میں شائع ہوتا ہے۔ عربی، فارسی، اردو، ترکش اور دیگر زبانوں میں اتنا کم ہے کہ طلباء اور محققین کو پڑھانے کے لئے انتہائی ناکافی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو انگریزی پڑھنے لکھنے اور اس کی تفہیم کے لئے اہلیت حاصل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جس میں مسلمان بہت پیچھے ہیں۔

(iii)۔ سرکاری سکولوں میں پرائمری اور سیکنڈری سطح پر مؤثر سائنسی تعلیم دستیاب نہیں ہے لیکن صرف چند پرائیویٹ شہری سکولوں میں دستیاب ہے۔

(iv)۔ مسلم دنیا میں یونیورسٹیاں اور ٹیکنیکل سکول تحقیق کی بجائے نظریاتی (theoretical) تدریس پر زور دیتے ہیں کیونکہ ان میں لیبارٹریاں اور مطلوبہ اہلیت رکھنے والی فیکلٹیز کم ہیں۔ صرف چند ایک اعلیٰ پایہ کے ڈاکٹورل یا تحقیقی مرکز پائے جاتے ہیں۔ یونیورسٹیاں طلبا کی تعداد بہت زیادہ اور فنڈز بہت کم ہونے کے باعث تحقیق کے لئے مناسب جگہ اور وسائل مہیا کرنے سے قاصر ہیں۔

(v)۔ مسلم معاشرے میں تحقیق کو بطور پیشہ اختیار کرنے والوں (career researchers) کی شدید کمی ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ بہت سے ممالک غیر معمولی خصوصی مہارت محققین اور پروجیکٹس رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن نوجوان محققین کی صحیح تربیت کر سکنے والے پختہ کار اور قابل بھروسہ اساتذہ کی ان کے ہاں کافی کمی ہے۔ بہت سے گریجویٹ تحقیق کی تربیت حاصل کر لیتے ہیں لیکن انہیں بیوروکریٹک/ انتظامی پوسٹوں پر بھرتی کر لیا جاتا ہے۔ مسلم دنیا کو

یونیورسٹیوں، ریسرچ انسٹی ٹیوٹس، سرکاری وزارتوں، غیر منافع بخش فاؤنڈیشنوں، ملٹی نیشنل کارپوریشنوں (اور/یا) کارپوریشنوں میں تحقیق کی صلاحیتیں پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

(vi)۔ مسلم دنیا کو اپنی تطابقی (adaptive) تحقیق کی صلاحیتوں کو ترقی دینی چاہیے نہ کہ غیر ملکی تیار شدہ آلات کی کلید برداری کر کے انہی منصوبوں کو جاری رکھنے پر انحصار کیا جائے۔

(vii)۔ مسلم دنیا میں سرگرم عمل کثیر الملکتی فرمیں اسی امر کو ترجیح دیں گی کہ تحقیق کا کام یورپین یا امریکن سائیٹس پر کرایا جائے۔ وہ مسلم ممالک میں کسی تطابقی تحقیق پر کام شروع کرا کر تحقیق کے صرف ایسے مشترکہ منصوبوں کے لئے ترغیبات دیں گی جو سرکاری کمپنیوں اور کثیر الملکتی کمپنیوں کے اشتراک عمل سے تکمیل پائیں۔

(viii)۔ سائنسدانوں (ماہرین فزکس، انجینئرز، ڈینٹسٹس، فزیشنز اور دیگر سائنسی پیشوں سے متعلق) کی پروفیشنل سوسائٹیاں عام طور پر جرائد اور اجلاسوں کے لئے پیشگی مالی امداد فراہم کرتی ہیں۔ لیکن مسلم ممالک میں پروفیشنل سوسائٹیاں مسلم دنیا کو ترقی دینے میں سستی کا مظاہرہ کرتی ہیں یا سرے سے دلچسپی ہی نہیں لیتیں۔

(ix)۔ جاپان، امریکہ، جرمنی اور دیگر مغربی ممالک ہر سال اپنے جی ڈی پی کا 2 فیصد یا اس سے زائد حصہ تحقیق پر خرچ کرتے ہیں جبکہ کوئی مسلمان ملک اپنے جی ڈی پی کے 0.50 فیصد سے زیادہ ریسرچ پر خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

(x)۔ مسلم دنیا میں مطلق العنان حکومتوں کا راج ہے جو آزادئ اظہار و تجسس اور اختلافِ رائے کی حوصلہ شکنی کرتی ہیں۔ پروفیشنل سوسائٹیوں کو مفلوج اور یونیورسٹیوں کو خوفزدہ اور ان کے بیرونی دنیا کے ساتھ رابطوں کو محدود رکھتی ہیں۔ مسلم ریاستیں ٹیکنالوجی کی منتقلی کے مروجہ طریق کار پر انحصار کرتی ہیں اور سائنس اور ٹیکنالوجی کو محض ایک قابل خرید جنس سمجھتی ہیں۔ یہ نقطۂ نظر اندرون ملک تحقیق کی صلاحیتوں کے ارتقا پر منفی اثرات مرتب کرتا ہے۔

(xi)۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کا علاقائی تعاون سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے لئے بہت ضروری ہوتا ہے لیکن مسلم دنیا میں ایسا تعاون نہ ہونے کے برابر ہے۔

(xii)۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کو مناسب انداز میں اداراتی شکل نہیں دی گئی: مثلاً ان کے لئے فنڈز کی

فراہمی کا تسلسل نہیں ہے۔ انسانی وسائل کو مناسب ترقی نہیں دی گئی۔ طویل المیعاد مقاصد متعین نہیں اور انتظامی خودمختاری کا فقدان ہے۔

(xiii)۔ عقیدے اور استدلال میں ہم آہنگی پیدا کرنا بھی اہم اور نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ علم و ترقی کے مخالفین سائنس کو مسترد کرنے کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ شرح خواندگی کم ہونے کی وجہ سے سائنس سے لاتعلقی و لاپرواہی برتی جا رہی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں مناسب ترقی نہ ہو تو کوئی معاشرہ یا تہذیب آگے نہیں بڑھ سکتی۔ مغربی تہذیب کے حالیہ عروج کا راز سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی اور صنعتی انقلابات میں مضمر ہے۔ آج مسلمان اگر اقوام عالم میں عزت و وقار چاہتے ہیں تو انہیں سائنس اور ٹیکنالوجی پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔



چودھواں باب

خُلقِ عظِیم

صِلْ مَنْ قَطَعَكَ وَأَعْطِ مَنْ حَرَمَكَ[1]
(اس سے جڑو جو تم سے قطع تعلق کرے، اسے دو جو تمہیں محروم کرے)

مسلمان عمومی طور پر اخلاقی انحطاط سے دو چار ہیں۔ یہ اخلاقی تنزل اس وقت زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے جب ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم حضور نبی کریم ﷺ کے پیروکار ہیں۔ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ[2]
(اور بے شک آپ (ﷺ) اخلاق کے بلند مرتبے پر ہو)

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ
کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ
صَلُّوْ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ

(آپ ﷺ اپنے کمالات کی وجہ سے معراج کے لئے گئے)
(آپ ﷺ کے حُسن کی وجہ سے اندھیرے چھٹ گئے)
(آپ ﷺ جامع محاسن اخلاق ہیں)
(پس آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کی اولاد پر دورد بھیجو)

اسلام دیگر سب مذاہب کی طرح اخلاقی اقدار کا درس دیتا ہے۔ قرآن مجید اور حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیں عجز وانکسار، عفو، اخلاق اور شیریں مزاجی کی تعلیم دی ہے مگر ہم ان بنیادی اقدار سے بہت دور ہیں۔ اگر ہم ان اقدار کو صحیح انداز میں اختیار کرلیں تو ہماری زندگی بے حد خوشگوار ہوجائے گی۔

---

[1] مسند احمد۔ رقم: 16883
[2] سورۃ القلم: آیت: 4

1۔ عاجزی اختیار کرنا

اسلام ہمیں اپنے رویے اور طرزِ عمل میں عجز و انکسار سے کام لینے کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں انہیں زمین پر عاجزی اور فروتنی کے ساتھ چلنا چاہیے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا[1]

(اور اللہ تعالیٰ کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں)

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ[2]

(آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ان کے لیے نرم مزاج ثابت ہوئے اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ترش رو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس سے منتشر ہو جاتے)

جب ایک مومن کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ زندگانی اور قوت کا حقیقی منبع ہے۔ یہ زندگی عارضی ہے اور انسانوں کو روزِ قیامت اپنا حساب کتاب پیش کرنا ہے تو وہ قدرتی طور پر عاجز، منکسر المزاج اور شفیق و مہربان بن جاتا ہے۔ اسے بتایا جاتا ہے کہ اگر وہ اللہ پاک سے رحم کا طلب گار ہے تو اسے اس کی مخلوقات کے ساتھ رحم دلانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے شفقت اور نرم دلی کا سلوک نہیں کرے گا تو وہ اللہ عزوجل کی طرف سے رحم و شفقت سے محروم ہو جائے گا۔ اگر وہ لوگوں کی مدد کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا۔ اگر وہ لوگوں کے دکھ درد دور کرتا رہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے دکھ درد دور کرتا رہے گا اور روزِ قیامت بھی اس کی پریشانیاں دور کر دے گا۔ یہ تعلیمات اس کے اندر ہمدردی اور غمگساری جاگزین کر کے تنگ مزاجی کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زندگی کے تمام پہلوؤں میں عجز و انکسار اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے:

---

[1] ۔سورۃ الفرقان: آیت:63

[2] ۔سورۃ آل عمران: آیت:159

(i)۔ جوکوئی کسی مومن کی اس دنیا کی تکالیف دور کرنے میں اس کی مدد کرے گا، اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کی تکالیف دور کر دے گا۔ جوکوئی کسی شخص کے قرضہ واپس نہ دے سکنے کی مشکلات کم کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کی اس دنیا کی مشکلات بھی کم کر دے گا اور اس کی آخرت کی مشکل بھی آسان کر دے گا۔ جوکوئی دوسروں کی خطاؤں پر پردہ ڈالے گا، اللہ تعالیٰ اس جہان میں اس کی پردہ پوشی کرے گا اور آخرت میں بھی اسے رسوائی سے بچائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی مدد کرتا رہے گا، جب تک وہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہے گا[1]۔

(ii)۔ دولت صدقہ خیرات دینے سے کم نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی عزت اس وقت بڑھا دیتا ہے جب وہ دوسروں کو معاف کر دیتا ہے۔ مزید برآں کوئی شخص بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے خود کو حقیر نہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کا رتبہ بلند کر دے گا[2]۔

(iii)۔ پہلی امتوں میں سے ایک آدمی اپنے لباس میں تکبر کرتے ہوئے نکلا۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا تو زمین نے اسے پکڑ لیا۔ پس وہ اب زمین میں قیامت تک دھنستا چلا جائے گا[3]۔

(iv)۔ حضرت برا بن عاذب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یوم الاحزاب پر ہمارے ساتھ مل کر مٹی ہٹا رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ مٹی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بطن مبارک کی سفیدی کو ڈھانپ رہی تھی[4]۔

(v)۔ حضرت الاسود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں کیا کرتے رہتے تھے؟ جواب ملا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خاندان کی خدمت کرتے رہتے تھے۔ جب نماز کا وقت آ پہنچتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چلے جاتے اور نماز پڑھتے تھے[5]۔

(vi)۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ اگر تم میں سے کسی کا خادم اس کے لئے کھانا لے کر

۱۔ صحیح مسلم۔ رقم:36

۲۔ صحیح مسلم۔ رقم:2288

۳۔ جامع ترمذی۔ جلد دوم: رقم:389

۴۔ صحیح بخاری۔ رقم:6809

۵۔ صحیح بخاری۔ رقم:644

آئے اور تم اسے بٹھانا اور اپنے ساتھ کھلانا نہیں چاہتے تو پھر اسے ایک یا دو لقمے کھلا دو کیونکہ اس نے تمہارے لئے کھانا تیار کیا ہے اور پیش کیا ہے[1]۔

2۔ غصہ نہیں کرنا

غصہ اخلاقی زندگی کا دشمن ہے۔ غصے کی حالت میں انسان اخلاقی اقدار کو فراموش کر دیتا ہے۔ ہندوستان کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے یہ بات ذیل کے اشعار میں نہایت خوبصورتی سے کہی ہے:

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے گا
ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی
جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

غصے کو صرف اللہ تعالیٰ کا خوف روک سکتا ہے۔ اہل ایمان کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت جو قرآن مجید میں بتائی گئی ہے، یہ ہے کہ جب انہیں غصہ آ جائے تو وہ صبر اور عفو سے کام لیتے ہیں۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ[2]

(اور اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جلدی کرو جس کی چوڑائی (وسعت) آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ جو لوگ آسانی اور سختی میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں، غصہ پینے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں سے محبت کرتا ہے)

فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ

---

[1]۔ صحیح بخاری۔ رقم: 2418

[2]۔ سورۃ آل عمران: آیت: 133-134

وَّاَبۡقٰى لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰى رَبِّهِمۡ يَتَوَكَّلُوۡنَ ۝ وَالَّذِيۡنَ يَجۡتَنِبُوۡنَ كَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوۡا هُمۡ يَغۡفِرُوۡنَ[1]

(جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چندروزہ زندگی کا سروسامان ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ بہتر اور ہمیشہ رہنے والا ہے وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو ایمان لائے ہیں۔ اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آجائے تو درگزر کرتے ہیں)

وَلَمَنۡ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ[2]

(البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے)

حضور نبی اکرم ﷺ نے اہل ایمان کو غصہ نہ کرنے اور مسکراہٹ آمیز رویہ اختیار کرنے کے کئی طریقے بتائے اور متعدد نصیحتیں فرمائی ہیں۔

(i)۔ حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھا تھا اور دو آدمی باہم گالم گلوچ کر رہے تھے ان میں سے ایک کا منہ (مارے غصہ کے) لال ہو گیا اور رگیں پھول گئیں تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں ایک ایسی بات جانتا ہوں کہ اگر یہ شخص اس بات کو کہہ دے تو اس کا غصہ جاتا رہے اگر یہ **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم** کہہ دے تو اس کا غصہ ختم ہو جائے[3]۔

(ii)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے نبی ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ﷺ مجھے نصیحت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: غصہ نہ کیا کرو۔ اس نے کئی بار عرض کیا تو آپ ﷺ یہی فرماتے رہے کہ غصہ نہ کیا کرو[4]۔

---

[1] ۔سورۃ الشوریٰ: آیت:36-37

[2] ۔سورۃ الشوریٰ: آیت:43

[3] ۔صحیح بخاری۔ جلد دوم: رقم:539

[4] ۔صحیح بخاری۔ جلد سوم: رقم:1069

(iii)۔ ایک اور روایت کے مطابق اس شخص نے کہا کہ میں نے اس چیز کے بارے میں سوچا جو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ غصہ ہر قسم کی برائیوں کا مجموعہ ہے[1]۔

(iv)۔ تم غصہ نہ کرو، جنت تمہاری ہوگی[2]۔

(v)۔ جو کوئی اپنے غصے کو اس وقت کنٹرول کرتا ہے جب وہ اپنے غصے پر عمل کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو روزِ قیامت طمانیت سے بھر دے گا[3]۔

(vi)۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پچھاڑ دینے والا زور آور نہیں ہوتا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ پھر زور آور کون ہے؟ ارشاد فرمایا: وہ جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو پا لے[4]۔

(vii)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں حضور نبی کریم ﷺ کے ہمراہ جا رہا تھا۔ اس وقت آپ ﷺ نے ایک نارنجی رنگ والا جبہ پہن رکھا تھا جس کا کالر غیر ہموار سا تھا۔ ایک بدو آیا اس نے آپ ﷺ کے جبے کے ایک کونے کو زور سے کھینچا۔ میں نے دیکھا کہ کالر کھینچنے کی وجہ سے آپ ﷺ کی گردن پر نشان پڑ گیا ہے۔ اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا: آپ (ﷺ) کو اللہ تعالیٰ نے جو دولت دی ہے اس میں سے کچھ مجھے بھی دے دو۔ آپ ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور مسکرائے۔ پھر حکم دیا کہ اسے کچھ دے دیا جائے[5]۔

(viii)۔ حضرت معاذ بن انس الجہنی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو انتقام کی قدرت کے باوجود غصہ پی جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو بروز محشر مخلوقات کے سامنے بلائے گا اور اسے اختیار دے گا کہ جنت کی حوروں میں سے جسے چاہے اپنا لے[6]۔

(ix)۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ فحش گوئی کرنے والے

---

[1]۔ مسند احمد۔ رقم: 373

[2]۔ طبرانی شریف۔ رقم: 465

[3]۔ طبرانی شریف۔ رقم: 453

[4]۔ مسند احمد۔ جلد چہارم: رقم: 498

[5]۔ صحیح بخاری۔ رقم: 2009

[6]۔ جامع ترمذی۔ جلد اول: رقم: 2110

اور لعنت کرنے اور گالی گلوچ کرنے والے نہ تھے۔ جب کبھی ناراض ہوتے تو صرف اس قدر فرماتے کہ اس کو کیا ہو گیا ہے؟ اس کی پیشانی خاک آلود ہو[1]۔

3۔ مسکرانا ہے

(i)۔ حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجھے کسی بھی ایسے شخص سے ملنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ مسکرانے والا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی بھائی پر مسکرانے کو صدقے جیسا کام قرار دیتے تھے[2]۔

(ii)۔ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے ملاقات کا موقع دینے سے کبھی انکار نہیں کیا۔ جب سے میں نے اسلام قبول کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اپنے چہرے پر مسکراہٹ لائے بغیر مجھے نہیں دیکھا[3]۔

(iii)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کردار کے لحاظ سے بہترین لوگوں میں سے تھے۔ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے کسی کام کے لئے بھیجا اور میں نے کہا: اللہ تعالیٰ کی قسم میں نہیں جاؤں گا۔ تاہم دل میں میں نے محسوس کیا کہ مجھے وہ کرنا چاہیے جس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے حکم دیا تھا۔ چنانچہ میں روانہ ہو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں گلی میں چند لڑکے کھیل رہے ہیں۔ اچانک پیچھے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آ گئے اور مجھے گردن کے پچھلے حصے سے پکڑ لیا۔ جب میں نے مڑ کر دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرا رہے تھے[4]۔

(iv)۔ ایک دفعہ ایک شخص نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے سواری کے لئے کوئی جانور دے دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اچھا! میں تمہیں اونٹنی کا ایک بچہ دے دیتا ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ میں اونٹنی کے بچے کا کیا کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا کوئی

---

[1] صحیح بخاری۔ جلد سوم: رقم: 1004

[2] جامع ترمذی۔ رقم: 3641

[3] صحیح مسلم۔ رقم: 6050

[4] سنن ابوداؤد۔ رقم: 4755

اونٹ ایسا بھی ہے جو اونٹنی سے پیدا نہ ہوا ہو[1]۔

(vi)۔ حضرت عبداللہ بن حارث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا[2]۔

4۔ نرمی کرنا ہے

اسلام ہمیں نرمی کرنے کا حکم دیتا ہے جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

(i)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ مجھے گھوڑے پر سوار ہونے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ میں بار بار اس کی لگام کھینچ رہی تھی۔ اس پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں کچھ نرمی کرنی چاہیے[3]۔

(ii)۔ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک اللہ تعالیٰ نرمی فرمانے والا ہے اور نرمی کرنے والے کو پسند فرماتا ہے اور اسے وہ کچھ عطا فرماتا ہے جو سختی کرنے والے کو نہیں دیتا[4]۔

(iii)۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نرمی جس چیز میں بھی ہوتی ہے وہ اسے خوبصورت بنا دیتی ہے۔ جس چیز میں سے نرمی نکال دی جاتی ہے تو وہ چیز بدصورت ہو جاتی ہے[5]۔

(iv)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جہنم کی آگ پر ہر اس شخص کو حرام قرار دے دیا گیا ہے جو باوقار ہو، نرم خو ہو، سہولت پسند طبیعت کا ہو (جھگڑالو نہ ہو) اور لوگوں کے قریب ہو[6]۔

۱۔ سنن ابوداؤد۔ رقم: 4998
۲۔ جامع ترمذی۔ جلد دوم: رقم: 1607
۳۔ صحیح مسلم۔ رقم: 1863
۴۔ سنن ابوداؤد۔ رقم: 4807
۵۔ صحیح مسلم۔ جلد سوم: رقم: 2101
۶۔ مسند احمد۔ جلد دوم: رقم: 2002

(v)۔ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! سب سے افضل عمل کون سا عمل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ پر ایمان وتصدیق، اللہ عزوجل کے راستہ میں جہاد اور حج مبرور۔ اس آدمی نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سی چیزیں بیان فرمادی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: پھر کلام میں نرمی، کھانا کھلانا، سہل ہونا اور اچھے اخلاق سب سے افضل عمل ہیں۔ اس نے کہا کہ میں تو صرف ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تو پھر جاؤ اور اپنی ذات پر تہمت نہ لگنے دو[1]۔

(vi)۔ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: اسلام کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کھانا کھلانا اور نرم گفتگو کرنا۔ میں نے عرض کی: ایمان کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ صبر کرنا اور سخاوت کرنا[2]۔

(vii)۔ ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ ان کا ایک خادم گرم گرم چائے لایا۔ جو اس خادم کی کوتاہی کی وجہ سے بزرگ کے پاؤں پر گر گئی۔ اس بزرگ کا پاؤں جل گیا۔ کرب و غصے کے عالم میں انہوں نے خادم کی طرف دیکھا۔ وہ سخت پریشان و پشیمان تھا۔ اس نے موقع کی نزاکت سے قرآن مجید کا سہارا لیا اور کہا:

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ

(وہ غصہ پی جاتے ہیں)

بزرگ خاموش ہوگئے۔ چہرے سے کرب و غصے کی علامات ختم ہوگئیں۔

خادم نے اگلا جز پڑھا:

وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ

(وہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں)

بزرگ نے فرمایا جا! میں نے تمہیں معاف کر دیا۔

۱۔ مسند احمد۔ جلد ہفتم: رقم: 939

۲۔ مشکوۃ شریف۔ جلد اول: رقم: 42

خادم نے آیت کا اگلا حصہ پڑھا:

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ[1]

(اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

بزرگ نے فرمایا کہ جا! میں نے تمہیں آزاد کیا۔

یہ ہے اسلامی اخلاق کہ پاؤں جلانے کے بدلے میں آزادی بخش دی جائے۔ جبکہ ہماری حالت خاصی توجہ طلب ہے۔ ہمیں غصہ بہت آتا ہے۔ مزاج میں برہمی و درشتی ہر وقت رہتی ہے۔ جتنا بڑا عالم اور جتنا بڑا صوفی ہوتا ہے۔ اس کا جلال اتنا زیادہ ہوتا ہے۔ جتنا بڑا آفیسر، اتنا زیادہ تکبر و غصہ۔

میں لڑکپن میں قرآن پاک کی تفسیر پڑھ رہا تھا۔ جب کوئی چیز سمجھ میں نہیں آتی تھی تو میں کسی مدرسہ میں کسی عالم دین کے پاس جا کر سوال کرتا۔ جواب سن کر اگر پھر کوئی سوال کر دیا تو بس حضرت صاحب کو جلال آ جاتا تھا۔ یہی حال اعلیٰ سرکاری ملازمین کا ہے۔ جتنا بڑا آفیسر اتنا زیادہ بدتہذیب۔ ایک آفیسر نے مجھے ایک دن بہت فخر سے بتایا حالانکہ وہ ریٹائرڈ تھے اور ماشاءاللہ مذہبی ہو گئے تھے کہ جب وہ ڈی سی آفس میں سپریٹینڈنٹ (superintendent) تھے تو فلاں (ایک وزیر کا صاحب کا نام لے کر) کو میں نے کبھی اپنے دفتر میں کرسی پیش نہیں کی تھی۔ میں نے سخت بے ادبی کی اور کہہ دیا کہ غالباً یہ آپ کی بداخلاقی تھی۔ اسی کے ٹیکس سے تمہیں تنخواہ ملتی تھی۔ اس کے کام کے لیے سرکار نے تمہیں ملازمت دی تھی۔

5۔ معافی ہی معافی

اسلام ہمیں عفو و درگزر کا درس دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے بہت سے صفاتی نام بتائے گئے ہیں جنہیں 'اسماً الحسنیٰ' کہا جاتا ہے۔ یعنی خوبصورت ترین نام۔ ان میں سے کچھ نام اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی و درگزر سے تعلق رکھتے ہیں۔

(i)۔ 'الغفورُ: بے حد و حساب معافی دینے والا: قرآن میں اللہ تعالیٰ کا یہ صفاتی نام 70 سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔ اسی جڑ سے اللہ پاک کے کئی اور نام بھی ہیں: جیسے 'غافر' اور 'غفار' عربی کے لفظ 'غَفَرَ' کے معنی 'ڈھانپنا' کے ہیں اور اس سے 'معاف کرنے'، 'درگزر کرنے'، 'قرضہ یا سزا

[1]۔ سورۃ آل عمران: آیت:134

معاف کرنے' اور 'بخش دینے' کے مفہوم نکلتے ہیں۔قرآن مجید کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ 'شرک' (بغیر توبہ کئے) معاف نہیں کرتا مگر وہ اس کے علاوہ کوئی اور گناہ جسے چاہے معاف کرسکتا ہے[1]۔

(ii)۔ 'العفوٗ: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ نام پانچ بار آیا ہے۔لفظ 'عفوٗ' کے معنی ہیں 'رہا کرنا'، 'صحت دینا'، 'بحال کرنا'، 'معاف کرنا'۔اس طرح اللہ تعالیٰ کے حوالے سے اس کے معنی یہ ہوئے کہ 'ہمیں گناہوں اور غلطیوں کی وجہ سے ملنے والی سزا کے بوجھ سے چھڑوانے والا'۔ ہماری وہ عزت بحال کردے بعد اس کے کہ ہم اسے اپنے گناہوں اور غلطیوں کی وجہ سے کھو بیٹھے تھے۔

(iii)۔ التواب: توبہ قبول کرنے والا: قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے اس صفاتی نام کا تقریباً 11 مرتبہ ذکر آیا ہے۔لفظ 'تواب' سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ وہ بار بار توبہ قبول کرنے والا ہے۔

(iv)۔ الحلیم: رحم دل: قرآن مجید میں یہ نام پندرہ مرتبہ آیا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فوراً فیصلہ صادر نہیں کرتا بلکہ وقت دیتا ہے کہ اس کا بندہ اس کی طرف واپس لوٹ آئے۔یعنی توبہ کرلے۔

(v)۔ الرحمان الرحیم: نہایت درجے کا رحم دل اور مہربان: قرآن میں 'الرحمان' کا ذکر 57 بار اور 'الرحیم' کا ذکر 115 بار آیا ہے۔ اول الذکر سے رحم کے وفور اور کثرت کا اشارہ ملتا ہے اور مؤخر الذکر سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ایسا ہے۔

(vi)۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہ دعا سکھائی ہے:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الْعَفُو تُحِبُّ الْعَفُو ،فَاعْفُ عَنی یا غفور[2]

(اے میرے پروردگار! تو بے حد وحساب معاف کرنے والا ہے۔تو معاف کرنے کو پسند کرتا ہے۔پس مجھے معاف فرمادے)

حضور نبی کریم ﷺ سب سے زیادہ معاف کرنے والی شخصیت تھے۔ جب آپ ﷺ اپنی امت کو اللہ تعالیٰ کا پیغام سنانے کے لیے طائف گئے تو انہوں نے آپ ﷺ سے بہت بدسلوکی۔ دشنام طرازی کی اور آپ ﷺ پر پتھر برسائے۔آپ ﷺ نے بہت بے توقیری اور زخمی ہونے کی

---

[1]۔سورۃ النساء: آیت: 136 (اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ: ہرگز نہیں بخشے گا اللہ تعالیٰ کہ اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جائے البتہ شرک کے علاوہ جس کے چاہے گناہ معاف فرمادیتا ہے)

[2]۔جامع ترمذی۔رقم: 3515

حالت میں وہ شہر چھوڑا۔ جب آپ ﷺ دم لینے کے لئے ایک درخت تلے بیٹھے تو ایک فرشتے نے آکر خبر دی کہ اللہ تعالیٰ اہل طائف سے بہت ناراض ہے اور اس نے مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ میں اس کے پیارے حبیب ﷺ سے بدسلوکی کرنے والوں کو تباہ کر دوں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ ایسا نہ کرے بلکہ انہیں زندہ رہنے دے کیونکہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے اپنی جہالت کی وجہ سے کیا ہے۔ آپ ﷺ نے دعا فرمائی: اے میرے پروردگار! ان لوگوں کو صحیح راستہ دکھا دے کیونکہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں[1]۔

جب حضور نبی کریم ﷺ فتح مکہ کے بعد مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ کے سامنے چند ایک بدترین دشمن تھے۔ جو کئی سالوں سے آپ ﷺ کے خلاف لڑ رہے تھے۔ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقا کو اذیتیں دیتے رہے اور بہت سوں کو شہید بھی کیا۔ اب آپ ﷺ کو ان پر پورا اختیار حاصل ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ ان کے ساتھ جو چاہتے سلوک کر سکتے تھے۔ ان کے ہر جرم کی سزا دینے پر مکمل قدرت رکھتے تھے۔ مگر آپ ﷺ نے کیا کیا؟ آپ ﷺ نے انہیں سے پوچھا کہ بتاؤ کیا جانتے ہو کہ میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟ وہ سوائے قصاص لئے جانے کے کسی چیز کی توقع نہیں کر رہے تھے اور آپ ﷺ سے رحم کی استدعا کی۔ آپ ﷺ نے اعلان فرمایا:

آج میں تم سے وہی کچھ کہوں گا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا:

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ[2]

(آج تم پر کوئی گرفت نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو)

اسلام نے ہمیں معافی سکھائی ہے۔ ابوجہل اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ اس کا بیٹا عکرمہ بن ابی جہل بھی باپ کے نقش قدم پر چلتا تھا۔ فتح مکہ میں حضور نبی کریم ﷺ نے اس کا خون بھی معاف کر دیا تھا۔ وہ مکہ سے بھاگ گیا اور یمن میں پناہ گزیں ہو گیا۔ اس کی اہلیہ ام حکیم بنت حارث پہلے ہی مسلمان ہو چکی تھی۔ اس نے آپ ﷺ کی خدمت میں اپنے خاوند کے لیے معافی کی درخواست کی۔ آپ ﷺ

---

[1]۔ صحیح بخاری۔ رقم: 458

[2]۔ سورۃ یوسف: آیت: 92

نے یہ درخواست قبول فرمالی۔ وہ یمن جا کر اپنے خاوند کو واپس لائیں۔عکرمہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کرلیا۔ جب وہ آپ ﷺ کی محفل میں آنے لگا تو آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے ارشاد فرمایا: عکرمہ بن ابی جہل تمہارے پاس آ رہا ہے۔اس کا باپ اسلام کا سخت ترین دشمن تھا۔تم اس کے سامنے اس کے باپ کو برا بھلا مت کہنا۔ مردہ کو برا کہنے سے زندہ کو تکلیف ہوتی ہے[1]۔ سبحان اللہ! کیا احترام آدمیت ہے۔ اپنے مظلوم اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کہا جا رہا ہے کہ تمہارے بدترین ظالم دشمن کا بیٹا آ رہا ہے۔اس کے باپ کے خلاف بات کر کے اس کو تکلیف نہ دینا۔ یہ وہ کشادہ دلی اور عظمت کردار تھی جس کی وجہ سے مشرق و مغرب نے اسلام قبول کرلیا۔عکرمہ نے اپنی باقی زندگی اسلام کے لیے وقف کر دی۔

حضور نبی کریم ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے جا رہی تھیں۔ ھبار بن اسود نے آپ رضی اللہ عنہا کے اونٹ کو نیزہ مارا۔جس سے اونٹ زخمی ہو گیا اور بلک پڑا۔حضرت زینب رضی اللہ عنہا اونٹ سے گر پڑیں۔اس وقت وہ حمل سے تھیں۔ان کا حمل ضائع ہو گیا۔اس کے بعد وہ بقیہ زندگی بیمار رہیں۔اس ظالم ھبار نے آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر معافی طلب کی۔آپ ﷺ نے اس کو بغیر کسی شرط کے معاف فرمادیا[2]۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے محسن اور محبوب چچا تھے۔وحشی بن حرب اور ہندزوجہ ابوسفیان نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بہت زیادتی کی۔وحشی نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔اس نے فتح مکہ کے بعد مدینے میں حاضر ہو کر معافی مانگی۔آپ ﷺ نے معاف فرمادیا۔ ہندہ نے غزوہ احد میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا سینہ چیرا اور جگر نکال کر چبایا تھا۔آپ ﷺ نے اس کو بھی معاف کر دیا[3]۔

مجھے ذاتی طور پر اسلامی تاریخ کا ایک واقعہ بہت ہی عجیب لگتا ہے۔حضور نبی کریم ﷺ کے زمانے میں آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر ایک جھوٹی اور بے بنیاد تہمت لگائی گئی۔اس

---

[1]۔ دیکھیے کنز العمال۔جلد ہفتم: رقم: 1335

[2]۔ سیرت حلبیہ از علامہ علی بن برہان الدین حلبیؒ۔جلد سوم۔صفحہ نمبر 279

[3]۔ دیکھیے صحیح بخاری۔جلد دوم: رقم: 1296 اور کشف الباری اردو شرح صحیح بخاری از حضرت مولانا سلیم اللہ خانؒ۔جلد ہشتم: صفحہ نمبر 499-500

غیر اخلاقی وغیر انسانی حرکت میں ایک صحابی حضرت مسطح رضی اللہ عنہ بھی شریک تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ حضرت مسطح رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک غریب رشتہ دار تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی غربت کے سبب اس کا ماہانہ خرچ اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ جب حضرت مسطح رضی اللہ عنہ نے یہ حرکت کی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بجا طور پر اس کا وظیفہ بند کر دیا۔

آپ سوچیں کہ اول تو وظیفہ دینا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی قانونی ذمہ داری نہ تھی بلکہ آپ رضی اللہ عنہ نے ازسرخود اخلاقی بنیادوں پر اس پر یہ کرم کر رکھا تھا۔ دوسرے بے گناہ اور لاڈلی بیٹی پر تہمت کے بعد ان کے پاس ایک اخلاقی جواز بھی تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب غم وغصہ کی وجہ سے اس کا وظیفہ بند کیا تو اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوٓا أُولِي الْقُرْبٰى
وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا
تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ [1]

(اور تم میں سے جو لوگ اچھی مالی حالت رکھتے ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے رشتہ داروں، محتاجوں اور اللہ کی راہ میں وطن چھوڑنے والوں کی مدد نہ کریں گے۔ ان کو معاف کر دینا چاہیے اور درگزر کرنا چاہیے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تم کو معاف کر دے اور اللہ عزوجل معاف کرنے والا مہربان ہے)

اس آیت کے نزول کے بعد آپ رضی اللہ عنہ نے اس کا وظیفہ بحال کر دیا۔ کیا اعلیٰ انسانی تعلیمات ہیں؟ کیا اخلاقی معیار ہے کہ گالیاں کھا کر بھی اپنے دشمن پر کرم جاری رکھنا ہے۔

6۔ بلندیٔ اخلاق

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اگر لوگ تم سے شریفانہ طور پر پیش آتے ہیں تو تم بھی ان سے شریفانہ طرزِ عمل اختیار کرو۔ اگر وہ تم سے بدسلوکی کرتے ہیں تو بھی تم ان سے حسنِ اخلاق سے پیش آؤ[2]۔

۱۔ سورۃ النور: آیت:22
۲۔ مشکوٰۃ شریف۔ رقم:183

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ میری حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا: عقبہ! رشتہ توڑنے والے سے رشتہ جوڑو، محروم رکھنے والے کو عطا کرو اور ظالم سے درگذر اور اعراض کرو[1]۔

یہ احادیث بڑی وضاحت کے ساتھ بتاتی ہے کہ ہمارا رویہ اور طرزِ عمل دوطرفہ (bilateral) نہیں بلکہ یک طرفہ ہے۔ ہمیں یہ نہیں کہا گیا کہ کسی شخص کے ساتھ اس لئے احسان کرو کہ وہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے بلکہ ہمیں نقصان پہنچانے والے شخص سے بھی مثبت سلوک اور اچھا رویہ اختیار کرنا ہے۔ ہم نے برائی کے بدلے برائی نہیں بلکہ برداشت اور عفو کا رویہ اختیار کرنا ہے۔ ہم یہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور اپنے فائدے کے لئے کرتے ہیں۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں تو دوسرے لوگوں کی برائیاں ہمیں ان سے اچھا سلوک کرنے سے نہیں روکتیں۔ حسنِ اخلاق کی ایک تکمیل ہے جس کے لئے اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا ہے[2]۔

اسلام کی تعلیمات کتنی لائق تحسین ہیں۔ قرآن مجید اور تعامل پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے مسلمانوں کو کتنی اعلیٰ وارفع اقدار سکھائی گئی ہیں کہ وہ دشمنوں سے بھی نیکی کریں۔ ان کی بھی مدد کریں جنہوں نے انہیں دکھ دیا ہو۔ لیکن افسوس کہ اس کے باجود آج کے مسلمان اعلیٰ اخلاقی قدروں کے حوالے سے نہیں پہچانے جاتے۔

میں جب برطانیہ (1995ء-1998ء) میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ہمارے قانونِ فوجداری کے پروفیسرز اعلیٰ عدلیہ کے نظائر (precedents) پڑھایا کرتے تھے۔ عجیب اتفاق تھا کہ بداخلاقی کے زیادہ تر مقدمات کے نظائر (precedents) ان مسلمانوں کے حوالے سے تھے جو وہاں آباد تھے۔ میں اس مسئلے پر اکثر سوچا کرتا تھا اور اپنے دل میں شرمندگی محسوس کرتا تھا۔ ان کے خلاف دھوکہ، فریب، اعتماد کو ٹھیس پہنچانے اور دیگر اخلاقی جرائم کے مقدمات اپنی مسلم کمیونٹی کی طرف سے ہی دائر ہوئے تھے۔

---

[1] ۔ مسند احمد۔ جلد ہفتم: رقم: 602

[2] ۔ مسند احمد۔ جلد چہارم: رقم: 1774 (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے مبعوث ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ عمدہ اخلاق کی تکمیل کردوں)

باوجوداس حقیقت کے کہ اسلام اچھے کردار کی تعلیم دیتا ہے۔حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم میں بہترین وہ ہے جو بہترین کردار کا حامل[1] ہے۔انسان کی بڑائی اس کی تعلیم، دولت یا منصب سے نہیں ناپی جاتی بلکہ اس کے اعلیٰ اخلاق، عجز وانکساری، سادگی اور خلوص کے حوالے سے ناپی جاتی ہے۔

ایک دفعہ میں مولانا مودودیؒ (d. 1979) کا ریڈیو پاکستان سے انٹرویو سن رہا تھا۔ یہ انٹرویو انہوں نے اپنی وفات سے چند ماہ پہلے دیا تھا۔ان سے سوال کیا گیا کہ ان کی تمام عمر اسلام کے احیا کے لیے گزری ہے۔مسلمانوں کی ترقی کے لیے گزری ہے۔آپ تجربے کی روشنی میں کیا سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ کس چیز کی ضرورت ہے؟ مولاناؒ نے فوراً جواب دیا کہ مسلمانوں کو اخلاق سیکھنے کی ضرورت ہے۔مودودی صاحبؒ کی زندگی کا یہ حاصل تھا۔ یقیناً انہوں نے سو فیصد صحیح فرمایا ہے۔اخلاق کے بغیر ہم بانجھ ہیں۔اس پر گہرے سوچ وبچار کی ضرورت ہے۔ ہمارا مذہب اعلیٰ اخلاقیات کے ذریعے پھیلا لیکن ہم ان اخلاقی بلندیوں سے عاری ہیں جن کا علمبردار اسلام ہے۔ ہمارے پھول اپنی خوشبوؤں سے محروم ہو چکے ہیں۔ہمیں گہرے غور وفکر کی ضرورت ہے۔ہمیں اپنی اخلاقی اقدار پر غور کرنا ہوگا۔ ہمیں عجز وانکسار، عفو ودرگزر، اعلیٰ اخلاق اور خوش مزاج ہونا چاہیے اور اس مقصد کے لیے ہمیں اپنی اصلاح اور اخلاق وآداب کی درستی کے لئے ایک مہم شروع کر دینی چاہیے۔

---

[1]۔جامع ترمذی۔رقم:1169 (حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمانوں میں سے کامل ترین ایمان والا وہ ہے جو اخلاق میں سب سے بہتر ہے)

پندرہواں باب

احترامِ آدمیت

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا [1]

(اور بلاشبہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی۔ انہیں خشکی اور تری میں سوار کیا۔ انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا۔ ہم نے جو مخلوق پیدا کی ان میں بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا کی)

انسانی حقوق کی تحریک جنگ عظیم دوم (WW-II) کے بعد جلد ہی طاقت پکڑنے لگی۔ اقوام متحدہ (UNO) نے 1948ء میں عالمگیر اعلانِ انسانی حقوق (Universal Declaration of Human Rights) کی دستاویز تیار کر لی۔ 1966ء میں اقوام متحدہ (UNO) نے بین الاقوامی معاہدہ برائے شہری وسیاسی حقوق (International Covenant on Civil and Political Rights) اور بین الاقوامی معاہدہ برائے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق (International Covenant on Economic, Social and Cultural Rights) تیار کر لئے۔ خواتین سے امتیازی سلوک برتنے کی ممانعت کا کنونشن (The Convention on Elimination of all forms of Discrimination Against Women) 1981ء میں نافذ ہوا اور کنونشن برائے حقوق بچگان (Convention on the Rights of the Child) 1990ء میں نافذ ہوا۔ اس کے علاوہ عالمی برادری نے انسانی حقوق کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں سینکڑوں اعلانات، معاہدات اور دستاویزات تیار کیں اور متفقہ قراردادیں منظور کر لیں۔ حقوق انسانی کی اس ساری تحریک کو ہم اہل اسلام مغرب کی سازش اور ہتھکنڈہ سمجھتے ہیں۔ اس کے سبب ہم نے ان تحاریک کے خلاف ایک منفی اپروچ اختیار کر لی ہے جو سخت نقصان دہ ہے۔

مذہب انسانی احترام سکھاتا ہے۔ اسلام نے روز اول سے انسان کو اپنی تعلیمات کا مرکز بنایا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام و ابلیس کی کہانی اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ انسان صاحب شرف ہے۔ مسجود ملائکہ

1۔ سورۃ الاسراء: آیت: 70

ہے۔توریت، زبور، انجیل اور قرآن پاک کا مقصد انسانیت کی فلاح وترقی ہے۔ دنیا میں انصاف قائم کرنا ہے۔قانون کی حکمرانی لانا ہے۔حضور نبی کریم ﷺ نے انسانیت کے شرف کی تکمیل کی۔ عہد نامہ قدیم وجدید (زبور، توراۃ، انجیل) کا نصب العین بھی بنی نوع انسان کی عظمت کی پہچان اور اس کی ترقی و بہبود ہے۔زبور شریف میں ارشاد ہے:

(i)۔ انسان ہے کیا کہ تو اس کے بارے میں متفکر ہے۔ وہ اولاد انسان ہے جسے تو ملتا رہتا ہے۔

(ii)۔ کیونکہ تو نے اس کو فرشتوں سے کچھ ہی کم بنایا ہے اور اس کے سر پر عزت وعظمت کا تاج رکھا ہے۔

(iii)۔ تو نے اپنے ہاتھوں سے بنائی دنیا پر اس کو غلبہ عطا کیا ہے اور سب چیزوں کو اس کے پاؤں تلے دے دیا ہے۔

(iv)۔ تمام بھیڑیں اور بیل اور کھلے میدانوں میں گھومنے والے جانور۔

(v)۔ ہوا میں اڑتے پرندے، سمندروں میں تیرتی مچھلیاں اور جو کچھ بھی خشکی کے راستوں اور سمندروں کے درمیان ہے۔

(vi)۔ اے خداوند عالم! تیرا کتنا شاندار نام ہے جو ساری روئے زمین پر گردش کر رہا ہے[1]۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا[2]

(اور بلاشبہ ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی۔ انہیں خشکی اور تری میں سوار کیا۔ انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا۔ ہم نے جو مخلوق پیدا کی ان میں بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا کی)

قرآن مجید نے تصورِ احترامِ آدمیت کا مختلف طریقوں اور مختلف سیاق و سباق میں اظہار کیا ہے۔ایک تو وقار انسانی کی براہ راست اور غیر مشروط توثیق ہے جو جملہ عالم انسانیت کے احترام و وقار کی

۱۔ Psalm-8

۲۔سورۃ الاسراء: آیت:70

قدر شناسی کے سلسلے میں اظہر من الشمس اور جامع ترین ہے۔ جس میں کسی قسم کے رنگ و نسل عقیدہ یا صنف کی کوئی حد بندیاں یا شرائط نہیں ہیں۔

(1)۔ اہم ترین انسانی حق اس کا زندہ رہنے کا حق اور انسانی زندگی کا احترام ہے جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا[1]

(جو کوئی کسی نفس کو قتل کرے جبکہ یہ قتل نہ کسی اور جان کا بدلہ لینے کے لیے ہو اور نہ کسی کے زمین میں فساد پھیلانے کی وجہ سے، تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔ جو شخص کسی کی جان بچالے تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کی جان بچالی)

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ[2]

(ناحق کسی جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے)

یہ آیات ہر انسان پر لازم قرار دیتی ہیں کہ وہ کسی بھی حال میں انسانی جان نہ لے۔ اگر کسی نے ایک انسان کو قتل کیا تو ایسا سمجھا جائے گا کہ اس نے ساری انسانی نسل کو قتل کر دیا ہے۔ یہاں ایک انسان کو قتل (homicide) کو انصاف کے تقاضے کے تحت 'انہدام زندگی' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی صحیح قانونی عدالت کے فیصلے کی شرط لگائی ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ کیا اس شخص نے دیگر انسانوں کے حقِ زیست اور امن سے لا پرواہ ہو کر ایسا اقدام کیا ہے جس کی بنا پر وہ اپنے حقِ زیست کو ضبط کرا بیٹھا ہے۔ اس طرح جان لینا، اُس جان لینے کے برعکس ہے۔

قرآن مجید بیان کرتا ہے:

وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا[3]

(جو شخص کسی کی جان بچالے تو یہ ایسا ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کی جان بچالی)

---

[1]۔ سورۃ المائدہ: آیت:32

[2]۔ سورۃ الانعام: آیت:151

[3]۔ سورۃ المائدہ: آیت:32

کسی شخص کو موت سے بچانے کی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں۔مثلاً ایک شخص بیمار ہے، یا زخمی ہے یا بھوکوں مر رہا ہے اس کا علاج کر دیا گیا یا کھانا وغیرہ کھلا کر زندہ رہنے کے قابل بنا دیا گیا۔مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ایسے عارضوں میں مبتلا افراد کی بلا امتیاز رنگ ونسل اور قومیت و مذہب زندگیاں بچائیں۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا[1]

(اور جو کوئی مومن کو ارادتاً قتل کر دے، اس کی سزا جہنم ہے۔جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔اس (قاتل) پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے۔اس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے۔ اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے)

(2)۔ اسلام معاشی حقوق کو تسلیم کرتا ہے جس کے لئے قرآن مجید اپنے پیروکاروں کو یوں حکم دیتا ہے:

وَفِيْۤ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ[2]

(اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق تھا)

بالفاظ دیگر ایک طرف وہ اپنے رب کا حق پہچانتے ہیں۔دوسری طرف بندوں کے ساتھ ان کا یہ معاملہ ہے کہ وہ اپنے مال میں خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، صرف اپنے بال بچوں ہی کا حق نہیں سمجھتے۔ان کو احساس ہے کہ ہمارے اس مال میں ہر اس بندۂ خدا کا حق ہے جو مدد کا محتاج ہو اور کسی وجہ سے سوال نہ کر سکتا ہو۔

حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں روزِ قیامت تین افراد کا مخالف ہوں گا:

(i)۔ وہ شخص جو میرے نام کی قسم کھاتا ہے مگر دغا بازی کرتا ہے؛

(ii)۔ وہ شخص جو کسی آزاد فرد کو غلام ظاہر کر کے فروخت کر دیتا ہے اور اس قیمت کو کھا جاتا ہے؛

(iii)۔ جو شخص کسی سے مزدوری کراتا ہے اور اس سے پورا کام لیتا ہے مگر اس کی اجرت ادا نہیں کرتا[3]۔

(3)۔ اسلام انصاف پر بہت زور دیتا ہے۔اس بات کو قرآن مجید میں یوں واضح کیا گیا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ

۱۔سورۃ النساء: آیت:93

۲۔سورۃ الذاریات: آیت:19

۳۔صحیح بخاری۔رقم:2227

لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ[1]

(ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں)

وہ مقصد وحید جس کے لئے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک، سارے انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے وہ تین چیزوں (واضح نشانیوں، کتابوں اور میزان) کے ساتھ آئے تاکہ دنیا میں بنی نوع انسان کا طرز عمل اور نظامِ زندگی، انفرادی اور اجتماعی، دونوں انصاف کے ساتھ ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسلمان اللہ تعالیٰ کے حقوق، اپنے حقوق اور جن لوگوں کے ساتھ اسے رہنا ہے، ان کے حقوق سے واضح طور پر آگاہ رہے اور اسے سب حقوق پوری ایمانداری سے ادا کرنے ہیں۔ اس طرح اجتماعی زندگی کے نظام (معاشرہ) میں سے ہر طرح کی ناانصافی دور کردی جائے۔ معاشرتی زندگی کو انتہا پسندی سے تحفظ دیا جائے۔ اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں صحیح توازن اور عدل واحسان قائم کیا جائے تاکہ معاشرے کے جملہ اجزا (عناصر) انصاف کے ساتھ اپنے اپنے حقوق پائیں اور اپنے اپنے فرائض اور ذمہ داریاں ایمانداری کے ساتھ ادا کریں۔

بہ الفاظ دیگر تمام انبیاء علیہم السلام کو بھیجنے کا مقصد انفرادی اور اجتماعی انصاف کا قیام تھا۔ وہ پروردگار کی طرف سے ہدایت کے مطابق ہر فرد کی ذاتی زندگی میں، اس کے ذہن میں، اس کے کردار میں، اس کے طرز عمل اور کاروبار میں ایک توازن، ضبط و اعتدال پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی وہ پورے انسانی معاشرے کو بھی انصاف کی بنیاد پر استوار کرنا چاہتے تھے تاکہ فرد اور معاشرہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ روحانی، اخلاقی اور مادی طور پر معاون بنیں، نہ کہ ایک دوسرے کے لئے راستے کی رکاوٹ بن جائیں[2]۔

اس طرح قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا[3]

(اور دیکھو ایک گروہ نے جو تمہارے لئے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا ہے تو اس پر

---

[1] سورۃ الحدید: آیت:25

[2] تفہیم القرآن از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بحوالہ آیت مذکورہ

[3] سورۃ المائدہ: آیت:2

تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کردے کہ تم بھی ان کے مقابلہ میں ناروا زیادتیاں کرنے لگو)

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى[1]

(کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاۗءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا[2]

(اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ ہی کے لیے عدل وانصاف پر مضبوطی کے ساتھ گواہی دینے والے ہوجاؤ۔ چاہے وہ تمہارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ کے یا رشتہ داروں، عزیزوں کے۔ وہ امیر ہو یا غریب اللہ تعالیٰ ان دونوں کا زیادہ خیر خواہ ہے۔ تم خواہش کے پیچھے پڑ کر انصاف نہ چھوڑ و اور اگر تم نے غلط بیانی یا پہلو تہی کی تو جان لو جو کچھ تم کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے)

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ[3]

(اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو)

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ[4]

(کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ پھر تم سب کو اپنے پروردگار کی طرف لوٹ کر جانا ہے)

(4)۔ اسلام لوگوں کے درمیان بلا امتیاز رنگ ونسل اور قومیت ومذہب قطعی مساوات پر یقین رکھتا ہے۔

---

[1]۔سورۃ المائدہ: آیت:8

[2]۔سورۃ النساء: آیت:135

[3]۔سورۃ النساء: آیت:58

[4]۔سورۃ الانعام: آیت:164

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى[1]
(اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا)
وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ[2]
(اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہے)
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ[3]
(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! مرد دوسرے مردوں کا مذاق نہ اڑائیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد نافرمانی کرنا بری بات ہے)
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا[4]
(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بدگمانی کرنے سے پرہیز کرو کیونکہ بہت سی بدگمانیاں گناہ ہوتی ہیں۔ جاسوسی نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے)
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا

---

[1] سورۃ الحجرات: آیت:13
[2] سورۃ الحجرات: آیت:13
[3] سورۃ الحجرات: آیت:11
[4] سورۃ الحجرات: آیت:12

وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓی اَھْلِھَا[1]

(اے یمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو، جب تک کہ گھروالوں سے اجازت اور انہیں سلام کہہ لو)

(5)۔ اسلام مذہب اور ضمیر کی آزادی کا تحفظ کرتا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ[2]

(دین کے بارے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے)

(6)۔ حضور نبی کریم ﷺ نے انسانی عزت وتکریم کی تکمیل فرمادی۔ میثاقِ مدینہ اور خطبۂ حجۃ الوداع متذکرہ بالا جملہ تعلیماتِ قرآن مجید کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ خطبہ حجۃ الوداع انسانی حقوق کا پہلا باقاعدہ منشور تھا۔ اس کے نمایاں نقوش میں درج ذیل امور شامل تھے:

(i)۔ اے لوگو! جس طرح تم اس مہینے، اس دن اور اس شہر کو مقدس سمجھتے ہو اسی طرح تم ہر مسلمان کی زندگی اور اس کی املاک کو ایک مقدس امانت سمجھو۔

(ii)۔ کسی کو گزند نہ پہنچاؤ تا کہ تمہیں بھی کوئی گزند نہ پہنچائے۔

(iii)۔ تم ناانصافی نہ مسلط کرو گے اور نہ برداشت کرو گے۔

(iv)۔ اے لوگو! عورتوں کے تم پر حقوق ہیں اور اسی طرح تمہارے عورتوں پر حقوق ہیں اس لئے عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آنا اور ان پر شفقت کرنا کیونکہ وہ تمہاری شریک کار اور پُرخلوص مددگار ہیں۔

(v)۔ تمام بنی نوع انسان حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام سے ہی پیدا ہوئے۔ ایک عربی کو ایک عجمی پر کوئی فوقیت نہیں اور نہ ایک عجمی کو ایک عرب پر کوئی فوقیت حاصل ہے۔ نیز ایک سفید فام کو کسی سیاہ فام پر اور نہ کسی سیاہ فام کو کسی سفید پر کوئی فوقیت حاصل ہے ماسوائے تقویٰ اور اعمالِ صالحہ کے۔

(vi)۔ جان لو کہ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے اور سب مسلمان اکٹھے ہو کر ایک اخوت بن چکے ہیں۔ کسی مسلمان کے لیے وہ چیز حلال نہیں ہے جو اس کے ساتھی مسلمان کی ہے تاوقتیکہ وہ اپنی

---

[1]۔ سورۃ النور: آیت: 27

[2]۔ سورۃ البقرہ: آیت: 256

آزاد مرضی اور ارادے سے اس کو وہ چیز دے دے۔

(vii)۔ اپنے آپ سے ناانصافی نہ کرنا۔

(7)۔ قرآن مجید انسانی حقوق کے محترم ہونے کی یہ وجہ بتاتا ہے:

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ[1]

(اور بلاشبہ ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جسے ہم نے علم کے ساتھ خوب کھول کر بیان کیا ہے اور جو ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے)

انسانوں کے لئے رحم وہ صفت (value) ہے جس کے اندر نرم مزاجی، توجہ، رواداری، محبت اور عفو جیسے جذبات پائے جاتے ہیں۔ جب ان خصوصیات کا مشاہدہ کیا جائے تو یہ بندوں کے لئے ان کے خالق کی رحمت کا ایک عکس ہوتی ہیں۔ قرآن مجید واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ ساری مخلوقات کے لئے رحمت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو صرف اپنے خاندان، دوستوں یا عرب قوم یا ساتویں صدی عیسوی کے یا ہمیشہ آنے والے مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ سارے جہانوں کے لئے رحمت بنایا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ[2]

(اے نبی ﷺ! ہم نے آپ ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)

حضور نبی اکرم ﷺ رحمتِ مجسم تھے۔ آپ ﷺ اپنے اردگرد کے تمام لوگوں، خاندانوں، یتیموں، دوست احباب، اجنبیوں حتیٰ کہ دشمنوں سے بھی شفقت فرماتے تھے۔ آیئے ایک مثال آپ ﷺ کی سوانح حیات میں سے لے لیتے ہیں۔ آپ ﷺ مسجد نبوی میں اپنے خادموں کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ایک بدو آیا اور اس نے مسجد نبوی کے صحن میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اٹھ کر بھاگے تاکہ اس کو روکیں۔ آپ ﷺ نے سختی سے فرمایا کہ اسے تنگ نہ کرو۔

---

[1]۔ سورۃ الاعراف: آیت: 52

[2]۔ سورۃ الانبیاء: آیت: 107

پیشاب کرنے دو۔اس کی مجبوری ہوگی[1]۔قربان جاؤں یہ تھے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام کہلانے کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن دوسرے مسلمان کو اپنی مسجد میں نماز نہیں پڑھنے دیتے۔کیا نسبت ہے؟ کیا قربت ہے؟ کیا بعد المشرقین ہے؟ تو کجا و من کجا۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ماحول اور جانوروں کا بھی خیال رکھتے اور ان کے ساتھ رحم کا سلوک کرتے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ واضح کر دیتے ہیں کہ بے چارے جانوروں کو اذیت دینا نہ صرف نا قابل قبول ہے بلکہ ہم ایسی حرکتوں کے لئے خدا کے سامنے جوابدہ بھی ہیں۔

(i)۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی شخص کھیل تماشے کے لئے ایک چڑیا کو مار دیتا ہے تو وہ چڑیا روزِ قیامت فریاد کرے گی: اے اللہ تعالیٰ! اس شخص نے مجھے خواہ مخواہ قتل کر دیا تھا۔اس نے یہ کام کسی مفید مقصد کے لئے نہیں کیا تھا[2]۔

(ii)۔ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر کسی جانور پر زیادہ بوجھ لدا ہوا دیکھتے یا لاغر حالت میں پاتے تو اس کے مالک سے ارشاد فرماتے کہ جانوروں سے سلوک کرتے ہوئے خدا سے ڈرا کرو[3]۔

(iii)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی کسی حاجت کے لیے تشریف لے گئے۔ہم نے ایک چھوٹی چڑیا دیکھی اس کے دو بچے تھے۔ہم نے اس کے دونوں بچے پکڑ لیے، تو وہ چڑیا آئی اور (انہیں حاصل کرنے کے لیے) تڑپنے لگی۔اتنے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا: کس نے اس کے بچے لے کر اسے تکلیف پہنچائی ہے؟ اس کے بچے اسے واپس لوٹا دو۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چیونٹیوں کی ایک بستی دیکھی جسے ہم نے جلا ڈالا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ کس نے جلایا ہے؟ ہم نے عرض کیا کہ ہم نے۔

---

[1]۔صحیح بخاری۔جلد اول: رقم: 221 (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے مسجد میں کھڑے ہو کر پیشاب کر دیا، تو لوگوں نے اسے پکڑ لیا۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو اور اس کے پیشاب پر ایک ڈول پانی ڈال دو۔اس لئے کہ تم لوگ نرمی کرنے کے لئے بھیجے گئے ہو، سختی کرنے کیلئے نہیں)

[2]۔سنن نسائی۔جلد سوم: رقم: 755

[3]۔سنن ابوداؤد۔رقم: 2549

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آگ کے پیدا کرنے والے کے سوا کسی کے لیے آگ کی سزا دینا مناسب نہیں ہے[1]۔

(iv)۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک راستے پر سے گزر رہے تھے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ساتھ تھے۔ راستے میں ایک کتیا اپنے بچوں کو دودھ پلا رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہمیں راستہ چھوڑ دینا چاہیے ورنہ کتیا پریشان ہوگی۔ بچے دودھ نہیں مکمل کر سکیں گے۔

یہ تعلیمات حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار کی عکاسی کرتی ہیں جن کے اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ آج مشرق اور مغرب کے مسلمانوں میں اس اخلاقی کردار کی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی۔ ہم وہ لوگ ہیں جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے پیروکار ہونے کا دعویٰ تو رکھتے ہیں کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پُرعظمت کردار کا ہم میں کوئی شائبہ تک پایا جاتا ہے؟

بمصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی، تمام بولہبی است[2]
(خود کو مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچاؤ کہ وہی اصل دین ہیں)
(اگر تم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک نہ پہنچے تو یہ ابولہبیت ہوگی)

جدید دنیا نے انسانی حقوق پر بہت زور دیا ہوا ہے۔ ہم مسلم معاشرے کے لوگ، بدقسمتی سے اسلام کی واضح تعلیمات کے برعکس انسانی حقوق کی جدید تحریک کو اسلام کے خلاف چال اور سازش قرار دیتے ہیں۔ نتیجتاً ہم نے اس مسئلے کے بارے میں منفی ذہن بنا لیا ہے جو کہ بہت نقصان دہ ہے۔ ہم پر تو اپنی تاریخ کے لحاظ سے بھی ایک ذمہ داری تھی کہ انسانی حقوق کی تحریک کا آغاز ہم خود کرتے اور اس کی رہنمائی کرتے۔ ہم انسانی حقوق کے محافظ ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیات اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری خطبے اور دیگر احادیث میں مذکور ہے۔ لیکن الٹا ہم نے رجعت پسندانہ اور منفی طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں یہ رویہ اسلام کے نصب العین

---

[1]۔ سنن ابوداؤد۔ جلد سوم: رقم: 1856
[2]۔ حسین احمد؛ ارمغان حجاز از محمد اقبالؒ

سے مطابقت نہیں رکھتا۔

ہم اپنے ورثے سے ہمکنار ہو سکتے ہیں اور آج کی دنیا سے ہم آہنگ اور ہمقدم ہو کر چلنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ہم جدید دنیا پر اسلامی اقدار کے اطلاق کے لئے کھلے ذہن سے کوئی بھی قابل عمل طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔ ہم جدید انسانیت کے ان طور طریقوں سے اختلاف کر سکتے ہیں جو ہمارے نظام عقائد سے متصادم ہو۔ ہم اپنے عقائد سے مطابقت رکھنے والے طریقوں کو مثبت انداز میں قبول کر سکتے ہیں۔



سولھواں باب

عورت بھی انسان ہے

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ[1]
(عورتوں کے بھی معروف طریقے پر وہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں)

عورتیں کل انسانیت کا نصف حصہ ہیں۔ عالمی آبادی کا پچاس فیصد (50%) عورتوں پر مشتمل ہے لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں کا عورتوں کے بارے میں عمومی رویہ اسلامی نہیں ہے۔ یہ عہد متوسط کے روایت پسندانہ طرزِ عمل جیسا ہے۔ عورتوں کے بارے میں یہ رویہ اخلاقی طور پر غلط ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ دورِ حاضر کے تقاضوں سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس نصف انسانیت کے بارے میں بیرونی تصورات سے بہت متاثر ہیں۔ ان تصورات میں سے ایک تصور یہ ہے کہ حضرت حوا علیہا السلام معصیت کے پہلے اقدام (حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنے) کا سبب بنی تھی۔ اس سے اس تصور نے جنم لیا کہ عورتیں تمام معصیتوں کی جڑ ہیں۔ چنانچہ مردوں نے عورتوں کو منبعِ فساد قرار دے کر اپنی فکر وعمل کا ایک مخصوص انداز اختیار کر لیا۔

مسیحیوں نے شروع شروع میں اس عقیدے کو محورِ خیال بنائے رکھا لیکن اب وہ عورتوں کے بہت سے حقوق کو تسلیم کرتے ہیں جو کہ تحریک حقوقِ انسانی کا نتیجہ ہے تاہم مسلمان ابھی تک 'اسرائیلیات' (روایاتِ عہد نامہ قدیم وجدید) کی کہانیوں اور افسانوں کو اپنی تقریروں اور تحریروں اور عمل کے ذریعے دوہراتے رہتے ہیں۔ جب کہ قرآن کریم اس بارے میں بالکل مختلف اور بہت واضح انداز میں احکامات دیتا ہے۔

(1)۔ اسلام نہایت واضح اور غیر مبہم انداز میں اعلان کرتا ہے کہ ایک عورت بطور ایک بنی نوع انسان مرد کے مساوی ہے۔ قرآن مجید مردوں اور عورتوں کو ایک ہی طریقے سے مخاطب کرتا ہے۔ یعنی 'الناس' (اے لوگو) الانسان (اے بنی نوعِ انسان)، البشر (اے انسانوں) اور المؤمن (اے ایمان والو)۔ یہ سب اصطلاحیں عوام کو مخاطب کرنے کے لیے استعمال ہوئی ہیں، جو عورتوں اور مردوں، دونوں کے لئے ہیں۔ اس میں کوئی امتیاز نہیں، خواہ صنف کے لحاظ سے وہ جو کچھ بھی ہیں۔ درج ذیل آیت میں قرآن مجید نے دونوں کی برابری بیان کی ہے۔

---

[1]۔ سورۃ البقرہ: آیت: 228

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ[1]

(اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا)

قرآن مجید اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کو مساوی مخرج سے پیدا کیا۔ بطور بنی نوع انسان ان میں سے کسی کو دوسرے پر کسی بھی لحاظ سے برتری یا کمتری کی حالت میں نہیں بنایا تاہم ان میں سے کسی کو اخلاقی برتری، راستبازی، انصاف پسندی اور نیک اعمال کی بنا پر ہو سکتی ہے۔ اس برتری کو مرد یا عورت مساوی طور پر حاصل کر سکتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ[2]

(اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہارے خاندان اور قبیلے بنا دیئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہے)

(2)۔ زمانہ قبل از اسلام ایک عام معاشرتی اور کسی قدر مذہبی عقیدہ تھا کہ عورتوں پر اس لئے لعنت بھیجی گئی کہ حضرت حوا علیہا السلام باغِ بہشت سے حضرت آدم علیہ السلام کے اخراج کا سبب بنی تھی۔ قرآن مجید نے یہ کہانی بیان کرتے ہوئے بار بار حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام دونوں کا ذکر کیا ہے اور اعلان کیا ہے کہ وہ خطا حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام دونوں سے سرزد ہوئی تھی۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۭ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ[3]

(پس اس نے دونوں کو دھوکے سے پھسلا دیا جب دونوں نے اس درخت کو چکھا تو ان کے لیے ان کی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں اور دونوں جنت کے پتے اپنے آپ پر چپکانے لگے اور ان دونوں کو ان کے رب نے آواز دی کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور تم دونوں سے نہ فرمایا تھا کہ بیشک شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے)

---

[1]۔ سورۃ النساء: آیت: 4

[2]۔ سورۃ الحجرات: آیت: 13

[3]۔ سورۃ الاعراف: آیت: 22

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ[1]

(لیکن شیطان نے ان دونوں کو پھسلا کر وہاں سے نکلوا دیا)

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ[2]

(دونوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اگر تو نے ہمیں نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم خسارہ پانے والوں سے ہو جائیں گے)

(3)۔ اسلام مرد اور عورت، دونوں کو یکساں حیثیت دیتا ہے اور اس نے صنف کی بنیاد پر ان کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا۔ اسلام عورتوں اور مردوں کو برابر اہمیت دیتا ہے اور اس نقطے پر زور دیتا ہے کہ ان دونوں اصناف میں سے کسی ایک کو بھی قتل کرنے والے کو مساوی سزا ملے گی۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا[3]

(اور جو کوئی مومن کو ارادتاً قتل کر دے، اس کی سزا جہنم ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے)

ہم صنفی مساوات کی وضاحت سے متعلق قرآنی تعلیمات کو نظر انداز کرتے ہوئے عموماً اور غلط طور پر مسلم معاشرے یہ یقین کئے جا رہے ہیں کہ مرد عورتوں سے ایک بالاتر مخلوق ہے۔ یہ موقف رکھنے والے بہانے کے طور پر اس آیت کا سہارا لیتے ہیں۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ[4]

(عورتوں کے لئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق ان پر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے)

یہ آیت مسلمانوں کو محض یہ ہدایت فراہم کرتی ہے کہ وہ اپنے خاندانی معاملات کو کیسے چلائیں۔

---

[1]۔سورۃ البقرہ: آیت:36

[2]۔سورۃ الاعراف: آیت:23

[3]۔سورۃ النساء: آیت:93

[4]۔سورۃ البقرہ: آیت:228

اسلام خاندان کو ایک بنیادی معاشرتی اکائی قرار دیتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد دونوں کے حقوق اور فرائض کا اس مقدس اکائی کے اندر تعین کیا ہے۔ جہاں تک ان الفاظ 'مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ حاصل ہے' کا تعلق ہے ان کا اطلاق خالصتاً ان دونوں کے ازدواجی تعلق اور خصوصاً مردوں کی اپنے خاندان کے لیے کما کر لانے کی ذمہ داری پر ہوتا ہے۔ یہ مرد کو عورتوں کو کنٹرول میں لینے اور ان سے بدسلوکی کرنے کا لائسنس نہیں دے دیتا، کیونکہ اسلام انہیں برابر کے انسان قرار دیتا ہے۔

قرآن مجید کے مطابق عزت کے مستحق بنی نوع انسان، مرد اور عورتیں، دونوں ہیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کی بہترین تخلیق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بنی آدم (انسان) کو بے پناہ شفقت سے نوازا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ [1]

(ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے)

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا [2]

(یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی، انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں میں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت بخشی)

اسلام نے زمانہ قبل از اسلام میں مروج دختر کشی کی شدید مذمت کی ہے۔ قرآن مجید نے اس کے مرتکبین کو سخت تنبیہ کرتے ہوئے بتایا کہ قیامت کے روز ان سے اس برے فعل کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ قرآن مجید نہایت زوردار طریقے سے کہتا ہے:

وَإِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ وَإِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ [3]

(اور جب زندہ درگور کی ہوئی بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس غلطی کے بدلے قتل گئی)

قرآن مجید بیٹیوں کی پیدائش کو ایک رحمت کہتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ بیٹی کی پیدائش کو خاندان کے لئے غمناک موقع نہ سمجھا کریں۔

۱۔ سورۃ التین: آیت: 4

۲۔ سورۃ الاسراء: آیت: 70

۳۔ سورۃ التکویر: آیت: 8-9

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمۡ بِالۡاُنۡثٰى ظَلَّ وَجۡهُهٗ مُسۡوَدًّا وَّهُوَ كَظِيۡمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الۡقَوۡمِ مِنۡ سُوۡٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمۡسِكُهٗ عَلٰى هُوۡنٍ اَمۡ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحۡكُمُوۡنَ[1]

(جب ان میں کسی کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی جاتی ہے تو اس کے چہرے پر کلونس چھا جاتی ہے اور وہ خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کہ اس بُری خبر کے بعد کسی کو کیا منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ بیٹی کو لئے رہے یا مٹی میں دبا دے؟ دیکھو کتنی بری بات ہے)

(4)۔ اسلام حصولِ علم کو مرد اور عورت دونوں کے لیے لازم قرار دیتا ہے۔ قرآن مجید علم کی اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ[2]

(تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہلِ کتاب (علماء) سے پوچھ لو)

اسی طرح متعدد احادیث میں عورتوں کو علم حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

(i)۔ حصولِ علم تمام مسلمانوں کے لئے لازم ہے[3]۔

(ii)۔ جو آدمی بھی اپنی لونڈی کی تربیت کرتا ہے اور اچھی تربیت کرتا ہے۔ اس کو تعلیم دلاتا ہے اور اچھی تعلیم دلاتا ہے۔ پھر اس کو آزاد کرتا ہے اور اس سے شادی کرتا ہے تو اس کے لیے دو اجر ہیں[4]۔

(iii)۔ کچھ خواتین نے حضور نبی کریم ﷺ سے استدعا کی کہ آپ ﷺ جس طرح مردوں کو وقت دیتے ہیں اسی طرح ہمارے لئے بھی ایک دن مقرر فرما دیں۔ اس پر آپ ﷺ نے ان سے ایک دن کا وعدہ کر لیا۔ اس دن آپ ﷺ انہیں دینی اسباق دیتے اور احکاماتِ الٰہی سے آگاہ کرتے تھے[5]۔

(5)۔ اسلام مسلمان عورتوں کو زندگی کے تمام معاملات پر اظہار خیال کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا

۱۔ سورۃ النحل: آیت: 58-59

۲۔ سورۃ الانبیاء: آیت: 7

۳۔ سنن ابن ماجہ۔ رقم: 183

۴۔ سنن کبریٰ للبیہقی۔ جلد ہشتم: رقم: 1569

۵۔ صحیح بخاری۔ رقم: 101

ہے۔ گھر کے امور سے لے کر سیاسی تنظیم تک وہ ہر معاملے میں اپنی رائے کا اظہار کر سکتی ہیں۔
قرآن مجید مسلمانوں کی ایک خصوصیت کو درج ذیل الفاظ میں بیان کرتا ہے:

وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ ۖ[1]

(وہ اپنے معاملات باہمی مشورے سے چلاتے ہیں)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مختلف معاملات میں اپنی ازواجِ مطہرات سے مشورہ کرتے اور ان کی آرا معلوم کرتے تھے۔ ایک مثال کا ذکر سیرۃ اور احادیث کی کئی کتابوں میں آتا ہے۔ جب حدیبیہ میں ایک عارضی معاہدہ[2] ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل مکہ کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس کی شرائط میں سے ایک شرط یہ تھی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس سال حج کئے بغیر مدینہ واپس چلے جائیں گے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس شرط پر خوش نہیں تھے جسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طرفین کے مابین خونریزی سے بچنے کے لئے قبول کر لیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سامنے تجویز پیش کی کہ وہ مدینہ منورہ واپس جانے سے پہلے اپنے جانور ذبح کر لیں اور سر منڈوانے کی رسم حج ادا کر لیں۔ لیکن کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس مشورہ پر عمل نہ کیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارا اپنے الفاظ دوہرائے، پھر بھی کسی نے عمل نہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس پر حیرت ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اہلیہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی طرف گئے اور اپنی ناراضی سے انہیں آگاہ کیا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین عمل نہیں کر رہے ہیں۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا:

> اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واقعی چاہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجویز پر عمل کیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے یہ عمل خود کر کے دکھائیں، یہ جگہ چھوڑ دیں اور اس وقت تک کسی سے بات نہ کریں جب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود قربانی کر کے سر نہ منڈوا لیں[3]۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا ہی کیا جیسا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے مشورہ دیا تھا۔ جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ اعمال دیکھے تو وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور وہ کام کرنے لگے جن کے لئے انہیں پہلے کہا گیا تھا۔ یہ حدیبیہ کے مذاکراتِ امن میں خواتین کی شمولیت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

---

[1] سورۃ الشوریٰ: آیت:38

[2] صلح حدیبیہ

[3] صحیح بخاری۔ جلد سوم: رقم:891

ان سے مشاورت کی ایک واضح مثال ہے۔ یہ کام ایسے وقت ہوئے جو تاریخِ اسلام کے بڑے حساس لمحات تھے۔ اسی طرح ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے موقع پر خواتین سے مشورہ کیا گیا تھا۔

ایک اور دلچسپ نظیر بھی ہے خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ اپنے خطبے میں مشورہ دیا کہ حق مہر بہت زیادہ مقرر نہ کیا کرو کیونکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بیویوں کو بارہ (12) اوقیہ سے زیادہ مہر نہیں دیا۔ یہ سن کر ایک عورت اٹھ کھڑی ہوئی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بات کا جواب دیتے ہوئے بولی کہ جب اللہ تعالیٰ ہمیں زیادہ دلوانا چاہتا ہے آپ رضی اللہ عنہ ہمیں کیوں محروم کر رہے ہیں؟ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ نہیں کہا:

وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا [1]

(خواہ تم نے اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو، اس میں سے کچھ واپس نہ لینا)

یہ دلیل سن کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے مہر کی مقدار مقرر کرنے کا اپنا حکم واپس لے لیا۔ اسلام نے عورتوں کو جھوٹے الزام سے محفوظ رکھنے اور ان کی آبرو کے تحفظ کے لئے مثالی سزا (حدّ قذف) مقرر کی ہے۔ قرآن مجید نے اعلان کیا ہے کہ تمام عورتیں باعصمت ہیں اور اپنے پیروکاروں کو کہا ہے کہ وہ ان پر بے بنیاد الزامات ہرگز نہ لگائیں۔ اگر کسی عورت پر حرام کاری کا الزام ہے تو الزام لگانے والے پر لازم ہے کہ وہ ثبوت کے لئے چار گواہ پیش کرے۔ اگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے تو اسے اسی (80) کوڑے مارے جائیں گے۔ مزید برآں وہ آئندہ کبھی گواہی دینے کا اہل نہیں رہے گا۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ [2]

(اور جو لوگ پاکدامن عورتوں پر تہمت لگائیں اور پھر چار گواہ پیش نہ کریں ان کو اسّی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کی جائے کیونکہ وہ فاسق ہیں)

(7)۔ اسلام عورتوں کو اقتصادی حقوق دیتا ہے، جن میں گھر سے باہر نکل کر کام کرنے کا حق بھی شامل

---

[1] سورۃ النساء: آیت: 20

[2] سورۃ النور: آیت: 4

ہے۔قرآن مجید دوعورتوں کے کام کرنے کا ذکر کرتا ہے جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا تھا۔

وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۠ وَوَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمُ امْرَاَتَيْنِ تَذُوْدٰنِ ۚ قَالَ مَا خَطْبُكُمَا ؕ قَالَتَا لَا نَسْقِيْ حَتّٰى يُصْدِرَ الرِّعَآءُ ٚ وَاَبُوْنَا شَيْخٌ كَبِيْرٌ [1]

(اور جب وہ مدین کے کنویں پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں اور ان سے الگ ایک طرف دوعورتیں اپنے جانوروں کو روکے ہوئے ہیں۔موسیٰ (علیہ السلام) نے ان عورتوں سے پوچھا تمہارا کیا مسئلہ ہے؟ انہوں نے کہا ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلاسکتیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانور نہ لے جائیں اور ہمارے والد بہت بوڑھے آدمی ہیں)

اسلام نے عورتوں کو بطور ماں، بہن، بیٹی اور بیوی، کی حیثیتوں سے حقوقِ وراثت دیئے ہیں۔وہ اپنے آباؤاجداد کی املاک میں سے اپنا جائز حصہ پاسکتی ہیں۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ۭ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا [2]

(ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں مردوں کا حصہ ہے اور عورتوں کا بھی ماں باپ اور رشتہ داروں کے ترکہ میں حصہ ہے۔مال کم ہو یا زیادہ حصہ مقرر کردیا گیا ہے)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہلی زوجہ تھیں اور قریش کی ایک مشہور تاجر تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی جوانی میں ان کا مالِ تجارت لے کر بیرونی ممالک میں جاتے تھے۔حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے بارے میں روایت کرتی ہیں کہ وہ چمڑے کو سکھا کر اس سے مختلف چیزیں بناتیں اور مارکیٹ میں فروخت کر کے حاصل ہونے والی رقم غرباء میں تقسیم کر دیتی تھیں [3]۔

۱۔سورۃ القصص: آیت:23

۲۔سورۃ النساء: آیت:7

۳۔سنن نسائی۔جلد دوم: رقم:1307

مسلمانوں کی تاریخ انکشاف کرتی ہے کہ مسلمان عورتیں جہاد میں بھی حصہ لیتی تھیں۔حضرت ربیع بنت معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ہم عورتیں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک ہوتی تھیں قوم کو پانی پلاتی تھیں اور ان کی خدمت کرتی تھیں اور زخمیوں کو مدینہ پاک لاتی تھیں[1]۔

(8)۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک کنواری لڑکی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی کہ اس کے باپ نے اس کا نکاح ایسی جگہ کر دیا ہے جو اسے پسند نہیں ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس لڑکی کو اختیار دے دیا (اگر وہ چاہے تو نکاح فسخ کر دے۔[2]
اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: ابو ودیعہ جن کا نام کذام تھا نے اپنی بیٹی کا نکاح ایک شخص سے کر دیا۔ان کی بیٹی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور شکایت کی کہ اس کا نکاح فلاں شخص سے زبردستی کیا جا رہا ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے اس کے شوہر سے الگ کر دیا اور ارشاد فرمایا کہ عورت کو مجبور نہ کیا کرو[3]۔حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کنواری لڑکی سے نکاح کی اجازت لی جائے اور شوہر دیدہ عورت سے مشورہ کیا جائے۔کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کنواری لڑکی شرماتی ہے (تو اس سے اجازت کیسے حاصل کی جائے؟)۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس کی خاموشی ہی اس کی رضامندی کی علامت ہے[4]۔ایک دوسری روایت میں ہے کہ اگر وہ (لڑکی) انکار کر دے تو اس پر زبردستی کرنے کا کوئی جواز نہیں[5]۔حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے اپنی بیٹی حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کرانے سے پہلے بیٹی کی رضا پوچھی تھی۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شادی کی پیشکش ایک اور واضح مثال ہے کہ خواتین کو اپنے شوہر کے انتخاب کا مکمل حق حاصل ہے۔

(9)۔ قرآن مجید واضح کر دیتا ہے کہ تمام مسلمان عورتیں کسی عدالت میں بطور گواہ پیش ہونے کی

---

[1]۔صحیح بخاری۔جلد سوم: رقم:657
[2]۔مسند احمد۔جلد دوم: رقم:600
[3]۔مسند احمد۔جلد دوم: رقم:1523
[4]۔مسند احمد۔جلد چہارم: رقم:13
[5]۔مسند احمد۔جلد چہارم: رقم:1807

اہلیت رکھتی ہیں تاہم بعض فقہاء کرامؒ کی رائے ہے کہ حدودُ کے کیس میں ایک عورت کا بطور گواہ پیش ہونا نا قابل قبول ہے جب تک کہ ان میں سے دو اکٹھی ہو کر ایک مرد گواہ کے ہمراہ گواہی نہ دیں۔ یہ فقہاء کرامؒ اپنی دلیل کی تائید میں ایک آیت کا حوالہ دیتے ہیں:

فَاِنۡ لَّمۡ یَکُوۡنَا رَجُلَیۡنِ فَرَجُلٌ وَّ امۡرَاَتٰنِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰىهُمَا الۡاُخۡرٰى[1]

(اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تا کہ ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے)

روایتی علماء اور فقہاء اس آیت کی سخت تعبیر کرتے ہیں کیونکہ یہ آیت صرف قرضے اور کاروباری معاملات کے بارے میں ہے جن سے عورتیں زمانۂ وحی میں عموماً غیر متعلق رہتی تھیں۔ بعض اہل دانش اس سخت گیرانہ تعبیر سے درج ذیل وجوہ کی بنا پر اختلاف رکھتے ہیں:

(i)۔ یہ آیت ایک اصول کی تشریح کرتی ہے جو تجارتی معاملات کا حوالہ دیتا ہے۔

(ii)۔ یہ شہادت کا کوئی قانونی اصول نہیں بتاتی۔

(iii)۔ اس کا اطلاق زندگی کے دیگر شعبوں پر نہیں کیا جا سکتا خاص طور پر اس وقت جب قرائنی شہادت کی ضرورت ہو۔

(iv)۔ اس آیت نے کسی صورت میں بھی یہ نہیں بتایا کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے۔

(v)۔ یہ آیت سبب (تناسب) بتاتی ہے کہ اگر ایک عورت غلطی کر جائے تو دوسری اس کو یاد دلا دے گی۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ اس زمانے میں عورتیں زیادہ تر ایسے معاملات سے سروکار نہیں رکھتی تھیں۔ اس لئے ان کے فہم میں غلطی کا امکان ہو سکتا تھا۔

(vi)۔ ایسے معاملات میں جج کو یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کون سی شہادت کو قبول کرنا ہے اور کس پر انحصار کرنا ہے۔

(vii)۔ یہ آیت صرف مستقبل کے مالیاتی امور تک محدود رہے گی اس کا تمام دیگر معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(viii)۔ جب خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان کی اہلیہ

---

[1] سورۃ البقرہ: آیت: 282

حضرت سیدہ نائلہ رضی اللہ عنہا کی گواہی کو قبول کیا کیونکہ وہ آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کی واحد گواہ تھیں۔

اگر روایتِ حدیث میں ایک عورت کی گواہی مساوی طور پر قبول کر لی جاتی ہے اور حدیث ماخذِ قانون مانی جاتی ہے تو معمول کے معاملات (قانونی یا فوجداری) میں عورت کی گواہی کیوں قبول نہیں کی جاسکتی۔ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دو ہزار پانچ سو (2,500) سے زائد احادیث مروی ہیں اور اسلامی قانون کے متعدد اہم اصول ان روایات پر استوار ہیں۔

(10)۔ اسی طرح ایک عورت کو بطور ماں، بہن، بیٹی اور بیوی خصوصی حقوق حاصل ہیں جن میں اعتماد و بھروسہ، عزت واحترام، حُسن سلوک، مناسب برتاؤ، فراہمی خوراک، لباس، رہائش، بڑھاپے میں خصوصی دیکھ بھال اور دیگر روزمرہ کی ضروریات کی تکمیل شامل ہیں۔ قرآن مجید میں والدہ کے حقوق کے متعلق بے شمار آیات موجود ہیں:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ[1]

(ہم نے انسان کو اس کے والدین کے بارے میں نصیحت کی ہے۔ اس کی ماں نے اسے اپنے بطن میں بہت کمزوری میں اٹھائے رکھا اور دو سال اسے دودھ پلاتی رہی)

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا[2]

(ہم نے انسان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک برتاؤ کرے۔ اس کی ماں نے مشقت اٹھا کر اسے پیٹ میں رکھا اور مشقت اٹھا کر ہی اس کو جنا اور اس کے حمل اور دودھ چھڑانے میں تیس مہینے لگ گئے)

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا[3]

(اور نرمی اور رحم کے ساتھ ان کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو: اے ہمارے

---

[1]۔ سورۃ لقمان: آیت: 14

[2]۔ سورۃ الاحقاف: آیت: 15

[3]۔ سورۃ الاسراء: آیت: 24

پروردگار! ان پر رحم فرما! جس طرح انہوں نے رحمت وشفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا)

(11)۔ اسلام بیٹے اور بیٹی کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کرتا بلکہ اہل ایمان کو تحریک دیتا ہے کہ وہ بیٹیوں کے ساتھ زیادہ شفقت ورحم کا سلوک کریں۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ جس کسی کے ہاں بیٹی جنم لے اور وہ اسے زندہ نہیں دفنا دیتا، اس کی تذلیل نہیں کرتا اور بیٹے کو اس پر ترجیح نہیں دیتا، اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کردے گا[1]۔

ایک دوسری روایت ہے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص دو لڑکیوں کی ان کی بلوغت تک صحیح پرورش کرتا ہے، وہ شخص جنت میں میرے ساتھ ہوگا[2]۔

ایک اور حدیث میں کہا گیا ہے: کہ اگر کسی شخص کی تین بیٹیاں یا تین بہنیں، یا دو بیٹیاں یا دو بہنیں ہیں اور وہ اچھی طرح ان کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے، تو اس کے لئے ایک جنت ہے[3]۔

(12)۔ اسلام مردوں کو سکھاتا ہے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ محبت اور ہمدردی کا سلوک کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ[4]

(اور اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ایک نشانی ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور شفقت پیدا فرما دی۔ یقیناً اس میں اس کی قدرت کی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں)

---

[1]۔ مسند احمد۔ رقم: 1957
[2]۔ صحیح مسلم۔ جلد سوم: رقم: 2194
[3]۔ جامع ترمذی۔ رقم: 1997
[4]۔ سورۃ الروم: آیت: 21

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ [1]

(بیویاں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو)

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا [2]

(ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔ اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ نے اس میں بہت بھلائی رکھ دی ہو)

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ [3]

(اوران کے خاوند اگر پھر موافقت چاہیں تو اس (مدت) میں وہ ان کو اپنی زوجیت میں لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں اور عورتوں کا حق (مردوں پر) ایسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے۔ البتہ مردوں کو ایک درجہ عورتوں پر فضیلت حاصل ہے)

اسی طرح بہت سی احادیث مردوں کو اپنی بیویوں سے حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آنے کی ہدایت کرتی ہیں:

(i)۔ تم میں سے بہترین وہ ہیں جو اپنی بیویوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں اور تم سے میں اپنی ازواج کے ساتھ اچھا ہوں [4]۔

(ii)۔ مسلمانوں میں سے کامل وہ ہے جو اچھے آداب رکھتا ہے اور اپنے خاندان پر شفقت کرتا ہے [5]۔

(iii)۔ آدمی کے اسلام لانے کے بعد اسے جو چیز سب سے بہتر فائدہ پہنچاتی ہے وہ اس کی خوبصورت بیوی ہے۔ جب بھی وہ اس کی طرف نظر کرتا ہے وہ اسے خوش کرتی ہے۔ جب وہ اسے حکم دیتا ہے

---

[1]۔ سورۃ البقرہ: آیت: 187

[2]۔ سورۃ النساء: آیت: 19

[3]۔ سورۃ البقرہ: آیت: 228

[4]۔ جامع ترمذی۔ رقم: 3895

[5]۔ جامع ترمذی۔ رقم: 3252

وہ اس کی اطاعت کرتی ہے۔اس کے گھر پر نہ ہونے کی صورت میں اس کے مال اور اپنی جان کی حفاظت کرتی ہے[1]۔

(iv)۔ اپنی بیویوں کے حقوق پورے کرنے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قابلِ احترام مخلوق ہیں۔خبردار رہو کہ انہیں غذا، لباس اور دیگر ضروریات پوری کرنا تمہاری ذمہ داری ہے[2]۔

اسلام شادی کے ادارہ کو بے حد اہمیت دیتا ہے اور اپنے پیرکاروں کی اپنی پسند کی شادی کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔مسلمان مرد اور عورت بلوغت کو پہنچنے کے بعد نکاح کا معاہدہ کر سکتے ہیں۔تاہم مسلمانوں کے لئے شادی اس صورت میں لازمی نہیں ہے اگر وہ شادی کی ذمہ داریاں پوری کرنے کی سکت نہ رکھتے ہوں۔

وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ[3]

(تم میں سے جو لوگ غیر شادی شدہ ہوں اور تمہارے لونڈی اور غلاموں میں سے جو صالح ہوں ان کے نکاح کر دو)

اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ دنیا میں بہترین چیز ایک اچھی عورت ہے[4]۔آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آگاہ رہو! تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحت کے بارے میں جواب دہ ہے۔پس وہ امیر جو لوگوں پر نگہبان بنایا گیا ہے (روز قیامت) اس سے لوگوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔مرد اپنے گھر والوں کا نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا۔عورت اپنے شوہر کے مکان اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے اور اس سے ان کے بارے میں سوال ہوگا۔خادم اپنے آقا کے مال کا نگہبان ہے اور تم میں سے ہر شخص اپنے ماتحت کے بارے میں جواب دہ ہے[5]۔

ذرا تصور میں لائیے کہ حضور نبی کریم ﷺ اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کیسا

۱۔کنز العمال۔جلد ہشتم: رقم:4672

۲۔صحیح مسلم

۳۔سورۃ النور: آیت:32

۴۔مشکوٰۃ شریف۔جلد سوم: رقم:308

۵۔سنن ابوداؤد۔جلد دوم: رقم:1161

سلوک فرماتے تھے۔ آپ ﷺ ان کے گھر میں، دروازے پر دستک دیئے بغیر کبھی داخل نہیں ہوئے اور جب بھی وہ تشریف لاتیں تو آپ ﷺ ان کا خیر مقدم کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد آپ ﷺ اپنی زندگی میں ان کی سہیلیوں کو عید پر تحفے بھیجتے رہے[1]۔ اس سے زیادہ اپنی بیوی کی محبت اور احترام کیا ہوسکتا ہے۔

(13)۔ ہم اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے امتی ہیں لیکن ہم نے خواتین سے متعلق بہت پست رائے قائم کررکھی ہے اور ان سے توہین آمیز اور رسوا کن رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ہر لمحے کہتے ہیں کہ عورت جوتی برابر ہے۔ عورت فتنہ ہے۔ اس ضمن میں ہم نے بہت ایسی روایات کا سہارا لیا ہے جو جرح وتعدیل[2] کے اصولوں پر پورا نہیں اترتیں۔ بعض احکام خاص حالات کے لیے تھے۔ ہم نے انہیں عمومی بنالیا ہے۔ جو قانون اور اصول تعبیر کے تمام مروجہ اصولوں کے خلاف ہے لیکن ہم اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔

ایک سے زائد شادیوں سے متعلق قرآن بہت واضح ہے:

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ○ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا[3]

(یتیموں کو ان کا مال دے دو۔ ان کے اچھے مال سے اپنا برا مال تبدیل نہ کرو۔ ان کے مال میں اپنا مال ملا کر مت کھاؤ۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اگر تمہیں ڈر ہے کہ تم یتیموں کے معاملے میں انصاف نہیں کرسکو گے تو (ان سے نکاح نہ کرو) ان سے نکاح کرو جو تمہیں پسند آئیں (ان کے علاوہ دوسری) عورتوں سے دو دو، تین تین

---

[1]۔ دیکھیے جامع ترمذی۔ جلد اول: رقم: 2106

[2]۔ جرح سے مراد حدیث کے راویوں کے وہ عیوب بیان کرنا جن کی وجہ سے ان کی عدالت ساقط ہوجاتی ہے اور ان کی روایت کردہ حدیث رد کردی جاتی ہے اور تعدیل سے مراد حدیث کے راوی کے عادل ہونے کے بارے میں بتلانا اور حکم لگانا کہ وہ عادل یا ضابط ہے۔

[3]۔ سورۃ النساء: آیت: 2-3

اور چار چار اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم ان میں عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی
۔۔۔۔۔اس سے تم ایک کی طرف جھکنے سے بچو گے)

حضرت سعید بن جبیرؒ[1] (d. 714)، قتادہؒ[2] اور دیگر تابعینؒ کی رائے یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح تم یتیموں کے حقوق کے بارے میں حوف ذدہ ہو۔ اس طرح عورتوں کے حقوق کے بارے میں بھی فکر مند ہونا چاہیے۔

(i)۔ اس سے ثابت ہوا کہ اصل مسئلہ یتیم بچیوں کے حقوق کا بیان ہو رہا تھا۔ ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے ان سے شادی کے نام پر ظلم کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

(ii)۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اگر تم انصاف کر سکو۔ یہ آیت تعدد ازواج (polygamy) کے جواز کو عدل (justice) کی شرط سے مشروط (conditional) کرتی ہے۔ جو شخص عدل کی شرط پوری نہیں کرتا مگر ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کے جواز سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دغا بازی کرتا ہے۔ حکومت اسلامی کی عدالتوں کو حق حاصل ہے کہ جس بیوی یا جن بیویوں کے ساتھ وہ انصاف نہ کر رہا ہو ان کی دادرسی کریں[3]۔

(iii)۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ واضح کیا جا رہا ہے کہ ایک ہی بہتر ہے تا کہ تم ایک کی طرف جھک کر برائی کے مرتکب ہو گے اور یہ انصاف کے خلاف ہو گا۔

ہم نے اس آیت کو اس کے تناظر سے باہر نکال لیا اور انصاف کی شرط کو بھی بھول گئے۔ شادی کو عیاشی کا ذریعہ بنا لیا۔ یہ حکم نہیں تھا جو اہل اسلام پر فرض تھا بلکہ ایک خاص تناظر میں ایک مشروط رخصت تھی۔ یہ عمومی حکم نہیں تھا بلکہ خاص حالات میں ایک گنجائش تھی۔

آیئے حضور نبی کریم ﷺ کی سیرت کو ملاحظہ کریں (آپ ﷺ کی اپنی شادیوں کو ہم یہاں موضوع نہیں بنا سکتے۔ اس لیے کہ قرآن پاک میں واضح ہے کہ یہ رعایت صرف آپ ﷺ کے لیے تھی) بخاری شریف نے حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث نقل کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں

---

[1]۔ حضرت سعید بن جبیرؒ (665ء-714ء) معروف تابعی، مفسر، محدث اور فقیہ تھے۔ ان کی فقہی آرا کو اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کے ہاں انتہائی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

[2]۔ حضرت قتادہ بن دعامہؒ پیدائشی نابینا معروف تابعی مفسر، محدث عصر اور فقیہ تھے۔

[3]۔ تفہیم القرآن از مولانا مودودیؒ بحوالہ سورۃ النساء: آیت: 2-3

نے منبر پر حضور نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے سنا۔ آپ ﷺ ارشاد فرماتے تھے کہ ہشام بن مغیرہ کی اولاد میں سے ایک نے مجھ سے یہ اجازت مانگی کہ وہ اپنی لڑکی کا نکاح علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب سے کردیں۔ تو میں تو اجازت نہیں دیتا۔ ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ کبھی اجازت نہیں دیتا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ابوطالب کا بیٹا میری بچی کو طلاق دے دے اور ان کی بیٹی سے نکاح کرلے۔ بات یہ ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا میرا ایک ٹکڑا ہے جو اس کو برا لگے مجھے بھی لگتا ہے۔ جس چیز سے اس کو تکلیف ہو، مجھے بھی تکلیف ہوتی ہے[1]۔

سوال یہ ہے کہ کیا حضور نبی کریم ﷺ کو صرف اپنی بیٹی کے جذبات کی فکر تھی یا آپ ﷺ انسانی فطرت کے بارے میں ارشاد فرمارہے تھے۔ میرا ایمان ہے کہ نبی علیہ السلام صرف اپنی بیٹی کے لیے کوئی حکم جاری نہیں کرسکتا وگرنہ آپ ﷺ یہ نہ فرماتے کہ میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا اگر وہ چوری کرتیں۔ آپ ﷺ کی اس حدیث پاک سے یہ بات واضح ہے کہ دوسری شادی عمومی معاملہ نہیں ہے۔ یہ دولت کے اظہار یا ہوس رانی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اصولی اور انسانی مسئلہ ہے۔

(14)۔ اسلامی تہذیب کے سنہری عہد میں عورتیں مسلم معاشرے کی سماجی اور ثقافتی زندگی میں وسیع اور موثر طور پر حصہ لیتی تھیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کی زوجہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اپنی نوعمری کے دور میں ہی ایک متبحر عالمہ تھیں۔ بڑے بڑے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فقہ، تاریخ اور ادب سے متعلقہ سوالات پر آپ رضی اللہ عنہا سے مشورہ لینے حاضر ہوا کرتے تھے۔ حضرت اُمِ درداء رضی اللہ عنہا یروشلم مسجد میں عمومی تقریر کرنے آتی تھیں۔ جہاں اموی امیر سلیمان بن عبدالملک (d. 717)[2] بھی شریک مجلس ہوتے تھے۔

فقہ کے چار بڑے مکاتب میں سے ایک مکتبۂ فکر کے بانی حضرت امام شافعیؒ (d. 820) قاہرہ میں حضرت نفیسہؒ کے شاگرد تھے۔ حضرت امام ابن حجر عسقلانیؒ[3] (d. 1449) نے اپنے 50 ساتھی

---

[1]۔ صحیح بخاری۔ جلد سوم: رقم: 218

[2]۔ سلیمان بن عبدالملک (674ء-717ء) ایک اموی خلیفہ تھا جو 715ء سے 717ء تک برسرِاقتدار رہا۔ سلیمان، عبدالملک بن مروان کا بیٹا اور اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کا چھوٹا بھائی تھا۔

[3]۔ حافظ احمد بن حجر عسقلانیؒ (1372-1449) ایک نامور شافعی فقیہ اور محدث تھے۔ علم حدیث میں آپؒ سند تسلیم کیے جاتے ہیں۔ آپؒ کی مشہور تصانیف: الاصابہ فی تمییز الصحابہ، فتح الباری شرح صحیح البخاری، تہذیب التہذیب، الدُّرر الکامنہ، التقریب التہذیب، المطالب العالیہ بزوائد المسانید الثمانیہ اور بلوغ المرام من ادلۃ الاحکام ہیں۔

شاگردوں کے ہمراہ مکتب عائشہ الحنبلیہ میں تربیت پائی۔ آپؒ نے اپنی سوانح حیات میں پندرہ سو (1,500) سے زائد خواتین کا ذکر کرتے ہیں جو عالمہ اور فقہاء تھیں۔ امام سخاوی[1] (d. 1497) نے نویں صدی عیسوی کی ذہین و دانشور خواتین کے لئے ایک پوری جلد وقف کی ہے جن میں سے متعدد 'فیض[2]' (Fez) سے تعلق رکھتی تھیں۔

حضرت امام جلال الدین سیوطیؒ (d. 1505) نے اپنی 'نزہۂ' میں سینتیس (37) مسلم شاعرات کی سوانح قلم بند کی ہے۔ امام ابن عساکرؒ[3] (d. 1175) 81 خواتین اساتذہ کے شاگرد تھے۔ اسلام کے چند بڑے علماء ابن خلکانؒ[4] (d. 1282)، خطیب بغدادیؒ[5] (d. 1071) اور حضرت امام زمخشری[6] (d. 1144) نے اپنے علم کا بیشتر حصہ اپنی ہم عصر خواتین سے پایا۔ حضرت ابن مزرعہ رضی اللہ عنہ کی پوتی حضرت رقیہؒ اپنے دور میں حدیث کی نامور راویۂ حدیث تھیں۔ انہیں مصر شام اور مدینہ منورہ میں بڑی تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی طرح بہت سی دیگر خواتین کو دینی علوم اور ادب میں بڑا مقام حاصل تھا۔ جن میں دمشق کی عائشہ قواعد عربی زبردست مہارت رکھتی تھیں اور خطیبہ بھی تھیں اور یروشلم کی عائشہ راویۂ حدیث اور استاد تھیں۔

(15)۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین اسلامی فوج میں بھی شامل رہیں۔ نہ صرف نرسوں کے طور پر

---

[1]۔ حضرت شمس الدین محمد بن عبدالرحمان سخاویؒ (1428۔1497) ایک شافعی عالم، محدث اور مؤرخ تھے۔

[2]۔ طربوش یا فیض (Fez) مراکش کا ایک شہر ہے جو 1927ء سے پہلے تک سلطنت مراکش کا دارالحکومت بھی تھا۔

[3]۔ حافظ ابوالقاسم علی بن ابی محمد الحسن المعروف ابن عساکرؒ (1106ء-1175ء) دمشق (شام) کے ایک بلند پایہ محدث اور مورخ تھے۔ آپؒ نے دمشق کی تاریخ پر ایک ضخیم اور مفصل کتاب لکھی التاریخ الکبیر الدمشق کے نام سے لکھی جو 80 جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو تاریخ ابن عساکر کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔

[4]۔ شمس الدین ابن خلکان بن یحییٰ بن خالد برمکی المعروف ابن خلکانؒ (1211ء-1282ء) ایک نامور مورخ، فقیہ اور عالم تھے۔ آپؒ کی وجہ شہرت تصنیف وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان ہے جو تاریخ ابن خلکان نے نام سے پہچانی جاتی ہے۔

[5]۔ احمد بن علی خطیب بغدادیؒ (1002ء-1071ء) تاریخ عالم کے ایک نامور مفکر اور مورخ تھے۔ عام طور پر انہیں خطیب بغدادیؒ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد 60 ہے تاہم تاریخ بغداد نامی کتاب کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہے۔

[6]۔ علامہ ابوالقاسم محمود بن عمر بن محمد زمخشریؒ (1075ء-1144ء) ایک ممتاز عالم اور مفسر تھے جو تفسیر کشاف کے مولف ہیں۔ انہیں بجا طور پر بحر العلوم کہا جاتا ہے۔

بلکہ بطور محارب (جنگجو) بھی دادِ شجاعت دیتی رہیں۔ مؤرخ ابن اثیر[۱] (d. 1233) نے ایک خاتون ہیرو صفیہ کی مثال دی ہے۔ جنگ یرموک میں حضرت اسما بنت یزید رضی اللہ عنہا نے تنِ تنہا دشمن کے نو (9) سپاہیوں کو قتل کر دیا تھا۔ غزالہ نامی خاتون کی بہادری ایک ضرب المثل بن گئی جس کے فوجی دستے نے الحجاج کی اموی فوج کے چھکے چھڑا دیئے اور اسے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ فلسطین میں ہونے والی صلیبی جنگوں میں متعدد خواتین نے اپنے شوہروں کے شانہ بشانہ کئی معرکوں میں حصہ لیا۔

شجرۃُ الدُّر (d. 1257) ایوبی سلطان الصالح ایوب کی بیوہ تھی جس نے مصر کے خلاف ساتویں صلیبی جنگ (1249ء-1250ء) میں شوہر کی وفات کے بعد فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ اس نے 2 مئی 1250ء کو سلطانۂ مصر بن کر ایوبی دور کا خاتمہ اور مملوکوں کا آغاز کر دیا۔ ہندوستان میں رضیہ سلطانہ 1236ء سے لے کر 1240ء تک سلطانۂ دہلی رہی۔ اس دور کی دیگر شہزادیوں کی طرح اسے بھی فوج کی قیادت کرنے اور ضرورت پڑنے پر بادشاہت چلانے کی تربیت دی گئی تھی۔ چودھویں صدی عیسوی میں ترکان خیاتون خراسان میں تخت نشین رہی۔ اسی وقت مشہور و معروف تنزو نے فارس اور عراق پر حکمرانی کی۔ اسی صدی میں ملکہ دلشاد عراقی صوبوں میں وسیع اختیارات کی حامل رہی۔

بارہویں صدی ہجری کے ایک اندلسی مؤرخ ابن جبیر[۲] (d. 1217) نے لکھا ہے کہ علمی بحثوں میں عورتیں بھی حصہ لیا کرتی تھیں۔ احمد بن محمد المقری[۳] (d. 1632) نے اپنی کتاب نفح الطب میں عورتوں کی شاعری پر طویل باب لکھا ہے۔ اس نے پچیس شاعرات کا ذکر کیا ہے جنھوں نے فنِ بلاغت میں اعلیٰ مقام حاصل کیا تھا۔

غرناطہ[۴] عورتوں کے ادبی کارناموں کے حوالے سے بھی بہت مشہور شہر تھا۔ ادب اور فن میں

۱۔ عزالدین ابوالحسن علی بن محمد بن عبدالکریم الجزری المعروف بہ ابن اثیر (1160ء-1233ء) تاریخ اسلام کے مشہور تاریخ دان ہیں۔ مورخین میں ابن جریر طبری کے بعد ابن اثیر کا نام سب سے نمایاں ہے۔

۲۔ ابن جبیر (1145ء-1217ء) اندلس کے ایک نامور سیاح، جغرافیہ دان اور شاعر تھے۔

۳۔ ابوالعباس احمد ابن محمد المقری (1578ء-1632ء) ایک نامور مسلمان مورخ تھا۔

۴۔ غرناطہ (Granada)، ہسپانیہ (Spain) کے جنوب میں ایک تاریخی شہر کا نام ہے۔ اسکی وجہ شہرت یہاں مسلمانوں کے دور کا ایک محل الحمرا ہے۔ 1492 تک غرناطہ سپین میں آخری اسلامی ریاست کا مرکز تھا۔

عورتوں کی ذہانت کی لہلہاتی فصلیں عورتوں کو حاصل معاشرتی آزادی کی مرہون منت تھیں۔ ان میں بعض اپنے دور کی مشہور خطاط تھیں۔ مثلاً لبنیٰ اور فاطمہ (جو الحکم ثانی کی سیکرٹری تھیں) المراکشی کی روایت ہے کہ صرف قرطبہ کے ضلع میں ایک سوستر (170) خوش نویس عورتیں تھیں۔ اس دور میں مشینی طباعت نہیں تھی اس لئے فن خطاطی بہت اہم کردار ادا کرتا تھا۔

(16)۔ اس کے برعکس عہد حاضر کے مسلمانوں نے خواتین کو ہمارے معاشرے سے خارج کر رکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عورتوں کو باہر کی دنیا سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔ یہ بہت بڑی بے انصافی ہے کہ مسلمانوں نے عورتوں کو باجماعت ادائیگی نماز اور صلوٰۃ الجمعہ میں شرکت سے محروم کر رکھا ہے۔ انہیں نماز عید میں بھی شرکت کا موقع نہیں دیا جاتا۔ ہم نے ایران، ترکی اور مغرب میں بھی 'حجاب' پہنے خواتین کو کام کرتے دیکھا ہے۔ وہ شرم و حیا اور وقار کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ کسی کو بُری نیت سے ان کو دیکھنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ تاہم بعض مسلمان ممالک میں عورتوں اور مردوں کو کلی طور پر الگ الگ رہنا پڑتا ہے۔ یہ بڑی ناانصافی ہے۔ ہم انہیں محفوظ مقامات پر بھی کام کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ حالانکہ ایسے مسائل کا بہت آسان حل ہے۔ مثال کے طور پر پرائمری سطح پر بچوں کو پڑھانے کے لئے خواتین بھرتی کی جائیں تو وہ اپنے پُرشفقت انداز میں بچوں کی بہتر تعلیم و تربیت کر سکتی ہیں۔ میری سوچی سمجھی رائے ہے کہ موجودہ دور میں جب کہ انسان پوری طرح بیدار ہے اور معاملات کا شعور بڑھ رہا ہے۔ تعلیم عام ہو چکی ہے اور حقوق نسواں کی تحریک ہر روز نئی قوت حاصل کر رہی ہے۔ ہمیں اپنا طرز عمل بدل لینا چاہیے۔ اس لیے کہ عورتوں کے بارے میں ہماری موجودہ سوچ اور رویہ غیر معقول ہے۔

سترہواں باب

اقلیتوں کے حقوق

وَاَوۡفُوۡا بِالۡعَهۡدِ‌ۚ اِنَّ الۡعَهۡدَ كَانَ مَسۡـُٔوۡلًا [1]
(اپنے عہد کی پابندی کرو! بے شک عہد کے بارے میں تمہیں جوابدہی کرنا ہوگی)

قدیم اسلامی ادب میں ایک مسلم ریاست میں رہنے والے غیر مسلموں کو ذمی کہا جاتا تھا۔ لفظ ذمہ کے معنی ایک میثاق یا ایک معاہدہ کے ہیں۔ جس کے تحت اہل ایمان ایک ذمی کا احترام کرنے کا عہد کرتا ہے جس کی خلاف ورزی پر ذم (الزام) عائد ہوجاتا ہے [2]۔ اس لفظ کے دوسرے معنی تحفظ کی ضمانت کے ہیں [3]۔ قانونی طور پر یہ اصطلاح چند حقوق کا حوالہ دیتی ہے جن کا تحفظ ریاست کی ذمہ داری ہے [4]۔ لہٰذا جن لوگوں کے حقوق کا ذمہ لیا جاتا ہے انہیں 'ذمی' یا زیر تحفظ رعایا کہا جاتا ہے۔

(1)۔ مسلمانوں کو غیر مسلم اقلیتوں کے محافظ بننا ہے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے کیونکہ انہیں قرآن مجید میں ایک عمومی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے انصاف کو عالمگیر بنائیں۔ اس دائرے میں غیر مسلم بھی آجاتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِيۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِكُمۡ اَوِ الۡوَالِدَيۡنِ وَالۡاَقۡرَبِيۡنَ‌ ۚ اِنۡ يَّكُنۡ غَنِيًّا اَوۡ فَقِيۡرًا فَاللّٰهُ اَوۡلٰى بِهِمَا‌ فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰٓى اَنۡ تَعۡدِلُوۡا ۚ وَاِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا [5]

(اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ ہی کے لیے عدل وانصاف پر مضبوطی کے ساتھ گواہی دینے والے ہوجاؤ۔ چاہے وہ تمہارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ کے یا رشتہ داروں، عزیزوں کے وہ امیر ہو یا غریب۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کا زیادہ خیر خواہ ہے۔ تم خواہش کے پیچھے پڑ کر انصاف نہ چھوڑو اور اگر تم نے غلط بیانی یا پہلو

---

[1]۔ سورۃ الاسرا: آیت:34

[2]۔ War And Peace in the Law of Islam by Majid Khadduri, p. 198.

[3]۔ غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی از شیخ یوسف عبداللہ القرضاویؒ۔ صفحہ نمبر 7

[4]۔ Islamic Law, Its Scope and Equity by Said Ramadan, p. 67.

[5]۔ سورۃ النساء: آیت:135

تھی کی تو جان لو جو کچھ تم کرو گے اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ[1]

(اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی خاطر پوری طرح قائم رہنے والے، انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ۔ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل نہ کرو۔ عدل کرو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو! بیشک اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے جو تم کرتے ہو)

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ[2]

(اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ[3]

(اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ ہی کے لیے عدل و انصاف پر مضبوطی کے ساتھ گواہی دینے والے ہو جاؤ۔ چاہے وہ تمہارے اپنے خلاف ہو)

قرآن مجید کی یہ آیت ایک واقعہ سے متعلق ہے جس میں مدینہ منورہ میں رہنے والا ایک یہودی ملوث تھا۔ ایک مسلمان شخص نے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کی ڈھال چرائی اور مدینہ طیبہ ہی کے ایک یہودی کے گھر میں رکھوا دی اور اس پر چوری کا جھوٹا الزام لگا دیا۔ جب معاملہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں

۱۔ سورۃ المائدہ: آیت:8

۲۔ سورۃ الممتحنہ: آیت:8

۳۔ سورۃ النساء: آیت:135

لا یا گیا تو آپ ﷺ نے یہودی کو صاف بری کر دیا۔ یہ واقعہ ایسے وقت پر ہوا تھا جب مسلمان مدینہ منورہ کے یہودیوں سے وسیع پیمانے پر برسرِ پیکار تھے۔ باالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ نے مسلم معاشرے کو ایک سبق پڑھا دیا کہ انصاف کرتے وقت یہ نہ دیکھو کہ فریقین کس عقیدے یا مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ باوجود اس حقیقت کے، کہ اس وقت یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان عداوت چل رہی تھی اور مسلمانوں کو انصاف کا دامن نہ چھوڑنے کی تلقین کی گئی تھی۔

(2)۔ غیر مسلم ایک میثاق کے تحت مسلمانوں کی زیر حفاظت ہوتے ہیں جنہیں اصطلاحاً ذمی کہا جاتا ہے۔ اس کے لئے قرآن مجید میں یہ آیت آئی ہے:

وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمۡ وَلَا تَنۡقُضُوا الۡاَيۡمَانَ بَعۡدَ تَوۡكِيۡدِهَا وَقَدۡ جَعَلۡتُمُ اللّٰهَ عَلَيۡكُمۡ كَفِيۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا تَفۡعَلُوۡنَ[۱]

(اور جب تم نے کوئی عہد کیا ہو تو اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرو اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد نہ توڑو جبکہ تم اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا چکے ہو۔ تم جو کچھ کرتے ہو یقیناً اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے)

کہا جاتا ہے کہ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسی آیت کے پیشِ نظر کہا: میں اپنے جانشینوں کو تاکید کرتا ہوں کہ وہ ان غیر مسلموں کی اچھی طرح دیکھ بھال کریں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی حضرت محمد ﷺ کے زیر تحفظ ہیں اور اس طرح کہ وہ ان سے رابطے میں رہیں۔ ان کی طرف سے لڑیں اور ان پر ایسا بوجھ نہ ڈالیں جو ان کی استطاعت سے زیادہ ہو[۲]۔

قرآن پاک واضح طور پر اور تاکیداً مذہبی رواداری پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ مذہب کے بارے میں کسی زور زبردستی سے کام نہ لیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں مقیم غیر مسلموں اور مسلم ریاست میں سے گزرنے والوں کے تحفظ اور اس کے ضمیر کی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے[۳]۔ اس مسئلے پر قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ ۙ[۴]

۱۔ سورۃ النحل: آیت: 91

۲۔ صحیح بخاری۔ رقم: 3052

۳_ Muslim Conduct of State by Dr. Muhammad Hamidullah, para. 412

۴۔ سورۃ البقرہ: آیت: 256

(مذہب کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے)
اس نقطے کی قرآن مجید نے مزید وضاحت یوں کی ہے:
وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ[1]
(اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے)

(3)۔ اسلامی تہذیب کی اہم ترین خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ذمیوں کو عدالتی، معاشرتی اور ثقافتی خودمختاری دیتی ہے۔ اسلامی قانون کے تحت رہتے ہوئے عدالتی خودمختاری کے جزو کے طور پر ہر کسی پر اسلامی قانون مسلط نہیں کیا جائے گا۔ اسلام ہر گروہ (یہودی، مسیحی، مجوسی وغیرہ) کو اجازت دیتا ہے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ وہ اپنے ٹربیونلز قائم کریں جن کی صدارت ان کے اپنے گروپوں کے جج کریں۔ انسانی معاملات کے تمام شعبوں پر اپنے گروپ کے قوانین نافذ کریں[2]۔ اس طرح اس عدالتی خودمختاری کا مطمحِ نظر نہ صرف انفرادی اور پرائیویٹ معاملات (جن میں ذاتی حیثیت کا استقرار ہو) ہوں بلکہ زندگی کے تمام معاملات، سول، تعزیراتی، مذہبی اور دیگر امور شامل ہوں۔ اس خودمختاری کو 'میثاق مدینہ' (Charter of Medina) میں پوری طرح تحفظ دیا گیا ہے۔ میثاق مدینہ کی درج ذیل شقوں کا اعادہ کرنا مفید مطلب رہے گا:

(i)۔ ایسے یہودی جو مومنوں کی پیروی کریں گے ان کی مدد کی جائے گی اور ان سے مساویانہ (معاشرتی قانونی اور معاشی) سلوک ہوگا جیسا کہ ریاست کے دیگر وفادار شہریوں سے وعدہ ہے۔

(ii)۔ کسی یہودی سے محض اس کے یہودی ہونے کی بنا پر کوئی زیادتی نہیں کی جائے گی۔

(iii)۔ ہمارے پیروکار یہودیوں کے دشمنوں کی کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔

(iv)۔ بنی عوف کے یہودیوں کے ساتھ اہل ایمان کے اتحادیوں کا سا سلوک کیا جائے گا۔ یہودی اپنا مذہب رکھتے ہیں۔ اس کا اطلاق ان کے آزاد کردہ مردوں پر ہوگا۔ استثنائی سلوک صرف ان سے ہوگا جو انصاف کے خلاف اقدام کریں گے اور ارتکابِ گناہ کریں گے۔ ایسا کرنے والے

۱۔ سورۃ العنکبوت: آیت:46

۲۔ Introduction To Islam, by, Dr. Muhammad Hamidullah, p. 45.

خود اپنا اور اپنے خاندانوں کا نقصان کریں گے۔

(v)۔ یہودیوں کے اتحادیوں سے وہی سلوک کیا جائے گا جو یہودیوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

(vi)۔ یہودیوں کو اپنے (دورانِ جنگ کے) اخراجات خود برداشت کرنا ہوں گے اور مسلمان اپنے اخراجات برداشت کریں گے۔

(vii)۔ اگر کوئی اس معاہدے کے کسی فریق پر حملہ کرتا ہے تو دوسرے اس کی مدد کو آئیں گے۔

(viii)۔ فریقین معاہدہ کو لازماً باہمی مشاورت سے کوئی قدم اٹھانا ہوگا۔

(ix)۔ مدینہ منورہ صرف ان لوگوں کے لیے پناہ گاہ ہوگا جو اس معاہدے کے تحت ہوں گے[1]۔

(4)۔ اسلام غیر مسلموں کے اس حق کو واضح طور پر تسلیم کرتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی اور مذہبی حقوق کا تحفظ کریں۔ ایک مسلمان شوہر کی عیسائی یا یہودی بیوی کو اس امر کی آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب کا تحفظ کرے اور اس پر عمل کرے یعنی وہ اپنے کلیسا (Church) یا کنیسہ (Synagogue) جاسکتی ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمانوں اور مفتوحہ غیر مسلم اقلیتوں کے مابین معاہدوں میں ایک شرط یہ بھی رہی ہے کہ اسلامی حکومت اقلیتوں کی ضروریاتِ زندگی اور تحفظِ جان و مال کی ذمہ دار ہوگی۔ اہلیانِ حیرہ[2] کے ساتھ معاہدۂ امن کی ایک شق یہ تھی: جو غیر مسلم ضعیف ہو جائے اور کام کاج کے قابل نہ رہے یا کسی قدرتی آفت کی وجہ سے معذور ہو جائے یا جو پہلے بہت ثروت مند تھا کسی ناخوشگوار واقعہ کے باعث کنگال ہو جائے۔ حکومت ایسے افراد سے ٹیکس وصول نہیں کرے گی۔ بلکہ ایسے مردوں اور ان کے خاندانوں کو سرکاری خزانے سے امداد دی جائے گی[3]۔

قرآن مجید اعلان کرتا ہے:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

۱۔ http://www.constitution.org/cons/medina/charter.htm

۲۔ حیرہ قدیم عراق کا ایک شہر تھا جو موجودہ کوفہ سے تین کلومیٹر جنوب میں دریائے فرات کے مغربی کنارے پر واقع تھا۔ زمانہ حال میں اس شہر کے صرف کھنڈرات ہی باقی رہ گئے ہیں۔

۳۔ بدائیۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد از ابن رشد۔ صفحہ نمبر 310

الْمُقْسِطِيْنَ [1]

(اللہ تعالیٰ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

اس آیت مبارکہ میں نہ صرف تحفظ شامل ہے بلکہ یہ ان سے شفقت اور خلوص کا برتاؤ کرنے کا بھی مشورہ دیتی ہے کیونکہ اسلام مجموعی طور پر بنی نوع انسان کی وحدت کو تقدس عطا کرتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا [2]

(اے بنی نوع انسان! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو)

اسی طرح قرآن مجید عالمگیر مذہبی اتحاد کو تقدس کا درجہ دیتا ہے اور اس طرح تعصب کا خاتمہ کرنے کے لیے لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ تمام آسمانی مذاہب کو برحق سمجھیں:

قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَاۤ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ [3]

(مسلمانو! کہو کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اُس ہدایت پر جو ہماری طرف نازل ہوئی ہے اور جو ابراہیم (علیہ السلام)، اسماعیل (علیہ السلام)، اسحاق (علیہ السلام)، یعقوب (علیہ السلام) اور اولادِ یعقوب (علیہ السلام) کی طرف نازل ہوئی تھی اور جو موسیٰ (علیہ السلام) و عیسیٰ (علیہ السلام) اور دوسرے تمام پیغمبروں (علیہم السلام) کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ عزوجل کے مسلم ہیں)

۱۔ سورۃ الممتحنہ: آیت: 8

۲۔ سورۃ الحجرات: آیت: 13

۳۔ سورۃ البقرہ: آیت: 136

پھر قرآن مجید ایک قدم اور آگے جا کر خصوصی نوعیت کی مذہبی وحدت کو بلا کسی کی تحقیر یا عناد کے تقدس عطا کرتا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ[1]

(مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو! امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا)

(5)۔ میثاق مدینہ کے افتتاحی پیراگراف میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک ہی امت سمجھا گیا ہے۔ یہ دستاویز حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے ہے جو اہل ایمان قریش کے مسلموں اور مدینہ منورہ کے مسلموں اور ان کے تعلقات کو منظم کر رہی ہے جنہوں نے ان کی پیروی کی اور ان کے ساتھ مل کر مساعی کیں۔ یہ ایک قوم کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ ایک امت ہیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیر حفاظت لوگوں کے بارے میں از خود بے حد محتاط و روادار تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص ایک بھی زیر حفاظت شخص (ذمی) کو قتل کرتا ہے وہ جنت کی خوشبو تک نہ سونگھ سکے گا[2]۔

(6)۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے واقعات میں سے چند مثالیں درج ذیل ہیں: نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد فتح مکہ سے ذرا پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کے لئے مدینہ پہنچا۔ انہیں مسجد نبوی کے احاطے میں خیمے نصب کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ اگرچہ انہیں خیمے مسجد کے صحن سے باہر نصب کرنے کے لئے کہا جا سکتا تھا کیونکہ وہ عیسائی تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں خیمے احاطے کے اندر گاڑنے کی اجازت دے دی[3]۔ ان کو گھوڑے بھی قریب ہی باندھنے اور چارہ کھلانے کی اجازت مل گئی۔ نجران سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کے لئے آنے والے عیسائیوں کا وفد 60 گھڑسواروں پر مشتمل تھا۔ ان میں چودہ ان کے سردار تھے جنہیں فیصلہ کرنا تھا۔ یہ مدینہ منورہ میں آ کر مسجد نبوی میں داخل ہوئے۔ انہوں نے رنگارنگ لباس اور چغے زیب تن کر رکھے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت نماز عصر پڑھ کر فارغ

---

[1]۔ سورۃ الحجرات: آیت: 10

[2]۔ صحیح بخاری۔ رقم: 3166

[3]۔ تفسیر قرطبی از امام قرطبیؒ بحوالہ سورۃ انعام: آیت: 61

ہو چکے تھے۔ وفد کے ہمراہ اونٹوں کا کارواں تھا۔ ان کی قیادت بنی الحارث بن کعب کر رہا تھا۔جن صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس وفد کو دیکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے ایسا وفد اس کے بعد کبھی نہیں دیکھا۔ جب ان کی عبادت کا وقت ہو گیا تو انہوں نے وہیں مسجد نبوی میں عبادت کرنا شروع کر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ارشاد فرمایا کہ انہیں عبادت کرنے دو اور وہ مشرق کی طرف منہ کر کے عبادت کر رہے تھے[۱]۔

ہم بطور مسلمان حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پیروکار ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں جنہوں نے عیسائیوں کو اپنی مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دے دی جو کہ مسجد الحرام (بیت اللہ) کے بعد دوسری مقدس ترین مسجد ہے۔ کیا آج ہم عیسائیوں یا یہودیوں کو اپنی مسجد میں داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں؟ بعض لوگ یہ دلیل دے سکتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کی اجازت اس لئے دی کہ وہ آغاز اسلام تھا اور اس وقت مسلمان کمزور تھے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس وقت کمزور تھے؟ اگر کمزور تھے تو کیا یہ بات قابل فہم ہے کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اتنی فراخ دلی سے کیوں کام لیا؟ ایسا سمجھنا بالکل غلط ہے۔ اس وقت تک مسلمان جزیرہ نمائے عرب کا نصف حصہ فتح کر چکے تھے۔ نجران کے لوگ مسلمانوں سے کمزور تھے۔ ان کے ساتھ جو بھی سلوک کیا گیا وہ خالصتاً خوش اخلاقی، حسن معاشرت اور پُرخلوص رواداری کا مظہر تھا۔ یہ معاملہ اقدار کا تھا مصلحت اندیشی کا نہیں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سب انسانوں کے ساتھ ہمیشہ سے ایسا ہی سلوک فرماتے تھے۔

(7)۔ جب حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے نومبر 636ء میں چھ ماہ تک یروشلم کا محاصرہ کئے رکھا تو پیٹریاک سوفرونیئس[۲] (Sophronius, d. 638) اس شرط پر ہتھیار ڈالنے پر رضامند ہوا کہ وہ صرف خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے گیٹ کھولے گا۔ آپ رضی اللہ عنہ اپریل 637ء میں بذاتِ خود یروشلم پہنچے تا کہ شہر کی اطاعت کو قبول کریں۔ چنانچہ انہوں نے 638ء میں ان کے لئے 'منشورِ حقوق' جاری کیا۔ اس منشور میں آزادی، سلامتی اور آزادئ عقیدہ کے بنیادی اصولوں کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا جو کہ اسلام میں مرکزی اہمیت رکھتے ہیں:

۱۔ دیکھیے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم از شبلی نعمانی جلد دوم صفحہ نمبر 401

۲۔ سوفرونیئس (560ء-638ء) ایک عیسائی راہب تھا جو سوفرونیئس آف یروشلم کے نام سے معروف ہے۔ 637ء میں مسلم افواج کی یروشلم کی فتح کے وقت اس نے شرط رکھی کہ شہر کو صرف مسلمانوں کے خلیفہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا جائے گا۔ چنانچہ خلیفہ وقت نے یروشلم کا سفر کیا۔

'بسم اللہ الرحمان الرحیم۔ یہ پیغامِ سلامتی بندۂ خدا امیر المومنین عمر (رضی اللہ عنہ) کی جانب سے 'ایلیاۂ' (یروشلم) کے باشندوں کو دیا جار ہا ہے۔ وہ یہاں کے سب لوگوں کو خواہ وہ علیل ہیں یا صحت مند، ان کی جان و مال، ان کے کلیساؤں، صلیبوں اور لوازماتِ مذہب کی سلامتی کی ضمانت دیتا ہے۔ ان کے کلیساؤں کو نہ تو تبدیل کیا جائے گا اور نہ انہیں رہائش گاہیں بنایا جائے گا۔ نہ منہدم کیا جائے گا۔ نہ یہاں کے باشندوں اور نہ ان کی مملوکہ اشیاء و لوازم زندگی کو کوئی ضرر پہنچایا جائے گا اور نہ ہی ان کی کسی قسم کی اشیاء میں کوئی کمی کی جائے گی۔ ان کے مذہب و عقیدے سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی ان میں سے کسی ایک کو گزند پہنچائی جائے گی'۔

کیا مسلمان ممالک آج اپنے ہاں اقلیتوں سے ایسا سلوک کرتے ہیں؟ 'نہیں بالکل نہیں' غیر مسلموں کے ساتھ ہمارا سلوک نفرت انگیز ہے حتیٰ کہ ہم اپنے ساتھی مسلمانوں سے بھی عجیب سلوک کرتے ہیں۔ بعض اوقات دوسرے مسلمانوں پر غیر مسلم کا لیبل چسپاں کر دیتے ہیں۔ ان پر محض دباؤ ڈالنے کے لئے یا سنی سنائی گواہی اور اٹکل پچوؤں کی بنا پر ان کی زندگی کو اجیرن کر دیتے ہیں۔ میں اس سیاق و سباق میں دو مثالیں دوں گا۔

(8)۔ میں 1990ء میں عمر کوٹ (سندھ) میں تعینات تھا۔ ایک مذہبی گروہ نے جلسہ کرنا چاہا۔ مذاکرات ہوئے۔ شرائط طے پا گئیں۔ جلسہ ہوا تو تمام شرائط کو پامال کر دیا گیا۔ میں نے اس پر قانون کے مطابق کاروائی کی۔ کچھ علماء گرفتار ہوئے۔ میں خود جیل میں جا کر ان سے ملا۔ ان کے اچھے کھانے کا انتظام کیا۔ جائے نماز پیش کی۔ بے گناہ یا کم گناہگار فوراً رہا کر دیئے۔ چند روز کے بعد میرے خلاف پورے سندھ میں پوسٹر لگ گئے کہ میں قادیانی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا یہ ہوا کہ عمر کوٹ کے علماء نے اپنے خطبات میں اس کی تردید کی۔ اس لیے کہ وہ مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے۔ مقامی جامع مسجد کے خطیب اسلامی یونیورسٹی میں میرے شاگرد رہ چکے تھے۔ میرا سوال یہ ہے کہ کیا یہی اسلام ہے؟

دوسری مثال ایک اعلیٰ عہدے پر فائز سرکاری ملازم کی ہے جو بہت متقی و پرہیزگار اور صاحب علم شخص تھا۔ وہ دن کی پانچوں نمازیں با جماعت ادا کرتا تھا۔ اس کے سب بیٹے اور بیٹیاں اعلیٰ مذہبی تعلیم سے آراستہ تھیں۔ ساری اولاد اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ عملی مسلمان بھی تھی۔ اس خدا ترس ملازم کے سرکاری فرائض میں ایک سیاستدان کی بدعنوانیوں سے متعلق رپورٹ لکھنا بھی شامل تھا۔ اس پر

سیاستدان ناراض ہو گیا۔ چنانچہ اس سیاستدان نے 1970ء کے عشرے میں جیل میں ایک کتاب لکھی جس میں ذاتی بغض کی وجہ سے یہ بھی لکھ دیا کہ یہ سرکاری ملازم قادیانی فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بعد چند مذہبی جماعتیں اس کے پیچھے پڑ گئیں اور اسے قادیانی کہنا شروع کر دیا۔ یہ محض ایک الزام تھا جس کی کوئی ٹھوس شہادت نہیں تھی اور حقائق کے بھی منافی تھا۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس سے اس شخص پر کیا بیتی ہوگی اور معاشرے میں اس کی کیا عزت رہ گئی ہوگی۔ کیا اسلام ہمیں یہی سکھاتا ہے؟ کیا کسی زندگی کو کسی تحقیق یا گواہی کے بغیر اجیرن کر دینا درست ہوتا ہے؟

1990ء کے اوائل میں میں اس مذہبی جماعت کے چند بڑوں سے ملا۔ جنہوں نے اس افسر کے خلاف یہ الزام لگایا تھا۔ میں نے اس بے بنیاد الزام کے حوالے سے دکھی دل سے ان سے شکایت کی۔ اب ذرا ان کا جواب سنیے: انہوں نے مجھے کہا کہ میں اس افسر سے کہوں کہ وہ اس الزام کی تردید کر دے۔ میں نے کہا: 'اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم'۔ وہ یہ سن کر پریشان اور ہکا بکا رہ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے آپ کا یہ جواب سُن کر دلی صدمہ پہنچا ہے۔ میں نے ان سے مزید کہا کہ یہ آپ کا اخلاقی اور مذہبی فرض تھا کہ آپ اس پر اتنا سنگین الزام لگانے سے پہلے تحقیق کر لیتے۔ اس محض افواہ یا سنی سنائی بات پر یقین نہ کرتے۔ بہرصورت گواہی اور ثبوت کا بار ان کے کندھے پر ہے اور اس حقیقت کی بنا پر کہ یہ اپنے آپ کو عالمِ دین بھی کہتے ہیں۔ ان کا اصرار تھا کہ ملزم ٹھہرائے جانے والے شخص کو الزام کی تردید کے لئے ثبوت لانا چاہیے۔ میں نے انہیں قائل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر ڈالی کہ ہر شخص عزت اور وقار کا مستحق ہے۔ ہمیں لیبل لگا کر دوسرے کی زندگی خراب نہیں کرنی چاہیے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ میں نے انہیں فیض احمد فیض کا یہ شعر سنایا:

آتش فشاں ز قہر و ملامت زبانِ شیخ
از اشکِ تر ز دردِ غریباں ردائے تو[1]
(شیخ کی زبان سے غصہ و ملامت کی آگ نکل رہی ہے)
(جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کی چادر غریبوں کے درد میں روتے روتے تر ہو جاتی تھی)

۱۔ نعت؛ غبارِ ایام از فیض احمد فیض

اٹھارہواں باب

آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی[1]

بیشتر مسلمان کسی نہ کسی طرز کی غلامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہم طویل عرصہ سے اسی حالت میں رہ رہے ہیں۔ مسلم معاشرے کا روایتی مذہبی طبقہ ماضی بعید کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور ایک انچ بھی مستقبل کی طرف متحرک نہیں ہونا چاہتا۔ یہ طبقہ ایک زوال پذیر اور ذہنی لحاظ سے 'زمانہ سہوِ تاریخ' (anachronistic intellectual paradigm) میں رہ رہا ہے۔ مذہبی طبقے نے ذہنی غلامی کی وجہ سے اجتہاد، علمی تحقیق اور خود مختارانہ فکر کو ترک کر دیا ہے۔ دوسری جانب مسلم معاشرے کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ مغربی تہذیب کا ایک اندھا غلام ہے۔ اشرافیہ مغرب کی طرف منہ اٹھائے اسے واحد ماخذ علم و تہذیب کے طور پر دیکھتی ہے اور اس کی اندھی تقلید کرتے ہوئے اپنے مسلم ورثے کے حسین و نفیس پہلوؤں کو نظر انداز کر رہی ہے۔

بلاشبہ مغرب، افکار اور تحقیق کے میدان میں دنیا بھر کی قیادت کر رہا ہے۔ خاص طور پر سائنسی انقلاب (Scientific Revolution) کے ظہور سے اس کی ترقی کی رفتار تیز تر ہو چکی ہے۔ مغربی فلسفہ صحیح اور غلط کی تمیز کرنے کا ایک پیمانہ بن گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ جب مسلمان خوابِ گراں میں محوِ استراحت (fallen into deep slumber) تھا تو مغرب زیستِ انسانی کے ہر شعبے میں منازلِ ارتقا طے کر رہا تھا۔ اب وہ اپنے علم و ٹیکنالوجی کی ترقی بشمول اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر پوری دنیا پر غالب آیا ہوا ہے۔ نتیجتاً جدید مسلم دنیا کے شکست خوردہ اور آرام طلب ذہنوں نے مغرب کو مادی تعمیر و ترقی کے حتمی پیمانے کے طور پر قبول کر لیا ہے اور اس قبولیت کے ہمراہ اخلاقیات کے لئے بھی مغربی پیمانہ اختیار کر لیا گیا ہے۔ یہ طبقہ ایک انتہا پر ہے۔

جبکہ روایتی مذہبی طبقہ دوسری انتہا پر ہے۔ وہ افراد جو اس گروہ کی تشکیل کرتے ہیں ان کا عقیدہ

---

[1] خضرِ راہ؛ بانگِ درا از محمد اقبالؒ

ہے کہ مغرب سے جو چیز بھی آتی ہے 'کفر' اور گمراہی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مغربی فلسفے اور سائنس کا ماخذ مادیت ہے جو دہریت (Atheism)، عدمیت (Nihilism) اور سیکولرازم (Secularism) کو پروان چڑھاتی ہے۔ عصر حاضر کا روایتی مذہبی طبقہ مسیحی کلیسا کی تاریخ دوہرا رہا ہے جو کہ شروع کے زمانے میں نئے خیالات و افکار پیش کرنے والوں کو اذیت ناک سزائیں دیا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں گیلیلیو (Galileo, d. 1642) کا کیس بہت سبق آموز ہے۔

کاپرنیکس (Copernicus, d. 1543) نے جو کہ پولش ریاضی دان اور ماہر فلکیات تھا۔ اپنی وفات سے ذرا پہلے 'On the Revolutions of the Heavenly Bodies' نام سے کتاب شائع کی۔ اس میں اس نے بتایا تھا کہ سورج نظام شمسی کا مرکز ہے اور زمین اس کے گرد گھومتی ہے جبکہ وہ اپنے محورِ معین کے گرد بھی روزانہ گردش کرتی ہے۔ عیسائی فرقہ 'ڈومینکن آرڈر' (Dominican Order) کے ایک رکن 'گیووینی ٹلسانی' (Giovanni Tolsani) نے 1546ء میں لکھا کہ کاپرنیکس (Copernicus, d. 1543) کے تقریباً تمام نظریات جھوٹ پر مبنی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ انجیل مقدس سے بالکل ناآشنا ہے کیونکہ یہ نظریات انجیل کے بعض اصولوں کے منافی ہیں'[1]۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں 'Revolutions' کو ممنوعہ کتابوں کے اشاریئے میں شامل کر دیا گیا۔

گیلیلیو (Galileo, d. 1642) نے 'Revolutions' پڑھی اور اس موضوع پر خود بھی لکھا۔ 1616ء میں اسے ایک حکمنامہ موصول ہوا جس میں اسے متنبع کیا گیا کہ وہ 'Heliocentrism' (سورج کو مرکز قرار دینے کا نظریہ) کا علمبردار نہ بنے، نہ اس کا دفاع کرے اور نہ ہی کسی کو یہ پڑھائے۔[2]۔ جب اس نے 1630ء میں اپنی کتاب 'Dialogues' کو شائع کروانے کی کوشش کی تو ماسٹر آف دی سیکرڈ

۱۔ "Was Copernicus' Revolutions Approved by the Pope?" by Edward Rosen, Journal of the History of Ideas. Vol. 36, No. 3 (Jul. - Sep., 1975), p. 537.

۲۔ Galileo's Mistake: A New Look at the Epic Confrontation between Galileo and the Church by Wade Roland, p. 201.

پیلس[1] (Master of the Sacred Palace) نے گیلیلیو (Galileo, d. 1642) کو حکم دیا کہ وہ کسی سے اس کے مسودے کو پڑھوالے تاکہ اس امر کی ضمانت مل سکے کہ یہ قابل اشاعت ہے۔ فادر ماسٹر جیانسیٹو سٹیفنی (Father Master Giancito Stefani) کو مسودے کا جائزہ لینے کے لیے مقرر کیا گیا۔ پبلشر نے فادر ماسٹر کی تمام ہدایات پر عمل کیا اور اس نے 'Dialogues' کو دو بڑے نظاموں 'بطلیموسی' اور 'کوپرنیکسی' پر ڈائیلاگ کے طور پر شائع کر دیا۔ 1632ء میں پوپ اربن ہشتم (Pope Urban- VIII) نے پبلشر کے نام تقریباً فوری طور پر حکم جاری کر دیا کہ 'بس مزید کا پیاں نہ چھاپنا'۔

چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ 'انکویزیشن' (مذہبی عدالت) گیلیلیو (Galileo, d. 1642) پر مقدمہ چلائے گی۔ گیلیلیو (Galileo, d. 1642) نے روم جانے اور مقدمے کا سامنا کرنے سے لیت ولعل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سربراہ عدالت کو خط لکھا کہ وہ بذریعہ ڈاک سوالوں کا جواب دینے کو تیار ہے۔ اس نے صحت کی کمزوری کی بنا پر دوسو (200) میل لمبا سفر کرنے سے معذوری ظاہر کی اور تین طبیبوں سے بھی لکھوالیا کہ یہ شخص زندگی کو خطرے میں ڈالے بغیر سفر نہیں کرسکتا۔ لیکن اس کی استدعا مسترد کر دی گئی۔ پوپ کا اصرار تھا کہ اگر وہ بوڑھا، کمزور اور بیمار آدمی ہے تو وہ سردیوں میں روم تک دوسو میل لمبا سفر ضرور کر سکے گا۔ اس لئے اسے صحت بہتر ہونے تک جیل میں بند رکھا جائے۔ چنانچہ گیلیلیو (Galileo, d. 1642) نے 13 فروری 1623ء کو تیئیس (23) دن میں روم تک سفر مکمل کر کے فلورنس (Florence) کے سفارت خانے میں قیام کیا۔ کہا جاتا ہے کہ گیلیلیو (Galileo, d. 1642) کی ٹانگوں میں شدید درد تھا اور وہ مسلسل دو راتیں روتا اور آہیں بھرتا رہا۔

مقدمے کی کارروائی آٹھ ماہ چلتی رہی۔ اس سے رسمی قسم کے سوالات پوچھے گئے اور 'کوپرنیکس سسٹم' کے بارے میں اس کے صحیح احساسات جاننے کی کوشش کی گئی۔ جان بچانے کے لیے اس نے اپنا بیان یوں ریکارڈ کرایا۔ 'میرا یقین تھا اور اب بھی ہے کہ یہ انتہا درجے کا سچ اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ بطلیموس (Ptolemy, d. 170) نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ زمین ساکن ہے اور سورج متحرک۔

---

[1]۔ رومن کیتھولک چرچ میں تھیالوجین آف پونٹیفیکل ہاؤس ہولڈ ایک 'رومن کیورل' عہدہ ہے جسے ہمیشہ سے فرائر پریچر آف ڈومینکن آرڈر کے طور پر ذمہ دار بنا کر اسے پوپ کا تھیالوجین مقرر کیا گیا ہے۔ اس عہدے کو پہلے 'ماسٹر آف سیکرڈ اپوسٹولک پیلس' کہا جاتا تھا۔

گیلیلیو (Galileo, d. 1642) کی طرف سے 'کوپرنیکس ازم' سے دستبرداری کا اعلان ان الفاظ پر ختم ہوا، 'میں اقرار کرتا ہوں جیسا کہ میرا ضمیر کہتا ہے کہ اب میں مسترد شدہ رائے کو درست نہیں سمجھتا اور میں حکام کے فیصلے کے بعد سے اس پر قائم نہیں ہوں۔ میں آپ کے ہاتھوں میں ہوں، آپ جو چاہیں مجھ سے سلوک کریں'۔

22 جون 1633ء کو گیلیلیو (Galileo, d. 1642) اعترافِ گناہ کی سفید قمیض پہنے مذہبی عدالت کی عمارت کے بڑے ہال میں داخل ہوا، گھٹنوں کے بل جھک کر اپنے لیے یہ سزا سنی:

'ہر گاہ کہ تم گیلیلیو والد آنجہانی ونسنز و گیلیلی ساکن فلورنس عمر ستر (70) برس، نے سال 1615ء میں اس مقدس دفتر میں ایک جھوٹے نظریئے کو سچ قرار دینے کی کوشش کی لیکن اب تم مستقبل میں مزید محتاط رہو گے اور دوسروں کے سامنے ایک مثال بننے کے لئے اس قسم کی لغزشوں سے باز رہو گے۔ ہم حکم دیتے ہیں کہ 'Dialogue of Galileo Galilei' نامی کتاب کو سرکاری طور پر ممنوع قرار دیا جائے۔ ہم اس مقدس دفتر میں اپنی خوشی سے رسمی سزائے قید سنا رہے ہیں۔ ہم حسب دلخواہ کفارے کے طور پر تم پر یہ سزا عائد کرتے ہیں کہ تم اگلے تین برسوں کے دوران کفارے کی سات دعائیں پڑھتے رہو گے۔ ہم یہ حق اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں کہ ہم ان سزاوں کو معتدل، ہلکی کر دیں یا پوری طرح معاف کر دیں'۔

سزا کے اعلان کے بعد گیلیلیو نے اپنی دستبرداری کا بیان پڑھنے کے لئے گھٹنے کو جھکایا:

آپ جیسی عظیم المرتبت ہستیوں اور تمام اہل ایمان مسیحیوں کے ذہنوں میں سے میں اس سخت شبہے کو دور کر دینا چاہتا ہوں جو میرے خلاف بجا طور پر پیدا ہوا ہے۔ میں خلوص دل اور بلا تصنع ایمانداری کے ساتھ دستبردار ہوتا ہوں، لعنت بھیجتا ہوں اور اظہار نفرت کرتا ہوں پہلے بیان کردہ غلط آرا اور کلماتِ کفریہ سے اور عموماً ہر دیگر غلط بیانی اور تفرقے سے جو مذکورہ مقدس کلیسا کے خلاف ہو اور میں قسم اٹھاتا ہوں

کہ میں دوبارہ کبھی ایسا نہ کہوں گا نہ زبانی طور پر اور نہ تحریری طور پر، جس سے میرے متعلق اس قسم کے شبہات پیدا ہوں۔

پھر اس نے کہا 'میں گیلیلیو گیلیلی، دستبردار ہو گیا ہوں، قسم اٹھا چکا ہوں، وعدہ کر رہا ہوں اور مندرجہ بالا وعدے کا پاسدار رہوں گا اور اس کی صداقت کا گواہ ہوں۔

میں اپنے ہاتھوں سے اپنی دستبرداری کی موجودہ دستاویز کے حرف حرف کی تصدیق کرتا ہوں جس کی روم میں کانوینٹ آف منروا میں خواندگی کی گئی۔ یہ تحریر جون 1633ء کی بائیسویں تاریخ کو قلم بند ہوئی۔

گیلیلیو(Galileo, d. 1642) کی نگرانی 'سینا' میں آرچ بشپ پکولومینی کے سپرد کی گئی۔ 1633ء کے اواخر میں گیلیلیو(Galileo, d. 1642) کو اس کے اپنے چھوٹے سے فارم ہاؤس میں جو 'ارسٹری' (فلورنس) میں واقع تھا منتقل ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ جہاں کچھ عرصہ بعد اس کی بینائی ختم ہو گئی اور 1642ء میں وہ فوت ہو گیا۔ پوپ نے گیلیلیو(Galileo, d. 1642) کو کسی چرچ میں دفنانے کی اجازت نہ دی۔ اس کی بجائے اسے فلورنس(Florence) میں سانتا کرزس چرچ(Santa Croce Church) میں بے نشان قبر میں دفن کرنا پڑا۔ 1734ء میں اس کی وفات کے بانوے(92) سال بعد ایک درخواست کی گئی جس کی منظوری ہوئی، اس کے نتیجے میں گیلیلیو(Galileo, d. 1642) کو تدفین کے لئے بہتر جگہ میسر آسکی۔ چرچ کے اندر مزار بنا جہاں اس کی حقیقی تدفین ہوئی۔ اس کی تصنیف 'ڈائیلاگز'(Dialogues) ممنوعہ کتابوں کے اشاریئے پر رہی اور اسے بالآخر دوسو دو(202) سال بعد 1835ء میں اس اشاریئے سے حتمی طور پر خارج کر دیا گیا۔ گیلیلیو(Galileo, d. 1642|) کی وفات کے تین سو پچاس(350) سال بعد 1992ء میں پوپ جان پال دوم(Pope John Paul II) نے اعتراف کیا کہ گیلیلیو(Galileo, d. 1642) نے چرچ کے ہاتھوں غیر منصفانہ سزا پائی تھی۔

گیلیلیو(Galileo, d. 1642) کے مقدمے کے سلسلے میں ایک دلچسپ قصہ مشہور ہے کہ گیلیلیو(Galileo, d. 1642) سادہ سے کمرے میں کلیسائی عدالت میں سرکاری تفتیش کنندوں کے

سامنے پڑی میز کے بالمقابل ایک کرسی پر بیٹھا سوالوں کے جوابات دیتے دیتے اپنے ہاتھ پشت کے پیچھے لے گیا اور ایک آہ بھری اور اپنی انگلیوں کو صلیب کی شکل دی اور کچھ ایسے الفاظ کہے جن کا مطلب تھا 'ٹھیک ہے، زمین سورج کے گرد نہیں گھومتی، پھر زیرلب بولا' اور پھر بھی گھومتی ہے۔

مختصراً یہ کہ جب یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا کیتھولک چرچ نئے تصورات کو قدیم زمانے سے چلے آنے والے مذہبی عقائد کے منافی قرار دے کر شور مچاتا رہا۔ سائنسدانوں اور دانش کی نئی تحریک کے علمبرداروں کو سخت و عبرتناک سزائیں دینے کے لیے کلیسائی عدالتیں چلتی رہیں لیکن نوزائیدہ ذہنی تحریکوں کو نہ دبا سکیں کیونکہ یہ عقل و استدلال پر مبنی تھیں اور وقت کے تقاضوں پر پوری اتر رہی تھیں۔ تخیلات کا ایک معرکہ برپا ہونے جا رہا تھا جو دراصل نئی اور پرانی سوچوں کے مابین ایک کشمکش تھی۔ کلیسا نے اپنی جنگ مذہب کے نام پر لڑی جو آگے چل کر آزاد تصورات اور مذہب کے درمیان جنگ میں بدل گئی۔ یہ ساکت و معطل رہنے یا ترقی کی طرف بڑھنے کی لڑائی تھی۔ نئی فکر کی تحریک نے لڑائی جیت لی اور کلیسا کو پسپا ہونا پڑا۔ اسے یہ پسپائی فضول اور غیر معقول عقائد اور رویئے اختیار کرنے کی وجہ سے ہوئی۔

آج کی مسلم دنیا میں صورت حال کسی حد تک ویسی ہی ہے۔ ہمارا روایتی مذہبی طبقہ سولہویں صدی کے مسیحی کلیسا کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ چنانچہ ایک ترقی پسند مذہب اسلام کو ایک رجعت پسند مذہب کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ مسلم دنیا کے متعدد اہل دانش کو اپنی جانیں بچانے کے لیے دوسرے مسلم ممالک یا مغربی ممالک میں چلے جانے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمانؒ (d. 1988) اور علامہ محمد اسدؒ (Leopold Weis, d. 1992) کو پاکستان چھوڑنا پڑ گیا، کیونکہ انہیں 'مغرب زدہ' قرار دے دیا گیا تھا اور دونوں نے بیرونی ممالک میں وفات پائی۔

ڈاکٹر فضل الرحمانؒ (d. 1988) اسلام کے ایک معروف سکالر تھے انہوں نے عربی کی تعلیم پنجاب یونیورسٹی میں حاصل کی، بعد میں آکسفورڈ یونیورسٹی چلے گئے۔ جہاں انہوں نے ابن سینا (Avicenna, d. 1037) پر ایک مقالہ لکھا۔ بعد ازاں انہوں نے تدریسی کیریئر اختیار کیا۔ پہلے ڈرہم یونیورسٹی (Durham University) اور پھر میک گل یونیورسٹی (McGill University) میں چلے گئے جہاں وہ 1961ء تک اسلامی علوم پڑھاتے رہے۔ پھر وہ پاکستان آ گئے تاکہ اسلامی ریسرچ کے مرکزی انسٹی ٹیوٹ کی سربراہی کر سکیں۔ یہ ادارہ حکومت پاکستان نے اس خیال سے قائم کیا تھا

کہ اسلام کو قوم کی روزمرہ کی زندگی میں نافذ کیا جائے۔ عائلی قوانین کے بارے میں ان کے ترقی پسندانہ خیالات کی وجہ سے ایک زبردست تنازعہ کھڑا ہو گیا جس سے ان کے خلاف نفرت کا طوفان برپا ہو گیا۔ اس پر وہ ستمبر 1968ء میں اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر یونیورسٹی آف شکاگو (University of Chicago) امریکہ میں چلے گئے۔ جہاں انہوں نے مشرقِ قریب پر تحقیقی پروگرام شروع کر دیا جو اب بھی دنیا کے بہترین پروگراموں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف میں

(i). Islam

(ii). Prophecy in Islam: Philosophy and Orthodoxy

(iii). Islam and Modernity: Transformation of an Intellectual Tradition

(iv). Major Themes of the Quran

(v). Revival and Reforms in Islam

(vi). Islamic Methodology in History

(vii). Health and Medicine in the Islamic Tradition

شامل ہیں۔ ڈاکٹر فضل الرحمانؒ (d. 1988) اسلامی حکومت و معاشرے کی اصلاح کے علمبردار بھی بنے۔ ان کا یہی موقف تھا جس نے انہیں پاکستان واپس آنے سے روکا تھا۔ انہوں نے 26 جولائی 1988ء میں امریکہ میں وفات پائی۔ وفات کے بعد سے ان کی تحریریں دنیا بھر اور بالخصوص مشرق قریب کے علما و اہل دانش میں مزید مقبول ہو رہی ہیں۔ یونیورسٹی آف شکاگو (University of Chicago) میں ان کی خدمات کا ابھی تک اعتراف کیا جا رہا ہے۔ یونیورسٹی میں مرکز برائے مطالعہ مشرق وسطیٰ کو ان سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

علامہ محمد اسدؒ (Leopold Weis, d. 1992) ایک یہودی نژاد آسٹرو ہنگیرین صحافی اور بیسویں صدی عیسوی کے نہایت بااثر یورپی مسلمانوں میں سے ایک تھے۔ انہوں نے عبرانی، آرامی، انگلش، فرانسیسی، فارسی اور عربی زبانوں میں مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ انہوں نے 1892ء میں عرب دنیا میں بطور صحافی کام کرنا شروع کیا۔ 1926ء میں وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے۔ ہندوستان آئے تو فلسفی شاعر

حضرت اقبالؒ (d. 1938) سے متعارف ہوئے جنہوں نے انہیں ترغیب دی کہ وہ مستقبل کی اسلامی ریاست کے ذہنی قضیوں کو واضح کرنے میں مدد دیتے رہیں۔ علامہ محمد اسدؒ (Leopold Weis, d. 1992) نے جنگ عظیم دوم (WW-II) کے دنوں میں پانچ سال حکومت برطانیہ کی نظر بندی میں بھی گزارے۔ 14 اگست 1947ء میں علامہ محمد اسدؒ (Leopold Weis, d. 1992) نے پاکستانی شہریت پائی اور بعدازاں متعدد بیوروکریٹ اور سفارتی عہدوں پر فائز رہے جن میں اقوام متحدہ میں پاکستان کی سفارتی نمائندگی بھی شامل تھی۔ ان کی تصانیف میں

(i). The Message of the Quran

(ii). The Road to Makkah

(iii). The Law of Ours

(iv). Islam at crossroads

(v). The Principles of State and Government in Islam

اور انگریزی ترجمہ بخاری شریف شامل ہے۔ ان کے اعزاز میں اپریل 2008ء میں بائیسویں ڈسٹرکٹ آف دی آنا (District of Vienna) میں 'یو این او سٹی' (UNO City) کے سامنے والی جگہ کا نام علامہ محمد اسد (Leopold Weis, d. 1992) سے منسوب کر کے 'Mohammad Asad Platz' رکھ دیا گیا۔

میں نے ان کے کئی خطوط دیکھے ہیں جن میں انہوں نے فریاد کی ہے کہ وہ مذہبی لوگوں کے اظہار نفرت کی وجہ سے پاکستان چھوڑنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ یہ لوگ اسلام میں ان کے اجتہاد اور عقلیت پسندی کی اہمیت پر زور دینے کی بنا پر مخالف ہو گئے تھے۔ چنانچہ اس صاحب علم نومسلم کو جو حضرت اقبالؒ (d. 1938) کی ہدایات کے مطابق اسلام اور پاکستان کے لئے محنت شاقہ کرتا رہا پاکستان چھوڑنا پڑا۔ وہ مراکش چلے گئے اور باقی زندگی اپنی اہلیہ 'پولا' کے ساتھ گزاری۔ انہیں اندلسیہ (مراکش) کے سابق بربری صوبہ میں قبرستانِ غرناطہ میں دفن کیا گیا۔

یہ دو مثالیں اس امر کی وضاحت کرتی ہیں کہ ہم بہت مشکل صورت حال سے دو چار ہیں اور

ہمارے سامنے ایک کٹھن منزل ہے۔اسے طے کرنے کے لیے اولاً تو ہمیں اس طرز فکر کوترک کرنا ہوگا کہ مغرب سے جو کچھ بھی آتا ہے وہ کفر والحاد ہے۔ہمیں ہر چیز کو فقہ اسلامی کے اس سنہری اصول کی روشنی میں چھاننا چاہیے۔جو کچھ درست ہے، اسے اپنا لینا اور جو کچھ بُرا ہے، اسے ترک کر دینا چاہیے۔ہمیں صحیح اور غلط کے درمیان خود امتیاز کرنا چاہیے۔اچھے اوصاف مثلاً محنت، دیانتداری، علم، تحقیق (ریسرچ) کا جذبہ، انسانی حقوق کا احترام، فلاحی ریاست کے تصور اور جمہوری اقدار کا تحفظ کرنا چاہیے کیونکہ علم ہماری متاعِ گم گشتہ ہے[1]۔ہمیں اسے قبول کرنا چاہیے خواہ کہیں سے بھی دستیاب ہو۔باب العلم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرمان کا مفہوم ہے کہ نیک امر پر عمل کرنا ہی تمہارا کام ہے۔یہ نہ دیکھو کہ کہنے والا کون ہے۔

ثانیاً ہمیں ذہنی غلامی کا خاتمہ کرنا چاہیے۔مغربی فکر اور تہذیب کا تنقیدی جائزہ لینا چاہیے۔ مغرب ایک رہنما کے طور پر کام دے سکتا ہے لیکن یہ ہماری منزل نہیں ہونی چاہیے۔ہمیں یہ ادراک ہونا چاہیے کہ مغرب کا طرز عمل، جو مذہب سے عناد رکھتا ہے بعض اوقات حیوانی بھی ہو جاتا ہے۔ان معاملات میں ہمیں اپنی اقدار پر اعتماد اور انحصار کرنا سیکھنا ہوگا۔ہماری آنکھیں مغربی ثقافت کی ظاہری چمک دمک سے خیرہ نہیں ہو جانی چاہئیں۔ہمیں حقیقت تک رسائی کے لئے گہرا غوطہ لگانے کی کوشش کر کے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ بنی نوع انسان واقعی خوش اور مطمئن ہے یا کیا جدید تہذیب نے اسے زیادہ رنجیدہ اور مایوس تو نہیں کر دیا؟

ثالثاً ہمیں ذہنی قیادت کا (اگر پوری نہ ہو تو نہ سہی) آبرومندانہ حصہ بننا چاہیے اور افکار اور ثقافت کے مستقبل کی سمت کا تعین کرنا چاہیے۔اس کام کے لئے زبردست محنت اور قوت و ہمت درکار ہے۔ہم ذہنی طور پر بہت کمزور ہیں اور اب تک ذہنی غلامی کے دور سے گزر رہے ہیں۔ہم وقت کے ساتھ ہم قدم نہ رہنے کی وجہ سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔تاہم تاریخ میں بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ کمزور قومیں جب اٹھ کھڑی ہوتی ہیں تو زمامِ کار سنبھال لیتی ہیں۔اسلامی تہذیب کے آغاز کے زمانے میں رومن، یونانی اور ایرانی تہذیبیں سر برآوردہ تھیں۔ہم نے کمزور ہونے کے باوجود قیادت ان سے چھین لی۔اب

---

[1]۔کنز العمال۔جلد ہشتم: رقم:4285 (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حکمت کی بات مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے۔لہٰذا اسے جہاں بھی پائے وہی اس کا مستحق ہے)

پھر ہمیں اپنی قوت کو مجتمع کر کے غلامی کے دائرے سے باہر نکلنا چاہیے تا کہ اسلامی عالمی قیادت کے دور کا دروازہ کھول سکیں۔ جیسا کہ قرآن مجید اقتدار کی اترائی اور چڑھائی کے بارے میں فرماتا ہے:

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ[1]

(یہ تو زمانے کے نشیب وفراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں)

جو فاتح تھے وہ مفتوح ہو گئے ہیں اور جو مفتوح ہیں وہ فاتح ہو جائیں گے۔ کچلے ہوئے لوگ زمین کے وارث بن جائیں گے۔ اس کے حصول کے لئے ہمیں خود کو وقف کر دینا چاہیے۔ ہم میں سے بعضوں کو علم وتحقیق اور فلاحی واصلاحی کاموں کے لئے اپنی زندگیاں قربان کرنا ہوں گی۔ علماء اور دانشوروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ذہنی غلامی کی مذمت کریں اور عوام اور بالخصوص نوجوانوں کو تلقین کریں کہ وہ اپنا وقت اور قوت کو ضائع نہ کریں بلکہ اپنی زندگیاں حقیقی انسانی ترقی کے لئے صرف کریں۔ ہم میں سے کسی کو بھی اپنی خودی نہیں بیچنی چاہیے بلکہ اپنے اندر ڈوب کر اخلاقی اور روحانی قوت حاصل کرنی چاہیے یہ اخلاقی قوت ہے جو بالآخر جیت جاتی ہے اور دنیا کو فتح کر لیتی ہے۔

---

[1]۔ سورۃ آل عمران: آیت: 140

انیسواں باب

تزکیہ واحسان

فَسَوۡفَ یَأۡتِی اللّٰہُ بِقَوۡمٍ یُّحِبُّہُمۡ وَیُحِبُّوۡنَہٗۤ [1]

(عنقریب اللہ تعالیٰ بہت سے ایسے لوگ پیدا کر دے گا جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو محبوب ہوگا)

اسلام کی روحانی وسعتیں اس امر کی متقاضی ہیں کہ انہیں مناسب انداز میں سامنے لایا جائے کیونکہ بنی نوع انسان روحانیت کی تلاش میں مضطرب ہونے کے باوجود اس تک رسائی پانے سے قاصر ہے۔نوجوان اور تعلیم یافتہ مسلم ذہن اسلام کی بیرونی وسعتوں میں ہی کھو جاتا ہے۔اس امر کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں پر ان کے ایمان کے اندرونی حسن کو بھی آشکارا کیا جائے۔اسلام کی داخلی پنہائیوں کو عموماً تزکیۂ نفس (پاکیزگی روح) یا تصوف (Mysticism) یا احسان کہا جاتا ہے۔

اسلام کا اصل نصب العین انسان اور اس کے خالق کے درمیان ایک رابطہ پیدا کرنا ہے۔اس عمل کا ایک جزو وہ ہے جو دکھائی دیتا ہے۔اسے 'ظاہر' یا 'شریعت' کہا جاتا ہے اور دوسرا جزو جو روحانی اور اخلاقی پہلو سے تعلق رکھتا ہے 'باطن' کہلاتا ہے۔اسے احسان یا تصوّف کہتے ہیں۔شریعت ایک بنیادی ساخت مہیا کرتی ہے تاکہ بنی نوع انسان گمراہ ہونے سے بچ جائے لیکن بنی نوع انسان کا اخلاقی ارتقا اس کی اپنی داخلی خواہش پر منحصر ہے۔یہ خواہش جتنی زیادہ اور بڑی ہوگی اتنی ہی زیادہ روحانی ترقی ہوگی۔تصوف انسان کی روحانی تمنا اور ارتقا کو آگے بڑھاتا ہے۔صوفیاء اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا کرنے کی بجائے اس سے محبت کا درس دیتے ہیں۔ان کا کلیہ سورۃ المائدہ کی یہ آیت ہے:

فَسَوۡفَ یَأۡتِی اللّٰہُ بِقَوۡمٍ یُّحِبُّہُمۡ وَیُحِبُّوۡنَہٗۤ [2]

(عنقریب اللہ تعالیٰ بہت سے ایسے لوگ پیدا کر دے گا جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو محبوب ہوگا)

(1)۔ صوفیاء کرامؒ نے اللہ عزوجل کے لئے پُر جوش محبت کرنے کی تاکید کی اور اس محبت کے ساتھ

۱۔سورۃ المائدہ: آیت:54

۲۔سورۃ المائدہ: آیت:54

اس کی مخلوقات سے بھی محبت کرنے پر زور دیا۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ[1] کا مشہور قصہ علامتی طور پر مفید ہے۔ ان کے ایک مرید کہیں سفر سے آئے تو وہاں کی سوغات کے طور پر قینچی لائے۔ آپؒ نے فرمایا کہ تم میرے لیے کاٹنے کی چیز لائے ہو۔ اگر تحفہ لانا ہی تھا تو سوئی دھاگہ لاتے کہ وہ جوڑنے کے کام آتا۔ صوفیاء کرامؒ کی یہی خصوصیت تھی جو دین کی اشاعت کا سبب بنی۔ اس محبت کے درس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں میں رقابت (rivalry) کم ہوگئی۔ اس میل جول سے لوگ اسلام سے متاثر ہوئے اور اسلام میں داخل ہوئے[2]۔ یہ مسلم صوفیاء کرامؒ کا کردار تھا جس نے اسلام پھیلانے میں مدد دی۔ اس ہمدردانہ معاشرتی رویہ نے اس دشمنی وعناد کو کم کر دیا جو صدیوں سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان چلا آ رہا تھا۔ ان کے قریب آنے اور میل ملاپ نے ایک دوسرے کے رویئے کو دیکھ کر غیر مسلم اسلام سے بہت متاثر ہوئے اور اس کے دائرے میں شامل ہو گئے۔

مشہور انگریزی شاعر Leigh Hunt نے 1834ء میں حضرت ابو بن ادہمؒ[3] (Abou Ben Adhem, d. 782) کے حوالے سے اس مسئلہ پر خوبصورت نظم لکھی ہے۔ جس میں اس بات کو بہت خوبصورت سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے محبت کرنے والوں سے اللہ محبت کرتا ہے:

Abou Ben Adhem

Abou Ben Adhem - may his tribe increase-
Awoke one night from a deep dream of peace,
And saw, within the moonlight in his room,
Making it rich, and like a lily in bloom,
An angel writing in a book of gold
Exceeding peace had made Ben Adhem bold,

---

[1] ۔ حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکرؒ (1188ء-1280ء) برصغیر میں چشتیہ سلسلے کے عظیم صوفی بزرگ تھے۔ آپؒ کا مزار پاک پتن، پاکستان میں ہے۔

[2] ۔ فکر اسلامی از وحیدالدین خاں۔ صفحہ نمبر 131

[3] ۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ (718ء-782ء) ایک مشہور صوفی بزرگ تھے۔

And to the presence in the room he said:
What writest thou? The vision raised its head
And with a look made allo of sweet accord,
Answered, The names of those who love the Lord.
And is mine one? Said Abou. Nay, not so,
Replied the angel. Abou spoke more low,
But cheerly still, and said, I pray thee, then,
write me as one who loves his fellow men.
The angel wrote and vanished. The next night
It came again, with a great wakening light,
And showed the names whom love of God had blest
And lo! Ben Adhem's name led all the rest.

ابو بن ادہمؒ

اللہ تعالیٰ اس کی جماعت کی تعداد بڑھائے
اک روز گہری نیند سے بیدار ہوا
اور چاند کی روشنی سے اپنے حجرہ کو منور دیکھا
اس نے حجرہ کو چمبیلی کی کلیوں کی طرح بھرا ہوا تھا
اک فرشتہ سنہری کتاب میں لکھ رہا تھا
پر سکون ماحول نے ابو بن ادھمؒ کی ہمت بندھائی
اور حجرہ میں موجود فرشتے سے پوچھا
تم کیا لکھ رہے ہو؟ فرشتے نے سر اٹھایا

اور آپؐ پر محبت بھری نگاہ ڈالی
اور جواب دیا، اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والوں کے نام
ابو بن ادہمؒ نے پوچھا: کیا ان میں میرا نام بھی ہے؟
فرشتے نے جواب دیا کہ نہیں
ابو بن ادہمؒ نے دھیمی لیکن خوشی کی آواز میں کہا
میں تم سے گزارش کرتا ہوں
میرا نام ان میں لکھ لو جو اس کے بندوں سے محبت کرتے ہیں
فرشتہ نے لکھا اور غائب ہوگیا
فرشتہ اگلی رات پھر آیا
اب وہ نیند سے بیدار کر دینے والی روشنی کے ساتھ آیا
اور ان کو وہ نام دکھائے جن کو اللہ تعالیٰ کی محبت کی سند ملی تھی
اور اس فہرست میں ابو بن ادہمؒ کا نام سب سے اوپر تھا۔

(2)۔ آج کا تصوف کائنات اور بنی نوع انسان سے ربط وضبط کی بجائے ترکِ دنیا اور خلوت گرینی کی وکالت کرتا ہے جبکہ حقیقی صوفی رویئے اور طرزِ عمل میں تعیش اور انتہا پسندی ترک کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ تصوف کے اس غلط تصور نے امتِ مسلمہ کو نحیف و کمزور کر کے رکھ دیا ہے۔ حضرت اقبالؒ (d. 1938) کے مطابق مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سقوطِ بغداد کے بعد دوسرے نمبر پر تصوف کا غلط تصور ہے:

دورِ متأخر کے تصوف میں کلیتاً آخرت کا جذبہ پیدا ہو جانے سے لوگوں کی نظروں سے اسلام کا ایک بہت اہم پہلو اوجھل ہو گیا جو کہ معاشرتی نظم وضبط سے متعلق تھا۔ ان کی بے لگام سوچ بچار کی تخمینہ کاری میں مصروف ہو جانے کے باعث تصوف نے اسلام کے بہترین ذہنوں کو بالآخر اپنے اندر جذب کر لیا۔ اس طرح مسلم

ریاست عموماً دوسرے درجے کا ذہن رکھنے والوں اور اسلام سے لا پرواہ لوگوں کے ہاتھوں میں رہ گئی اور عوام کی رہنمائی کے لئے کوئی عالی دماغ شخصیت باقی نہ رہی اور ان کا تحفظ کورانہ تقلید کرنے والے مدّرسین کے پاس رہ گیا ہے[1]۔

(3)۔ جب مسلمان ذہنی طور پر مخبوط الحواسی کی کیفیت میں تھے تو مغرب میں فطری علوم ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ ہم عمومی طور پر دنیا کی رائج الوقت ذہنی سرگرمیوں سے منقطع رہے۔ ہمارا تصوف خوابوں اور متصوفانہ مشاہدات پر زور دیتا رہا حالانکہ اسے ہماری توجہ کائنات پر مرکوز کرانی چاہیے تھی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ صوفیوں نے لوگوں کو سائنسی علوم پڑھنے سے براہِ راست روک دیا تھا لیکن غلط تصورات کی وجہ سے، وہ مزاج اور طرزِ عمل جو ہم نے وضع کیا اگر سائنس دشمن نہیں تو غیر سائنسی ضرور تھا۔ سائنس ہماری توجہ خارجی مادی دنیا کی طرف مبذول کرتی ہے جبکہ ہم نے اپنی توجہ اور قوتوں کو صرف اور صرف 'باطن' (داخلی وسعتوں) پر مرکوز کر دیا تھا۔ ہمارا روحانی سفر جب تک رواں رہا، اسے ہماری تمام وقت توجہ کی ضرورت نہیں تھی۔ جوں جوں ہم روحانی طور پر بڑھتے رہے ہم نے دنیا کو زیادہ سے زیادہ سنبھالے رکھا ہے۔ اس سفر میں بھی ہم سیکھتے اور ترقی کرتے رہے ہیں۔

جس زمانے میں ہمارے ہاں بڑے صوفی پیدا ہوئے۔ یورپ میں اعلیٰ پائے کے سائنسدان پیدا ہوئے۔ جیسا کہ

حضرت جلال الدین رومیؒ	(d. 1273)	راجر بیکن	(d. 1294)
حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبندیؒ	(d. 1389)	گٹن برگ	(d. 1468)
حضرت شیخ احمد سرہندیؒ	(d. 1624)	کیپلر	(d. 1630)
حضرت خواجہ باقی باللہؒ	(d. 1605)	ڈیکارٹ	(d. 1650)
حضرت مظہر جان جاناںؒ	(d. 1781)	نیوٹن	(d. 1727)

1۔ The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam by Muhammad Iqbal, p. 150 - 151

حضرت سید احمد شہیدؒ	(d. 1831)	جیمز واٹ	(d. 1819)
حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ	(d. 1899)	ڈارون	(d. 1882)
حضرت اشرف علی تھانویؒ	(d. 1943)	آئن سٹائن	(d. 1955)

ہمارے یہ صوفیا کرامؒ عظیم لوگ تھے۔ انہوں نے انسان کی اخلاقی ترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ لیکن اچھا ہوتا کہ ان کے ساتھ ساتھ عظیم پائے کہ سائنسدان بھی پیدا ہوتے جو انسانی علم کو آگے بڑھاتے۔ انسان کی روحانی ترقی کے ساتھ ساتھ مادی فلاح کا بھی مداوا کرتے۔

تصوف نے پلوٹینس[1] (Plotinus, d. 270) کی تعلیمات اور ہندوؤں کی رسم 'تیاگ'[2] (renunciation) کے زیر اثر فکر و عمل کا ایک پیچیدہ نظریہ وضع کر لیا جو روحانیت کے بارے میں سادہ اسلامی تعلیمات کے ساتھ بڑی حد تک مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ یہ نظریہ اس خوبصورت توازن سے متصادم تھا جو اسلام نے روح اور مادے کے درمیان اور دنیاوی و اُخروی معاملات کے درمیان قائم کیا تھا۔ یہی اسلام کا اصل نصب العین تھا[3]۔

(4)۔ مسلمانوں نے دو بڑے نقصان اٹھائے جو تصوف کی ان گمراہ کن تعلیمات، رہبانیت (asectism) اور تیاگ (renunciation) اور نا معقولیت (irrationality) کی صورت میں ظاہر ہوئے:

(i)۔ اسلام متحرک و عملی دین کی بجائے چلہ کشی و مردم بیزاری کی طرف چلا گیا۔ دین کی سماجی، سیاسی و معاشی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ خدا کی ذات کی بجائے شیخ کی طرف بلایا جانے

---

[1]۔ Plotinus: پلوٹینس (204ء-270ء) دنیائے قدیم کا ایک بڑا یونانی فلسفی تھا۔ اس کا فلسفہ تین اصولوں پر مشتمل تھا: ذاتِ واحد، ذہانت اور روح۔ انیسویں صدی کے مورخوں نے 'افلاطونیتِ نو' کی اصطلاح ایجاد کی جو اس پر اور اس کے فلسفے پر لاگو ہوتی تھی وہ زمانہ قدیم کے آخری حصے میں بہت مقبول تھا۔ 'پلوٹینس اینیڈز' نے مذہب، مادہ پرستی، عیسائیت، یہودیت، اسلامی اور باطنی مابعد الطبیعیاتی (metaphysicians and mystics) مفکرین اور صوفیاء کرامؒ کو صدیوں تک بہت متاثر کیا۔

[2]۔ 'تیاگنا' کسی چیز کو باطل اور غیر اہم قرار دے کر چھوڑ دینے کو کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح خاص طور پر ان لوگوں کے لئے استعمال ہوتی ہے جو پہلے عیش و عشرت کی زندگی گذار رہے ہوں لیکن پھر سب کچھ چھوڑ کر رہبانہ طرز عمل اختیار کر لیں۔

[3]۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے مصنف کی دوسری کتاب: کتاب الزہد

لگا۔ دین کی عطا کردہ اجتماعیت (collectivity) کی بجائے ذاتی عرفان (gnosis)، کشف (revelation) اور مراقبہ (meditation) جیسے انفرادی اعمال کیے جانے لگے۔ دین نے تو عبادت و دعا کو بھی اجتماعی عمل بنایا تھا۔ ہم نے اس کو حجرہ تک بلکہ جنگلوں تک محدود کر دیا۔ اس سے سماج ٹوٹنے لگا۔ اجتماعیت کمزور پڑ گئی۔ روحانیت ذاتی فعل بن گیا۔ اس کی اجتماعیت ختم ہو گئی۔ اجتماعیت کی قوت نہ ہونے کی وجہ سے روحانی و نفسی مسائل بڑھنے لگے۔ عبادت کا مقصد اس وقت صحیح طور پر پورا ہوتا ہے جب اس کو اجتماعی طور پر کیا جائے۔ اس لیے اسلام نے نماز با جماعت، جمعہ کی نماز، عیدین اور سالانہ حج پر زور دیا ہے۔

حضرت اقبالؒ (d. 1938) نے بجا کہا ہے کہ عبادت اسی وقت بہتر نتائج دے سکتی ہے جب وہ اجتماعی طور پر کی جائے۔ اسلام میں حقیقی عبادت ایک اجتماعی اقدام ہے، انفرادی نہیں۔ اس کا مقصد انسانی میل جول کے دائرے کو وسیع کرنا پھر اس کو اس طرح بڑھانا ہے کہ یہ رفتہ رفتہ عالمگیر بن جائے۔ ان کے الفاظ میں:

> 'تاہم نماز کا حقیقی مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب اقدامِ نماز، اجتماعی اقدام بن جائے۔ صحیح نماز کی سپرٹ (spirit) معاشرتی ہے۔ اسلام میں نماز با جماعت کی ادائیگی معاشرتی راہ و رسم بڑھانے اور روحانی رخشندگی پھیلانے کا خصوصی ذریعہ ہے۔ اس میں بہت سے فائدے مضمر ہیں۔ جب مسلمان روزانہ کی اجتماعی نماز سے بڑھ کر آگے چلتے ہوئے سالانہ تقریب کے لئے مکہ کی مرکزی مسجد میں پہنچیں تو آپ بہ آسانی دیکھ سکتے ہیں کہ اسلامی عبادت کا دستور العمل بتدریج بڑھتے بڑھتے انسانی دائرہ رفاقت کو وسیع تر کر دیتا ہے'[1]۔

(ii)۔ مسخ شدہ تصوف کے ساتھ ساتھ انفرادی سطح پر عجیب قسم کے نفسیاتی مسائل نے جنم لے لیا۔ ہر ایرے غیرے نے زاہد ہونے کے دعوے کرنا شروع کر دیئے۔ لوگ مکار صوفیوں کو غیر معمولی

۱۔ Reconstruction of Religious Thought in Islam by Muhammad Iqbal, p.84

قوتوں کے مالک سمجھنے لگے۔

(5)۔ صوفیوں نے 'حالتِ سکر' (intoxication) میں عجیب وغریب دعوے کر دیئے۔ یہ حقائق زندگی سے کٹ کر اور غلط روحانی کیفیات میں ڈوب گئے۔ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کا قول قابلِ توجہ ہے کہ

محمد عربی برفلک الافلاک رفت و باز آمد
واللہ گرمن رفتمے، ہرگز باز نیامدے
(حضرت محمد ﷺ معراج میں آسمانوں پر گئے اور واپس آ گئے)
(خدا کی قسم اگر میں وہاں جاتا تو ہرگز واپس نہ آتا)

حضرت اقبالؒ (d. 1938) کے بقول یہی فرق ہے صوفی کے شعور میں اور نبی علیہ السلام کے شعور میں۔ صوفی روحانی تجربے (unitary experience) کے بعد پھر عام حالت میں واپس نہیں آنا چاہتا مگر نبی علیہ السلام واپس آتا ہے اور انسانیت کے لیے فلاح لاتا ہے۔ وہ اس تجربے سے واپس آ کر تاریخ کی قوتوں کو اپنے قابو میں کرتے ہیں اور فکر ونظر کی ایک نئی دنیا تخلیق کرتے ہیں۔ صوفی کے لیے روحانی تجربہ اس کی معراج ہے۔ انتہا ہے جبکہ نبی علیہ السلام کے لیے روحانی تجربہ صرف سیکھنے کا ایک عمل ہے۔ بیداری کا عمل ہے:

حضرت اقبالؒ (d. 1938) اپنے سات خطبات میں سے پانچویں میں جس میں نبوت اور ولایت کا فرق بتایا گیا ہے، کہتے ہیں:

> حضرت محمد ﷺ بلند ترین آسمان پر تشریف لے گئے اور واپس پلٹ آئے۔ خدا کی قسم اگر میں وہاں جاتا تو کبھی واپس نہ آتا۔ یہ الفاظ عظیم صوفی بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ہیں۔ غالباً پورے صوفیانہ ادب میں پیغمبرانہ ادراک اور صوفیانہ شعور میں موجود واضح نفسیاتی فرق کو ایک جملے میں ادا کرنے کی کوئی اور نظیر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گی۔ صوفی نہیں چاہتا کہ وہ اس واردات اتحاد کی لذت اور سکون سے واپس لوٹے اور جب وہ کبھی لوٹتا ہے اور اسے واپس لوٹنا پڑتا ہے۔ اس

کی واپسی نوع انسانی کے لیے کوئی بڑا مفہوم نہیں رکھتی۔ نبی علیہ السلام کی واپسی تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ اس سے لوٹتا ہے تاکہ زماں کی قلمرو میں داخل ہو اور تاریخ کی قوتوں کو قابو میں رکھتے ہوئے مقاصد کی تازہ دنیا تخلیق کرے۔ صوفی کے لیے اتحاد لذت اس کی آخری منزل ہے مگر نبی علیہ السلام کے لیے یہ تجربہ اپنے آپ میں دنیا کو ہلا دینے والی نفسیاتی قوتوں کو بیدار کرنے کا عمل ہے۔ جس سے عالم انسانیت کو مکمل طور پر تبدیل کیا جا سکے۔ یہ خواہش کہ اس کا مذہبی تجربہ ایک زندہ عالمگیر قوت میں تبدیل ہو جائے، نبی علیہ السلام میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے[1]۔

(6)۔ ہمارے صوفیاء کرامؒ بالعموم اپنے صوفیانہ تجربات میں گُم ہو گئے تھے تاہم ان میں کچھ پیغمبر علیہ السلام کے نقش قدم پر چلتے ہوئے سنجیدہ اور متین حالت میں واپس آ گئے اور انہوں نے دنیا کے لئے مثبت خدمات انجام دیں۔ جو کچھ انہوں نے اپنے عارفانہ تجربے سے حاصل کیا اس سے انہوں نے دنیا میں تبدیلی کی۔ مگر اکثریت کی دعاؤں نے بنی نوع انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ چنانچہ وہ انسانی صلاحیتوں کے لئے تاریک غار (black hole) بن گئے۔ معتزلہ[2] (rationalist) کی غیر ضروری عقلیت کے جواب میں ہم نے صوفیت کے وجدان (intuition) کو لا کھڑا کیا جس سے ایک غیر عقلی اور توہماتی (superstition) رویے نے جنم لیا۔

(7)۔ عقل علم کا واحد ذریعہ نہ تھا لیکن وحی کے ساتھ ساتھ عقل لازم ہے۔ وحی بھی عقل کو خطاب کرتی ہے۔ ہم نے عقلیت کے خلاف روحانی تجربے کو لا کھڑا کیا۔ کشف، الہام اور وجدان کو علم کا

---

[1]۔ The Spirit of Muslim Culture; The Reconstruction of Religios Thoughts in Islam by Dr.Iqbal

[2]۔ معتزلہ ایک عقلیت پسند مسلک ہے جس کا بانی ایک ایرانی نژاد واصل بن عطا تھا جو خواجہ حسن بصریؒ کا شاگرد تھا۔ معتزلہ دین کے سارے معاملات کو عقل کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں عقل کو نقل پر غیر معمولی فوقیت دیتے ہیں۔ خلافت عباسیہ خاص طور پر مامون الرشید کے دور میں اس مسلک نے بہت زیادہ ترقی کی البتہ بعد میں حکمرانوں کے عتاب کا شکار ہو گیا۔

اصل ذریعہ سمجھ لیا۔ عقل اور علم کے خلاف باتیں کرنے لگے۔ صوفیا نے جو بات ایک خاص انداز میں ایک خاص وجہ سے کہی وہ ہم نے عمومی اصول بنا لیا۔ حضرت جلال الدین رومیؒ (d. 1273) نے تیرہویں صدی عیسوی میں کہا:

صد ورق و صد کتاب را در نار کن

روئے دل را جانب دلدار کن

(سینکڑوں صفحے اور سینکڑوں کتابیں آگ میں ڈال دیں)

(اور اپنے دل کا رخ اپنے محبوب کی طرف کر لیں)

اس طرح کی عارفانہ گفتگو سے ہم نے غلط نتیجہ نکالا۔ ہم نے ایک غیر عقلی (anti-intellectual) رویہ اپنا لیا۔ علم سے دور رہنے لگے جس کے نتیجے میں تصوف نے ایک غیر علمی اور غیر عقلی شکل اختیار کر لی جس کے سبب کم علم صوفیا غیر اسلامی نظریات کا شکار ہو گئے۔ وہ جاہلیت کے حملوں کو نہ سمجھ سکے۔ رام اور رحیم کو، کرما اور کریم[1] کو ایک سمجھنے لگے۔

(8)۔ اس صوفیانہ سوچ سے ایک بہت بڑا نقصان ذات کی نفی (negation of self) کی صورت میں سامنے آیا جس سے شخصی آزادی اور ارتقا رک گیا۔ صوفی نے اپنی ذات کو شیخ میں فنا (فنا فی الشیخ) کرنا تھا۔ پھر نبی پاک ﷺ کی ذات میں فنا (فنا فی الرسول ﷺ) اور پھر خدا کی ذات میں فنا (فنا فی اللہ) کرنا تھا۔ اس نفسیاتی سوچ نے وحدت الوجود (Pantheism) کو جنم دیا کہ آپ اللہ تعالیٰ کی ذات کا حصہ بن جائیں گے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے فنا کی اس سوچ کے مضمرات کو سمجھا۔ اس فنا کے بعد بقا کو اپنایا۔ خدا تعالیٰ کی ذات میں اپنی ذات کو گم کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ خدا عزوجل کے رحم و کرم پر ہوتے ہوئے اپنی ذات کا تشخص (identity) قائم رکھا۔ ذات کا یہ قیام (affirmation) انسانی ترقی کا بنیادی لازمہ ہیں۔ جب تک انسان اپنی ذات کو آگے نہیں لائے گا، وہ کوئی بھی تخلیقی عمل نہیں کر سکتا۔ یہی

---

[1]۔ اس ضمن میں ہندوستان میں بارہویں صدی کی ابتدا میں بھگتی تحریک شروع کی گئی جس کا مقصد ہندوستان میں موجود تمام مذہبی خیالات کو ملا کر ایک نیا مذہبی تصور قائم کرنا تھا۔

ہمارے ساتھ ہوا۔ بڑے بڑے ذہن تصوف کی اس غلط تعبیر کی نذر ہو گئے۔ حیوانی صفات (animal instincts) کو ضبط کرنے کی بجائے ان کو فنا کرنے پر تل گئے۔ غیر ضروری عاجزی نے اعتماد ذات ہی ختم کر دیا۔ خودی میں ڈوب کر باہر نہ نکل سکے۔ حضرت اقبالؒ (d. 1938) نے صحیح ارشاد فرمایا ہے کہ

یہ ذکر نیم شبی، یہ مراقبے، یہ سرور
تیری خودی کے نگہبان نہیں تو کچھ بھی نہیں[1]

(9)۔ ہم اپنی ذات میں اعتماد کی بجائے فنا فی مرشد میں (فنا فی الشیخ) کے چکر میں پڑ گئے۔ قرآن مجید نے آسمان وزمین کی طرف بلایا تھا ہم نے کہا کہ شیخ کی اطاعت کرو۔ بقول حافظ شیرازیؒ:

بامئے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا[2]
(اگر پیر صاحب کہیں تو پیالہ شراب سے بھر لو، اس لیے کہ شیخ
صاحب کو منزل کے راستوں کا عرفان حاصل ہوتا ہے)

اس نظام فکر سے غیر صحتمندانہ شخصی تقدس اور شخصیت پرستی (personality cultism) نے جنم لیا جو بذات خود تحقیق و تعلیم کی دشمنی ہے۔ یہ سوچ جب آگے بڑھی تو اس نے نعرہ لگایا کہ ولایت نبوت سے بہتر ہے۔ ولی (پیر) نبی سے زیادہ اہمیت اختیار کر دیا جو سراسر غیر اسلامی سوچ تھی۔

(10)۔ تقویٰ کے نام پر ہم نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ جائز نعمتیں بھی اپنے اوپر حرام کر لیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ایک بار ایک معمولی وجہ سے ارادہ فرمایا کہ آپ ﷺ آئندہ شہد نہیں کھائیں گے۔ اس ارادہ پر اللہ پاک نے ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ[3]

(اے نبی ﷺ! جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے لئے حلال کر دیا ہے

---

[1]۔ تصوف؛ ضرب کلیم از محمد اقبالؒ
[2]۔ غزل اول: بیت چہارم۔ دیوان حافظؒ از حافظ محمد شیرازیؒ
[3]۔ سورۃ التحریم: آیت: 1

اسے آپ ﷺ کیوں حرام کرتے ہیں؟)

جبکہ ہم نے اب بہت سی نعمتیں آپ ﷺ کی غلامی کے نام پر اپنے لیے ترک کرلی ہیں۔

میرے ایک پیارے دوست نے ایک بار مجھے پورے اعتماد میں لے کر بتایا کہ ان کے پیر صاحب بہت عبادت گزار تھے۔ انہوں نے ایک ٹہنی پکڑ کر کئی سال ایک ٹانگ پر کھڑے ہوکر عبادت کی۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا اور میں نے عرض کیا کہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کی سنت نہیں ہے۔ آپ ﷺ آرام بھی فرماتے تھے۔ کام بھی کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے ساری رات عبادت سے منع فرمایا ہے۔ سارا سال روزے رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ آقائے نامدار ﷺ نے تو ہمیں اعتدال کا سبق دیا ہے۔ حدیث مبارکہ ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: دین بہت آسان ہے۔ پس تم لوگ میانہ روی اختیار کرو اور (اعتدال سے) قریب رہو اور خوش ہو جاؤ (کہ تمہیں ایسا دین ملا) اور صبح اور دوپہر کے بعد اور کچھ رات میں عبادت کرنے سے دینی قوت حاصل کرو[1]۔

ایسا طرز عمل غلط ہے اور اسلام میں سختی سے ممنوع ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ہمیں اعتدال کا سبق دیا اور درمیانے راستے پر چلنے کی تلقین کی ہے۔ اس قسم کی انتہا پسندانہ عبادت سے مجھے یاد آیا کہ سینٹ میکیر لیس چھ ماہ تک ایک دلدل میں رہتا رہا اور عام طور پر ایک من لوہے کا وزن اپنے گلے میں رکھتا تھا۔ ہمارے بھی ملنگ یہی کرتے ہیں۔ زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں۔ سینٹ یوسیس تین سال تک ایک خشک کنویں میں مقیم رہا۔ مشہور راہب یوحنا مسلسل تین سال تک کھڑے ہوکر عبادت کرتا رہا۔ سونے کے لیے بس ایک چٹان پر لیٹ جاتا تھا۔ سینٹ انتھونی نے کبھی پیر دھونے کا گناہ نہیں کیا تھا۔ سینٹ ابراہم نے پچاس سال میں کبھی اپنا منہ نہیں دھویا۔ سبحان اللہ! کیا تقویٰ تھا؟ یہ روایت اسلام میں ممکن نہیں ہے[2]۔

(11)۔ ہمیں اس تصوف کو غیر اسلامی اور غیر انسانی نظریات سے پاک کرنا ہوگا۔ روحانیت اللہ پاک کی ذات عالی کی حضوری اور حضور نبی کریم ﷺ کی غلامی کا نام ہے۔ ہمیں نبوی مزاج اپنانا

---

[1]۔ صحیح بخاری۔ جلد اول: رقم: 38

[2]۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر از سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ صفحہ نمبر 212 بحوالہ تاریخ اخلاق یورپ از لیکی

ہوگا۔ انسانوں میں رہتے ہوئے اعلیٰ اخلاق اور روحانی واردات رکھتے ہوئے عمومی فلاح کے لئے کام کرنا ہوگا۔ روحانی تجربے اور نفسیاتی بیماریوں میں فرق کرنا ہوگا۔ انسانیت سے محبت کرنا ہوگی۔ عاجزی پیدا کرنا ہوگی۔ دین کی اشاعت کے لئے اپنے آپ کو گھولنا ہوگا۔ اجتماعیت میں انفرادیت ڈھونڈنا ہوگی۔ نیلے پیلے رنگوں اور نفسیاتی خوابوں سے نجات پانا ہوگی۔ طریقت کو شریعت کے تابع کرنا ہوگا۔

یہ حکمتِ مَلکوتی، یہ علم لاہُوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں[1]

(12)۔ اگر تصوف حقیقی ہو تو وہ ہمیں اس جدید دنیا میں بہت کام دے سکتا ہے جس میں لوگ مال و دولت اور عیش و آرام کے لئے ہلکان ہوئے جا رہے ہیں اور مادی آسائشوں کو زندگی کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

(i)۔ حقیقی تصوف ہمیں اپنے خالق سے محبت اور اس کی اطاعت سکھاتا ہے۔

(ii)۔ ہم خدا کی اس طرح عبادت کریں جیسے ہم اسے دیکھ رہے ہیں یا کم از کم ہم یہ سمجھیں کہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔

(iii)۔ تصوف یہ سکھاتا ہے کہ ہم حضور نبی کریم ﷺ کی حیات طیبہ کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں اور ان کی اقدار کو اہمیت دیں۔

(iv)۔ تصوف یہ تعلیم دیتا ہے کہ ہم اس اندھیرے کے پردوں کے پار دیکھیں، جو ہمارے نظامِ اخلاق کی شکل بگاڑتا ہے اور یہ کہ روحانی تربیت ہمیں چیزوں کو ان کے حقیقی روپ میں دیکھنے کے قابل بنا سکتی ہے۔

(v)۔ ہم اس دنیا کے 'لئے' ہو سکتے ہیں لیکن اس دنیا کے نہیں۔

(vi)۔ تصوف نظر کی پاکیزگی کا سبق دیتا ہے تاکہ ہم پاکیزگیٔ روح کی ضمانت حاصل کر سکیں۔

(vii)۔ تصوف دل میں محبت شفقت اور عدل جاگزیں کرتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ چالاکیوں، استحصال

۱۔ تصوف؛ ضرب کلیم از محمد اقبالؒ

بددیانتی اور بے راہ روی سے کیسے محفوظ رہا جائے۔

(viii)۔ تصوف ادب واحترام، خدمت اور سب سے یکساں سلوک سکھاتا ہے۔

(ix)۔ تصوف انسانوں اور ماحول (جانوروں، پھولوں، میووں، پتوں اور درختوں) سے محبت کا درس دیتا ہے۔

(x)۔ یہ ہمیں اپنے تکبر، حرص، بے صبری، غصے اور خودنمائی کو کنٹرول کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔

(xi)۔ ہم اپنے ذہنوں کو غرور، حرص اور نمود ونمائش اور ماضی و مستقبل کے تفکرات سے آزاد کر سکتے ہیں۔

(xii)۔ ہم دکھ درد میں صابر بننا سیکھ سکتے ہیں جیسا کہ اللہ ہمیں درد اور مسرت، خوشیوں اور غموں کے ذریعے صبر وضبط کا درس دیتا ہے۔

مولانا رومیؒ (d. 1273) فرماتے ~~ہیں کہ خدا~~ تمہیں ایک احساس سے دوسرے احساس تک پلٹا تا ہے اور تمہیں متقابلات کے ذریعے ہدایت دیتا ہے تا کہ تمہارے پاس اڑان کے لیے دو 'پر' ہوں نہ کہ 'ایک'۔



بیسواں باب

مسلم اقلیت کی ذمہ داریاں

وَمَنۡ يُّهَاجِرۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ يَجِدۡ فِى الۡاَرۡضِ مُرٰغَمًا كَثِيۡرًا وَّسَعَةً[۱]
(جوکوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے وسیع جگہ اور بسر اوقات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا)

آج مسلمان دنیا میں دوسرا بڑا مذہبی گروپ ہیں۔ 2015ء کی ایک شماریاتی تحقیق کے مطابق مسلمانوں کی تعداد ایک ارب ستر کروڑ (1.7 بلین) ہے جو کل عالمی آبادی کا 22/23 فیصد ہیں[۲]۔ اسلام مشرق وسطیٰ، شمالی افریقہ، قرنِ افریقہ، ساحل اور ایشیا کے بعض حصوں میں ایک اکثریتی مذہب ہے۔ لگ بھگ باسٹھ فیصد (62%) مسلمان جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا میں رہتے ہیں۔ یہ تعداد ایک ارب ہے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مغربی چین، بلقان (مشرقی یورپ کا ایک حصہ جو بحیرہ اسود، ایجین اور ایڈریاٹک سمندروں سے گھرا ہوا ہے) بھارت اور روس میں رہتی ہے۔ مغربی یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا میں بھی مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے۔ آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (OIC) ستاون (57) مسلم ریاستوں (بشمول فلسطین) کی نمائندہ ہے۔

(1)۔ غیر مسلم ریاستوں میں رہنے والے مسلمانوں کے حقیقی مسائل از سر نو غور و فکر کے متقاضی ہیں کیونکہ مسلم اکثریت کے حامل ممالک سے مغربی ملکوں کی طرف بڑے پیمانے پر ہجرت ہو رہی ہے۔ زمانۂ جنگ میں جدید تصورِ شہریت محض قانونی رہائش یا اظہار وفاداری سے کہیں زیادہ چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ ایسی چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے جو محض قوانین کی پابندی کا عہد کرنے سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ جدید شہریت وہاں پہلے سے موجود تمام شہریوں کے ساتھ یکجہتی کا مطالبہ کرتی ہے جو بالعموم مذہبی اور نسلی طور پر مختلف ہوتے ہیں۔ مسلمان شہریوں اور مغربی ممالک کے مستقل باشندوں کو سیاسی آزادخیالی کی اس قسم (برانڈ) کو لازماً قبول کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔ جدید مسلم دانشور فقہ الاقلیات (Jurisprudence of Muslim Minorities) کے نام پر ان سیاسی و معاشرتی حقیقتوں سے ہم آہنگی اختیار کرنے کی کوشش

۱۔ سورۃ النساء: آیت:100

۲۔ http://www.gordonconwell.edu/resources/

کر رہے ہیں۔ یہ مسلم اہل دانش اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ مغربی ممالک میں مسلمان اپنے لئے خودمختار حکومت کا مطالبہ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ آزاد خیال معاشرے مسلم اقلیتوں کو متوازی قانونی دائرہ اختیار عطا نہیں کر سکتے اور یہ کہ مغربی ریاستوں میں جدید شہریت تمام مذاہب کے ماننے والوں سے یہ توقع رکھتی ہے کہ وہ اخلاقی اور معاشرتی یکجہتی کا اظہار کریں گے۔

(2)۔ کیا مسلمان قرآنی احکامات کی روشنی میں ایک غیر مسلم ریاست میں رہ سکتے ہیں؟ کیا مغربی ممالک زمانۂ جنگ میں مسلمانوں سے وفاداری کا مطالبہ کر سکتے ہیں جب کہ یہ ان کے ساتھی مسلمانوں سے متعلقہ فرائض سے متصادم ہو؟ کیا مسلمان مغرب میں ایسی اخلاقیات (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کوفروغ دے سکتے ہیں جیسے کہ یہ رویہ جسے مسلمان قابل نفرت سمجھتے ہیں مثلاً ہم جنسیت اور کلماتِ کفریہ؟

مسلم فقہاء کرامؒ اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ مسلمان غیر مسلم ماحول کے اندر رہ سکتے ہیں کیونکہ قرآن مجید میں اس کی گنجائش موجود ہے۔

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا [1]

(ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے درجات ہیں، مغفرت اور محبت ہے۔ اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)

فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا [2]

(اور ان کے لیے بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر کرنے والا ہے)

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ
وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ
فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا [3]

۱۔ سورۃ النساء: آیت:96

۲۔ سورۃ النساء: آیت:99

۳۔ سورۃ النساء: آیت:100

(جوکوئی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سی جگہ اورگزران کی کشادگی پائے گا اور جوکوئی اپنے گھر سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نکل کھڑا ہوا پھر اسے موت نے آلیا تو یقیناً اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہوگیا اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا، مہربان ہے)

ایک قدیم فقیہ کا یہ موقف کہ مسلموں اور غیر مسلموں کے تعلقات کی بنیادی حیثیت جنگ ہے اور جنگ کی بنیاد لادینی ہے۔ یہ موقف موجودہ زمانے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کمزور نظریئے کا ایک ممکنہ نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ غیر مسلم بے دھڑک مسلمانوں کو قتل کرتے جائیں جو ان کی اس سوچ کا ایک فطری نتیجہ ہوگا کہ مسلمان اور غیر مسلم مستقل طور پر حالتِ جنگ میں ہیں۔

(3)۔ تاہم قرآن مجید کی چند آیات ہیں جو بظاہر اس کے برعکس اشارہ دیتی ہیں:

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ[1]۔

(مومنین اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور یار و مددگار ہرگز نہ بنائیں)

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ[2]

(اے ایمان والو! تم اپنا دوست ایمان والوں کے سوا اور کسی کو نہ بناؤ۔ وہ تمہاری خرابی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ وہ تو چاہتے ہیں کہ تم دکھ میں پڑے رہو۔ ان کی عداوت ان کی زبان سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو ان کے سینوں میں پوشیدہ ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ہم نے تمہارے لیے آیات بیان کردیں تاکہ تم سمجھ جاؤ)

الَّذِیْنَ یَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا[3]

۱۔ سورۃ آلِ عمران: آیت: 28

۲۔ سورۃ آلِ عمران: آیت: 118

۳۔ سورۃ النساء: آیت: 139

(یہ لوگ مسلمانوں کو چھوڑ کر کفار کو دوست بناتے ہیں کیا ان کفار کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں۔ ہر قسم کی عزت تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ[1]

(اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! یہود و نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو انہیں دوست بنائے گا تو یقیناً وہ انہی میں سے ہوگا۔ بیشک اللہ عز وجل ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا)

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ[2]

(مومنوں کو چاہیے کہ ایمان والوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا اس کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ مگر یہ کہ ان کے شر سے بچنے کے لیے ایسا کرے اور اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈرا رہا ہے اور اللہ پاک ہی کی طرف لوٹ جانا ہے)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا[3]

(اے صاحب ایمان لوگو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی صاف حجت قائم کرلو؟)

بعض دانشور یہ دلیل دیتے ہیں کہ غیر مسلموں سے دوستی کی ممانعت کے متعلقہ آیات کے وہ معانی نہیں ہیں جو عموماً ان سے لئے جاتے ہیں۔ تاہم یہ آیات بظاہر غیر مسلموں سے دوستانہ تعلقات اور

۱۔ سورۃ المائدہ: آیت: 51

۲۔ سورۃ آلِ عمران: آیت: 28

۳۔ سورہ النساء: آیت: 144

وفاداریاں نبھانے سے روکتی ہیں۔ اگر ہم ان آیات کی لفظی تعبیر کریں تو پھر مسلمان ایک غیر مسلم ریاست کا تحفظ یا سرپرستی قبول نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ان آیات کو مناسب انداز میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

یہ آیات مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معمول کے معاشرتی اور سیاسی تعلقات کی ممانعت نہیں کرتیں بلکہ ان سے ایسی مذہبی اور سیاسی وفاداری سے باز رہنے کے لئے کہتی ہیں جو مسلم کمیونٹی یا بحیثیت مجموعی سب مسلمانوں کے مفادات کے لئے نقصان دہ ہو۔ مسلمانوں کو غیر مسلموں سے اتنے گہرے تعلقات نہیں رکھنے چاہئیں جن کی وجہ سے ان کے اندر اخلاقی مفاسد پیدا ہوتے ہوں اور نہ ہی انہیں مذہبی معاملات، سیاسی اتحاد یا وفاداریوں کے سلسلے میں مسلمانوں پر غیر مسلموں کو ترجیح دینی چاہیے۔ مزید برآں یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں تھیں جب قرونِ اولیٰ کے مسلمان مخاصمانہ ماحول کے اندر محض اپنی بقا کی لڑائی لڑ رہے تھے۔ جہاں اسلام اور کفر کے درمیان مسلسل کشمکش برپا تھی۔ یہ آیات مسلمانوں کی اقلیتی حالت سے متعلق نہیں ہیں۔

مزید برآں یہ آیات دو خصوصی صورت احوال کی طرف اشارہ دیتی ہیں۔ ان لوگوں سے محبت رکھنا جو مسلمانوں سے ان کے مذہب کی بنا پر لڑ رہے ہوں اور ان سے ان کے کفر کی وجہ سے محبت رکھنا[1]۔

(4)۔ تاہم 'حُبِ فطری' (Innate love) اور 'حُب عقیدی' (creedal love) میں ایک فرق ہے۔ مسلمان اچھے تعامل یا مشترکہ مفاد کی خاطر غیر مسلموں سے حبِ فطری رکھ سکتے ہیں مگر حبِ عقیدی نہیں رکھ سکتے۔ اسلامی اخوت کے علاوہ انسانی اخوت اور قومی اخوت ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید کی درج ذیل آیات اس نقطے کی اچھی وضاحت کرتی ہیں۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ[2]

(اور عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی حضرت ہود علیہ السلام کو بھیجا۔ اس نے کہا: 'اے برادرانِ قوم! اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے؟)

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۭ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ

---

[1] تفسیر المنار از راشد رضا بحوالہ سورۃ آلِ عمران: آیت: 127-128

[2] سورۃ الاعراف: آیت: 65

غَيْرُهٗ[1]

(اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب علیہ السلام کو بھیجا۔ اس نے ان سے کہا: 'اے میری قوم کے لوگو! اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے)

ان آیات میں سابق ابراہیمی انبیاء علیہم السلام کا حوالہ ان کے کافر، گناہ گار اور ظالم برادران و رشتہ داران کے طور پر دیا گیا ہے[2]۔ اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ قرآن مجید پیغمبروں علیہم السلام کے غیر مسلموں کے ساتھ معمول کے دوستانہ و برادرانہ تعلقات کی اجازت دیتا ہے۔

(5)۔ اسی طرح مسلم فقہاء کرامؒ اس امر سے اتفاق کرتے ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ معاہدوں کی اسی طرح پاسداری کی جانی چاہیے جیسے مسلمانوں کے باہمی معاہدوں کی پابندی لازمی قرار دی گئی ہے۔ ان معاہدوں کو 'امان' (معاہدۂ تحفظِ باہمی) کہا جاتا ہے۔ اسلام میں یہ معاہدے مسلمانوں کو پابند بناتے ہیں کہ وہ ان کے تحت عائد ہونے والی اپنی اخلاقی اور قانونی ذمہ داریاں پوری کریں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جو کوئی معاہدے کی خلاف ورزی کرے گا قیامت کے روز اس کے لئے ایک جھنڈا اٹھایا جائے گا تا کہ اس کے دھوکے کا پتہ چل جائے[3]۔

یہ عام طور پر مسلمہ رسمِ امان ایک غیر مسلم ریاست کے مفادات کے احترام کا جواز مہیا کرتی ہے جب تک ایک مسلمان وہاں رہتا ہے۔ عہد حاضر میں 'ویزا' یا 'توطن' (naturalization) کا نظام، امان کے مساوی قانونی اور اخلاقی اہمیت رکھتا ہے۔ لہٰذا یہ غیر مسلم ریاستوں کے حق میں قانونی اور سیاسی ذمہ داریاں پیدا کرتا ہے[4]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فقہ اسلامی ایک مسلمان کو اس امر کا پابند بناتی ہے کہ وہ جس ملک میں رہائش رکھتا ہو وہاں کے قانون کی پابندی کرنا اس کے لئے ایک اخلاقی اقرار نامہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا اپنے ایمان اور ضمیر کے ساتھ وفاداری اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ ایک مسلمان اپنے ملک کے

---

[1]۔ سورۃ ہود: آیت: 84

[2]۔ الخصائص العامہ لی الاسلام از یوسف عبداللہ القرضاویؒ۔ صفحہ نمبر 98

[3]۔ کتاب المبسوط از امام سرخسیؒ۔ جلد دہم: صفحہ نمبر 105

[4]۔ فقہ العقلیات از عبدالقادر۔ صفحہ نمبر 160

ساتھ دیانتدارانہ وفاداری کرے اور شریعت مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنی جائے رہائش کے ملک کے دستور کے دائرے کے اندر رہ کر وہاں کا ایک دیانتدار اور وفادار شہری بنے[1]۔

(6)۔ درج ذیل آیاتِ قرآنی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اقلیت ایسے ممالک میں رہ سکتی ہے جہاں غیر مسلم اکثریت میں ہوں:

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا[2]

(ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے اور اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے)

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا[3]

(ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے)

فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا[4]

(بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں معاف کر دے۔ اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے)

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا[5]

(اور جو کوئی اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں پناہ لینے کے لئے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا اور جو اپنے گھر سے اللہ تعالیٰ

---

[1]۔ To be a European Muslim by Tariq Ramadan, p. 171.

[2]۔سورۃ النساء: آیت:96

[3]۔سورۃ النساء: آیت:98

[4]۔سورۃ النساء: آیت:99

[5]۔سورۃ النساء: آیت:100

اور رسول ﷺ کی طرف ہجرت کے لئے نکلے، پھر راستہ ہی میں اسے موت آجائے، اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمے واجب ہوگیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے)

(7)۔ یورپی کونسل برائے فتویٰ وتحقیق کے رہنما جناب فیصل مولویؒ[1] (d. 2011) اور علامہ یوسف القرضاویؒ[2] اس اصول کی بنیاد پر مزید آگے بڑھتے ہوئے یہ دلیل دیتے ہیں کہ اگر کسی کی رہائش غیر مسلم ریاست ایک مسلم ریاست پر حملہ کر دے تو اس زمانے میں وہاں موجود مسلمانوں کی 'خود لگامی' (ضبط نفس) کے فریضے میں مزید توسیع ہو جاتی ہے[3]۔ بعض سکالرز 'نظریہ سیاسہ شرعیہ' (اسلامی قانون کی پالیسی) کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ ایسے وقت میں غیر مسلم ریاست کے دفاع میں لڑائی میں شریک ہوجانا بھی جائز ہے۔ اس جواز کی بنیادیں درج ذیل ہیں:

(i)۔ شریعت اس کی ممانعت نہیں کرتی، لہٰذا یہ جائز ہے۔

(ii)۔ شریعت کفریہ کلمات کو آگے بڑھانے کی ممانعت کرتی ہے۔ یہ وہ چیز نہیں جس کا جدید دور کی غیر مسلم فوج یا سیاسی نظام میں خدمت انجام دینے پر اطلاق ہوتا ہو[4]۔

(iii)۔ اگرچہ ایسی خدمت (سروس) ناخوشگوار ہے تاہم اس سے مسلمانوں کو چند ایک فوائد پہنچ سکتے ہیں۔ مثلاً مال وجان کی حفاظت اور غیر مسلم سیاسی ڈھانچے میں ان کی حیثیت کی بہتری۔

(iv)۔ اس طریق کار کا 'مقاصدِ شریعت' میں بھی جواز موجود ہے[5]۔

علامہ یوسف قرضاویؒ کا استدلال یہ ہے کہ بنیادی اصول یہ ہے کہ غیر مسلم حکومت کا حصہ بننا

۱۔ فیصل مولویؒ (1941ء-2011ء) ایک معروف لبنانی جج، فقیہ، اسلامی مبلغ اور مبصر تھے جو لبنان، عرب اور یورپ میں بہت معروف ہیں۔

۲۔ علامہ یوسف القرضاویؒ (1926ء- حیات) عالم اسلام کے ممتاز ترین عالم دین، اخوانی فکر کے حامل، صدر عالمی اتحاد برائے مسلم علماء ہیں۔

۳۔ http://www.fatwa-online.com

۴۔ Al-Ahkam al-Siyasiyya by Sarkhasi, p. 117.

۵۔ صناعۃ الفتویٰ وفقہ العقلیات از شیخ عبداللہ بن محفوظ بیہؒ۔ صفحہ نمبر 304

ممنوع ہے لیکن اس سے استثنا کے لئے چند ایک مسلمہ وجوہات ہیں مثلاً:

(i)۔ شر اور ناانصافی کم کرنے کے لئے جس حد تک جانا ممکن ہو۔

(ii)۔ دو برائیوں میں سے کمتر کو اختیار کر لینا۔

(iii)۔ اعلیٰ مثال سے نسبتاً کم تر حقیقت تک اُتر آنا۔

یہ درج بالا مستثنیات ان قانونی کلیات سے مربوط ہیں بشمول:

(الف)۔ ضرورت ممنوعہ چیزوں کو جائز کر دیتی ہے۔

(ب)۔ مشکل گوارہ کر لی جائے تو وہ باعث آرام بن جاتی ہے۔

(ج)۔ نہ زخم پہنچانا نہ ہی ادلے کا بدلہ پانا۔

(د)۔ مشکلات میں کمی لانا[1]۔

(8)۔ چند اہل علم حضرات ہیں جو غیر مسلم ریاستوں میں رہنے والے مسلمانوں کے مصالحتی رویئے کو 'دعوۃ' کے مقاصد (اسلامی مشینری سرگرمیوں یا تجدید اسلام کی مساعی) کو فروغ دینے کے لئے جائز قرار دیتے ہیں۔'دعوۃ' غیر مسلم ریاستوں میں قیام کے لئے ایک مضبوط، پُرمعنی اور ولولہ انگیز مقصد ہوتی ہے۔ یہ مصلحت (مفاد عامہ) ایک ایسی بے انتہا نیکی ہے کہ یہ ہر اس تحفظ کو زائل کر دیتی ہے جو کسی بھی باضمیر مسلمان کو اقلیتی شرط کے بارے میں ہو (ایک غیر مسلم اکثریت میں ایک مسلمان کا مقیم ہونا) ان کی مجبوریوں میں ایک غیر مسلم فوج کی ملازمت بھی شامل ہوسکتی ہے۔

اسی طرح علامہ یوسف قرضاویؒ یہ دلیل دیتے ہیں کہ کسی مسلمان کے ایک غیر مسلم ملک میں قیام کے جواز کے بارے میں کوئی سوال نہیں اٹھایا جا سکتا کیونکہ اگر ہم اس کی ممانعت کر دیں جیسا کہ بعض سکالرز کہتے ہیں تو پھر ہم غیر مسلموں کو اسلام کی طرف بلانے کے دروازے بند کر دیں گے۔ اگر ماضی میں ایسا کیا گیا ہوتا تو اسلام جزیرہ نمائے عرب میں ہی محدود ہو کر رہ جاتا۔ اگر ہم اپنی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ غیر مسلم ملکوں میں اسلام کی اشاعت بعض مسلمانوں کے انفرادی اثر و رسوخ کی وجہ سے ممکن ہوئی تھی جو ان ملکوں میں تاجروں اور صوفیوں کی شکل میں گئے۔ وہ اپنا وطن ترک کر کے دور دراز ممالک میں پہنچے جہاں وہ مقامی لوگوں سے گھل مل کر رہے، کاروبار کیے، رشتے ناطے

---

[1]۔ من فقہ الدولۃ فی الاسلام از یوسف عبداللہ القرضاویؒ۔ صفحہ نمبر 180

کیے۔ان کے اخلاق وحسنِ عمل سے لوگ ان کے مذہب سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔مقامی لوگوں نے انفرادی واجتماعی طورا سلام کو دل وجان سے قبول کیا۔

علامہ یوسف قرضاویؒ کہتے ہیں کہ مسلمان ایسے حالات میں بھی غیر مسلم ممالک کی افواج میں شامل ہو سکتے ہیں جب وہ فوجیں مسلمان ممالک کے خلاف جنگ لڑ رہی ہوں تا کہ غداری کے الزام سے بچ سکیں۔اگر یہ الزام لگ جائے تو اس سے وہاں مقیم مسلمانوں کے لئے سنگین خطرات پیدا ہو جائیں گے اوران کے دعوۃ کے کام کو بھی شدید نقصان پہنچ سکتا ہے۔وہ یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ اگر افراد نے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی خاطر جنگ میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تو اس سے اُس ملک کی مسلم آبادی خطرے میں پڑ جائے گی۔یہ دلیل ان فقہی اصولوں پر مبنی ہے کہ بڑے ضرر سے بچنے کے لئے کم درجے کے ضرر کو قبول کر لیا جانا چاہیے۔یہ کہ نجی ضرر کو اس لئے قبول کر لیا جائے تا کہ عمومی ضرر سے محفوظ رہا جا سکے اور یہ کہ گروہ کے مفاد کو فرد کے مفاد پر ترجیح حاصل ہے[1]۔

(i)۔ یہ نقطہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے کہ آج بیشتر مسلمان فقہاء کرامؒ کا عمومی موقف یہ ہے کہ دعوۃ نے جہاد کی جگہ لے لی ہے۔ان کا یہ موقف غیر مسلم ممالک کے صرف مسلم شہریوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ساری امتِ مسلمہ کے لئے ہے۔یہ نقطۂ نظر بیشتر قدیم فقہاء کرامؒ کے نظریئے سے دو وجوہ کی بنا پر متصادم ہے:

(الف)۔ جہاد ایک دفاعی تصور تھا۔جہاد کے بارے میں بیشتر آیات میں اسے ایک دفاعی جنگ کہا گیا ہے۔

(ب)۔ جہاد سے متعلق جارحانہ نوعیت کی آیات کو اس انتہا درجے کے عناد کے سیاق وسباق میں سمجھا جانا چاہیے جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں سے عرب مشرکین رکھتے تھے۔اسے غیر مسلموں کے بارے میں ایک عمومی جنگجو یانہ رویہ نہیں سمجھا جانا چاہیے۔

(ج)۔ حکم جہاد کے تحت عائد ہونے والا بنیادی فریضہ غیر مسلموں کا لڑ کر خاتمہ کرنا نہیں ہوتا بلکہ ایک فریضۂ دعوت ادا کرنا ہوتا ہے یعنی لوگوں تک اسلام کا عالمگیر پُر امن اور ترقی پسند پیغام پہنچانا ہے۔

(10)۔ اس صورت احوال کے ساتھ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ دعوت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان

1۔ http/www.fatwa-online.com

تعلقات کی بنیادی کیفیت (الاصل) ہے۔لوگوں کو پُر امن اور پوری اخلاقیات کے ساتھ اسلام کی طرف راغب کرنے کی خواہش ایک سیاسی آزادی کی طرح کا ایک عمل ہے اور یہ شہریت کے جدید تصور سے متصادم نہیں ہے۔قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ[1]

(اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے بہت اچھے طریقے کے ساتھ بحث کرو۔ یقیناً آپ کا رب زیادہ جاننے والا ہے جو اس کے راستے سے گمراہ ہوا اور وہ ہدایت پانے والوں کو بھی جاننے والا ہے)

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ڐ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ[2]

(دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے واضح ہوچکی ہے۔اس لیے جو شخص باطل معبودوں کا انکار کر کے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ خوب سننے، جاننے والا ہے)

(11)۔ ان آیات سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن پاک دعوت کے لئے خاص طریقے استعمال کرنے کا مطالبہ کرتا ہے۔جو درج ذیل ہیں:

(i)۔ موعظۃ الحسنہ: یہ اس امر کا مطالبہ کرتی ہے کہ غیر مسلموں سے خیر سگالی کے جذبے، دوستی، صبر اور خلوص سے پیش آیا جائے اور کھلے معاشرتی ماحول میں گفتگو کی جائے تاکہ مخاطب ایسا محسوس کرے کہ مسلمان دوست ہوتے ہیں اور اچھی نصیحت کرتے ہیں جس سے سب کو فائدہ اور خوشی

---

[1]۔سورۃ النحل: آیت:125

[2]۔سورۃ البقرہ: آیت:256

حاصل ہوگی[۱]۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ [۲]

(اوراے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیکی اور بدی برابر نہیں ہے۔تم برائی کا دفاع بہترین نیکی کے ساتھ کرو۔ دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑ چکی ہے وہ دلی دوست بن جائے گا)

وَقُلْ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُبِينًا [۳]

(اور میرے بندوں سے فرما دیں وہ اچھی بات کیا کریں بیشک شیطان ان کے درمیان جھگڑا ڈالتا ہے۔ بلاشبہ شیطان ہمیشہ سے انسان کا کھلا دشمن ہے)

مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ مِنْهَا ۖ وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِنْهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُقِيتًا [۴]

(جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر نظر رکھنے والا ہے)

(ii)۔ بہترین استدلال۔ (جدل) قرآن مجید مسلمانوں کو بہترین دلائل کے ساتھ گفتگو کرنے کا حکم دیتا ہے، جیسا کہ پیچھے مذکور آیت 'اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ[۵]' میں کہا گیا ہے (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔ تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہِ راست پر ہے)

۱۔ ارباب الدعوۃ فی القرآن از محمد حسین فضل اللہ۔ صفحہ نمبر 62

۲۔ سورۃ فصلت: آیت:34

۳۔ سورۃ الاسراء: آیت:53

۴۔ سورۃ النساء: آیت:85

۵۔ سورۃ النحل: آیت:125

یہ آیت اہل ایمان کو حکم دیتی ہے کہ وہ پہلے والے تصورات اور تعصّبات کو حذف کر کے گواہی اور شہادت پیش کرو اور عقل کے مسلمہ قواعد کے مطابق اور اچھا استدلال پیش کرو۔ اس کے لئے داعی اور مدعو کے درمیان شفافیت اور دیانت پر قائم رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کا مطلب معاندانہ، مجادلانہ اور حاصل صفر قسم کا ٹاکرا ہرگز نہیں ہے۔

(iii)۔ زور زبردستی سے اجتناب: اسلام میں مذہب کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہ کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ مثلاً

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ [1]

(دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے واضح ہوچکی ہے۔ اس لیے جو شخص باطل معبودوں کا انکار کر کے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ خوب سننے، جاننے والا ہے)

قرآن مجید حکم دیتا ہے کہ دعوت کو ہر قسم کے دباؤ یا جبر سے مبرا رکھا جائے کیونکہ ہر شخص اپنے کئے کا خود ذمہ دار ہے۔ جبر ایمان کو جنم نہیں دے سکتا۔ دعوۃ اسلامی معاشرے میں نظم ونسق کے دفاع کے کام سے مختلف چیز ہے جو کہ آزادئ اظہار پر چند قدغنیں عائد کرتا ہے۔ ایک غیر مسلم معاشرے میں دعوۃ کو کسی قوت، دھوکے یا جبر سے بالکل الگ تھلگ ہو کر آگے بڑھنا ہے۔

(iv)۔ حکمت ودانائی: اسلام تبلیغ کے کام میں حکمت کے اطلاق کا تقاضا کرتا ہے:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ [2]

(اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت کے ساتھ دعوت دو)

'حکمت' خصوصی وقت اور جگہ کے مطابق طریق ہائے کار اور ذرائع رسائی کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ زمینی حقائق کا فہم حاصل کرنے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس کے موثر ہونے کے لیے اپنے اندر لچک کی اہلیت

---

[1] ۔سورۃ البقرہ: آیت:256

[2] ۔سورۃ النحل: آیت:125

پیدا کی جانی چاہیے۔

حکمت کا یہ طریق کار دل جیتنے کے کسی خاص انداز کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا ایک حکم ہے۔حکمت تقاضا کرتی ہے کہ دوسرے کو پہچانا جائے اور معاشرے کے ساتھ ربط وضبط، یکجہتی رکھی جائے اور باہمی علم، بقائے باہم کا جذبہ اور تعاون کی فضا پیدا کی جائے۔

(12)۔ دعوۃ کا مطلب کسی کو تبدیلی عقیدہ کی تاکید کرنے کا نام نہیں۔ یہ طریق عمل ہر کسی سے اسلام قبول کرنے کی توقع نہیں کرتا بلکہ یہ اسلام پیش کرنے کا ایک کام ہوتا ہے۔خواہ وہ اسے قبول کرے یا نہ کرے۔ مسلمانوں کو اس سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ دعوۃ اس اصول پر مبنی ہے کہ یہ ہر شخص کا حق ہے کہ وہ علم پر مبنی ایک راہ کا انتخاب کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ سب کے سامنے اسلام کی صحیح تعلیمات پیش کریں خواہ ان کے مخاطبین مسلمان ہوں یا غیر مسلم[1]۔

(13)۔ دعوۃ کی بنیاد اسلامی عالمگیریت (universalism) ہے جو تمام بنی نوع انسان کی ابتدا، فطرت اور مقصد کے اشتراک کو تسلیم کرتی ہے۔ یہ ادراک قرآنی تعلیمات پر مبنی ہے۔

(i)۔ يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ[2]

(اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تا کہ تم پرہیزگار بن جاؤ)

(ii)۔ يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا[3]

(اے لوگو! بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل آ چکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایک واضح روشنی نازل کی ہے)

---

[1]۔ To be a European Muslim: A Study of Islamic Sources in the European Contex by Tariq Ramadan, p. 134.

[2]۔ سورۃ البقرہ: آیت:21

[3]۔ سورۃ النساء: آیت:174

(iii)۔ يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ[1]

(لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کرلیں ان کے لئے رہنمائی اور رحمت ہے)

(iv)۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ[2]

(اور اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے)

حضرت امام نوویؒ[3] (d. 1277) کی روایت ہے کہ الماوردیؒ[4] (d. 1058) بیان ہے کہ اگر ایک مسلمان کسی ایک غیر مسلم ملک میں اپنے مذہب کا اظہار کر سکتا ہے تو وہ ملک دارالسلام کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا وہاں قیام کرنا ہجرت کر جانے سے بہتر ہے۔ کیونکہ اس سے توقع کی جاتی ہے کہ اس کی موجودگی کی وجہ سے وہاں کے کئی اور لوگ بھی اسلام قبول کرلیں گے۔

زمانے کی تپش کو محسوس کرتے ہوئے بے حد روایتی علماء نے بھی اقلیتوں کے حالات سے متعلق اپنے موقف پر از سرِ نو سوچنا شروع کر دیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم (وائس چانسلر) ابوالقاسم نعمانیؒ نے کہا ہے کہ 'ہندوؤں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس ادارے نے مسلمانوں سے عیدالاضحیٰ کے

---

[1]۔ سورۃ یونس: آیت:57

[2]۔ سورۃ سباء: آیت:28

[3]۔ حضرت ابوزکریا یحییٰ بن شرف النوویؒ (1233ء - 1277ء) ایک بہت بڑے عالم، فقیہ، محدث اور مصنف تھے جو کثیر کتب کے مصنف ہیں۔

[4]۔ حضرت ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردیؒ (972ء-1058ء) ایک نامور اسلامی سکالر تھے۔ آپؒ نے سیاسی اضطراب کے زمانے میں دین، حکمرانی، خلافت، پبلک اور دستوری قانون پر بہت سی قابل قدر کتابیں لکھیں۔ آپؒ کی اہم تصانیف احکام حکومت اور الاحکام السلطانیہ والولایۃ الدنیا اور خلافتی فرائض کی تصریحات ہیں۔

موقع پر گائے کی قربانی نہ کرنے کی اپیل کی ہے[1]۔

یہ فتویٰ اقلیتوں کے حالات کے بارے میں اسلام کی ترقی پسندانہ اور انسانی تعبیر کا اظہار ہے۔ یہ عصر حاضر کا ایک عمل ہے جو مندرجہ بالا دلائل کی تائید کرتا ہے۔ ذرا ایک لمحے کے لئے اس اہم آیت قرآنی پر غور کیجئے:

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيٓ أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوٓا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولٰٓئِكَ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَآءَتْ مَصِيرًا[2]

(جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے، ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانہ ہے)

یہ آیت بتاتی ہے کہ اگر مسلمان کسی غیر مسلم ریاست میں اذیت محسوس کریں یا وہاں اپنے مذہب پر عمل کرنے میں رکاوٹیں پائیں تو وہ کسی اسلامی ریاست میں ہجرت کر سکتے ہیں۔ جہاں ان کے لئے اپنے ایمان کے مطابق عمل کرنے میں آسانی ہو۔ تاہم زمینی حقیقت مختلف ہے۔ بعض مسلمان علماء اور سیاسی فعالیت پسندوں نے اپنے ملکوں میں اذیتوں کا سامنا کیا اور غیر مسلم ریاستوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ خاص طور پر انہی مغربی ریاستوں کا رُخ کرنا پڑا جنہیں وہ پسند نہیں کرتے۔ یہ ایک عجیب صورت حال ہے کہ وہ لوگ جو اپنی مسلم ریاستوں میں پہنچنے والی اذیتوں سے بچنے کے لئے غیر مسلم ملکوں میں پناہ پاتے ہیں وہ بھی ان مغربی ملکوں کے عمومی سیاسی یا شہری نظام کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں جو پھر بھی زیادہ تر اس غیر معقول رویئے کو برداشت کر لیتے ہیں۔

---

[1]۔ http://www.thehindu.com

[2]۔ سورۃ النساء: آیت: 97

اکیسواں باب

قومی ریاست اور وحدت امت

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ[1]

(لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو (اس لئے نہیں کہ تم ایک دوسرے سے نفرت کرو))

(1)۔ 'خلافت' کا لفظ 'خلیفہ' (جانشین) سے نکلا ہے جو مسلم قوم کا حکمران ہوتا ہے۔ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے پردہ فرما گئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین (بطور سیاسی اتھارٹی) منتخب ہوئے تو انہیں خلیفہ رسول اللہ (پیغمبرِ خدا کا جانشین) کہا جاتا تھا۔ قرآن مجید میں اسی طرح یہ اصطلاح اسی مفہوم میں حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت داؤد علیہ السلام تک بطور خلفائے خدا استعمال ہوتی رہی۔ جب فرشتوں سے گفتگو کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ[2]

(اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں زمین میں نائب بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا: کیا آپ زمین میں ایسا نائب بنائیں گے جو اس میں فساد کرے گا اور خون بہائے گا جبکہ ہم حمد وثناء کے ساتھ تیری تسبیح و تقدیس بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے)

۱۔ سورۃ الحجرات: آیت: 13

۲۔ سورۃ البقرہ: آیت: 30

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ [1]

(اے داؤد علیہ السلام! ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے لہٰذا لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کریں)

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْــًٔـا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ [2]

(اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، انہیں اللہ تعالیٰ زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو بنا چکا ہے۔ ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط کرے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند فرمایا ہے اور ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا۔ بس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ فاسق ہیں)

(2)۔ بعض ایسے اہل دانش وعلم ہیں جن کا استدلال یہ ہے کہ پوری 'امتِ مسلمہ' کے لئے ایک ہی خلیفہ ہونا چاہیے۔ عربی میں امہ سے مراد 'عوام' ہیں اور یہ لفظ خصوصاً ان مسلمانوں کا حوالہ دیتا ہے جن کا نظریۂ حیات (ideology) اور تہذیب وثقافت ایک ہو۔ لفظ 'امہ' اس کے محتاط ومخصوص مفہوم کے علاوہ عربی میں یہ عمومی مفہوم میں بھی مشترک مفاد رکھنے والے عوام (community of people) کے لیے آیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد مبارک ہے کہ

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ

[1]۔ سورۃ ص: آیت: 26

[2]۔ سورۃ النور: آیت: 55

مِنۡهُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَ اَكۡثَرُهُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ[1]

(تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے بنائی گئی ہے کہ تم نیک باتوں کا حکم کرتے اور بری باتوں سے منع کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔ ان میں ایمان والے بھی ہیں لیکن ان کے اکثر فاسق ہیں)

لفظ اُمَّہ کی مزید وضاحت میثاق مدینہ (دستورِ مدینہ) سے ہوتی ہے جس کے لئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 622ء میں مدینہ کے سرکردہ قبیلوں سے مذاکرات کئے۔ ان میں یہودیوں، عیسائیوں اور لامذہب شہریوں کا واضح طور پر 'اُمَّۃ واحدہ' کے ارکان ہونے کا حوالہ دیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی متذکرہ بالا آیات سے اس امر کی خاصی وضاحت ہوگئی ہے کہ قرآن مجید عالمگیر خلافت کے قیام کا حکم نہیں دیتا بلکہ یہ ایک سیاسی تشکیل ہے جو کہ ایک تاریخی عمل ہے۔ مسلمان روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ (نائب) اور انہیں کہا گیا ہے کہ اگر وہ کسی رقبے یا علاقے میں اپنا کنٹرول قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو وہاں اس کے احکامات کی پابندی کریں۔ وہ ان احکامات کو دستیاب سیاسی حالات میں زمانے کی سپرٹ کے مطابق بروئے کار لائیں۔

(3)۔ جدید قومی ریاست جدید تاریخ میں ایک سیاسی فکر و عمل کے ارتقاء کا ایک ماحصل ہے۔ جدید قومی ریاست 1648ء میں ویسٹ فیلیا معاہدۂ امن[2] (Peace of Westphalia) کے بعد ظہور پذیر ہوئی جو رومی مقدس حکومت (Holy Roman Empire) کی آخری شکست و ریخت کا نتیجہ تھی۔ اس 'معاہدے' نے رومی مقدس حکومت (Holy Roman Empire) کے اندر تیس (30) سالہ خونریز جنگ (1618ء-1648ء) اور سپین اور ڈچ ری پبلک کے مابین اسی (80) سالہ جنگ (1568ء-1648ء) کے بعد یورپ کے روحانی اور دنیاوی اتحاد کو بالکل تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

---

[1]۔ سورۃ آلِ عمران: آیت:110

[2]۔ معاہدہ ویسٹفیلیا (Peace of Westphalia) امن کے معاہدوں کا ایک سلسلہ تھا جو 1648ء میں مئی اور اکتوبر تک 'آسنابرک' (Osnabruck) اور 'منسٹر' (Munster) کے شہروں میں طے کئے گئے تھے۔

ایک قومی ریاست کی یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ ایک قائم بالذات جغرافیائی وجود جس کی شناخت یہ ہو کہ اس نے اپنا سیاسی جواز مطلق العنان رہ سکنے والی قوم کے طور پر حاصل کیا ہو۔ اس کا موازنہ کسی کثیر القومی ریاست، کسی شہری ریاست، کسی ایک بادشاہت، کسی ایک وفاق یا کسی دیگر ذی اختیار ساخت کے ساتھ کیا جا سکتا ہو۔ قومی ریاستیں اپنی تاثیر(effectiveness) کے لئے ایک واضح مرکزی کنٹرول کی حامل ہوتی ہیں اور اپنی خود مختار حیثیت پر عمل درآمد کی اہلیت رکھتی ہیں اور ایک دوسرے کی حاکمیت اور علاقے کو تسلیم کرتی ہیں۔ نظری اعتبار سے جدید قومی ریاست پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں سیاسی معیشت، سرمایہ داری، تاجریت، سیاسی جغرافیہ اور سیاسی فلسفہ کے شعبوں میں ذہنی ارتقا کی ایک ضمنی پیداوار ہے۔

'قومی ریاست' کے ظہور سے قبل متعدد بادشاہتیں موجود تھیں۔ مثلاً آسٹریا کی بادشاہت، فرانس کی بادشاہت، ہنگری کی بادشاہت، عثمانیوں کی بادشاہت، مغل بادشاہت، صفوی بادشاہت، برطانوی بادشاہت وغیرہ۔ یہ قومی ریاستیں کثیر النسلی بادشاہتیں تھیں جن پر ایک بادشاہ، ایک شہنشاہ، ایک سلطان یا ایک خلیفہ حکمران تھا۔

(4)۔ مسلمانوں کو سلطنتوں اور خلافتوں کا تاریخی تجربہ حاصل ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے شہری ریاست مدینہ منورہ قائم فرمائی جس کا ایک تحریری دستور تھا جسے میثاقِ مدینہ کہا جاتا تھا۔ یہ ریاست 622ء میں آپ ﷺ کے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچنے کے فوراً بعد قائم ہوئی۔ اس دستور کے لیے ہجرت کر کے آنے والے قبیلہ قریش اور آٹھ دیگر مقامی قبیلوں کے درمیان مذاکرات ہوئے۔ ان قبیلوں میں یہودی قبائل بھی شامل تھے۔ اس دستور نے ایک کثیر مذہبی ریاست کے لیے قانونی بنیاد تشکیل کر دی اور سب کو ایک قومی امہ(one nation) قرار دیا۔ یہ قومی امہ(nation) سب لوگوں سے منفرد تھی[1]۔

حضور نبی کریم ﷺ 632ء میں دنیا سے پردہ فرما گئے اور مدینہ کی شہری ریاست خلافتِ راشدہ میں تبدیل ہو گئی۔ یہ چار خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیاسی و مذہبی قیادت کے ماتحت تھی۔ یہ

1۔ The First Written Constitution in the World by Dr. Muhammad Hamidullah

خلافت بتدریج وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی جس نے میسوپوٹیمیا (عراق وشام)، مشرقی بحیرۂ روم، اناطولیہ، سلطنتِ ساسانیہ، شمالی افریقہ (مصر اور تیونس)، کوہ قاف اور جزیرہ نمائے عرب کو فتح کر لیا۔ خلافت راشدہ کے بعد بنی امیہ کی سلطنت قائم ہوگئی جس کی بنیاد حضرت امیر معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ نے رکھی اور اس کا خاتمہ مروان ثانی کی وفات پر 750ء میں ہوا۔ بنی امیہ نے مسلمانوں کی فتوحات کا دائرہ کا کیشیا، ماوراالنہر (ٹرانسوکشیانہ)، سندھ، مغرب اور جزیرہ نمائے آئبیریا (اندلس) تک بڑھا دیا جو ڈیڑھ کروڑ مربع کلومیٹر (57 لاکھ 90 ہزار مربع میل) رقبہ تھا۔ اس طرح بہ لحاظ رقبہ یہ دنیا کی وسیع ترین سلطنت تھی جو کبھی اہل دنیا نے دیکھی تھی۔ یہ پوری تاریخ انسانی کی پانچویں وسیع ترین سلطنت بنی[1]۔

750ء میں عباسیوں کے انقلابات نے بنوامیہ کا تختہ الٹ دیا تاہم ان کی ایک شاخ فرار ہو کر شمالی افریقہ پہنچ گئی اور پھر وہاں سے اندلس چلی گئی جہاں انہوں نے خلافت قرطبہ قائم کر لی جو 1031ء تک قائم رہی۔ عباسی انقلاب بنوامیہ کی عرب بادشاہت کا اختتام اور ایک زیادہ جامع اور کثیر النسلی ریاست کا آغاز تھا جس میں غالب تعداد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سلسلۂ نسب سے تعلق رکھنے والوں اور ایرانی نژاد لوگوں کی تھی۔ عباس سفاح پہلا عباسی خلیفہ تھا اور اس کا تعلق بنو ہاشم سے تھا جو کہ قبیلہ قریش کی ایک ذیلی شاخ تھی۔ آخری عباسی خلیفہ المستعصم باللہ تھا جو 1213ء سے 1258ء تک برسر اقتدار رہا۔ عباسی عہد میں مصر میں فاطمی خلافت 909ء میں قائم ہوئی اور 1171ء تک قائم رہی۔ خلفائے قاہرہ 1261 اور 1517 کے درمیان رہے۔ جنہیں مملوک سلطانوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ مملوک سلطنت نے 1250ء سے 1517ء تک مصر، مشرقی بحیرہ روم اور حجاز کو کنٹرول کیے رکھا۔

(5)۔ ذیل کے چارٹ سے مزید واضح ہو جائے گا کہ دنیا میں ایک ہی وقت میں مسلمانوں کی بہت سی ریاستیں موجود تھیں:

1۔ The End of the Jihad State: The Reign of Hisham Ibn 'Abd al-Malik and the Collapse of the Ummayyads by Khalid Yahya Blankinship, p. 371.

مسلم خلافتیں/ بادشاہتیں

(i)۔ خلافت راشدہ (632ء-661ء)

(ii)۔ سلطنت خلافت بنوامیہ (661ء-750ء)

(iii)۔ سلطنت قرطبہ، اسلامی سپین (756ء-1031ء)

(iv)۔ سلطنت خلافت عباسیہ (750ء-1258ء)

(v)۔ سلطنت خلافت فاطمین (910ء-1171ء)

(vi)۔ سلطنت ایوبی خاندان (1171ء-1260ء)

(vii)۔ سلطنت خلافت مملوک (بحری خاندان) (1250ء-1517ء)

(viii)۔ سلطنت خلافت عثمانیہ (1517ء-1923ء)

مسلمانوں کی علاقائی بادشاہتیں

یورپ اور روس

(i)۔ سلطنت قرطبہ، بنوامیہ، سپین (929ء-1031ء)

(ii)۔ سلطنت امارتِ سسلی (996ء-1072ء)

(iii)۔ سلطنت والگا بلغاریہ (992ء-1236ء)

(iv)۔ سلطنت گولڈن ہورڈ (1251ء-1502ء)

(v)۔ سلطنت اہلِ کریمیا (1441ء-1783ء)

مشرقِ وسطیٰ

(i)۔ سلطنت روم، سلجوق (1077ء-1307ء)

(ii)۔ سلطنت عثمانیہ (1299ء-1923ء)

(iii)۔ سلطنت خاندان خوارزم شاہ (994ء-1040ء)

(iv)۔ سلطنت طاہری خاندان (821ء-873ء)

(v)۔ سلطنت خوارزمی (1077ء-1231ء)

(vi)۔ سلطنت سفاری خاندان (861ء-1003ء)

(vii)۔ سلطنت سمانی خاندان	(819ء-999ء)
(viii)۔ سلطنت سلجوق خاندان	(1016ء-1153ء)
(ix)۔ سلطنت جیرے خاندان	(1521ء-1550ء)
(x)۔ سلطنت الخانی	(1256ء-1335ء/1353ء)
(xi)۔ سلطنت تیموری خاندان	(1370ء-1507ء)
(xii)۔ سلطنت ایوبی خاندان	(1171ء-1260ء)
(xiii)۔ سلطنت آق قویونلو	(1378ء-1501ء)
(xiv)۔ سلطنت قرہ قویونلو	(1375ء-1468ء)
(xv)۔ سلطنت ایران،صفوی خاندان	(1502ء-1736ء)
(xvi)۔ سلطنت افشاری خاندان	(1736ء-1796ء)
(xvii)۔ سلطنت قاچار خاندان	(1789ء-1925ء)
(xviii)۔ سلطنت مظفری	(1391ء-1583ء)
(xix)۔ سلطنت شیروان شاہ	(861ء-1539ء)
(xx)۔ سلطنت غوری	(1149ء-1161ء)
(xxi)۔ سلطنت غزنوی	(977ء-1186ء)
(xxii)۔ سلطنت عظیم سلجوق	(1175ء-1194ء)
(xxiii)۔ سلطنت آل بویہ	(934ء-1062ء)
(xxiv)۔ سلطنت راسی آف یمن	(897ء-1962ء)
(xxv)۔ سلطنت بنورسول آف یمن	(1229ء-1454ء)
(xxvi)۔ سلطنت طولونیہ	(868ء-905ء)

وسطی ایشیا

(i)۔ سلطنت چغتائی خاندان	(1260ء-1266ء)
(ii)۔ سلطنت سائبیریا خاندان	(1490ء-1598ء)
(iii)۔ سلطنت یارقند	(1514ء-1533ء)

(iv)۔ سلطنت شیبانی (1428ء-1468ء)

افریقہ اور سپین

(i)۔ سلطنت عدل (1415ء-1555ء)
(ii)۔ سلطنت المورد خاندان آف مراکش (1040ء-1147ء)
(iii)۔ سلطنت الموحد خاندان آف مراکش (1121ء-1269ء)
(iv)۔ سلطنت اجوران (13وی صدی-17ویں صدی)
(v)۔ سلطنت فلانی آف سکوٹو (1804ء-1903ء)
(vi)۔ سلطنت فلانی آف سیکوامدادو (13وی صدی-17ویں صدی)
(vii)۔ سلطنت فلانی/فلبی آف الحاج عمر تال (1797ء-1864ء)
(viii)۔ سلطنت فلانی یا فلبی آف بوندو ملک داؤدسائی (1230ء-1600ء)
(ix)۔ سلطنت مالی (1230ء-1600ء)
(x)۔ سلطنت سونگھائی (1340ء-1591ء)
(xi)۔ سلطنت کلوہ (10ویں صدی-1517ء)
(xii)۔ سلطنت عمان (13ویں صدی۔1744)
(xiii)۔ سلطنت اغالبہ خاندان افریقیہ تونس، مشرقی الجیریا، مغربی لیبیا اور سسلی (800ء-909ء)
(xiv)۔ سلطنت امیہ آف سپین، فاطمیوں سے جنگ کے دوران (661ء-750ء)
(xv)۔ سلطنت سپین آف الطوائف مملوک (1009۔1238)
(xvi)۔ سلطنت بنوحفص (1229ء-1574ء)
(xvii)۔ سلطنت علوی خاندان آف مراکش (1631ء-1672ء)
(xviii)۔ سلطنت مرینیہ خاندان آف مراکش (1244ء-1465ء)
(xix)۔ سلطنت رستمی خاندان (767ء-909ء)
(xx)۔ سلطنت وطاسی خاندان آف مراکش (1472ء-1554ء)
(xxi)۔ سلطنت سعدی خاندان آف مراکش (1511ء-1628ء)
(xxii)۔ سلطنت درویش (1896ء-1920ء)

جنوبی ایشیا

(i)۔ سلطنت علی راجہ	(1545ء–1819ء)
(ii)۔ سلطنت میسور	(1704ء–1799ء)
(iii)۔ سلطنت دہلی، شمالی ہند	(1206ء–1526ء)
(iv)۔ سلطنت مغل ہندوستان	(1526ء–1857ء)
(v)۔ سلطنت خلجی خاندان	(1290ء–1320ء)
(vi)۔ سلطنت لودھی خاندان	(1451ء–1524ء)
(vii)۔ سلطنت دہلی، مملوک خاندان	(1206ء–1290ء)
(viii)۔ سلطنت درّانی	(1747ء–1823ء)
(ix)۔ سلطنت سوری خاندان	(1540ء–1556ء)
(x)۔ سلطنت آصف جاہی خاندان	(1720ء–1948ء)
(xi)۔ سلطنت نوابِ اودھ	(1732ء–1856ء)
(xii)۔ سلطنت باہمنی، دکن	(1347ء–1527ء)
(xiii)۔ سلطنت تغلق خاندان	(1321ء–1398ء)
(xiv)۔ سلطنت برار، دکن	(1490ء–1572ء)
(xv)۔ سلطنت بدار، دکن	(1492ء–1619ء)
(xvi)۔ سلطنت احمد نگر، دکن	(1490ء–1636ء)
(xvii)۔ سلطنت قطب شاہی خاندان، دکن	(1518ء–1687ء)
(xviii)۔ سلطنت بیجاپور، دکن	(1490ء–1686ء)
(xix)۔ سلطنت خاندانِ سادات	(1414ء–1451ء)
(xx)۔ سلطنت بنگال	(1336ء–1576ء)
(xxi)۔ سلطنت جونپور	(1394ء–1479ء)
(xxii)۔ سلطنت گجرات	(1407ء–1573ء)
(xxiii)۔ سلطنت کشمیر	(1346ء–1586ء)

(xxiv)۔سلطنت سومرو خاندان	(1026ء-1351ء)
(xxv)۔ سلطنت سمہ خاندان	(1335ء-1520ء)
(xxvi)۔سلطنت تالپور خاندان	(1783ء-1843ء)
(xxvii)۔سلطنت کلہوڑا خاندان	(1701ء-1783ء)
(xxviii)۔سلطنت نواب کرناٹک	(1692ء-1859ء)

جنوب مشرقی ایشیا

(i)۔ سلطنت جوہر	(1528ء-1855ء)
(ii)۔ سلطنت ماگوئنداناؤ	(1500ء-1888ء)
(iii)۔ سلطنت کیلنٹن	(1411ء-1963ء)
(iv)۔ سلطنت ترنگانو	(1909ء-1957ء)
(v)۔ سلطنت پرلیس	(1821ء-1957ء)
(vi)۔ سلطنت کیداہ	(1909ء-1946ء)
(vii)۔ سلطنت پاہنگ	(1895ء-1948ء)
(viii)۔ سلطنت پیرک	(1528ء-1948ء)
(ix)۔ سلطنت نگری سمبیلان	(1895ء-1948ء)
(x)۔ سلطنت سلانگور	(1895ء-1948ء)
(xi)۔ سلطنت سُولُو	(1405ء-1915ء)
(xii)۔ سلطنت یوجیاکرتا	(1755ء-1939ء)
(xiii)۔ سلطنت آچے	(1946ء-1903ء)
(xiv)۔ سلطنت دہلی	(1632ء-1946ء)
(xv)۔ سلطنت سیاک سری اندراپورا	(1725ء-1946ء)
(xvi)۔ سلطنت ریاؤ	(1824ء-1911ء)
(xvii)۔ سلطنت اندراگیری	(1298۔1945)
(xviii)۔سلطنت جمبی	(1877ء-1904ء)

(xix)۔ سلطنت پالمبانگ دارالسلام	(1675ء-1823ء)
(xx)۔ سلطنت بینتن	(1527ء-1813ء)
(xxi)۔ سلطنت شیریبون	(1445ء-1677ء)
(xxii)۔ سلطنت دیماک	(1475ء-1548ء)
(xxiii)۔سلطنت سوراکارتہ	(1745ء-1946ء)
(xxiv)۔سلطنت ماتارام	(1587ء-1755ء)
(xxv)۔ سلطنت بونتیاناک	(1771ء-1950ء)
(xxvi)۔سلطنت بانجارماسین	(1526ء-2010ء)
(xxvii)۔سلطنت کوتائی	(1949ء تک)
(xxviii)۔سلطنت بولنگان	(1731۔1964)
(xxxix)۔سلطنت گوا	(1300ء-1945ء)
(xxx)۔ سلطنت ترنات	(1257ء-1914ء)
(xxxi)۔سلطنت تیدور	(1450ء-1904ء)
(xxxii)۔سلطنت باکان	(1513ء)
(xxxiii)۔سلطنت جیلولو	(1500ء-1920ء)
(xxxiv)۔سلطنت بوتون	(1450ء-1904ء)

(6)۔ مندرجہ بالا مختصر بحث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آمد اسلام سے لے کر اب تک خلافت راشدہ کے بعد کوئی اس جیسی مہتم بالشان مسلم اسلامی خلافت نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی عالمگیر خلافت قائم نہیں ہوئی جو پوری مسلم دنیا کی دنیوی اور سیاسی وحدت کی مظہر ہوتی۔ سنی مسلمانوں کی اکثریت خلافت راشدہ سے متعلق یکسو ہے تاہم اہل تشیع اسے بھی قبول نہیں کرتے۔ بعض اندازوں کے مطابق اہل تشیع پوری مسلم آبادی کا دس (10) سے تیرہ (13) فیصدی ہیں۔ ایران میں ان کی آبادی سب سے زیادہ ہے جو وہاں کی آبادی کا نوے (90) سے پچانوے (95) فیصد ہیں جبکہ انڈونیشیا میں ان کی آبادی بہت کم ہے یعنی وہ وہاں صرف 0.5 فیصد ہیں۔ پہلی عالمگیر مسلم خلافت (خلافتِ راشدہ) کا انتظام و انصرام حضور نبی کریم ﷺ کے صحابہ

کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے عہد میں چند مسائل کا شکار ہو گئی تھی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی سے بچنے کے لیے پولیس ایکشن کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بلوائیوں کے بارے میں ان کے نرم و شائستہ رویے سے یہ لوگ مزید دلیر ہو گئے۔ 656ء میں جب آپ رضی اللہ عنہ تلاوت قرآن پاک کر رہے تھے تو بلوائی دروازہ توڑ کر گھر میں اندر داخل ہو گئے اور آپ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان خانہ جنگی چھڑ گئی۔ موخر الذکر، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے رشتہ دار تھے اور ایک قبیلہ بنو امیہ سے تھے۔

خانہ جنگی کی پہلی لڑائی جنگ جمل (اونٹوں کی جنگ) تھی جو 'بصرہ' (عراق) کے مقام پر ہوئی۔ یہ نومبر 656ء میں ہوئی تھی۔ ایک طرف امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسری جانب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی افواج تھیں۔ جنہیں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی حمایت حاصل تھی۔ یہ سب کبائر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے۔ بعض روایات کے مطابق دونوں اطراف سے دس ہزار (10,000) سپاہی شہید ہوئے۔ دوسری لڑائی جنگ صفّین کہلاتی ہے۔ یہ جولائی 657ء میں ہوئی تھی۔ یہ شام کے علاقے الرّفاع میں لڑی گئی۔ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج اسی ہزار (80,000) مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ جن میں ستر (70) صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین وہ تھے جنہوں نے غزوۂ بدر میں شرکت کی تھی۔ ستر (70) وہ تھے جنہوں نے حدیبیہ کے مقام پر حلف اٹھایا تھا۔ چار سو (400) جلیل القدر انصاری رضوان اللہ علیہم اجمعین اور مہاجرین تھے۔ جب کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج میں زیادہ تر شامی تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج کے اندازاً پچیس ہزار (25,000) اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی فوج کے پینتالیس ہزار (45,000) افراد شہید ہوئے۔

جمل اور صفّین کی جنگوں نے سنیوں اور شیعوں کے مابین مستقل خلیج حائل کر دی۔ ان کے نتیجے میں 'خوارج[1]' نے بھی جنم لے لیا اور مسلمانوں میں سیاسی وحدت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ کیا اب

---

[1]۔ خوارج اسلام میں پہلا مذہبی فرقہ ہے جس نے شعائر سے ہٹ کر اپنا الگ گروہ بنایا۔ اس گروہ میں اکثریت بدوی عراقیوں کی تھی۔ یہ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فوج سے اس بنا پر علیحدہ ہو گئے تھے کہ انہوں نے حضرت امیر معاویہ کی ثالثی کی تجویز قبول کر لی تھی۔ خارجیوں کا نعرہ تھا کہ حاکمیت اللہ ہی کے لیے ہے۔ ان کا بنیادی عقیدہ تھا کہ دینی معاملات میں انسان کو حاکم بنانا کفر ہے اور جو لوگ ایسے فیصلوں کو تسلیم کرتے ہیں وہ واجب القتل ہیں۔ اسی بنا پر ایک لمبے عرصے تک انہوں نے امت مسلمہ میں قتل و غارت کا بازار گرم رکھا حتیٰ کہ کبائر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی شہید کر دیا۔

خلافت قائم ہوسکتی ہے جب کہ مسلم دنیا میں متعدد سیاسی، مذہبی علاقائی نسلی اور دیگر تفرقے موجود ہیں؟

(7)۔ امام خمینی نے 1979ء میں ایران میں ایک اسلامی ریاست قائم کی تھی جس پر مسلمانانِ عالم نے عمومی طور پر اور عرب ہمسایوں نے خصوصی طور پر منفی تاثر کا اظہار کیا۔ اس کے نتیجے میں ایران اور عراق کے مابین جنگ ہوگئی جو آٹھ سال (1980ء-1988ء) جاری رہی۔ یہ بیسویں صدی عیسوی کی سب سے بڑی روایتی جنگ تھی۔ اس سے عراق میں اندازاً 105,000-200,000 اموات ہوئیں۔ 400,000 افراد زخمی ہوئے اور 70,000 کو جنگی قیدی بنا لیا گیا[1]۔ ایران میں اموات تقریباً 200,000-220,000 ہوئیں جبکہ بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ دس لاکھ سے زیادہ ایرانی ہلاک ہوئے۔ جمل اور صفین کی جنگوں اور حالیہ ایران عراق جنگ کی روشنی میں کیا ممکن ہے کہ پوری مسلم دنیا میں ایک خلافت قائم ہو جائے گی؟ کیا اہلِ تشیع ایک سنی خلیفہ کو قبول کر لیں گے؟ کیا سنی ایک شیعہ خلیفہ کو قبول کر لیں گے؟ کیا ایک بنگلہ دیشی مسلمان پاکستانی خلیفہ کو قبول کر سکتا ہے؟

(8)۔ مختصراً یہ کہ ایک ہمہ گیر مسلم خلافت کا دعویٰ اور اس کے قیام کے لئے جدوجہد ان زمینی حقائق کی روشنی میں ایک ناقابلِ عمل رومانوی تصور ہے۔ بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ ایک نیا سیاسی فلسفہ ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا ہے اور جدید قومی ریاستوں کی تشکیل اور حصار بندی ہو رہی ہے۔ امتِ مسلمہ کے اندر اتحاد کی خواہش کو عملی شکل دی جا سکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ مسلم ریاستوں کی ایک 'دولت مشترکہ' کا قیام موجودہ تنظیم اسلامی کانفرنس (OIC) کو تقویت دے گا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ مندرجہ بالا حقیقتوں نے اس تنظیم کو اپاہج بنا کر رکھ دیا ہے۔

حضرت اقبالؒ (d. 1938) نے جو جدید اسلام کے حوالے سے گہری بصیرت رکھتے ہیں، بالکل بجا کہا ہے:

> ترکوں کے نظریئے کو سمجھنے کے لئے، آیئے ہم اولین مورخ اسلام ابن خلدون (d. 1406) سے رہنمائی حاصل کریں۔ ابن خلدون (d. 1406) اپنی مشہور تصنیف 'مقدمہ' میں اسلام میں ہمہ گیر خلافت کے بارے میں تین واضح تصورات

[1]۔ Conflict and conquest in the Islamic world: A Historical Encyclopedia, p.418.

پیش کرتا ہے: (1) یہ کہ یہ ایک الوہی ادارہ ہے اور نا گزیر ہے۔ (2) یہ کہ یہ نظم و نسق اور مصلحتِ سیاسی کا تقاضا ہے اور (3) یہ کہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں جو خوارج کا نقطۂ نظر ہے۔ جدید ترکی نے معتزلہ کا زاویہ نگاہ اختیار کیا کہ یہ کوئی الوہی حکم نہیں بلکہ مصلحت کا تقاضا ہے۔ (دوسرا نقطہ نظر) تجربے نے ثابت کیا ہے کہ تمام عالم اسلام میں ایک خلیفہ عملاً بے معنی ہو گیا ہے۔ ملت اسلامیہ اقوام عالم میں اس طرح بٹ گئی ہے کہ اب دوبارہ اس کو وحدانی مملکت اور خلافت بنانا امرِ محال ہے۔ اب یہ خیال نہ صرف یہ کہ کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا بلکہ اس کے اثرات ضرر رساں ہیں جو اقوام اسلامیہ کے اتحاد میں حائل ہوتے ہیں۔ شروع صدیوں میں خلیفہ کے لئے قریشی ہونا بھی لازمی شرط شمار ہوتا تھا۔ عربوں اور قریشیوں کے زوال کے بعد قاضی ابوبکر باقلانیؒ[1] (d. 1013) نے یہ فتویٰ دیا کہ اب یہ شرط ساقط ہو گئی ہے۔ ابن خلدون (d. 1406) کا بھی یہی خیال تھا کہ اب جس کے ہاتھ میں قوت آ جائے اس کو خلیفہ مان لینے کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ترکوں نے عملی تجربۂ سیاست اور تاریخ کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کیا ہے۔ محض فقیہانہ بحث نہیں کی۔ عربوں کی شہنشاہی مملکت کا زمانہ عرصۂ دراز ہوا کہ ختم ہو گیا۔ لیکن اس کا سایہ اسلامی فقہ پر اب تک پڑ رہا ہے۔ میرے خیال میں اس سلسلے میں پیش کئے گئے دلائل کو اگر صحیح طور پر سمجھا جائے تو نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ایک بین الاقوامی نصب العین جو کہ اگرچہ اسلام کی صحیح روح ہے اس پر عرب شہنشاہیت نہ صرف سایہ فگن ہوئی بلکہ اس نے اس روح کی جگہ لے لی ہے۔ سرِ دست ہر مسلم قوم کو اپنے اندر مستغرق ہو کر اپنے نقطہ نظر کو عارضی طور پر خود پر مرتکز کر لینا چاہیے تاوقتیکہ وہ سب مضبوط اور طاقتور ہو کر جمہوری ریاستوں کا ایک زندہ خاندان بن کر ابھر آئیں۔ قومی جذبے سے سرشار مفکرین کے مطابق ایک سچا اور جاندار اتحاد محض علامتی سرداری کے ذریعے قائم کر لینا آسان نہیں ہے۔ اس کا حقیقی اظہار آزاد اور خود مختار اکائیوں میں

---

[1]۔ امام ابوبکر محمد بن طیب باقلانی (940ء-1013) ایک معروف مسلمان فقیہ، سکالر، محقق علم الکلام کا ماہر تھا جس نے اپنی زندگی سنی عقائد کو علم الکلام کے ذریعے ثابت کرنے کے لیے وقف کر دی تھی۔

ہے۔ جن کی نسلی رقابتوں کو سدھار کر مشترک روحانی امنگ کے ساتھ ہم آہنگ بنا دیا گیا ہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں آہستہ آہستہ اس سچائی تک لے جا رہا ہے کہ اسلام نہ تو ایک قومیت ہے اور نہ شہنشاہیت ہے بلکہ ایک جمعیتِ اقوام ہے جو مصنوعی حد بندیوں اور نسلی امتیازات کو صرف حوالے کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ جبکہ اس کے ارکان کے معاشرتی افق کو محدود کرنے کی اجازت نہیں دیتا[1]۔

(9)۔ میری عاجزانہ رائے میں قرارداد مقاصد جو 12 مارچ 1949ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے منظور کی ایک اہم سیاسی فکری پیش قدمی ہے۔ اس میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ مستقبل کا پاکستانی دستور سراسر یورپی نمونے پر نہیں بنایا جائے گا بلکہ یہ اسلام کے نظریئے اور جمہوری عقیدے پر استوار ہوگا۔ یہ قرارداد 1956ء، 1962ء اور 1973ء کے دساتیر کا دیباچہ بنی اور بالآخر آرٹیکل 2(A) کے تحت جب 1973ء کے دستور میں آٹھویں ترمیم کی 1985ء میں منظوری ہوئی تو یہ دستور پاکستان کا حصہ بن گئی۔ قرارداد مقاصد کا متن یہ ہے:

یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کل کائنات کا بلاشرکتِ غیرے حاکمِ مطلق ہے اور اسی نے جمہور کی وساطت سے مملکتِ پاکستان کو اختیارِ حکمرانی اپنی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرنے کے لیے نیابتاً عطا فرمائے ہیں کیونکہ یہ اختیار حکمرانی ایک مقدس امانت ہے:

یہ دستور ساز اسمبلی جو پاکستان کے عوام کی نمائندہ ہے، آزاد و خود مختار ریاست پاکستان کے لئے ایک دستور وضع کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ ہرگاہ یہ ریاست اپنے اختیارات و حاکمیت عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے بروئے کار لائے گی۔ جس کی رُو سے اصولِ جمہوریت، حریت، مساوات، رواداری، عدل و حکمرانی کو جس طرح اسلام نے ان کی تشریح کی ہے پورے طور پر ملحوظ رکھا جائے گا، جس کی رُو سے مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر خود کو

---

[1]۔ Reconstruction of Religious Thoughts in Islam by Dr. Muhammad Iqbal, p. 67.

اسلامی تعلیمات کے مطابق جو قرآن اور سنتِ رسول ﷺ میں متعین ہیں، تربیت دے سکیں۔ جس کی رُو سے اس امر کا واقعی اہتمام کیا جائے گا کہ اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی عقیدوں پر قائم رہ سکیں اور اپنی ثقافتوں کو ترقی دے سکیں۔

جس کی رو سے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی جن میں حیثیتوں اور مواقع کی مساوات اور قانون کے مطابق معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی انصاف، آزادیِ فکر، آزادیِٔ اظہار، مذہب وعقیدہ، عبادت وتنظیم سازی اور تابعِ قانون اخلاقیات کی آزادی شامل ہے۔

جس کی رُو سے اقلیتوں اور پس ماندہ وپست طبقوں کے جائز حقوق کے تحفظ کا انتظام کیا جائے گا اور جس کی رُو سے نظام عدل کی آزادی کاملاً محفوظ ہوگی۔

جس کی رُو سے عدلیہ کی آزادی کی مکمل ضمانت دی جائے گی۔ پاکستان کے عوام اقوام عالم میں باوقار مقام حاصل کر سکیں اور وہ بین الاقوامی امن وترقی اور انسانیت کی خوشیاں بڑھانے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔

اس قرارداد کو اس وقت کے تمام بڑے اسلامی مفکرین کی حمایت حاصل تھی جن میں سید ابو اعلیٰ مودودیؒ (d. 1979)، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ[1] (d. 1949) پیر مانکی شریفؒ[2] (d. 1960) اور دیگر علماء کرامؒ بھی شامل تھے۔ اس قرارداد کو اب بھی علماء کرامؒ اور اہل دانش کی حمایت حاصل ہے۔ بالالفاظ دیگر پاکستان کے تمام علماء اور اہل دانش نے اجتماعی اجتہاد کے ذریعے پاکستان کی قومی ریاست کے تصور کو قبول کیا ہے۔ ایک عالمگیر اسلامی خلافت عہد حاضر میں ناممکن ہے اور نہ ہی کبھی ایک عالمگیر اسلامی خلافت ممکن ہوئی ہے۔ اس لیے اس محال تصور کے لیے خون نہیں بہانا چاہیے بلکہ اچھی مسلم قومی ریاستیں بنی چاہیں جن کا باہمی بین الاقوامی روحانی وسیاسی اتحاد ممکن ہوسکتا ہے۔

---

[1]۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (1885ء-1949ء) ایک معروف پاکستانی اسلامی سکالر تھے جنہوں نے دارالعلوم دیوبند انڈیا سے تعلیم حاصل کی۔

[2]۔ امین الحسنات المعروف پیر آف مانکی شریفؒ (1923ء-1960ء) شمال مغربی سرحدی صوبہ (حال خیبر پختونخواہ) کے ایک مذہبی وسیاسی لیڈر تھے۔

بائیسواں باب

جہادِ کبیر

As flies to the wanton boys, we are to the gods,
They kill us for their sport[1].
(جیسے کھلنڈرے بچوں کے لئے مکھیاں ہیں ویسے ہی ہم دیوتاؤں کے لئے ہیں، جو ہمیں تفریحاً قتل کر دیتے ہیں)

'جہاد' کے نام پر مسلمانوں کا بہت سا خون بہہ چکا ہے۔ امتِ مسلمہ لاکھوں نوجوانوں سے محروم ہو چکی ہے۔ اس وجہ سے ہماری بہتر مستقبل کی امیدوں پر بھی پانی پھر گیا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس 'حکمتِ عملی' کا ازسرنو جائزہ لیں۔ جس سے بڑے پیمانے پر کشت وخون ہوا، زبردست تباہی و بربادی ہوئی اور کوئی بھی مثبت نتیجہ نہیں نکل سکا۔

'جہاد' کے معنی کیا ہیں؟ موجودہ زمانے کے منظرنامے میں جہاد کا مطلب کیا ہے؟ وہ کیسی صورت حال اور کیسا ماحول ہوتا ہے جب مسلمان ہتھیار اٹھا سکتے ہیں؟ کیا جہاد صرف ہتھیار استعمال کرنے سے ہی ہوتا ہے؟ کیسے حالات ہوتے ہیں کہ ہتھیاروں سے جہاد کی اجازت نہیں ہوتی؟ کیا مسلمانوں کا ایک فرقہ، مسلمانوں کے دوسرے فرقے کے خلاف جہاد کر سکتا ہے؟ کیا مسلمانوں کی سرزمین کے باشندوں کے لیے (ذاتی طور پر) جہاد 'فرض عین' ہو سکتا ہے؟ اور وہ کیسے حالات ہوتے ہیں جن میں یہ ایک معاشرتی ذمہ داری (فرض کفایہ) بن جاتا ہے؟

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیئیس (23) برسوں میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پوری زندگی میں سو (100) معرکے سر کئے جن میں سے ستائیس (27) میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہ نفسِ نفیس شریک ہوئے۔ ان سب مسلح معرکوں میں صرف دوسوانسٹھ (259) مسلمان شہید ہوئے اور دوسری جانب صرف سات سوانسٹھ (759) غیر مسلم مارے گئے۔ ان فوجی اقدامات کی کل میزان کو بجا طور پر بلا خون بہائے لایا جانے والا انقلاب کہا جا سکتا ہے[2]۔ یہ درحقیقت عظیم ترین ذہنی روحانی اور اخلاقی

[1]_ Shakespeare
[2]_ Muhamamd: A Prophet for all Humanity by Wahiduddin Khan, p. 132

انقلابات میں سے ایک تھا جس کا تاریخ انسانی نے مشاہدہ کیا تھا اور یہ بہت ہی کم خون ریزی سے پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔

اس کے برعکس آیئے یہ دیکھتے ہیں کہ پچھلی صدی میں اسلام کے نام پر چلنے والی تحریکوں میں کیا کچھ ہوا۔ الجزائر کی جنگ آزادی میں پچیس لاکھ (2,500,000) مسلمان مارے گئے۔ پاک و بھارت جنگ، کشمیر، افغانستان اور چیچنیا میں لاکھوں مسلمان قتل ہوئے۔ فلسطین، شام اور مصر میں بھی یہی کچھ ہوا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو 'جہاد' کے تصور اور مفہوم پر از سرِ نو غور کرنا چاہیے اور قرآن وسنت کی حقیقی روشنی میں اپنی حکمت عملیوں کا نئے سرے سے جائزہ لینا چاہیے۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو مسلمانوں کے خون کا بہنا جاری رہے گا اور حاصل وصول بھی کچھ نہیں ہوگا۔ فیض احمد فیض[1] (Faiz, d. 1980) نے اس شعر میں ہماری حالتِ زار کا ہی حوالہ دیا تھا۔

نہ مدعی نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہوا[2]

مسلم دنیا میں 'جہاد' کو 'قتال' کے ساتھ گڈمڈ کر دیا گیا ہے۔ (قتال کے معنی لڑنا یا مسلح جدوجہد کرنے کے ہیں)۔ مسلمانوں کی اکثریت اس اصطلاح کو صحیح طور پر نہیں سمجھ پائی۔ وہ اس سے یہ مطلب لیتی ہے کہ کفار کے خلاف اس وقت تک لڑتے رہو جب تک وہ ہتھیار ڈال کر مشرف بہ اسلام نہ ہو جائیں۔ مسلم معاشرے کی اس منتشر الخیالی کی وجہ سے غیر مسلم بھی غلط فہمی کے شکار ہو گئے ہیں۔ جہاد ایک جامع اصطلاح ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں تمام قسموں کی مساعی (جدوجہد) کا حوالہ دیتی ہے: قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَجَاهِدُوا فِي اللهِ حَقَّ جِهَادِهِ[3]

(اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایسی جدوجہد کرو جیسا حق ہے)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے سید ابو اعلیٰ مودودیؒ (d. 1979) کہتے ہیں کہ جہاد محض

---

[1]۔ Faiz Ahmed Faiz: فیض احمد فیض (1911ء-1984ء) اردو ادب کے ترقی پسند شاعر تھے۔

[2]۔ لہو کا سراغ؛ نسخہ ہائے وفا از فیض احمد فیض

[3]۔ سورۃ الحج: آیت: 78

'قتال' ہی نہیں بلکہ یہ لفظ ایک طویل جدو جہد اور دقت طلب کوشش کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے[1]۔ مولانا ثناءاللہ پانی پتیؒ[2] (d. 1810) کی رائے میں جہاد کا مطلب جدو جہد، توسیع اور قوت کا استعمال ہے[3]۔

سورۃ الفرقان جو مکہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم ﷺ سے یوں خطاب فرمایا ہے کہ

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا[4]

(پس اے نبی ﷺ! کافروں کی بات ہرگز نہ مانیں اور اس قرآن مجید کے ذریعے کفار کے ساتھ جہاد کبیر کریں)

اس مکی سورت میں 'جہادِ کبیر' کے الفاظ اس وقت استعمال ہوئے جب اہل ایمان کو تلواریں اٹھانے کا حکم نہیں ملا تھا۔ حتیٰ کہ وہ ظالموں کے خلاف بھی تلوار استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ یہاں اہل ایمان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کفار کے خلاف جہاد، جہادِ کبیر کریں، قرآن مجید کے ساتھ، نہ کہ تلوار کے ساتھ۔ جہاد دراصل شر کے خلاف ہر سطح پر زندگی بھر جدو جہد جاری رکھنے کا نام ہے۔ یہ دیگر کسی بھی پُرعزم علمبردارانِ انسانی حقوق کی مانند ایک مسلمان سے بھی تقاضا کرتا ہے کہ وہ ناانصافی، استحصال، جہالت، غربت اور دیگر برائیوں کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے ایک پُرامن اور اخلاقی جدو جہد کرے۔ جہاد کا مطلب یہ بھی ہے کہ مخصوص حالات اور صورتِ حال میں ایک مسلح جدو جہد کی جائے یا جہاد کیا جائے۔ لیکن عربی کا لفظ قتال اس مفہوم کی صحیح تر ترجمانی کرتا ہے۔ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ان دشمنوں کے خلاف جسمانی طور پر مزاحمت کریں اور ان کے خلاف صف آرا ہو جائیں جو ان پر ظلم و زیادتی کریں اور انہیں ان کے گھر بار سے بے دخل کرنے کی کوشش کریں۔

جہادِ کبیر کے تین اضافی معانی بھی ہیں:

(1)۔ انتہائی کوشش جس میں آدمی کوشش و جان فشانی کا کوئی وقیقہ اٹھا نہ رکھے۔

(2)۔ جملہ مساعی اور بڑے پیمانے کی جدو جہد کرنا جہاں معاشرے کے تمام افراد اور مادی وسائل

[1]۔ تفہیم القرآن از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بحوالہ سورہ الحج: آیت: 78

[2]۔ مولانا ثناءاللہ پانی پتیؒ (d. 1810) برصغیر پاک و ہند کے عظیم فقیہ، محدث، محقق اور مفسر تھے۔

[3]۔ تفسیر مظہری از مولانا ثناءاللہ پانی پتیؒ بحوالہ مذکورہ

[4]۔ سورۃ الفرقان: آیت: 52

اس مقصد پر خرچ کر دیے جائیں۔

(3)۔ جامع جدوجہد جس میں آدمی کوشش کا کوئی پہلو اور مقابلے کا کوئی محاذ نہ چھوڑے[1]۔ جہادِ عظیم سے مراد دل سے، زبان سے اور تلوار سے جہاد ہے[2]۔

'جہادِ کبیر' کی مزید وضاحت حضور نبی اکرم ﷺ کی متعدد احادیث میں کی گئی ہے:

عن جابر قال: قدم على النبي صلى الله عليه وسلم قوم غزاة فقال: قدمتم خير مقدم، قدمتم من الجهاد الأصغر إلى الجهاد الأكبر مجاهدة العبد هواه[3]

(حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ مجاہدین کی ایک جماعت حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: آ گئے، بہت ہی خوب آئے۔ تم لوگ جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر کی طرف آ گئے ہو جس میں بندے کو نفس سے جہاد کرنا پڑتا ہے)

اسی طرح حضور نبی کریم ﷺ جب تبوک سے واپس تشریف لا رہے تھے (ذہن میں رہے کہ یہ وہ جنگ واحد ہے جس کی آپ ﷺ نے علی الاعلان تیاری کروائی اور اس جنگ میں اسلامی مملکت کے وجود کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین شاندار قربانی دے کر اپنی پکی فصلیں چھوڑ کر اس غزوہ میں گئے تھے)۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر[4]

(ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ رہے ہیں)

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی تبلیغ و دعوۃ کی مصروفیتوں کو 'جہادِ اکبر' قرار دیا اور مسلح جدوجہد (قتال) کو آپ ﷺ جہادِ اصغر (چھوٹا جہاد) سمجھتے تھے۔ اس تصور کی ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے

[1] تفہیم القرآن از مولانا مودودیؒ بحوالہ مذکورہ
[2] تفسیر مظہری از مولانا ثناء اللہ پانی پتی؛ تفسیر ضیاء القرآن از پیر کرم شاہ ازہریؒ بحوالہ مذکورہ
[3] کنز العمال۔ جلد دوم: رقم: 6673
[4] سنن البیہقی

مزید وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ چند سپاہی حضور نبی کریم ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے ان کا خیر مقدم کیا اور ارشاد فرمایا:

تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے رسول اللہ ﷺ! بڑا جہاد کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ انسان کو اپنی خواہشات اور ترغیبات کے خلاف جہاد کرنا چاہیے[1]۔

(4)۔ 'جہاد' کی اولین شرائط میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اسلام سے اچھی طرح آگاہ ہو اور شعوری طور پر جانتا ہو کہ جہاد شروع کرنے کا مقصد کیا ہے۔ وہ 'کفر' اور 'جاہلیہ'[2] سے بھی آگاہی رکھتا ہو جس کے خلاف وہ 'قتال' شروع کرنے والا ہو، تا کہ وہ کفر کو اس کی کسی شکل میں جس میں وہ ظاہر ہو رہا ہو پہچان سکے۔ اس موضوع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بالکل بجا کہا ہے کہ مجھے خطرہ ہے کہ وہ شخص اسلام کی کڑیاں بکھیر دے گا جس نے اسلام میں نشوونما پائی مگر وہ جاہلیت کو نہیں پہچانتا[3]۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے موجودہ دور کے بارے میں پیش گوئی کر دی تھی۔ آج مسلمانوں نے جہاد کے تصور کو ہی مسخ کر کے رکھ دیا ہے اور بے حد بے سلیقگی سے اس تصور کو استعمال کیا ہے۔ ہمارے حکمرانوں نے اسے کبھی اپنے مفاد کے لئے اور کبھی اپنے غیر ملکی آقاؤں کے حکم کی تعمیل کے لئے استعمال کیا۔ پھر اسے دہشت گردی قرار دے دیا۔ مسلمانوں کو یہ مضحکہ خیز رویہ فوراً ترک کر دینا چاہیے۔ حکمران ڈالر وصول کر لیتے ہیں اور نوجوان اپنا خون بہا کر اپنی زندگیاں ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ ماتم کر کر کے ان کی ماؤں کے آنسو خشک ہو جاتے ہیں اور دلہنوں کے آنگن اجڑ جاتے ہیں۔

شیکسپیئر (Shakespeare, d. 1616) کا یہ مصرعہ آج کی صورت حال کی بجا نقشہ گری کرتا ہے:

---

[1] تفسیر ضیاء القرآن از پیر کرم شاہ از ہریؒ بحوالہ سورۃ الفرقان: آیت: 52

[2]۔ یہ لفظ اسلام کی ضد کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

[3]۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ صفحہ نمبر 162

As flies to the wanton boys, we are to the gods

They kill us for their sport.

(جیسے کھلنڈرے بچوں کے لئے مکھیاں ہیں، ایسے ہی ہم دیوتاؤں کے لئے ہیں جو ہمیں تفریحاً قتل کردیتے ہیں)

(5)۔ سنت ثابتہ، حضور نبی اکرم ﷺ اور فقہائے امت کے مطابق جہاد کا اعلان نہ تو افراد کرسکتے ہیں اور نہ ہی مسلمانوں کا کوئی گروہ کرسکتا ہے:

(i)۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ جہاد ہر امام کے ساتھ فرض ہے خواہ وہ متقی ہو یا گنہگار[1]۔

(ii)۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی نے میری اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ اگر کسی نے امیر (کمانڈر/ رہنما) کی اطاعت کی، اس نے میری اطاعت کی۔ اگر کسی نے امیر کی حکم عدولی کی اس نے میری حکم عدولی کی اور امام ایک ڈھال ہے جو دورانِ جنگ حفاظت کرتی ہے۔ اگر وہ (امام) تمہیں حکم دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور وہ انصاف قائم کرتا ہے۔ اس کو اس کی جزا ملے گی اور اگر وہ تمہیں کوئی اور حکم دیتا ہے (کوئی تخریبی قسم کا کام) تو وہ اس کے لئے ذمہ دار ہوگا[2]۔

(iii)۔ حضور نبی پاک ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے لئے لڑا، امام کی پیروی کی اپنی بہترین دولت خرچ کردی اور فساد سے (انتشار پھیلانے سے) باز رہا، اس کا سونا اور جاگنا باعث ثواب ہوگا۔ تاہم اگر کوئی نمود ونمائش اور شہرت پانے کے لئے لڑا، امام کی نافرمانی کی اور فساد پھیلایا (فساد فی الارض کا موجب بنا)، اسے کوئی ثواب نہیں ملے گا[3]۔

(iv)۔ حضرت امام ابو یوسفؒ (d. 798) نے جو ایک سرکردہ حنفی فقیہ اور حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) کے خاص شاگرد اور اسلامی قانونی تاریخ کے اولین قاضی القضاۃ تھے انہوں نے یہ اصول اس طرح وضع کیا: امام یا اس کے نائب کی اجازت کے بغیر کوئی مہم روانہ نہیں کی جاسکتی

۱۔ سنن ابوداؤد: رقم: 2171

۲۔ صحیح مسلم: رقم: 3418

۳۔ سنن نسائی: رقم: 4122

اور مسلمان فوج کا کوئی شخص، امیر کی اجازت کے بغیر کوئی حملہ نہیں کرسکتا[1]۔

(v)۔ حضرت امام محمد الشیبانیؒ (d. 805) جو اسلامی بین الاقوامی قانون کے بانی اور حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 767) کے سرکردہ شاگردوں میں سے دوسرے نمبر پر تھے، انہوں نے بھی اسی نظریئے کا اظہار کیا ہے[2]۔

(vi)۔ باالفاظِ دیگر ایک گروہ کے امیر (وہ امیر جس نے اہل الحرب پر حملہ کیا ہے) کے اختیارات امام کی مقرر کردہ مہم کے امیر کے مماثل ہوتے ہیں۔

(vii)۔ حضرت علاؤ الدین ابوبکر الکسانیؒ (d. 1196) جو ایک سرکردہ حنفی فقیہ ہے اس نے ایسی صورت حال پر بحث کی ہے جس میں اہل الموعدہ (ایسی ریاست جس کے ساتھ ایک مسلم ریاست کا معاہدہ ہو چکا ہے) کے غیر مسلموں کا ایک گروہ اپنی حکومت کی اجازت کے بغیر دارالسلام پر حملہ کر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ 'اگر ایسے لوگوں کا گروہ جن کا کوئی 'مناعۃ' (فوجی اور سیاسی قوت) نہیں ہے تو وہ حملہ اس ریاست (اہل الموعدہ) کی طرف سے اس وقت تک حملہ نہیں سمجھا جائے گا جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ یہ حملہ اس ریاست کی مرضی سے ہوا ہے[3]۔ باالفاظ دیگر جب تک اس ریاست کی حکومت حملے میں ملوث نہ ہو تو معاہدۂ امن اس حکومت اور اس کے عوام پر لاگو رہے گا۔

(6)۔ یہ اصول 'حملے' اور 'دفاع' دونوں پر قابل اطلاق ہے۔ اس طرح جہاد کا اعلان کرنا صرف مسلم ریاست کا حق ہے وہ بھی دفاع کے لئے۔ یہ گروہوں یا افراد کا حق نہیں جو حکومت سے بے تعلق ہو کر بالا بالا ایسا کرتے رہیں۔ فوجی تصادم کے اندر یہ معلوم کرنا ناممکن ہوتا ہے کہ کیا کیا اقدامات کئے جا چکے ہیں۔ فوجی عملہ کی تیاریاں، فورسز کو کہیں روانہ کرنا، انہیں ہدایات جاری کرنا، جاری جنگ کے دوران کمانڈر کا ہدایات لینا، کسی کو قیدی بنانا، جنگی قیدیوں کو رہا کرنا،

---

[1]۔ کتاب الخراج از حضرت امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیمؒ۔ صفحہ نمبر 385
[2]۔ کتاب السیر الکبیر از حضرت امام محمد بن حسن الشیبانیؒ: شرح حضرت امام سرخسیؒ۔ صفحہ نمبر 259
[3]۔ بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع از حضرت ابوبکر علاء الدین الکسانیؒ۔ صفحہ نمبر 77

یاان کا دشمن کے جنگی قیدیوں سے تبادلہ کرنا، معاہدۂ امن پر دستخط کرنا، معاہدۂ امن کی تنسیخ کے لئے نوٹس دینا، یہ فیصلہ کرنا کہ کیا معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی ہے یا نہیں اور فوجی سرگرمیوں سے متعلقہ دیگر امور نمٹانا مسلم سربراہ ریاست کی اجازت یا اس کے علم میں لائے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔

فقہائے امت کے مطابق مندرجہ بالا اصول میں صرف ایک معقول استثنا ہے۔ اگر دشمن پیشگی خبردار کئے بغیر حملہ آور ہو جائے اور مرکزی حکومت سے رابطہ قائم کرنا ناممکن ہو تو وہ لوگ جو حملے کی زد میں آجائیں ان کا حق ہے کہ وہ اپنا دفاع کریں۔ یہ استثنا اس اصول پر مبنی ہے کہ ذاتی دفاع کرنا ہر شخص کے لئے ایک جائز حق ہوتا ہے جب ریاستی حکمرانوں سے ہدایات وصول کرنے کا کوئی امکان نہ ہو۔

(7)۔ ہندوستان میں انیسویں صدی عیسوی کی اہلحدیث تحریک کے بانیان نے یہ نظریہ پُرزور طریقے سے پیش کیا کہ حکومت برطانیہ کے خلاف جہاد حرام (غیر قانونی اور بغیر اسلامی جواز کے) ہے کیونکہ ایک مسلم سربراہ مملکت (خلیفہ) موجود نہیں ہے جو اعلان جہاد کرسکتا ہو۔ نواب صدیق حسن خانؒ[1] (d. 1890)، نذیر حسین دہلویؒ[2] (d. 1902) اور محمد حسین بٹالویؒ[3] (d 1920) ابتدائی تحریک اہلحدیث کے تین نامور علماء تھے اور ان کی یہ رائے بالکل بجا تھی کہ مسلم سربراہ ریاست کے بغیر جہاد غیر قانونی ہے[4]۔ نذیر حسین دہلویؒ (d. 1902) کے

[1]۔ نواب صدیق حسن خانؒ (1832ء-1890ء) برصغیر پاک و ہند کے ایک نامور اہلحدیث عالم تھے۔

[2]۔ نذیر حسین دہلویؒ (1805ء-1902ء) برصغیر پاک و ہند کے نامور اہلحدیث عالم اور ہندوستان میں اہلحدیث تحریک کے شریک بانی تھے۔

[3]۔ مولانا محمد حسین احمد بٹالویؒ (1840ء-1920ء) برصغیر پاک و ہند کے ایک نامور اہلحدیث عالم تھے جنہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی اور احمدیہ جماعت کا زبردست رد کیا۔

[4]۔ رسالہ الاقتصاد فی مسائل الجہاد از محمد حسین بٹالویؒ۔ صفحہ نمبر 18-19

مطابق امام (سربراہ مسلم ریاست) کی موجودگی جہاد کے لئے اولین شرائط میں سے ہے[1]۔ نواب صدیق حسن خانؒ (d. 1890) نے یہ مؤقف بھی اختیار کیا تھا کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے جواز میں مشکلات ہیں[2]۔

(8)۔ مندرجہ بالا بحث کی روشنی میں یہ بات کافی حد تک واضح ہوگئی ہے کہ اس امر پر 'اجماع' ہے کہ جہاد ایک اجتماعی فریضہ ہے جس کا اعلان، منصوبہ بندی اور انتظام و انصرام حکومت کو کرنا ہوتا ہے۔ افراد اور غیر ریاستی اہلکار نہ جہاد کا اعلان کر سکتے ہیں اور نہ شروع کرا سکتے ہیں۔ یہ رائے کاملاً منطقی ہے۔ اگر افراد یا گروہ اپنی آزاد مرضی سے جہاد کا اعلان کریں یا جہاد شروع کر دیں تو یہ ریاست کے اندر ریاست بنانے کے مترادف ہوگا جو لاقانونیت اور 'فتنہ' (بدنظمی و انتشار) بن جائے گا جسے قرآن مجید نے قتل سے بھی بدتر قرار دیا ہے:

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ[3]

(اور فتنہ قتل سے بھی بڑی سنگین برائی ہے)

(9)۔ بعض جہادی گروپ اپنے پرائیویٹ جہادوں کے جواز کے لیے حضرت ابوبصیر عتبہ بن اسید کے واقعے کا ذکر کرتے ہیں[4]۔ یہ واقعہ کچھ یوں ہے:

مدینہ شریف میں ہجرت کے چھٹے سال کے بعد حضور نبی اکرم ﷺ اور اہل مکہ کے درمیان

---

[1]۔ فتاویٰ نذیریہ از نذیر حسین دہلویؒ۔ صفحہ نمبر 191

آپؒ جہاد کرنے کے لیے تین مزید شرائط کا ذکر بھی کرتے ہیں:

(i)۔ مسلمانوں کے پاس دشمن سے لڑنے کے لئے ہتھیار ہونے چاہئیں؛

(ii)۔ ان کے پاس اپنا وطن ہونا چاہیے جہاں سے وہ جنگ شروع کر سکیں؛

(iii)۔ مسلمانوں کے پاس کافی فوج ہونی چاہئے۔ کم از کم دشمن کی فوج سے نصف تعداد میں ضرور ہو۔

[2]_ Mawa ‘d al-‘wa’d min ‘Uyun al-Akhbar wa al-Fawa’d by Nawab Siddiq Hassan Khan, p. 34-35.

[3]۔ سورۃ البقرہ: آیت: 191

[4]۔ دیکھیے والدین کی اجازت کے بغیر جہاد از حافظ عبدالسلام بن محمد۔ صفحہ نمبر 62-63

حدیبیہ[1] کے مقام پر ایک معاہدۂ امن پر دستخط ہوئے۔اس معاہدے کی شرائط میں سے ایک یہ تھی کہ اگر مکہ مکرمہ کا کوئی آدمی مدینہ منورہ میں مسلمانوں سے جا ملے تو اسے لازماً اہل مکہ کو واپس کر دیا جائے گا؛ تاہم اگر مسلمانوں میں سے کوئی جا کر اہل مکہ سے مل جائے تو اسے واپس نہیں بھیجا جائے گا[2]۔حقیقت حال یہ تھی کہ اس شرط پر صرف زبانی اتفاق ہوا تھا،ابھی اسے ضابطۂ تحریر میں نہیں لایا گیا تھا کہ حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ نامی ایک مسلمان جو کسی طرح مکہ مکرمہ کے ظالموں سے بچ کر حدیبیہ کے مقام پر مسلمانوں کے کیمپ میں پہنچ گیا اور ان سے مدد کی درخواست کر دی۔حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ کا باپ سہیل بن عمرو مذاکرات میں اہل مکہ کا ترجمان و نمائندہ تھا۔اس نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے بیٹے کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر راضی ہو گئے کیونکہ ایسا نہ کرنا معاہدے (جس پر ابھی دستخط نہیں ہوئے تھے) کی خلاف ورزی کے مترادف تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ کو واپس کر دیا۔تاہم حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ اہل مکہ کی گرفت سے نکل بھاگے اور ایسی جگہ جا پہنچے جو مسلم ریاست اور اہل مکہ دونوں کے دائرہ اختیار سے باہر تھی۔

اسی طرح ایک مسلمان حضرت ابوبصیر رضی اللہ عنہ کا معاملہ تھا۔وہ بھی اہل مکہ کی چیرہ دستیوں سے بچ نکلا اور مدینہ جا پہنچا۔اہل مکہ نے شرائطِ معاہدہ کے تحت اس کی بھی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسب معاہدہ حضرت ابوبصیر رضی اللہ عنہ کو بھی ان کے حوالے کر دیا۔لیکن واپسی پر حضرت ابوبصیر رضی اللہ عنہ نے بھی اپنی جان چھڑا لی اور حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ سے جا ملا۔اس کے بعد مکہ مکرمہ سے کئی اور مسلمان فرار ہو گئے لیکن مدینہ منورہ کے مسلمانوں کے معاہدے کے خیال سے وہاں کی بجائے حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ کے کیمپ میں پہنچتے رہے۔اس طرح ان کی تعداد بڑھتی رہی جس سے ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا رہا۔ان کی انسانی ضرورتیں تھیں۔انہوں نے اپنے گزارے کے لئے ایسے علاقے کو منتخب کر لیا جو اہل مکہ کے شام جانے والے تجارتی قافلوں کے راستے میں واقع تھا۔انہوں نے مکی قافلوں پر حملے کرنا شروع کر دیئے۔جس سے انہیں بے پناہ مالی و جسمانی نقصان پہنچنے لگا۔اس سے اہل مکہ بہت زچ ہوئے۔انہوں نے ابوسفیان کو حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بھیجا۔جس نے آ کر معاہدے کی اس شق کو ختم کرنے کی استدعا

---

[1]۔اس معاہدے کا نام اسی جگہ کی نسبت سے معاہدہ حدیبیہ رکھا گیا۔
[2]۔صحیح بخاری۔رقم:2731

کرتے ہوئے کہا کہ آپ ﷺ ہمارے تجارتی راستے کو محفوظ کرنے کے لئے اس گروپ کو مدینہ منورہ بلوا لیں[1]۔

بعض جہادی گروپ اس واقعہ کو نظیر بنا کر استدلال کرتے ہیں کہ حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ کی طرح کوئی بھی گروپ جہادی سرگرمیاں شروع کر سکتا ہے اور کسی سربراہ ریاست کی طرف سے اعلان کی ضرورت بھی نہیں ہے[2]۔ اس دلیل کو درج ذیل وجوہ کی بنا پر قبول نہیں کیا جا سکتا:

(i)۔ حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کا کیمپ مدینہ منورہ کی مسلم ریاست کے دائرہ اختیار اور اثر ورسوخ سے باہر تھا۔

(ii)۔ یہ گروپ نہ مسلم ریاست کے زیر کنٹرول تھا اور نہ ریاست اس کی کوئی مالی مدد کرتی تھی۔

(iii)۔ حضور نبی کریم ﷺ نے خود انہیں واپس بھیجا اور فرمایا تھا کہ تمہاری درخواست کی منظوری سے معاہدہ حدیبیہ توڑنے کے مترادف ہوگا۔

(iv)۔ آپ ﷺ نے ان کی سرگرمیوں کو نظر انداز نہیں کیا اور نہ قدر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔

(v)۔ اس گروپ کی سرگرمیوں کو مسلم فقہاء کرامؒ نے کبھی جہاد تسلیم نہیں کیا۔

(vi)۔ یہ واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ آپ ﷺ کتنی سختی سے معاہدے پر کاربند رہے باوجودیکہ ان شرائط کو قبول کرنے پر بہت مضطرب تھے۔

(vii)۔ یہ گروپ اس علاقے سے آپریٹ کرتا تھا جو اس کے اپنے کنٹرول میں تھا۔ مسلم ریاست کے اندر نہیں تھا[3]۔ کوئی بھی 'مفروضہ' مثلاً حضور نبی کریم ﷺ اس گروہ کی مدد کر رہے تھے یا اسے مالی امداد پہنچا رہے تھے آپ ﷺ کے کردار پر سنگین الزام لگانے کے مترادف ہوگا۔ حتیٰ کہ

---

[1]۔ صحیح بخاری: رقم: 2581؛ صحیح مسلم: رقم: 1783، 1784

[2]۔ الجہاد فی الاسلام از عبدالرحمٰن رحمانی۔ صفحہ نمبر 75-77

[3]۔ لہٰذا موجودہ پاکستانی جہادی، ریاستِ پاکستان سے باہر خود کو قائم کرنے کی شرط پر پورے نہیں اترتے۔ پاکستانی علاقے سے کی گئی کوئی بھی کارروائی پاکستان کی اُن قانونی ذمہ داریوں سے متصادم ہوگی جو بین الاقوامی قانون اور معاہدۂ شملہ کے تحت پاکستان پر عائد ہوتی ہیں۔ معاہدۂ شملہ بھارت اور پاکستان کا ایک دو طرفہ معاہدہ ہے جو 1971ء میں بعد از جنگ طے پایا تھا۔ اس سے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات معمول پر آ گئے تھے۔ اس جنگ میں بھارت اور بنگالی علیحدگی پسندوں نے بنگلہ دیش قائم کیا جو اس سے پہلے مشرقی پاکستان کہلاتا تھا۔

اہل مکہ نے بھی یہ الزام نہیں لگایا جو اس دوطرفہ معاہدے کے فریق تھے۔

(10)۔ لہٰذا کوئی بھی شخص مندرجہ بالا نظیر کا حوالہ دے کر حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کی سرگرمیوں کو بنیاد بنا کر اکیسویں صدی عیسوی میں جہاد کا اعلان اور جہاد شروع کرنے کا مجاز نہیں ہے جبکہ اس صدی میں مضبوط قومی ریاستیں موجود ہیں اور ایک قومی ریاست کا نظام پایا جاتا ہے جس میں عالمی مسلم کمیونٹی موجود ہے۔ فقہائے کرامؒ نے قرآن و سنت کی بنیاد پر بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جہاد کا اعلان کرنے، اسے عملی جامہ پہنانے یا تقدیس عطا کرنے کا کام حسبِ ضابطہ قائم اور آئینی طور پر مسلم حاکم، یعنی حکومت کر سکتی ہے۔ کسی فرد یا گروہ کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا نہ وہ خود یہ حق حاصل کر سکتا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے فتنہ اور لاقانونیت پھیلے گی۔ خون بہانے کا یہ طریق عمل (پریکٹس) جو ہم اکثر دیکھتے ہیں غلط تعبیر پر مبنی ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ غیر اسلامی ہے۔



تیئیسواں باب

اجتہاد

جب حضور اکرم ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو فرمایا: جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو جائے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ پاک کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم اللہ کی کتاب میں وہ مسئلہ نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: رسول اللہ ﷺ کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ مسئلہ سنت رسول (ﷺ) میں بھی نہ پاؤ اور کتاب اللہ میں بھی نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کروں گا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے ان کے سینہ کو تھپتھپایا اور ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ جس نے اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے قاصد (معاذ رضی اللہ عنہ) کو اس چیز کی توفیق دی، جس سے رسول اللہ (ﷺ) راضی ہیں[1]۔

انسانی زندگی میں ثبات وتغیر ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ یہ امر اسلام کے بارے میں بھی ایک حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ بعض اصول مستقل نوعیت کے ہیں اور انہیں قرآنی اصطلاح میں محکمات[2] کہا جاتا ہے جیسے 'توحید'، 'نبوت'، 'آخرت' اور انسانی وقار، یہ دائمی ہیں۔ ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں ہو سکتا خواہ کچھ بھی ہو جائے۔ اس دائمیت کے ساتھ ساتھ بعض ایسی چیزیں ہیں جن میں زمانہ گزرنے سے تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں بنی نوع انسان کی بقاء اور ارتقاء کے لئے بہت ضروری ہوتی ہیں۔ اسلام نے تبدیلیوں سے عہدہ برآئی کے لیے اجتہاد کا تصور دیا ہے تاکہ ہم تہذیب انسانی کی تیز رفتار پیش قدمی کا ساتھ دے سکیں۔ یہ تبدیلیاں سائنسی، معاشرتی، اقتصادی اور فلسفیانہ ارتقاء کی صورت میں ہو رہی ہیں۔ نامور سیاستدان و مدبر، شاعر اور سکالر حضرت اقبالؒ (d. 1938) اس تصور اجتہاد کی یوں وضاحت کرتے ہیں:

---

[1] سنن ابوداؤد۔ جلد سوم: رقم: 199

[2] محکمات محکم کی جمع ہے اور مستحکم اور پائیدار موضوعات کو محکمات کہا جاتا ہے۔ "محکمات" سے وہ قرآن پاک کی وہ آیات ہیں جن کا مفہوم اور معنی اس قدر واضح اور روشن ہو کہ جس کے معنی میں بحث و گفتگو کی کوئی گنجائش نہ ہو۔

ہمہ اقسام کی زندگی کی حتمی روحانی بنیاد، جیسا کہ اسلام نے متشکل کی ہے، لافانی ہے اور اپنا اظہار تنوع اور تغیر میں کرتی ہے۔ حقیقت کے ایسے تصور پر مبنی معاشرے کو اپنی زندگی میں دوام اور تغیر کی اقسام کے ساتھ لازماً ہم آہنگی اختیار کرنی چاہیے۔ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کو باقاعدہ و باضابطہ بنانے کے لئے لازماً غیر مبدل اصول ہونے چاہئیں۔ کیونکہ ان کا غیر مبدل ہونا مسلسل متغیر ہونے والی دنیا میں ہمیں قدم جمانے کی جگہ مہیا کرتا ہے۔ دائمی اصولوں کے بارے میں جب یہ سمجھ لیا جائے کہ انہوں نے تغیر کے جملہ امکانات کو خارج کر دیا ہے جو کہ از روئے قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں میں سے ایک ہے تو یہ ایک ایسا میلان ہوتا ہے جو اس چیز کو ساکن کر دیتا ہے جو اپنی فطرت میں اساسی طور پر 'متحرک' ہے۔ یورپ کی سیاسی اور معاشرتی علوم میں ناکامی اول الذکر اصول کا اظہار کرتی ہے جبکہ اسلام میں جمود، جو گزشتہ پانچ سو سال رہا، مؤخر الذکر اصول کا اظہار کرتا ہے۔ پھر اسلام کی ساخت میں جو اصولِ حرکت ہے؟ اسے اجتہاد کہا جاتا ہے[1]۔

اجتہاد کا یہ مطلب نہیں کہ ایک نیا مذہب تخلیق کیا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کے مستقل اصولوں کی تعبیر کرنا اور انہیں ہر عہد میں لاگو کرنا ہے۔ اجتہاد محض ایک فنی (ٹیکنیکل) مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک انسانی ضرورت اور زمانے کا ایک تقاضا ہے۔ مثال کے طور پر پہلے وقتوں میں تجارت اور کاروباری ترسیلات اونٹوں اور بادبانی کشتیوں کے ذریعے ہوتی تھیں۔ اب ان کی جگہ بحری جہازوں اور طیاروں کا استعمال ہو رہا ہے اور انٹرنیٹ سے بھی کام لیا جا رہا ہے۔ تجارت اور کاروبار کے بنیادی اصول (دیانت داری، حساب دہی، جائز قیمتوں کی ادائیگی، جائز منافع، املاک کا تحفظ اور وعدہ ایفائی) غیر مبدل رہتے ہیں۔ لیکن جدید کاروبار میں سے سامنے آنے والے مسائل کی نئی تعبیرات تلاش کرنا پڑتی ہیں اور ان کا اطلاق مفادِ عامہ کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔ اس کی ضرورت اس لئے لاحق ہوئی کہ کشتیوں کے ذریعے ہونے والی تجارت کی جگہ 'ای کامرس' (E-Commerce) نے لے لی ہے۔

حضرت ابو اسحاق الشاطبیؒ (d. 1388) نے اپنی معروف کتاب 'الموافقات' میں لکھا ہے کہ

---

[1] Reconstruction of Religious Thoughts in Islam by Muhammad Iqbal, p. 63.

اجتہاد کی ضرورت تا قیامت رہے گی کیونکہ انسان نے شریعت پر عمل کرنا ہے[1]۔ شریعت بنیادی اور وسیع تر اصول فراہم کرتی ہے لیکن چیزیں زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور نئے نئے مسائل سامنے آتے رہتے ہیں۔ ایسے مسائل کے حل کے لیے شریعہ کے بنیادی اور وسیع اصولوں کی نئی تعبیر اوران کے اطلاق کے طریقوں کو اجتہاد کہا جاتا ہے۔ بقول شاعر مشرق حضرت اقبالؒ:

> 'اس کے لفظی معنی زور لگانا، کے ہیں۔ اسلامی قانون کی اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک قانونی مسئلے پر اپنی آزاد رائے قائم کرنے کی کوشش (جدوجہد) کی جائے'۔ میرے خیال میں اس کا حقیقی ماخذ قرآن کریم کی یہ معروف آیت ہے:
>
> وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا[2]
>
> (جولوگ ہمارے لیے محنت کریں گے ہم انہیں اپنے راستے دکھائیں گے)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجتے ہوئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو ہدایت فرمائی۔ وہ اسلام میں اجتہاد کا سر چشمہ ہے۔ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا تو فرمایا: جب تمہارے پاس کوئی مقدمہ پیش ہو جائے تو تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ انہوں نے کہا کہ اللہ پاک کی کتاب سے فیصلہ کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم اللہ کی کتاب میں وہ مسئلہ نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ مسئلہ سنت رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں بھی نہ پاؤ اور کتاب اللہ میں بھی نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں کروں گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سینہ کو تھپتھپایا اور ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ جس نے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاصد (معاذ رضی اللہ عنہ) کو اس چیز کی توفیق دی، جس سے رسول

---

[1]۔ الموافقات فی اصول الشریعۃ از امام شاطبی: جلد چہارم: صفحہ نمبر 63

[2]۔ سورۃ العنکبوت: آیت: 69

اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) راضی ہیں[1]۔

لفظ اجتہاد 'جُہدْ' سے ماخوذ ہے جس کا مطلب 'زور' لگانا ہے۔ اجتہاد کے معنی ہیں اپنی ساری صلاحیتوں کو پوری طرح کام میں لانا۔ مذہبی اصطلاح کے طور پر اس کا مطلب ہے شریعۃ کے وسیع اصولوں کی روشنی میں ایک مسئلے کو حل کرنے کے لئے تمام کوششیں بروئے کار لانا۔ حضرت اقبالؒ (d. 1938) اس نقطے کی وضاحت کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں:

> 'تاریخ اسلام کا ہر طالب علم اس بات سے آگاہ ہے کہ اسلام کی سیاسی توسیع کے ہمراہ قانونی افکار کو منضبط و مربوط کرنا بے حد وحساب ضروری ہو گیا تھا۔ ہمارے فقہاء کرامؒ، انتھک کوشش کرتے رہے تاوقتیکہ انہوں نے قانونی افکار کا خزانہ جمع کر لیا جو مسلمہ مکاتب شریعت میں ڈھل گیا۔ یہ مکاتیب اجتہاد کے تین مدارج کو تسلیم کرتے ہیں۔

(1)۔ قانون سازی کا مکمل اختیار جو عملاً ان مکاتب کے بانیوں تک محدود ہے۔

(2)۔ نسبتی اختیار جو ایک خاص مکتبۂ فکر کے دائرے کے اندر رہ کر بروئے کار لایا جائے گا۔

(3)۔ خصوصی اجتہاد جو اس قانون سے تعلق رکھتا ہے جس کا اطلاق اس خاص مسئلے پر ہونا ہے جس کو بانیان نے طے نہیں کیا تھا۔

سادہ لفظوں میں اجتہاد دو قسموں کا ہے، جزوی اور کلی۔ اول الذکر اجتہاد یہ ہے کہ کسی چھوٹے حکم پر شریعت کے بنیادی اصولِ شریعہ کا اطلاق کرنے کے بعد ایک رائے قائم کرنا۔ جزوی اجتہاد کی ایک مثال غزوہ خندق میں پیش آئی۔ جنگ خندق سے فارغ ہو کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک گروہ کو حکم دیا کہ وہ بنی قریظہ کی بستی میں جائیں اور وہاں جا کر عصر کی نماز پڑھیں۔ وہ لوگ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں عصر کی نماز کا وقت آ گیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی وہ جماعت دو حصوں میں بٹ گئی۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم راستے میں نماز نہیں پڑھیں گے بلکہ منزل پر پہنچ کر پڑھیں گے۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ یہ تھے کہ بنی قریظہ میں جا کر نماز پڑھیں۔ اس کے برعکس کچھ دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ نماز میں تاخیر ہو رہی ہے۔ راستے میں نماز پڑھ لی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حکم دیا تھا اس کا اصل مطلب یہ تھا کہ جلد از جلد منزل پر پہنچا جائے۔ تاخیر نہ کی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں گروہوں کی رائے کو منظور

[1] سنن ابوداؤد۔ جلد سوم: رقم: 199

فرمایا[1]۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپؐ نے دونوں گروہوں کی تعبیر کو درست قرار دے دیا۔

کلی اجتہاد سے مراد ہے کہ کسی صورت حال میں عام فکر سے اوپر اٹھ کر دین کے وسیع تر مفاد میں رائے قائم کی جائے۔ حضور نبی کریم ﷺ کے عہد میں صلح حدیبیہ اس کی عمدہ مثال ہے (نبی علیہ السلام وحی کی روشنی میں کام کرتے ہیں۔ نبی کا عمل سنت کہلاتا ہے جو اجتہاد کا ماخذ ہے۔ اس لیے یہاں سیرت پاک کی مثالوں کو وسیع تر تناظر میں دیکھنا چاہیے)۔ یہ معاہدہ آپ ﷺ نے یک طرفہ شرائط پر کیا۔ عمرہ چھوڑ دیا۔ محمد رسول اللہ (ﷺ) کا لفظ مٹا دیا۔ حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ جیسے زخمی مظلوم کو واپس بھیج دیا۔ سب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ناخوش تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے گلہ کیا کہ ایسی شرائط پر تو معاہدے ہم نے دور جاہلیت اور کمزوری کے وقت بھی نہیں کیے تھے۔ اب تو ہمارے پاس ہدایت اور قوت ہے۔ مگر آپ ﷺ نے وقتی مصلحتوں اور پریشانیوں سے اوپر اٹھ کر سوچا۔ آپ ﷺ کی نظر حال کی بجائے مستقبل کو دیکھ رہی تھی۔ نتیجہ دیکھ لیں۔ قرآن مجید نے اس کو فتح مبین کہا ہے[2]۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ بظاہر دب کر کی جانے والی صلح اصل میں اسلام کے لیے مفید ثابت ہوئی اور غلبہ اسلام کا سبب بنی۔

اسی طرح جب حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کفار مکہ کے ظلم سے تنگ آ کر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے لگے تو قریش کے کچھ لڑکوں نے ان کا راستہ روکا اور دینار چھین لیے۔ اب حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کے سامنے یقیناً یہ حدیث ہو گی کہ جو شخص اپنی جائیداد کو بچاتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے[3]۔ ان کے سامنے شہادت کے فضائل بھی ہوں گے۔ آپ رضی اللہ عنہ باہمت انسان بھی تھے۔ لیکن انہوں نے قریش کے ان لڑکوں سے لڑنا پسند نہ کیا۔ شہادت کو چھوڑ دیا بلکہ اسلام کے وسیع تر مفاد میں اپنے دینار لڑکوں کے حوالے کر دیئے[4]۔ اپنی جان بچا کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ یہ کلی اجتہاد کی ایک شکل تھی۔ مندرجہ بالا مثالوں سے یہ واضح ہوا کہ اجتہاد کلی ہو یا جزوی کسی بھی دینی حکم یا ہدایت کے حوالے سے ہی ہوتا ہے۔

ہمیں عہد حاضر میں ایک عمومی اور کلی اجتہاد کی ضرورت ہے۔ جس کے نتیجے میں فکر اسلامی

---

[1]۔ صحیح بخاری۔ جلد دوم: رقم: 1342

[2]۔ سورۃ الفتح: آیت: 1 (اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا)

[3]۔ دیکھیے صحیح بخاری۔ جلد اول: رقم: 2380

[4]۔ کنز العمال۔ جلد اول: رقم: 4271

کی تشکیل جدید کی ضرورت ہے۔ حضرت اقبالؒ نے 1929ء میں فکر اسلامی کی تشکیل جدید (The Reconstruction of Religious Thoughts in Islam) میں اس عظیم کام کوشروع کیا۔عہد حاضر شدید تقاضا کرتا ہے کہ اس تشکیل جدید کے عمل کوجلد از جلد آگے بڑھایا جائے۔ تشکیل جدید کلی اجتہاد سے ہوتی ہے۔جس کے لیے ہمارے علما تیار نہیں ہیں۔اس لیے تشکیل جدید کا عمل نہیں ہوسکا حالانکہ اجتہاد اسلام میں مطلوب اور لازم ہے۔اجتہاد اتنا مطلوب ہے کہ اجتہادی غلطی پر بھی ثواب ملتا ہے۔حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب کوئی آدمی فیصلہ کرے اور وہ اجتہاد کرے اور اس کا فیصلہ درست ہو تو اس کے لیے دو اجر ہیں۔اگر وہ فیصلہ کرے اور اجتہاد کرے پھر وہ غلطی کر جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہے[1]۔

علماء نے لکھا ہے کہ پہلے شخص کے لیے جو دو اجر، کوشش اور درستگی کے لیے ہیں جبکہ دوسرے شخص کو صرف کوشش کا اجر ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ اجتہاد اتنا پسندیدہ عمل ہے کہ اس میں غلطی کرنے پر بھی ثواب ہے۔بشرطیکہ انسان کی نیت درست ہو۔اس سے اصول طے ہوگیا کہ اجتہاد ہر حال میں جاری رہنا چاہیے۔ چاہے غلطیاں بھی ہوتی رہیں۔اب ہم نے اجتہاد ختم کر دیا ہے کہ کہیں غلطی نہ ہو جائے۔ یہ اسلام کی تعلیم اور وقت کے تقاضوں کے خلاف ہے۔اس لیے ہم پر جمود (inertia) طاری ہے۔اگر ہم نے اپنا یہ رویہ ترک نہ کیا تو ذلت و رسوائی ہمارا مقدر ہوگی۔

اجتہاد ایک فریضہ اور ایک حساس مسئلہ ہے۔ ہر مومن اجتہاد کی مطلوب شرائط پر پورا نہیں اتر سکتا۔اجتہاد کرنے کے لئے ایک شخص میں متعدد بنیادی شرائط پائی جانی چاہئیں۔ان میں سے بعض شرائط کا قدیم کتابوں میں ذکر پایا جاتا ہے:

(i)۔ عربی زبان کا عالم ہونا۔

(ii)۔ قرآن کا عالم ہونا۔

(iii)۔ حدیث کا عالم ہونا۔

(iv)۔ اصول تفسیر، اصول حدیث اور اصول فقہ سے واقف ہونا۔

(v)۔ عظیم فقہا کی آراء سے واقف ہونا۔

---

[1]۔صحیح بخاری۔جلد سوم: رقم:2252

(vi)۔ دین کی روح سے واقف ہونا، شریعت کے مقاصد سے واقف ہونا۔

(vii)۔ مروجہ قوانین اور رسوم و رواج سے واقف ہونا۔

(viii)۔ احکام دین پر عمل کرنا وغیرہ وغیرہ۔

اگر ہم اپنے گرد و پیش میں موجود اہل علم کو اس پیمانے سے جانچیں تو پتہ چلے گا کہ متعدد علما و فضلا ان شرائط پر پورے اترتے ہیں۔ پھر اجتہاد کے دروازے نہیں کھلتے اور ہم تعطل کا شکار ہو رہے ہیں۔ حضرت اقبالؒ (d. 1938) نے اس صورت حال پر کڑی تنقید کی ہے:

> اجتہاد کے دروازے بند ہونا محض ایک افسانوی بات ہے جو کسی حد تک اسلام میں قانونی فکر کے قلم پذیری/ جم جانے (crystallization) اور کسی حد تک ذہنی سہل انگاری کا شاخسانہ ہے۔ ایسا تصور خصوصاً روحانی زوال کے زمانے میں ابھرتا ہے جو عالی دماغ لوگوں کو بُت بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ اگرچہ دورِ متاخر کے بعض علماء نے اس افسانے کی تائید کی ہے۔ تاہم جدید اسلام ذہنی آزادی سے رضا کارانہ دستبرداری کا پابند نہیں ہے۔ زرکشی نے جو آٹھویں صدی ہجری کا صاحبِ قلم تھا بجا طور پر کہا ہے: 'اگر اس تصور کے علمبرداروں کا مطلب یہ ہے کہ سابق دور کے فقہاء کے پاس زیادہ زیادہ سہولتیں تھیں اور دورِ متاخر کے صاحبانِ قلم کے لئے یہ راہ اختیار کرنے میں زیادہ مشکلات تھیں تو یہ احمقانہ بات ہے کیونکہ یہ دیکھنے کے لئے زیادہ سوجھ بوجھ کی ضرورت نہیں ہے کہ بعد کے فقہاء کے لئے اجتہاد، سابق دور کے فقہاء کی بہ نسبت زیادہ آسان ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن و سنت کی تفاسیر اتنی تعداد میں مرتب ہوئیں اور آج اتنی بڑی تعداد میں دستیاب ہیں کہ آج کے مجتہد کے پاس تعبیر کے لئے اتنا مواد اکٹھا ہو چکا ہے جو اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے[1]۔

اس رویے (اجتہاد کے دروازے بند ہو جانے کا) کے بڑے اسباب میں سے، ایک سبب شخصیت پرستی ہے۔ مسلمان سابق ادوار کی شخصیات کے فیصلوں اور ان کی آرا سے انحراف نہیں چاہتے۔ وہ

1۔ Reconstruction of Religious Thoughts in Islam by Muhammad Iqbal, p.75.

ذہنی اور علمی تنقید کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے اور نہ اس کی حمایت کر سکتے ہیں۔ تاہم اس قسم کا طرزِ عمل اسلام کے دورِ اول میں نہیں ملتا۔ ہماری فقہ کی ابتدائی تاریخ ایسی عصبیت کی عکاسی نہیں کرتی حالانکہ اول اسلام ایسا نہ تھا۔ اول فقہ میں ایسا نہ تھا۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) کے شاگردوں نے پچاسی فیصد (85%) معاملات میں اپنے استاد سے اختلاف کیا اور آج کل فقہ حنفی حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) کے شاگردوں کی آرا پر قائم ہے[1]۔ شاید اس سے بھی زیادہ نمایاں بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اس امر کی کافی مثالیں ہیں جن میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اختلاف کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تبادلۂ خیال کیا اور اپنی آرا پیش کیں۔

ہمارے نزدیک تنقید یا اختلاف رائے ایک (taboo) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے ولایت (England) میں حیرانی ہوئی کہ جب وہاں ہمیں مقدمات کی نظائر (precedents) پڑھا رہے ہوتے تھے تو عام جونیئر اساتذہ بھی برطانیہ کی اعلیٰ ترین عدالت (House of Lords) کے فیصلوں پر بہت بے رحمی سے تنقید کرتے تھے۔ اس کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جدید نظامِ تعلیم میں جرح و تنقید کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ بڑوں کے نظریات پر تنقید بالکل عام ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں میں ناقدانہ فکر (critical thinking) پائی جاتی ہے۔ جس کے سبب مغرب ہر لمحے ترقی کرتا رہتا ہے۔

ضمیر مغرب ہے تاجرانہ، ضمیر مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ[2]

ہم نے اپنے بڑوں کے گرد تقدیس (holiness) کے ہالے بنا لیے ہیں۔ ذرا سے اختلاف کو بھی توہین اور لائق گردن زنی تصور کیا جاتا ہے حالانکہ اختلاف اور احترام دو مختلف چیزیں ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ صلح حدیبیہ اور جنگ حنین کے موقع پر اکثر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اختلاف کیا تھا؟ خلافت راشدہ کے دور میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ امام ابو یوسفؒ (d. 798) اور امام محمد الشیبانیؒ (d. 805) نے امام ابوحنیفہؒ (d. 772) سے اکثر معاملات میں اختلاف کیا ہے۔ آپ دیکھیں کہ احترام و محبت بھی برقرار رہی اور اختلاف رائے بھی ہوا۔

---

[1]۔ خطبات بہاولپور از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صفحہ نمبر 92

[2]۔ ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض؛ ارمغان حجاز از محمد اقبالؒ

اس لیے ہمیں یہ رٹ چھوڑ دینی چاہیے کہ فقہ کے پانچ مسلمہ مکاتب فکر (حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ، حنابلہ اور اہل تشیع) کے علاوہ کوئی رائے نہیں ہو سکتی۔ دوسری رائے ہو سکتی ہے۔ قدیم و جدید علماؒ کی ایک کثیر اور قابل احترام جماعت اس کی حامی ہے۔ امام عبدالسلامؒ (d. 1262)، علامہ بحر العلوم حنفیؒ، امام محمد شوکانیؒ[1] (d. 1839)، اشرف علی تھانویؒ[2] (d. 1943) اور شیخ مصطفیٰ المراغیؒ[3] (d. 1945) اس صف میں شامل ہیں۔ یہاں میں صرف ان چند ناموں کا تذکرہ کر رہا ہوں۔ ہمارے ہاں کلی اجتہاد کی ایک بہت اچھی کوشش حضرت شاہ ولی اللہؒ (d. 1762) نے کی۔ شاہ صاحبؒ نے اسلام کی اجتماعی ہیئت اور عدل اجتماعی پر بہت زور دیا۔ جہادی تحریک (1831ء)، علما دیوبند، جامعہ ملیہ، ندوۃ العلماء، جماعت اسلامی، جمعیت العلماء ہند، علامہ شبلی نعمانی[4] (d. 1914)، سر سید احمد خان (d. 1898)، اور اقبالؒ (d. 1938) سب کسی نہ کسی درجہ میں شاہ صاحبؒ سے متاثر ہیں۔ لیکن میں انہیں اپنی تاریخ کے عظیم صاحبانِ ذہانت و فراست ماننے کے باوجود یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ وہ نئے زمانوں کے خطرات کا صحیح طور پر ادراک نہ کر سکے۔ دور حاضر کے نئے مسائل ان کے زمانے میں ہی سر اٹھا چکے تھے۔ وہ مغرب میں فطری سائنس اور معاشرتی علوم میں رونما ہونے والی نئی جہتوں میں ہونے والی پیشرفتوں سے لاتعلق رہے تھے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ (d. 1773) کے دور میں یورپ میں نشاۃِ ثانیہ (Renaissance) شروع ہو چکی تھی بلکہ صنعتی انقلاب (Industrial Revolution) شروع ہو رہا تھا۔ یورپی تاجر، مشنری، سیاح اور سائنسدان اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ انگریزوں نے 1639ء میں مدراس اور 1661ء میں بمبئی پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہندوستان کے اکثر ساحلی علاقے یورپ کی نئی سائنس و سماجی طاقت کے

---

[1] امام محمد الشوکانیؒ (1759ء-1839ء) معروف یمنی اسلامی محقق، فقہ اور اصلاح پسند سکالر تھے۔

[2] حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (1863ء-1943ء) ہندوستان کے معروف حنفی سکالر تھے۔

[3] شیخ محمد مصطفیٰ المراغیؒ (1881ء-1945ء) جامعۃ الازہر کے ریکٹر اور مصری اصلاح پسند مفکر تھے۔ آپ نے قرآن و حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے اجتہاد پر زور دیا۔

[4] مولانا شبلی نعمانیؒ (1857ء-1914ء) برصغیر پاک و ہند کے معروف اسلامی سکالر اور ندوۃ العلماء کے بانی تھے۔ آپ کو جدید اسلامی تحقیقات کا بانی خیال کیا جاتا ہے۔ ان کی سیرت النبی ﷺ، الفاروق، سوانح مولانا روم، علم الکلام، المامون، موازنہ (دبیر و انیس)، شعر العجم، مقالات شبلی، سیرت النعمان اور الغزالی مایہ ناز تصنیفات ہیں۔

سبب انگریزوں کے قبضے میں آ گئے تھے۔شاہ صاحبؒ نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ (d. 1773) نے تفصیل کے ساتھ جہاد وقتال کے اصول ومسائل بیان کیے ہیں لیکن دعوت وتبلیغ پر زیادہ توجہ نہ دی۔ان کی کتب دین کے اس اہم پہلو پر زیادہ تر خاموش ہیں۔ مسلمانوں میں حربی (militant) سوچ رہی ہے۔جبکہ دین زیادہ تر دعوتی سوچ کا نتیجہ ہے اور اسی سے قائم ہے۔اسی سے قائم رہے گا۔سید احمد شہیدؒ[1] (d. 1831) کی تحریک سے لے کر اخوان المسلمین[2] اور طالبان تک کی تاریخ گواہ ہے کہ ان تحریکوں کے پاک باز نوجوان بھی اپنی جوانیاں لٹا کر اسلام کو غلبہ نہ دے سکے۔غالباً اسی لیے کہ اسلام میں تلوار سے زیادہ قلم کی اہمیت ہے۔دین اقراء سے شروع ہوا ہے۔ سیف (تلوار) سے شروع نہیں ہوا۔اس لیے نتیجہ صاف ظاہر ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ (d. 1773) (متوفی 1773) سے بہت پہلے گیلیلیو (Galileo,d. 1642) اور نیوٹن (Newton, d. 1727) نے سائنسی میدانوں میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔حضرت شاہ ولی اللہؒ (d. 1773) نے اس سائنسی ارتقا کا نوٹس نہیں لیا۔ان کی شاہکار تصنیف حجۃ اللہ البالغہ پہلی بار 1870 میں چھپی جبکہ یورپ پچھلے چار سو برسوں سے کتابوں کی طباعت واشاعت کرتا چلا آ رہا تھا۔

میں حضرت شاہ ولی اللہؒ (d. 1773) کی خدمات کا بہت مداح ہوں۔انہوں نے پہلی بار قرآن مجید کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور وحی الٰہی کا فہم عام کرنے کی شاہراہ کھول دی۔ان کے مدرسہ رحیمیہ نے اسلامی علوم کی ترویج کے لئے بہت اہم کردار ادا کیا۔میں یہاں ان پر تنقید نہیں کر رہا بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ کلی اجتہاد کی اشد ضرورت ہے۔مسلم معاشرے کو شاہ ولی اللہؒ (d. 1773) جیسے بہت سے اہل علم ودانش کی ضرورت ہے جو ہر زمانے میں اور بہت سے مقامات پر دائماً متغیر ہونے والے حالات میں

---

[1] ۔سید احمد شہیدؒ (1786ء - 1831ء) برصغیر پاک وہند کے صوفی بزرگ، مجدد اور مرد مجاہد تھے۔آپؒ نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ سے منازل سلوک طے کیں۔آپؒ کی کوششوں سے ہندوستان کو سکھوں اور انگریزوں سے آزاد کروانے کے لیے تحریک مجاہدین وجود میں آئی۔آپؒ نے سکھوں سے کچھ علاقہ فتح کر کے وہاں اسلامی قوانین کا نفاذ بھی کیا۔بالآخر بالاکوٹ کے مقام پر مقامی لوگوں کی بے وفائی کی وجہ سے سکھ راجہ رنجیت سنگھ کی فوجوں نے آپؒ کو شہید کر دیا۔

[2] ۔اخوان المسلمین اسلامی تعلیمات کے احیاء کی جماعت ہے جو 1929ء میں مصر میں قائم ہوئی۔اس کے بانی شیخ حسن البنا تھے۔اس جماعت کا منشا اسلام کے بنیادی عقائد کا احیا اور ان کا نفاذ تھا۔مگر بعد میں یہ جماعت سیاسی شکل اختیار کر گئی اور مصر میں یہ تحریک کافی مقبول ہوئی اور اس کی شاخیں دوسرے عرب ممالک میں بھی قائم ہو گئیں۔

اسلام کے سنہرے اصولوں کی از سرِ نو تعبیر و تشریح کا کام کرتے رہیں۔ بدقسمتی سے اسلامی دنیا میں یہ عمل بند چلا آرہا ہے۔ شیخ ابن تیمیہؒ (d. 1328) کے بعد حضرت شاہ ولی اللہؒ (d. 1773) کے سوا کوئی قابل ذکر نام نہیں ملتا۔ بعد ازاں موت کی سی ایک طویل خاموشی چھا گئی ہے۔

اجتہاد سے مراد یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی قیادت زندگی کے نئے پیش آنے والے مسائل میں انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر صحیح فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ اسلام کی روح اور اسلام کے قانون سے اتنی گہری واقفیت رکھتے ہوں کہ وہ امت کی مشکلات کو حل کر سکیں۔ وہ عقل اور علم رکھتے ہوں۔ محنت کے لیے تیار ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس وسیع کائنات میں جو قوتیں عطا کی ہیں۔ ان سے کام لے سکیں۔ ان کو اسلام کے مقاصد کے لیے مفید بنا سکیں[1]۔

بدقسمتی سے آج ہماری صورت حال ان حالات کے بالکل برعکس ہے جو اسلام ہم سے توقع کرتا تھا کہ ہم پیدا کریں۔ ہماری زیادہ تر قیادت 'ایلیٹ کلاس' (elite) کے ہاتھ میں ہے جو علم اور ذہانت سے بالکل تہی دست ہے۔ نہ وہ دولتِ ایمان سے مالا مال ہے اور نہ اعلیٰ اخلاق سے مزّین ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ ہے تو وہ اقتدار اور دولت کی ہوس ہے۔ جب انتخابات کا وقت آتا ہے اور اپنے اقتدار کے دوام کے لئے ووٹ مانگنے آتے ہیں تو وہ اسلام پسند بن جاتے ہیں اور مذہب سے شغف ظاہر کرنے کے لئے جعلی طور طریقے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اسلام پسند عمومی طور پر بدعنوان حکمرانوں کی قوت کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔ پاکستان کا جنرل ضیاء الحق (d. 1988) اور سوڈان کے جنرل عمر بشیر کی مثال لے لیجیے۔ اسلام پسند لوگوں نے اس مغالطے کا شکار ہو کر کہ یہ اسلام نافذ کریں گے، دونوں کو کامیاب بنا دیا۔

اس ذہنی بنجر پن کا نتیجہ بادشاہتوں کے سقوط کی صورت میں نکلا ہے مسلم ممالک بھی اسی کے شکار ہوئے، سید ابوالحسن ندوی (d. 1999) ترکوں کی سلطنت کے زوال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

سب سے بڑا مرض جو ترکوں میں پیدا ہوا تھا وہ جمود تھا۔ جمود بھی دونوں طرح کا۔ علم و تعلیم میں بھی جمود اور فنون جنگ و عسکری تنظیم و ترقی میں بھی۔ قران مجید کی یہ آیت انہوں نے بالکل فراموش کر دی: مسلمانو! جہاں تک تمہارے بس میں ہے قوت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار رکھ کر دشمنوں کے مقابلہ کے

[1]۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ صفحہ نمبر 163

لیے اپنا ساز وسامان مہیا کیے رہو کہ اس طرح مستعد رہ کر تم اللہ تعالیٰ کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو[1] اور حضور نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ان کے حافظہ سے گویا محو ہو گیا تھا کہ دانائی کی بات مومن کا گم شدہ مال ہے۔ جہاں اس کو مل جائے وہی اس کا زیادہ حق دار ہے[2]۔ ایسی حالت میں کہ وہ یورپ کی حریف سلطنتوں اور قوموں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ ان کو فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کی وہ وصیت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے تھی جو انہوں نے مصر کے مسلمانوں کو کی تھی کہ اس بات کو کبھی نہ بھولنا کہ تم قیامت تک خطرہ کی حالت میں ہو۔ ایک اہم ناکہ پر کھڑے ہوئے ہو۔ اس کہ تم ہمیشہ ہوشیار اور مسلح رہنا چاہیے۔ کیونکہ تمہارے چاروں طرف دشمن ہیں اور ان کی نگاہیں تم پر اور تمہارے ملک پر لگی ہوئی ہیں۔

علمی جمود اور ذہنی اضمحلال اس وقت صرف ترکی اور اس کے علمی اور دینی حلقوں کی خصوصیت نہیں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ پورا عالم اسلامی مشرق سے مغرب تک ایک علمی انحطاط کا شکار تھا۔ دماغ تھکے تھکے سے اور طبعتیں بجھی بجھی سی نظر آتی تھیں۔ اگر ہم احتیاطاً آٹھویں صدی ہجری سے اس ذہنی اضمحلال کی ابتدا نہ کریں تو اس میں شک نہیں کہ نویں صدی ہجری وہ آخری صدی تھی جب جدت فکر، قوت اجتہاد اور ادب و شاعری، حکمت وفن میں ندرت اور تخلیق کے آثار نظر آتے ہیں۔ پچھلی صدیوں کے علماء کے تذکرے اور کتب سوانح پڑھیے۔ سینکڑوں ناموں میں ایک ایسا شخص ملنا مشکل ہو گا جس پر عبقری (genius) کے لقب کا اطلاق درست ہو یا جس نے کسی موضوع پر کوئی نئی چیز پیش کی ہو۔ پچھلی صدیوں میں ہم صرف چند افراد کا استثنا کر سکتے ہیں جو اپنے زمانہ کی عام علمی و ذہنی سطح سے بہت بلند تھے[3]۔

یہ طویل اقتباس یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ المناک صورت آج بھی ویسی ہی ہے جو سلطنت عثمانیہ کے بارے میں تھی۔ آج بھی وہی جمود ہے۔ وہی بے خبری ہے۔ آج بھی وہی خطرات ہیں۔ آج بھی وہی

---

[1]۔ سورۃ الانفال: آیت: 60 (وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ)

[2]۔ کنز العمال۔ جلد ہشتم: رقم: 4285 (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حکمت کی بات مومن کی کھوئی ہوئی چیز ہے۔ لہٰذا اسے جہاں بھی پائے وہی اس کا مستحق ہے)

[3]۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر از سید ابوالحسن علی ندویؒ۔ صفحہ نمبر 189

تھکاوٹ و اضمحلال ہے۔ آج بھی کوئی باہمت مرد نہیں ہے۔ ہم نے پانچ سو سال میں کوئی بھی عبقری (genius) پیدا نہیں کیا۔ آپ یورپ کی فہرست دیکھیں۔ سائنس میں آپ کو کاپرنیکس (Copernicus, d. 1543)، برونو (Bruno, d. 1600)، کیپلر (Kepler, d. 1630)، گیلیلیو (Galileo, d. 1645)، نیوٹن (Newton, d. 1727)، ڈارون (Darwin, d. 1882) اور آئن سٹائن[1] (Einstein, d. 1955) ملتے ہیں۔ فلسفہ میں بیکن (Bacon, d. 1294)، ہیوم (Hume, d. 1776)، والٹیر[2] (Voltaire, d. 1778)، کانٹ (Kant, d. 1804)، ہیگل[3] (Hegel, d. 1831)، شوپنہار[4] (Schopenhauer, d. 1860)، نطشے[5] (Nietzsche, d. 1900) اور برگساں[6] (Bergson, d. 1941) ملتے ہیں۔ معاشیات میں

۱۔ Albert Einstein؛ البرٹ آئن سٹائن (1879ء-1955ء)، بیسویں صدی کا سب سے بڑا طبیعیات دان سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ Voltaire؛ والٹیر (1694ء-1778ء) ایک روشن خیال فرانسیسی فلسفی تھا۔ وہ ایک شاعر، ناول نگار، ڈرامہ نویس اور تاریخ دان بھی تھا۔ انسانی حقوق کے شعور اور انقلاب فرانس کے لیے اس کا کردار بہت اہم ہے۔ اس کی تحریریں انقلاب فرانس کا سبب بنیں۔

۳۔ Friedrich Hegel؛ ہیگل (1770ء-1831ء) ایک مشہور جرمن فلسفی تھا۔ جس نے تاریخ، سیاسیات، مذہب، آرٹس، منطق اور مابعد ازطبیعیات پر کتب تحریر کیں۔ اس کی کتابیں بعد میں روشن خیالی کی تحریک کا سبب بنیں۔

۴۔ Arthur Schopenhauer؛ شوپن ہاؤر (1788ء-1860ء) ایک قنوطی جرمن فلسفی تھا۔ 19ویں صدی کے ابتدائی عشروں میں انقلاب فرانس اور نپولین کی جنگوں کی وجہ سے یورپ میں آئی افراتفری اس کے نظریات میں نظر آتی ہے۔ اس نے اپنے نظریات کو اپنی کتاب The World as Will and Idea میں پیش کیا۔

۵۔ Friedrich Nietzsche؛ فریڈرک نطشے (1844ء- 1900ء) جرمن فلسفی تھا جس نے فوق البشر (superman) کے تصور کو آگے بڑھایا۔

۶۔ Henri Louis Bergson؛ ہنری برگساں (1859ء-1941ء) فرانسیسی فلسفی اور مشہور حکیم تھا۔ اسے 1927ء میں ادبیات کا نوبل انعام دے گیا۔ برگساں ثنویت کا قائل تھا۔ یعنی عالم میں دو مستقل جوہر، زندگی اور مادہ ہیں جو آپس میں برسرپیکار رہتے ہیں۔ زندگی ہمیشہ رواں دواں رہتی ہے اور ہمیشہ اوپر کی سمت جاتی ہے۔ وہ ایک فعال اور متحرک قوت ہے جو بیک وقت مادے کے اندر اور مادے سے ماوراء کر گہرائی، لطافت، تنوع اور پیچیدگی کے لیے تڑپتی ہے۔

آدم سمتھ (Adam Smith, d. 1790))، ریکارڈو (Ricardo, d. 1823)، مالتھس[1] (Malthus, d. 1834)، مارکس (Marx, d. 1883) اور کینز[2] (Keynes, d. 1946) ملتے ہیں۔ ادب میں شیکسپیئر (Shakespeare, d. 1616)، ملٹن[3] (Milton, d. 1674)، کیٹس[4] (Keats, d. 1821)، شیلے (Shelley, d. 1822)، ورڈز ورتھ Wordsworth, d. 1850)، وکٹر ہیوگو[5] (Victor Hugo, d. 1885) اور ٹالسٹائی[6] (Tolstoy, d. 1910) ملتے ہیں۔ نفسیات میں ولیم جیمز[7] (William James, d. 1910)، ایڈلر[8] (Adler, d. 1937)، فرائڈ[9] (Freud, d. 1939) اور یونگ[10] (Jung, d. 1961) ملتے ہیں۔

یہ فہرست بہت طویل ہے۔ لندن میں آپ کسی محلے میں چلے جائیں تو آپ کو گلی میں ایک نیلے رنگ کی تختی ملے گی۔ جس پر لکھا ہوگا کہ وہ سائنسدان اس گھر میں فلاں سال سے فلاں سال تک رہا۔ اس گھر کو اس طرح محفوظ کیا گیا ہوگا کہ جیسے وہ سائنسدان ابھی چند لمحے کے لیے کہیں باہر گیا ہے۔ اس کا سارا سامان وہاں موجود ہے۔ ہم نے دین کی احیا کے نام پر سعودی عرب میں اپنے اکابرین کے سارے

۱۔ Thomas Robert Malthus؛ تھامس رابرٹ مالتھس (1766ء-1834ء) معروف برطانوی ماہر معاشیات تھا۔ اس نے آبادی کے لیے اپنا مشہور نظریہ پیش کیا۔ اس کے مطابق جلد یا بدیر قدرت حرکت میں آتی ہے، تباہی اور زلزلوں کے ذریعے آبادی پھر سے وسائل کے مطابق ہو جاتی ہے۔

۲۔ John Maynard Keynes؛ جان مینارڈ کینز (1883ء-1946ء) ایک انگریز ماہر معاشیات اور فلسفی تھا۔

۳۔ John Milton؛ جان ملٹن (1608ء-1674ء) ایک معروف انگریزی شاعر تھا۔

۴۔ John Keats؛ جان کیٹس (1795ء-1821ء) انگریزی ادب کا ایک عظیم شاعر اور رومانوی تحریک کی ایک اہم شخصیت تھا۔ اس کی خوبصورت شاعری حسوں کو متاثر کرتی ہے۔

۵۔ Victor Marie Hugo؛ وکٹر ہیوگو (1802ء-1885ء) فرانسیسی شاعر، ناول نگار اور ڈرامانویس تھا۔

۶۔ Count Lev Nikolayevich Tolstoy؛ ٹالسٹائی (1828ء-1910ء) روسی ناول نویس اور فلسفی تھا۔

۷۔ William James؛ ولیم جیمز (1842ء-1910ء) امریکی ماہر نفسیات، فلاسفر اور سرجن تھا۔

۸۔ Alfred Adler؛ آلفرڈ ایڈلر (1870ء-1937ء) آسٹریا کا مشہور ماہر علاج امراض نفسی تھا۔ اس نے انفرادی نفسیات (Individual Psychology) کے مکتب کی بنیاد رکھی۔

۹۔ Sigmund Freud سگمنڈ فرائڈ (1856ء-1939ء) کو جدید نفسیات کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔

۱۰۔ Carl Gustav Jung؛ یونگ (1875ء-1961ء) سوئس ماہر نفسیات تھا۔

نشانات مٹا دیئے ہیں۔صدیوں کا خزانہ چند دنوں میں برباد کر دیا۔اس سے بڑی بدتہذیبی اور علم دشمنی کیا ہو سکتی ہے۔یہ تاریخ سے کیسا انکار اور کیسی تہذیبی کورچشمی ہے!

میں نے مندرجہ بالا سطور میں یہ استدلال پیش کیا ہے کہ اسلام کلی اجتہاد کا متقاضی ہے۔ اسلامی فکر کو مکمل تشکیل نو کی ضرورت ہے کیونکہ پچھلے پانچ سو برسوں میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں آچکی ہیں تاہم میں متعدد مسائل کی نشاندہی کر سکتا ہوں جو فوری طور پر اجتہاد کے لئے صدا بلند کر رہے ہیں اور درخواست کرتا ہوں کہ ہم میں جو بہترین دماغ ہیں وہ ان کے حل کے لئے کوششیں شروع کریں۔

1۔ مسلم اقلیتیں

مسلم آبادیاں یا مسلمان افراد جن علاقوں میں بطور اقلیت رہ رہے ہیں ان کا رویہ کیسا ہونا چاہیے؟ کیا ان پر لازم آتا ہے کہ وہ جن ممالک میں رہ رہے ہیں وہاں کے قوانین کی پابندی کریں؟ بالخصوص ایسی صورت میں کہ ان ممالک کے قوانین بعض اسلامی اصولوں سے مختلف ہیں؟ ہماری فقہ کی کتابوں میں ان مسائل کا کوئی ذکر نہیں کیونکہ یہ کتابیں اس زمانے میں لکھی گئیں جب مسلمان اکثریت میں تھے۔ یہ کتابیں اس مفروضے کی روشنی میں لکھی گئیں کہ مسلمان اکثریتی آبادی ہیں اور ان کی اپنی حکومتیں ہیں چنانچہ مسلمانوں کے بطور اقلیت مسائل پر کوئی بحث نہیں کی گئی لہٰذا مسلمانوں کی پرورش اس خام خیالی کی دنیا میں ہوئی جس نے انہیں اکثریتی ذہنیت کا شکار کر دیا۔اس کے نتیجے میں ان کی فہم اور فیصلہ سازی کی صلاحیتوں پر وہی ذہنیت سایہ فگن رہتی ہے۔

اس ذہنیت نے مسلم امت کو بہت نقصان پہنچایا ہے کیونکہ اس نے بطور مسلم اقلیت، اکثریتی ذہنیت اختیار کر لی ہے۔اس سے متعدد مسائل نے جنم لے لیا ہے۔خاص طور پر وہ یورپ اور امریکہ میں رہتے ہوئے مشکلات سے دو چار ہوئے۔ان کے اس رویئے اور اس سے جنم لینے والے افعال کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں وہاں ایک منفی تصور پیدا ہو چکا ہے۔حزب التحریر[1] کے سابق سربراہ عمر باقری نے ایک برطانوی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ یہ امر اس کے ایمان کا جزو ہے کہ وہ برطانوی وزیر اعظم کے مکان اور دفتر '10 ڈاؤننگ سٹریٹ' میں اسلام کا پرچم لہرا دے۔کیا اسلام کے اندر ایسی چپقلش پیدا کر دینا مناسب رویہ ہے؟ جبکہ برطانیہ میں رہنے والے مسلمان وہاں تمام شہریوں کو حاصل تحفظ سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

1۔ حزب التحریر ایک اسلامی خلافت کی احیاء کی تحریک ہے جس کی بنیاد تقی الدین النبہانی نے 1953ء میں رکھی۔

یہ غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل برطانیہ اور دیگر ممالک میں بطور اقلیت مقیم مسلمانوں کے لئے سنگین مسائل پیدا کر رہا ہے۔ یہ رویہ اسلام تو نہیں ہے اور یقیناً اسلام نہیں ہے تو کیا ہمیں ایسی ہرزہ سرائی ترک نہیں کر دینی چاہیے؟ یقیناً کرنی چاہیے[1]۔

2۔ اقلیتوں کے حقوق

مسلم معاشروں یا ملکوں میں رہنے والی غیر مسلم اقلیتوں کے کیا حقوق ہیں؟ ہماری فقہ کی کتابیں، اقلیتوں کے مسائل کو ابھی تک نئی فتوحات کے تناظر میں دیکھتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اقلیتیں ذمی ہیں۔ اور یہ کہ یہ اقلیتیں اس وقت مسلمانوں کے لباس سے الگ قسم کا لباس پہنیں گیں اور 'جزیہ' (جنگی ٹیکس) ادا کریں گیں۔ اس مسئلے پر از سرِ نو غور ہونا چاہیے۔ کیا پاکستان ایران اور انڈونیشیا میں رہنے والی اقلیتوں پر اسی اصول کا اطلاق ہوگا۔ یہ سب مسلمہ طور پر مسلمان اکثریت کی ریاستیں ہیں۔ ان کے ہاں تحریری دساتیر ہیں جن میں تمام شہریوں کو بلا امتیاز عقیدہ یا مذہب بنیادی حقوق حاصل ہیں اور ان کی دستوری ضمانت دی گئی ہے۔

سیاسی فلسفہ، دستوری قانون اور بین الاقوامی قانون نے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے ضمن میں بے پناہ پیشرفت کی ہے۔ جس کی جدید مسلم ممالک کے دساتیر میں بھرپور عکاسی ہوتی ہے تاہم ہمارا اجتماعی روایتی مذہبی ذہن ان پیشرفتوں کی تائید نہیں کرتا۔ ہماری فقہ پر گزشتہ چودہ سو سال اور بالخصوص جنگ عظیم اول سے لے کر اب تک اقلیتوں کے حقوق کے سلسلے میں ہونے ولی پیشرفتوں کی روشنی میں نظر ثانی ہونی چاہیے۔ جب ہم اپنے ملکوں میں اقلیتوں کے ساتھ بدسلوکی کریں گے تو قومی اور بین الاقوامی سطحوں پر ہمارے بارے میں غلط تاثر قائم ہوگا جبکہ یہ دلائل بھی لائے جا رہے ہیں کہ اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اقلیتوں کے ساتھ بدسلوکی روا رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ امہ کا مزاج ہی اس طرح ڈھل چکا ہے۔ ہمیں اس مسئلے پر غور کرنا ہوگا اور اپنے مزاج میں اصلاح لانی ہوگی تا کہ ہماری شبیہہ مزید مسخ نہ ہو سکے[2]۔

3۔ خواتین کے حقوق

آرا اور قوانین ایک خاص معاشرتی ماحول میں تشکیل پاتے ہیں۔ اسی طرح مسلم قوانین، آرا اور

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے باب 20

[2] تفصیل کے لیے دیکھیے باب: 17

خواتین سے متعلقہ قواعد مختلف اوقات کے سیاق و سباق میں ایک خاص سیاسی اور معاشرتی تناظر میں متشکل ہوئے۔ گزشتہ ایک ہزار برسوں میں قومی اور بین الاقوامی قوانین میں بے پناہ پیشرفتیں ہوئیں لیکن مذہبی تعبیرات ان سے موافق نہیں ہوسکیں۔ جس کے نتیجے میں یہ تصورا بھرآیا ہے کہ اسلام میں عورتیں مردوں کے مساوی نہیں اور یہ کہ انہیں برابر حقوق حاصل نہیں ہیں۔ یہ تصور درست نہیں ہے۔

اسلام انسانی وقار اور مساوات کا مذہب ہے۔ ہمیں خواتین سے متعلقہ قوانین کا نئے سرے سے جائزہ لینا چاہیے بالخصوص دوسری شادی کے قوانین، قانون شہادت، حدود کے قوانین ور دیگر قوانین وضوابط کو زیرِغور لایا جانا چاہیے۔ ہمیں اس امر کا بھی جائزہ لینا چاہیے کہ کیا خواتین کا ثقافتی اور مذہبی سرگرمیوں سے اخراج قابل توجیہہ ہے یا یہ خالصتاً پدرسرانہ معاشرت پر مبنی ہے[1]؟

4۔ مالیاتی امور

معاشی معاملات میں بھی ہم قرونِ اول (first period) میں پھنسے ہوئے ہیں۔ معاشی معاملات نے پچھلے چار سو سال میں اپنی شکل بالکل بدل لی ہے۔ معاش نے نہ صرف مقامی سطح پر اپنی شکل بدل لی ہے بلکہ اس نے اب بہت حد تک بین الاقوامی جہت اختیار کر لی ہے۔ معاشی نظام میں مسئلہ سود (interest) کو بہت اہمیت حامل ہے۔ یہ عہد حاضر کا لازمہ بن گیا ہے۔ ہم اس کو حرام تو کہتے ہیں لیکن اس کے متبادلات (alternatives) پر توجہ نہیں کرتے یا پھر صرف حیلہ و بہانہ کر کے سود کو ہی حلال مان لیتے ہیں۔

یہ معاملہ بہت سنجیدہ سوچ کا تقاضا کرتا ہے کہ سود سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ مطلقاً (absolutely) حرام ہے یا اس کی کچھ قسمیں حرام ہیں؟ بین الاقوامی تجارت میں اس کا کیا کردار ہے؟ اگر سود بالکل حرام ہے تو جدید بینکاری کے نظام کو کیسے چلایا جائے؟ مضاربہ[2] کو کیسے چلایا جائے؟ انشورنس و دیگر فنڈز کے مسائل کیسے حل کیے جائیں؟ لوگوں سے بچتیں کیسے وصول کی جائیں؟ ان کی

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے باب:16

[2] مضاربہ تجارت کی ایک قسم ہے جس میں ایک شخص اپنا مال کسی دوسرے شخص کو اس شرط پر تجارت کی غرض سے دیتا ہے کہ نفع میں باہمی معاہدہ کے مطابق دونوں شریک ہوں گے اور نقصان مال والا برداشت کرے گا۔

حفاظت اور استعمال کیسے ہو؟ روپے کی قدر میں کمی (depreciation) سے لوگوں کو نقصان سے کیسے بچایا جائے۔ غیر مسلموں سے لین دین کیسے ہو۔ ان معاملات پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور کی ضرورت ہے۔ معاشیات پر جدید اسلامی لٹریچر نہ صرف قلیل ہے بلکہ جہاں کہیں موجود ہے یہ سطحی دکھائی دیتا ہے۔ ہمیں سنجیدہ اسلامی مفکرین کی ضرورت ہے جو آدم سمتھ (Adam Smith, d. 1790)) اور کارل مارکس (Karl Marx, d. 1883) جیسے یا ان سے بڑے پائے کے ہوں تا کہ وہ اسلامی اقتصادی سوچ کی غیر منطقی قدامت کو چیلنج کر سکیں[1]۔

5۔ فقہ

فقہ اور قانون مسلمانوں کے علوم کے خصوصی شعبے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں فقہ کی غیر معمولی تدوین و تبویب اس کا واضح ثبوت ہے۔ قانون ایک عملِ جاریہ ہے جو معاشرتی ارتقا کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا اور فروغ پاتا رہتا ہے۔ زندگی جتنی زیادہ پیچیدہ ہوتی جاتی ہے، قانون اتنا ہی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ہم ابھی تک اسی قانونی ساخت کے اندر کام کر رہے ہیں جو ایک ہزار سال پہلے موجود تھی اور جو آج کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہے۔ علم کی نئی شاخیں جدید دور میں وجود میں آئیں۔ زندگی کے بعض شعبوں میں بے پناہ وسعت و ترقی ہوتی رہی اور ہم اسے نظر انداز کرتے رہے۔ بینکنگ، انشورنس اور مواصلات (کمیونیکیشنز) ان میں سے چند شعبے ہیں جن کا یہاں حوالہ دے رہا ہوں۔ ہمیں ان پیچیدہ مسائل کے لئے اسلامی نقطہ نظر سے کوئی رہنمائی نہیں ملی بلکہ ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم ان مسائل کو مسائل کے طور پر قبول نہیں کرتے۔

ہماری فقہ میں فوجداری قانون زیادہ تر ایک ذاتی مسئلہ رہا ہے۔ جدید فقہ کا اس سیاق وسباق میں بالکل مختلف طریق کار ہے۔ اس فقہ میں دیوانی معاملات، شخصی معاملات ہوتے ہیں جبکہ فوجداری امور فرد اور ریاست کے مابین ہوتے ہیں۔ ایک مثال لیجیے ایک صورت میں اکبر، اسلم کو قتل کر دیتا ہے۔ جب اکبر پر مقدمہ چلتا ہے اور اس کی کارروائی عدالتِ قانون میں شروع ہو جاتی ہے تو اس کا حوالہ بطور 'ریاست بنام اکبر' دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اکبر نے سارے معاشرے کے خلاف ایک

---

[1]۔ Thomas Robert Malthus؛ تھامس رابرٹ مالتھس (1766ء-1834ء) معروف برطانوی ماہر معاشیات تھا۔ اس نے آبادی کے لیے اپنا مشہور نظریہ پیش کیا۔ اس کے مطابق جلد یا بدیر قدرت حرکت میں آتی ہے، تباہی اور زلزلوں کے ذریعے آبادی پھر سے وسائل کے مطابق ہو جاتی ہے۔

جرم کیا ہے اور ریاست معاشرے کی طرف سے کارروائی کر رہی ہے۔ وہ مسئلے کی تفتیش کر کے اکبر کے لئے سزا تجویز کرتی ہے اور معاشرے اور اسلم کے لیے بھی کام کرتی ہے۔

جب اسلام قتل کو ایک شخصی مسئلہ سمجھتا ہے تو یہ سزا کا حق 'ولی' (قانونی وارث یا سرپرست) کو دیتا ہے کہ وہ مجرم کو خواہ معاف کر دے یا دیت وصول کر لے۔ بعض صورتوں میں قاتل قانونی وارث ہو سکتا ہے اور کیا وہ خود کو معاف بھی کر سکتا ہے؟ یہ ایک احمقانہ بات ہے۔ عصرِ حاضر کے بعض مذہبی سکالرز نے اس مسئلے پر غور کیا ہے اور کچھ پیشرفت بھی کی ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اس نوعیت کے بعض جرائم فساد فی الارض کی ذیل میں لائے جا سکتے ہیں جن میں ریاست قانون شکنی کی فریق بن جاتی ہے اور عدالتوں کو معافی کو مسترد کرنے کا حق حاصل ہے، باوجود اس امر کے کہ قانونی وارثوں نے جرم معاف کر دیا ہو، بلا معاوضہ یا با معاوضہ۔

جب مسلم فقہ کی تدوین کی جا رہی تھی تو دیوانی اور فوجداری کے درمیان قانون کی واضح تقسیم نہیں تھی۔ آج قانون کی یہ تقسیم دنیا بھر کے تمام مسلمہ قانونی نظاموں نے تسلیم اور قبول کر رکھی ہے۔ چنانچہ لازم آتا ہے کہ ہم فقہ کے ان مسائل کا سنجیدگی سے جائزہ لیں۔ ہمیں اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ کیا اس نوعیت کے جرائم کو 'فساد فی الارض' کے موضوع کے تحت لایا جا سکتا ہے؟ یہ امتیاز بہت پُرمعنی ہے۔ فقہ کے اس اصول کو قبول کرنے کے بعد ہمیں بہت سے قوانین تبدیل کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ اسلام نے 'معروف' (جو قبول کیا گیا ہو اور یا مروّج ہو) پر بہت زور دیا ہے۔ قرآن مجید اس معاملے میں بہت واضح ہے۔ قدیم فقہاء کرامؒ میں سے ایک فقہی حضرت امام ابوحنیفہؒ (d. 772) نے اسے اسلامی قوانین کی تعبیر اور اطلاق کے لئے ایک بنیاد بنایا ہے۔ عصرِ حاضر کی عالمی قبولیت اور اطلاق اور قرونِ اولیٰ کے اسلامی نظائر کے مطابق مسلمانوں کو 'معروف' کے اس پہلو کو جدید قوانین اور فقہ کے فروغ کے لئے زیرِ غور رکھنا چاہیے۔

6۔ دنیوی تعلیم

کیا دینی اور دنیوی تعلیم دو الگ الگ قسم کی تعلیم ہیں؟ کیا وہ دو الگ الگ قسموں کی تعلیم تخلیق کرتی ہیں؟ کیا یہ ایک امتزاج ہے جو محتاط توجہ کا متقاضی ہے؟ کیا سائنس کی تعلیم کا حصول اتنا ہی اہم ہے جتنا فقہ کی تعلیم کا؟ کیا مسلمان سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے لائق نہیں؟

مسلمان مذہبی تعلیم کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں کہ اس کا حصول آخرت کی منزل آسان بنائے گا۔ جبکہ دنیوی تعلیم دنیاوی ہے بلکہ بعض کہتے ہیں کہ یہ گناہ ہے۔ لیکن اگر مسلمان دنیوی تعلیم کو گناہ نہ بھی سمجھیں تو اس کو کم اہمیت دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ مسلمانوں کا مذہبی طبقہ جدید تعلیم کے دائرے سے خارج ہو گیا ہے۔ مزید برآں ہمارے دینی مزاج کے حامل نوجوانوں نے جدید تعلیم کے بارے میں منفی رویہ اختیار کر رکھا ہے جو انہیں جدید زندگی میں نمایاں ترقی کرنے سے منع کرتا ہے۔

یہ مسلمانوں کے لئے انتہائی اہم سوال ہے۔ یہ ان کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا ہے اور اجتہاد کا مطالبہ کرتا ہے۔ مسلمانوں کو اس اجتہاد کی روشنی میں نصاب تعلیم اور طریق تدریس پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔

میں نے جدید امتِ مسلمہ کو درپیش صرف چند ایک سوالات کا ذکر کیا ہے جو بطور اصول اور بطور مثال سامنے لائے گئے ہیں۔ ابھی بہت کچھ جستجو طلب پڑا ہوا ہے جو ہمیں بطور امت آگے بڑھ کر ترقی یافتہ دنیا کے دوش بدوش چلنے سے روکتا ہے۔ یہ ہمیں دعوتِ فکر دیتا ہے اور ہمیں اس چیلنج کو قبول کرنا ہوگا۔ تنظیم اسلامی کانفرنس (OIC) کو یہ ذمہ داری اٹھا لینی چاہیے۔ اسے پہلے موضوعات تلاش کرنے چاہئیں۔ پھر ہر موضوع کے بارے میں ایک تفصیلی سوالنامہ مرتب کر کے مسلم دنیا کے اہل علم و دانش (سکالرز) کے پاس بھیجنا چاہیے۔ جب ان کی آراء وصول ہو جائیں تو ان کی نقول پوری مسلم دنیا کے دیگر اصحاب فکر و دانش کے پاس تبصرے کے لئے بھیجنی چاہئیں۔ اس سے بہت نتیجہ خیز آراء سامنے آجائیں گی۔ بعد ازاں بین الاقوامی کانفرنس بلائی جائے جس میں علماء اور سکالرز آپس میں تبادلہ خیال کریں اور مختلف موضوعات پر اتفاق رائے حاصل کرنے کے بعد عملی اقدامات وضع کئے جائیں۔ رابطہ عالمِ اسلامی، موتمر عالم اسلامی اور مسلمانوں کی دیگر باوقار و پُرعزم تنظیموں کو بھی یہ مسئلہ اٹھانا چاہیے تا کہ امت مسلمہ مطلوبہ مقاصد و نصب العین حاصل کر سکے[1]۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے باب:9 اور باب:12

حصہ سوم

متفرقات

از خواب گراں خیز

اٹھو! خوابِ غفلت سے

اے غنچہ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز
کاشانہ مارفت بتاراج غماں خیز
(اے سوئے ہوئے نوخیز پھول، نرگس کی طرح آنکھیں کھولتے ہوئے اٹھ (جاگ))
(کیونکہ ہمارا گھر غموں (بے عملی) نے تباہ کر دیا ہے)
از نالہ مرغ چمن، از بانگ اذاں خیز
از گرمی ہنگامہ آتش نفساں خیز
(چاہے چمن کے پرندے کی فریاد سے یا اذان کی آواز سے جاگ)
(چاہے آگ جیسی گرم سانسیں رکھنے والوں کی گرمی کے شور سے جاگ)
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ، گہری نیند، گہری نیند سے جاگ)
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ)
خورشید کہ پیرایہ بسیمائے سحر بست
آویزہ بگوش سحر از خون جگر بست
(سورج نے طلوع ہو کر اپنے ماتھے کو صبح کے زیور سے سجا لیا ہے)
(اس نے صبح کے کانوں میں اپنے خون جگر کا بُندہ لٹکا دیا ہے)

[1] ۔نوٹ: یہ حضرت علامہ محمد اقبالؒ کی نظم ہے۔ اس نظم کو اس لیے یہاں نقل کیا گیا ہے کہ یہ مسلمانوں کی اصل حالت کو بیان کرتی ہے۔

از دشت و جبل قافلہ ہارخت سفر بست
اے چشم جہاں بیں بہ تماشائے جہاں خیز
(بیابان اور پہاڑوں سے کاروانوں نے سامان سفر باندھ لیا ہے)
(دنیا کو دیکھنے والی اے آنکھ تو دنیا کے تماشے کے لیے اٹھ)
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ، گہری نیند، گہری نیند سے جاگ)
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ)
خاور ہمہ مانند غبار سر راہے است
یک نالہ خاموش و اثر باختہ آہے است
((اہل مشرق) سب کے سب راہ کے غبار کی مانند ہیں)
(وہ ایک خاموش فریاد اور بے اثر آہ کی مانند ہیں)
ہر ذرہ ایں خاک گرہ خوردہ نگاہے است
از ہند و سمر قند و عراق و ہمداں خیز
(اہل مشرق کی مٹی کا ہر ذرہ ایسی آنکھ کی طرح ہے جس پر گرہ باندھ دی گئی ہو)
(اہل مشرق ہندوستان، سمرقند، عراق اور ہمدان جہاں بھی ہیں اٹھ کھڑے ہوں)
از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ، گہری نیند، گہری نیند سے جاگ)
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ)
دریائے تو دریا ست کہ آسودہ چو صحرا است
دریائے تو دریا ست کہ افزوں نشد و کاست

(تیری زندگی کے دریا میں صحراؤں کی سی خاموشی اورسکون پایا جاتا ہے)
(تیرے دریا کے پانیوں میں اضافہ تو نہیں ہوا، کمی ضرور ہوئی ہے)

بیگانہ آشوب و نہنگ است چہ دریا ست
از سینہ چاکش صفت موج رواں خیز

(تیرا دریا، طوفان، تلاطم اور خطرناک مگرمچھوں سے بے خبر ہے)
(اس کے باوجود اس دریا کے پھٹے ہوئے سینے میں بہتی ہوئی لہر کی مانند اٹھ)

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز

(غفلت کی گہری نیند سے جاگ، گہری نیند، گہری نیند سے جاگ)
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ)

این نکتہ کشائندہ اسرار نہان است
ملک است تن خاکی و دیں روح روان است

(یہ باریک بات پوشیدہ رازوں کو کھولنے والی ہے)
(کہ اگر ملک مٹی کا جسم ہے تو دین اس کی روح رواں ہے)

تن زندہ و جاں زندہ زربط تن و جان است
با خرقہ و سجادہ و شمشیر و سناں خیز

(جسم اگر زندہ ہے اور روح بھی زندہ ہے تو پھر جسم اور روح میں تعلق قائم رہتا ہے۔
جسم کے بغیر روح اور روح کے بغیر جسم بے کار ہے)
(ملک اور دین کا معاملہ بھی یہی ہے۔اس لیے دین کے نفاذ کے لیے خرقہ، سجادہ اور
شمشیر وسنان کے ساتھ کوشش کرنا ہوگی۔ دینی وروحانی ترقی کے لیے جہاں سادگی و
فقر درکار ہیں وہاں کبھی کبھی تلوار کی بھی ضرورت ہوتی ہے)

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ، گہری نیند، گہری نیند سے جاگ)
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ)

ناموس ازل را تو امینی تو امینی!
دار اے جہاں را تو لیساری تو یمینی
(تو قانون فطرت کا امانت دار ہے۔ تیرے پاس اللہ کی امانت (قران) موجود ہے)
(تو اس قانون فطرت کا دایاں بازو ہے)

اے بندہ خاکی تو زمانی تو زمینی
صہبائے یقیں درکش و از دیر گماں خیز
(تو اپنے اس امانت داری کے منصب کو بھول کر ایک خاکی جسم رہ گیا ہے اور زمان و مکان کی قید میں پھنس گیا ہے)
(تو یقین کی شراب پی لے اور وہم کے مندر کو خیر باد کہہ دے، زندگی کی حقیقت تیرے ہاتھ آ جائے گی)

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ، گہری نیند، گہری نیند سے جاگ)
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ)

فریاد زا فرنگ و دل آویزی افرنگ
فریاد ز شرینی و پرویزی افرنگ
(یورپ سے اور اس کی دل لبانے والی رنگین فضاؤں سے خدا بچائے)
(یورپ کے شیریں کے حسن اور پرویز کی طرح کی مکارانہ چالوں سے بھی خدا محفوظ رکھے)

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزی افرنگ
معمار حرم! باز بہ تعمیر جہاں خیز

(سارا جہاں فرنگیوں کی وجہ سے ویرانہ بن چکا ہے۔ یورپ نے قلب و روح کی دنیا کو ویران کر دیا ہے۔ ان کی تباہی و بربادی چنگیز خان کی بربریت سے کہیں بڑھ کر ہے)

(اے مسلمان تو معمار حرم ہے اس لیے اب تیرے عمل کا وقت ہے۔ اس جہاں خراب کی از سر نو تعمیر کے لیے آگے بڑھ کیونکہ تیرے سوا جسم و روح کی تعمیر کوئی نہیں کر سکتا)

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز[1]

(غفلت کی گہری نیند سے جاگ، گہری نیند، گہری نیند سے جاگ)
(غفلت کی گہری نیند سے جاگ)

---

[1] ۔اے غنچہ خوابیدہ چو نرگس نگران خیز؛ زبور عجم از محمد اقبالؒ

حضرت علامہ محمد اقبالؒ کی ایسی ولولہ انگیز صدا بلند کرنے کی ایک وجہ تھی۔ وہ یہ کہ ہمیں بطور مسلمان یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہم اس دنیا میں کیسے زندہ رہنا چاہتے ہیں؟ ہمیں اپنے اعمال وافعال کے ذریعے عزم کرنا ہے کہ ہم کس قسم کے لوگ بننا چاہتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس اصول کو یوں واضح فرمایا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ [1]۔

(بیشک اللہ تعالیٰ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی)

لہٰذا مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جاگنے اور اپنی حالت کی اصلاح خود کر لینے کی مہلت دی گئی ہے۔ ایسا نہ کرنے والوں سے کہا گیا ہے: وقت کا انتظار کرو کہ اللہ تعالیٰ اپنا فیصلہ صادر فرما دے [2] اور اس کا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری پسند کا نہ ہو (ہو سکتا ہے کہ وہ مزید مصائب کا حامل ہو، یا تمھیں بدل کر نئے لوگ لے آنے کا ہو)

وَتِلۡکَ الۡاَیَّامُ نُدَاوِلُہَا بَیۡنَ النَّاسِ [3]

(یہ تو زمانہ کے نشیب وفراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں)

وَاِنۡ تَتَوَلَّوۡا یَسۡتَبۡدِلۡ قَوۡمًا غَیۡرَکُمۡ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوۡنُوۡۤا اَمۡثَالَکُمۡ [4]

(اگر تم منہ موڑو گے تو اللہ تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا اور وہ تم جیسے نہ ہوں گے)

اب فیصلہ ہمیں کرنا ہے۔

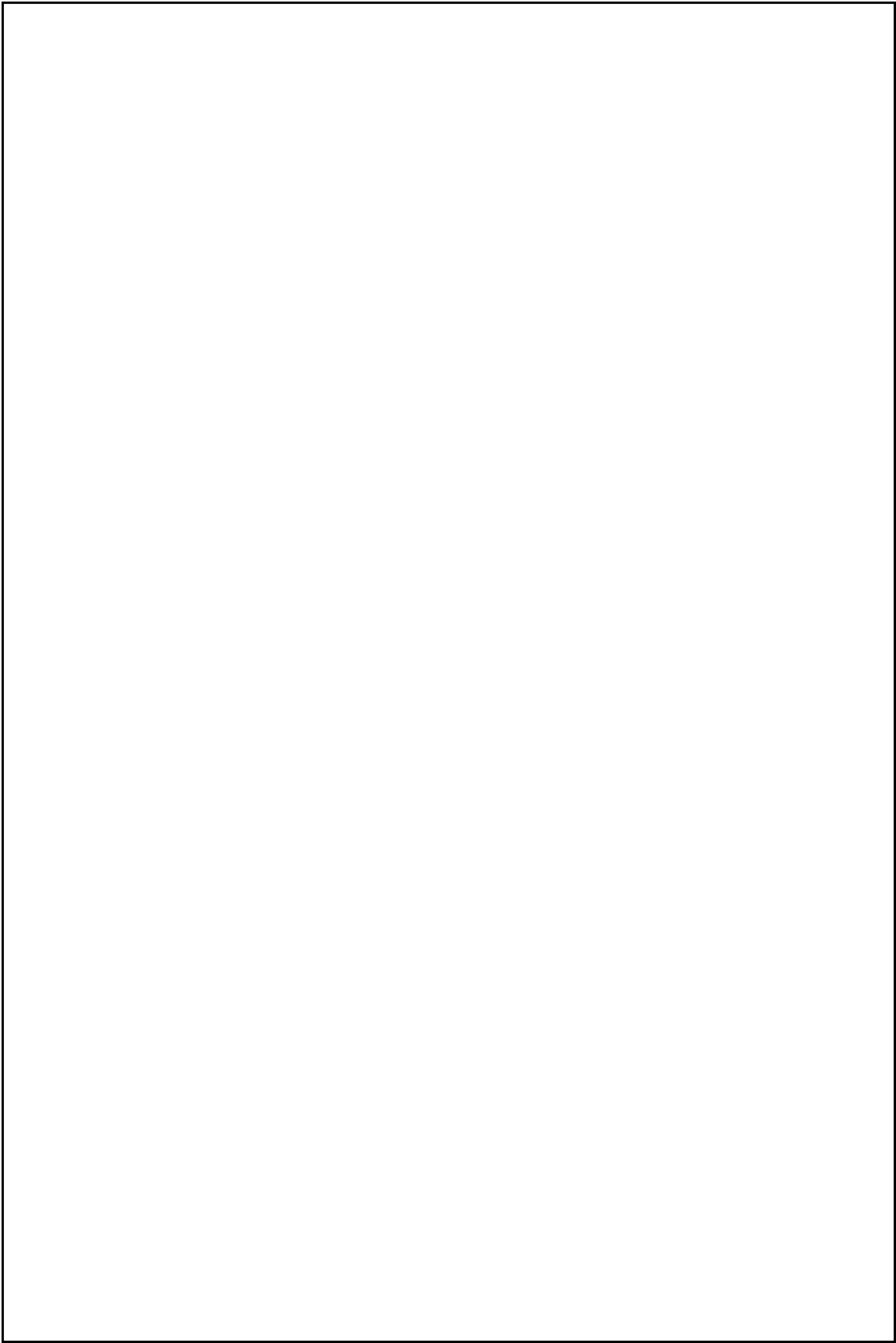
---

[1]۔ سورۃ الرعد: آیت: 11

[2]۔ سورۃ التوبہ: آیت: 24 (قُلۡ اِنۡ کَانَ اٰبَآؤُکُمۡ وَاَبۡنَآؤُکُمۡ وَاِخۡوَانُکُمۡ وَاَزۡوَاجُکُمۡ وَعَشِیۡرَتُکُمۡ وَاَمۡوَالُۨ اقۡتَرَفۡتُمُوۡہَا وَتِجَارَۃٌ تَخۡشَوۡنَ کَسَادَہَا وَمَسٰکِنُ تَرۡضَوۡنَہَاۤ اَحَبَّ اِلَیۡکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَجِہَادٍ فِیۡ سَبِیۡلِہٖ فَتَرَبَّصُوۡا حَتّٰی یَاۡتِیَ اللّٰہُ بِاَمۡرِہٖ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الۡفٰسِقِیۡنَ (فرما دیں اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا خاندان اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے نقصان سے تم ڈرتے ہو اور رہنے کے مکانات جنہیں تم پسند کرتے ہو تمہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم لے آئے اور اللہ تعالیٰ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا))

[3]۔ سورۃ آلِ عمران: آیت: 140

[4]۔ سورۃ محمد: آیت: 38



حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کر دم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کر دم
(میں نے اپنی ساری زندگی کا حاصل اپنے دوست کے راستے میں قربان کر دیا ہے)
(اپنی زندگی سے خوش ہوں کہ میں نے کچھ کر کے ہی دم لیا ہے)

کتابیات

1۔ ابن منظورؒ،حضرت انصاری،'لسان العرب'، دارالکتب العلمیہ ، بیروت،2009

2۔ ابن ابی شیبہؒ،امام ابی بکر عبداللہ بن محمد، 'مصنف ابن ابی شیبہ' ترجمہ مولانا اویس سرور، مکتبہ رحمانیہ، لاہور

3۔ ابن حسام الدینؒ، حضرت علاء الدین علی متقی، 'کنزل العمال' ترجمہ مولانا احسان اللہ شائق، دارالاشاعت، کراچی،2009

4۔ احمد بن حنبلؒ، حضرت امام، 'مسند امام احمد بن حنبلؒ ترجمہ مولانا محمد ظفر اقبال، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، 2004

5۔ ابن ہشامؒ، حضرت ابومحمد عبدالملک؛ حضرت محمد بن اسحاق بن یسارؒ، 'سیرت النبی ﷺ ابن ہشام' ترجمہ سید یٰسین علی حسنی نظامی دہلوی، ادارہ اسلامیات، لاہور،1994

6۔ ابن جوزیؒ، حضرت امام ابوالفرج عبدالرحمٰن، 'تاریخ عمر بن خطاب'، مکتبہ السلام، دمشق،1994

7۔ ابن کثیرؒ،حضرت امام ابوالفداء عماد الدین، 'البدائیہ والنہائیہ: تاریخ ابن کثیر' ترجمہ پروفیسر کوکب شادانی، نفیس اکیڈمی، کراچی،1987

8۔ ابن ماجہؒ، حضرت حافظ ابی عبداللہ محمد بن یزید، 'سنن ابن ماجہ' ترجمہ مولانا محمد قاسم امین، مکتبہ العلم، لاہور،2010

9۔ ابن رشد، ابوالولید محمد بن احمد، 'بدائیۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد'، دارالتذکیر، لاہور،2009

10۔ ابو یوسفؒ،حضرت امام یعقوب بن ابراہیم، 'کتاب الخراج'،مکتبہ فاروقیہ، پشاور،2000

11۔ ابو داوٗد سجستانیؒ، امام سلیمان بن اشعث ، 'سنن ابو داوٗد'، ترجمہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی،مجلس علمی دارالدعوۃ،نئی دہلی،2008

12۔ اندلسیؒ،حضرت ابن عطیہ،'المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز'،دارالکتب العلمیہ ، بیروت،2007

13۔ ادریسی،محمد بن محمد بن عبداللہ بن ادریس حمودی، 'نزھۃ المشتاق فی اختراق الآفاق'،مدرسۃ الثقافۃ الدینیہ،قاہرہ،2002

14۔ اقبالؒ،محمد،'اسرارخودی'، یونین سٹیم پریس،لاہور،1915

15۔ اقبالؒ،محمد،'رموز بخودی'، یونین سٹیم پریس،لاہور،1918

16۔ اقبالؒ،محمد،'پیام مشرق'،شیخ مبارک علی،لاہور،1923

17۔ اقبالؒ،محمد،'بال جبریل'،تاج کمپنی،لاہور،1935

18۔ اقبالؒ،محمد،'ضرب کلیم'،کتب خانہ طلوع اسلام،لاہور،1936

19۔ اقبالؒ،محمد،'ارمغان حجاز'،اقبال اکیڈمی پاکستان،لاہور،2002

20۔ اقبالؒ،محمد،'بانگ درا'،سنگ میل،لاہور،2011

21۔ اقبالؒ،محمد،'زبورعجم'،اقبال اکادمی پاکستان،لاہور،2014

22۔ اسحاق،مولانا محمد،'وحدت امت'،مکتبہ ملیہ،فیصل آباد،2007

23۔ ازہری،پیرمحمد کرم شاہ،'تفسیر ضیاء القرآن'،ضیاء القرآن پبلی کیشنز،لاہور،1995

24۔ بٹالویؒ،محمد حسین،'رسالہ الاقتصاد فی مسائل الجہاد'،وکٹوریہ پریس،لاہور،1876

25۔ بخاریؒ،حضرت امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل،'صحیح بخاری' ترجمہ حضرت مولانا محمد داوٗد راز،مرکزی

جمعیت اہل حدیث ہند، دہلی، 2004

26۔ عسقلانیؒ، حضرت امام ابن حجر، 'فتح الباری شرح صحیح بخاری ترجمہ فیض الباری' ترجمہ علامہ محمد ابوالحسن سیالکوٹی، مکتبہ اصحاب اہلحدیث، لاہور، 2009

27۔ البیہقیؒ، حضرت امام ابی بکر احمد بن حسین، 'سنن البیہقی (شعب الایمان)' ترجمہ مولانا قاضی ملک محمد اسماعیل، دارلاشاعت، کراچی، 2007

28۔ بیہؒ، شیخ عبداللہ بن محفوظ، 'صناعۃ الفتویٰ وفقہ العقلیات'، دارالمنہاج، جدہ، 2000

29۔ پانی پتیؒ، قاضی محمد ثناءاللہ عثمانی مجددی، 'تفسیر مظہری'، دارالاشاعت، کراچی، 1999

30۔ التبریزیؒ، الخطیب، حضرت شیخ ولی الدین، 'مشکوٰۃ' ترجمہ مولانا محمد صادق خلیلؒ، مکتبہ محمدیہ، لاہور، 2005

31۔ ترمذیؒ، حضرت امام محمد بن عیسیٰ، 'جامع ترمذی' ترجمہ مولانا افضل احمد، دارالاشاعت، کراچی، 2006

32۔ جوزیؒ، حافظ ابوعبداللہ بن قیم، 'اعلام الموقعین عن رب العالمین'، دارالکوکب العلمیہ، بیروت، 2000

33۔ جوزیؒ، حافظ ابوعبداللہ بن قیم، 'زادالمعاد'، دارالسلام، لندن، 2003

34۔ چکبست، پنڈت برج نرائن، 'کلیات چکبست'، ساکر، بمبئی، 1981

35۔ حافظؒ، محمد شیرازی، 'دیوان حافظ'، پروگریسو بکس، لاہور، 2010

36۔ حاکمؒ، امام ابی عبداللہ محمد بن عبداللہ، 'المستدرک الی الصحیحین' ترجمہ شاہ محمد چشتی، پیغام القرآن، لاہور، 2009

37۔ حلبیؒ، علامہ علی بن برہان الدین، 'سیرت حلبیہ' ترجمہ مولانا محمد اسلم قاسمیؒ، دارالاشاعت، کراچی، 2009

38۔ حمیداللہؒ، ڈاکٹر محمد، 'خطبات بہاولپور'، اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ، اسلام آباد، 2007

39۔ خان، ظفراللہ، 'کتاب الزہد'، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 2017

40۔ خان، وحیدالدین، 'فکرِ اسلامی'، دارالتذکیر، نئی دہلی، 2009

41۔ خیامؒ، حکیم عمر نیشابوری، 'رعبایات عمر خیام'، انتشارات امیر کبیر، تہران، 2000

42۔ دارمیؒ، حضرت امام ابومحمد عبداللہ، 'سنن الدارمی'، دارالمغنی، ریاض، 2000

43۔ دہلویؒ، شاہ ولی اللہ محدث، 'ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء' ترجمہ مولانا محمد عبدالشکور، قدیمی کتب خانہ، کراچی، 1999

44۔ دہلویؒ، شاہ ولی اللہ محدث، 'حجۃ اللہ البالغۃ: رحمۃ اللہ واسعۃ' ترجمہ مولانا محمد سعید پالن پوری، زمزم پبلشرز، کراچی، 2005

45۔ دہلوی، نذیر حسین، 'فتاویٰ نذیریہ'، اہلحدیث اکیڈمی، لاہور، 1971

46۔ رحمانی، عبدالرحمٰن، 'الجہاد فی الاسلام'، دارالاندلس، لاہور، 1997

47۔ رضا، محمد رشید، 'تفسیر المنار'، دارالکوکب العلمیہ، بیروت، 2000

48۔ رومیؒ، مولانا جلال الدین، 'مثنوی معنوی' ترجمہ قاضی سجاد حسین، الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور، 2006

49۔ سرخسیؒ، امام محمد بن احمد، 'کتاب المبسوط'، دارالمعرفۃ، بیروت، 1978

50۔ شاطبیؒ، حضرت امام ابو اسحاق ابراہیم بن موسیٰ، 'الموافقات فی اصول الشریعۃ' ترجمہ مولانا

عبدالرحمٰن کیلانی، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، 1993

51۔ شلتوت، شیخ محمود، 'القرآن والقتال'، دارالکتاب العربی، قاہرہ، 1951

52۔ الشعرانیؒ، امام عبدالوہاب بن احمد، 'الیواقیت والجواہر فی بیان عقائدالاکابر وباسفلہ الکبریت الاحمر فی بیان علوم الشیخ الاکبر محیی الدین بن العربی وھو منتخب من کتاب لواقح الانوار القدسیۃ المختصر من الفتوحات المکیۃ'، دارالاحیاء، بیروت، 1998

53۔ شوکانیؒ، امام محمد بن علی بن محمد، 'القول المفید فی الدلۃ الاجتہاد والتقلید'، فاروقی کتب خانہ، ملتان، 1993

54۔ الشیبانیؒ، امام محمد بن حسن، 'کتاب السیر الکبیر'، دارالکتب العلمیہ، بیروت، 1997

55۔ طبرانیؒ، امام ابی قاسم بن احمد، 'المعجم الکبیر: طبرانی شریف'، مکتبہ ابن تیمیہ، قاہرہ، 2000

56۔ طبریؒ، امام ابی جعفر محمد بن جریر، 'تاریخ الامم والملوک: تاریخ طبری' ترجمہ ڈاکٹر محمد صدیق ہاشمی، نفیس اکیڈمی، کراچی، 2004

57۔ طبریؒ، امام ابی جعفر محمد بن جریر، 'جامع البیان عن تاویل آیٔ القرآن'، دارالکتب العلمیہ، بیروت، 1997

58۔ عبدالقادر، خالد، 'فقہ الاقلیات المسلمہ'، دارالایمان، طرابلس، 1998

59۔ عبدالسلام بن محمد، حافظ، 'والدین کی اجازت کے بغیر جہاد'، دارالاندلس، لاہور، 2003

60۔ فضل اللہ، محمد حسین، 'ارباب الدعوۃ فی القرآن'، دارلازہرا، بیروت، 1986

61۔ فیض، احمد فیض، 'نسخہ ہائے وفا'، فرید بک، لاہور، 2010

61۔ القرضاویؒ، شیخ یوسف عبداللہ، 'غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی'، مکتبہ وہبہ، قاہرہ، 1984

63۔ القرضاویؒ، شیخ یوسف عبداللہ، 'الخصائص العامہ لی الاسلام'، مکتبہ وہبہ، قاہرہ، 1989

64۔ القرضاویؒ، شیخ یوسف عبداللہ، 'من فقہ الدولۃ فی الاسلام'، دارالشروق، قاہرہ، 1997

65۔ قرطبیؒ، امام ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر، 'تفسیر قرطبی' ترجمہ پیر محمد کرم شاہ الازہریؒ، ضیاء القرآن، لاہور، 2012

66۔ الکسانیؒ، ابوبکر علاء الدین، 'بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع' ترجمہ ڈاکٹر محمود الحسن عارف، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، 1993

67۔ مسلمؒ، حضرت امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج، 'صحیح مسلم' ترجمہ علامہ وحید الزمان، مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند، دہلی، 2004

68۔ مودودیؒ، سید ابواعلیٰ، 'تفہیم القرآن'، الاصلاح کمیونیکیشن نیٹ ورک، لاہور، 1999

69۔ ندویؒ، سید ابوالحسن علی، 'انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر'، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنو، 1979

70۔ نعمانیؒ، علامہ شبلی؛ علامہ سید سلیمان ندویؒ، 'سیرت النبی ﷺ'، ادارہ اسلامیات، لاہور، 2006

71۔ نسائیؒ، حضرت امام احمد بن شعیب، 'سنن نسائی' ترجمہ مولانا افضل احمد، دارالاشاعت، کراچی، 2001

72۔ نوویؒ، حضرت امام محی الدین یحیی بن شرف، 'المجموع شرح المھذب'، مکتبۃ الارشاد، جدہ، 2010

73۔ ہجویریؒ، سید علی، 'کشف المحجوب' ترجمہ میاں طفیل محمد، اسلامک پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۸

74۔ یعقوبیؒ، امام احمد بن ابی یعقوب، 'تاریخ یعقوبی' ترجمہ مولانا اختر فتح پوری، نفیس اکیڈمی، کراچی، 2005

(English)

1. Akhtar, D. S. (1997). The Islamic Concept of Knowledge. Al-Tawhid: A Quarterly Journal of Islamic Thought & Culture, 12(3).

2. Aristotle. (1995). The Politics of Aristotle. Oxford: Oxford University.

3. Asad, M. (2003). The Message of The Quran. London: The Book Foundation.

4. Asad, M. (2005). Islam at the Crossroads. Kuala Lumpur: The Other Press.

5. Binti Abdul Rahim, A. (2015). The Spirit of Muslim Culture According to Mohammed Iqbal. International Journal of Social Science and Humanity, 5(8), 725-729.

6. Blankinship, K. Y. (1994). The End of the Jihad State: The Reign of Hisham Ibn 'Abd al-Malik and the Collapse of the Ummayyads. Albany: State University of New York Press.

7. Boyer, C. B. (1991). The Arabic Hegemony: A History of Mathematics. John Wiley & Sons.

8. Briffault, R. (n.d.). The Making of Humanity. London: G.Allen & Unwin Ltd.

9. Calhoun, C. (2002). Dictionary of the Social Sciences. New York: Oxford University Press.

10. Campbell, D. (2000). Arabian Medicine and Its Influence on

the Middle Ages. London: Routledge.

11. Chiu, Y. (2010). History of Project Management. Netherlands: Eburon Press.

12. Donne, John (n.d.). An Anatomy of the World. London: A. Mathewes for T. Dewe.

13. Durant, W. J. (1993). The Story of Civilization. New York: MJF Books.

14. Farmer, Henry George. (1988). Historical Facts for the Arabian Musical Influence. London: Ayer Publishing.

15. Gordon, S. (1999). Controlling the State: Constitutionalism from Ancient Athens to Today. London: Harvard University Press.

16. Government of Pakistan. (14 January, 2015). Resolution. Islamabad.

17. Grant, E. (1974). A Source Book in Medical Science. Cambridge: Harvard University Press.

18. Hamidullah, D. M. (1974). Introduction to Islam. Lahore: Sh. Mohammed Ashraf.

19. Hamidullah, D. M. (1975). The First Written Constitution in the World. Lahore: Ashraf Press.

20. Hamidullah, D. M. (2012). The Muslim Conduct of State. Lahore: Islamic Book Trust.

21. Hartner, W. (n.d.). Al-Battani. Dictionary of Scientific Biography, 1, pp. 507-516.

22. Hill, D. R. (1998). Studies in Medieval Islamic Technology:

From Philo to al-Jazari - from Alexandria to Diyar Bakr. London: Routledge.

23. Hitti, P. (2000). The Arabs: A Short History. London: Macmillan.

24. Holmyard, E. (1931). Makers of Chemistry. Clarendon Press: Oxford.

25. Hujwiri, A. I.-J. (n.d.). Kash al-Mahjub: The Unveiling of the Veiled. (R. Nicholson, Trans.) London: Veil Publications.

26. Hunter, D. (1978). Papermaking: The history and technique of an ancient craft. Courier Dover Publications.

27. Ibn Ishaq, M. (n.d.). The Life of Muhammad: Translation of Ibn Ishaq's Sirat Rasul Allah. (A. Guillaume, Trans.) London: Oxford University Press.

28. Ibn Yusuf, Abdur-Rahman(2004). Fiqh Al-Imam: Key Proofs in Hanafi Fiqh. London: White Thread Press.

29. Ilwani, D. T. (1994). The Ethics of Disagreement in Islam. USA: Herndon.

30. Iqbal, D. M. (1934). Reconstruction of Religious Thought in Islam. London: Oxford University Press.

31. Iqbal, D. M. (1979). Discourses of Iqbal. (S. H. Razzaqi, Ed.) Lahore: Sh. Ghulam Ali & Sons.

32. Iqbal, D. M. (1992). Thoughts and Reflections of Iqbal. (S. Abdul Wahid, Ed.) Lahore: Sh. Mohammed Ashraf Publishers.

33. Joseph, George Gheverghese (2010). The Crest of the

Peacock: Non-European Roots of Mathematics. London: Princeton University Press.

34. Kant, I. (1963). What is Enlightenment? New York: Macmillan.

35. Kennedy, E. S. (1996). Mathematical Geography. Routledge.

36. Kettani, M. A. (1984). Science and Technology in Islam, The Touch of Midas. (Z. Sardar, Ed.) Manchester: Manchester University Press.

37. Khadduri, M. (2006). War and Peace in the Law of Islam. New Jersey: The Law Book Exchange.

38. Khan, Wahiduddin (2002). Muhammad: A Prophet for all Humanity. Noida: Goodword.

39. Kuper, A., & Kuper, J. (Eds.). (2009). The Social Science Encyclopedia. New York: Routledge.

40. Levey, M. (1973). Early Arabic Pharmacology: An Introduction Based on Ancient and Medieval Sources. Leiden: Brill.

41. Lucas, A. R. (2005). Industrial Milling in the Ancient and Medieval Worlds: A Survey of the Evidence for an Industrial Revolution in Medieval Europ. Technology and Culture, 46(1), 1-30.

42. Martin, L. (2006). Muhammad: His Life Based on the Earliest Sources. London: Inner Traditions.

43. Maududi, S. A. (1988). Towards Understanding The Quran. Leicester: Islamic Foundation.

44. Meyerhof, M. (1931). Science and Medicine in the Legacy of Islam. London: Oxford University Press.

45. Mikaberidze, A. (Ed.). (2011). Conflict and Conquest in the Islamic World: A Historical Encyclopedia. Santa Barbara: ABC-CLIO.

46. Nadwi, S. A. (2005). Islam and the World: The Rise and Decline of Muslims and its Effect on Mankind. London: UK Islamic Academy.

47. Nasr, P. S. (2007). An Anthology of Philosophy in Persia Vol. 1: from Zoroaster to Umar Khayyam. I.B.Tauris.

48. Palacios, M. A. (1968). Islam and Divine Comedy. Frank & Cass.

49. Qaradawi, Y. (2004). The Qaradawi Fatwas. The Middle East Quarterly, 11(3), 78-80.

50. Qazalbash Waqf Case, 99 (Shariat Appellate Bench of Supreme Court 1990).

51. Ramadan, S. (1961). Islamaic Law: Its Scope and Equity. London: P.R. Macmillan.

52. Ramadan, T. (1999). To be a European Muslim: A Study of Islamic Sources in the European Context. Leicester: Islamic Foundation.

53. Rand, A. (1964). The Virtue of Selfishness: A New Concept of Egoism. New York: New American Library.

54. Roland, W. (2003). Galileo's Mistake: A New Look at the Epic Confrontation Between Galileo and the Church. New York: Arcade Publishing.

55. Rosen, E. (1975). Was Copernicus Revolutions Approved by the Pope. Journal of the History of Ideas, 36(3), 537.

56. Rushdie, S. (2011). The Satanic Verses. London: Random House.

57. Russell, B. (1976). The Impact of Science on Soceity. London: Routledge Taylor & Francis Group.

58. Russell, B. (n.d.). The History of Western Philosophy. London: G.Allen & Unwin Ltd.Segal, A. (1996, June). Why Does the Muslim World Lag in Science? The Middle East Quarterly, 3(2), 61-70.

59. Smith, M. (1994). al-Ghazali: The Mystic. London.

60. Savory, R. M. (1980). Introduction to Islamic Civilisation. New Dehli: Vikas.

61. Sarton, George (1975). Introduction to the History of Science. New York: Huntington.

62. Scott, Gordon (2009). Controlling the State: Constitutionalism from Ancient Athens to Today. Harvard: Harvard University Press.

63. Sharif, M. M. (1963). A History of Muslim Philosophy. Otto Harrassowitz: Kempten.

64. Stephenson, F. Richard (1997). Historical Eclipses and Earth's Rotation. New York: Cambridge University Press.

65. Strum, Thomes; Is There a Problem with Mathematical Psychology? A fresh look at Kant's old argument, journal of history of behavioural sciences, 42 (2006).

66. Taylor, C. (1985). Philosophy and the Human Sciences. Cambridge: Cambridge University Press.

67. Taylor, F. S. (1957). A History of Industrial Chemistry. London: Heinmann.

68. Toynbee, A. J. (1947). A Study of History: Abridgement of Volumes I to VI. New York: Oxford University Press.

69. Walbridge, J. T. (1998). Explaining Away the Greek Gods in Islam. Journal of the History of Ideas, 59(3), 389-403.

70. Whitehouse, D. (2009). Renaissance Genius: Galileo Galilei & His Legacy to Modern Science. London: Sterling Publishing.

71. Wickens, G. (1976). The Middle East as a World Centre of Science and Medicine in Introduction to Islamic Civilization. Cambridge: Cambridge University Press.

72. Wright, C. J. (2006). Ibn 'Abd Al-Hakam's Futuh Misr: An Analysis of the Text and New Insights Into the Islamic Conquest of Egypt. Santa Barbara: University of California.

73.http:/www. etymonline, com/index, php? term = ream

74.https://en.wikipedia.org/wiki/Islamic_contributions_to_Medieval_Europe

75.https://en.wikipedia.org/wiki/Islamic_contributions_to_Medieval_Europe

76.http://archive.li/MQuyg

77.http://www-history.mcs.st-andrews.ac.uk/Biographies/Al-Jayyani.html

اشاریہ

ز

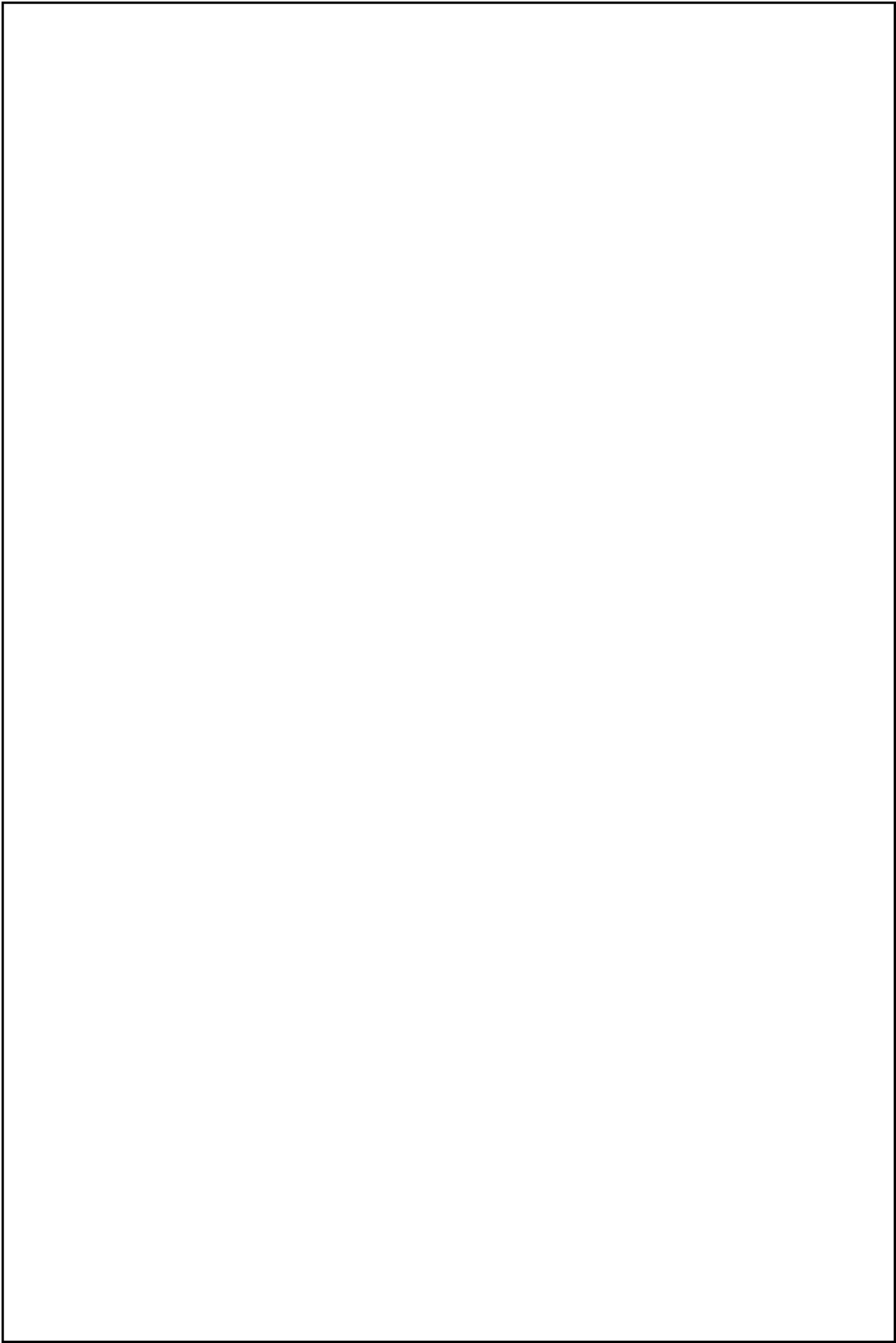
ژ

ش

غ

ف

ق





میں نے اسلام کی تعلیم بہت کم عمری میں، ملتان کے ایک دُورافتادہ گاؤں کے ایک مدرسے سے حاصل کرنا شروع کی جو آج تک جاری ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجھ پر اسلام کی خوبصورت سچائیاں واضح ہوتی چلی گئیں۔ اس سے میں اس امر کا قائل ہوگیا ہوں کہ اسلام کی موجودہ قدامت پسندانہ تعبیر سہوِ زمانی (anachronistic) ہے۔ اسلام، جو بنی نوعِ انسان پر اللہ تعالیٰ کی سراسر شفقت و رحمت ہے، غلط تعبیر کرنے والوں کے ہاتھوں استحصال اور غربت و افلاس پھیلانے حتیٰ کہ دہشت گردانہ اقدامات کی وجہ سے قتلِ انسان کا بھی ایک ذریعہ بن چکا ہے۔ مسلمان ماضی میں پھنس کر رہ گئے ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک صحیح جدید اسلامی زندگی وجود میں لانے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ اگر پیروکارانِ اسلام اپنے مذہب کو صحیح طور پر سمجھتے اور اس پر عمل کرتے تو یہ انہیں شاندار ترقیوں سے ہمکنار کر دیتا۔

حقیقی 'اجتہاد' نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان امن وخوشحالی کی زندگی کے حصول سے محروم ہو چکے ہیں، جس کی بنا پر وہ اپنی پوری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع کھو بیٹھے ہیں۔ یہ مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ میں مسلم عوام اور مذہبِ اسلام پر پورا یقین رکھتا ہوں۔ میرا یہ یقین بھی ہے کہ علم اور صحیح ایمان رکھتے ہوئے ہم وہی لوگ بن سکتے ہیں جو کبھی ہوا کرتے تھے۔ ایسے لوگ بن سکتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے چاہتا رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس نصب العین کے لیے یہ کتاب ہمارے سفر کا ایک حصہ بنے گی اور یہ سفر درحقیقت گمشدہ روایت کی بازیافت کے لیے ایک کوشش ہے۔



ظفر اللہ خان نے ابتدائی دینی و دنیاوی تعلیم صوفیائے کرام کے شہر ملتان سے حاصل کی۔ ایف اے کا امتحان ملتان ایجوکیشن بورڈ سے دوسری پوزیشن میں پاس کیا۔ بی اے کے امتحان میں بہاء الدین زکریاؒ یونیورسٹی ملتان سے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم ایس سی (بین الاقوامی تعلقات) کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ کچھ عرصے تک انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں درس و تدریس کے شعبے سے منسلک رہے۔ 1987ء میں سول سروس آف پاکستان کے ڈسٹرکٹ مینجمنٹ گروپ میں شمولیت اختیار کر لی۔ 1997ء میں سٹی یونیورسٹی لندن سے ایل ایل بی (آنرز) کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ یونیورسٹی آف ویسٹ آف انگلینڈ، برسٹل (برطانیہ) سے 1998ء میں قانون میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ حاصل کیا اور لنکنز ان (لندن) سے بار ایٹ لاء کرنے کے بعد ملازمت سے استعفیٰ دے کر آپ قانون کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ آپ نے ہیگ (ہالینڈ)، تورین (اٹلی)، جنیوا (سوئٹزرلینڈ) اور آکسفورڈ (برطانیہ) سے قانون اور بین الاقوامی تعلقات پر کئی خصوصی کورسز کیے۔ آپ اسلام، قانون اور حقوقِ انسانی پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ وفاقی سیکریٹری قانون و انصاف بھی رہے۔ آپ آجکل وزیراعظم پاکستان کے خصوصی معاون/ وفاقی وزیر برائے قانون و انصاف ہیں۔



Price Rs. --------/-